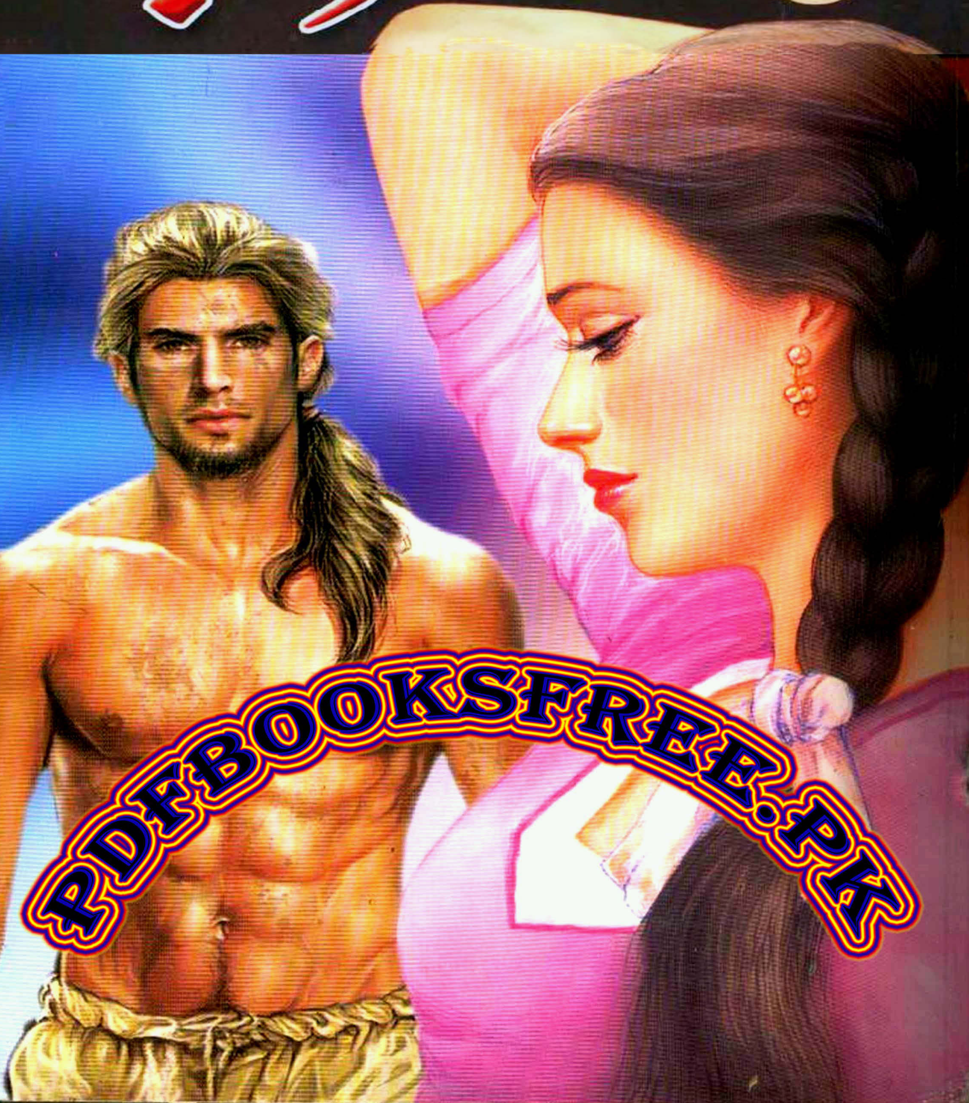
ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

8



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تہلکہ خیز کہانی

سراب

آٹھواں حصہ

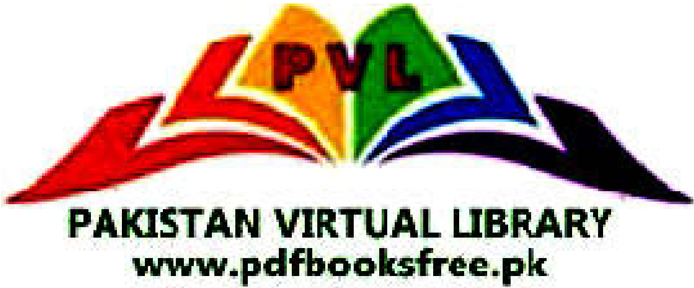
کاشف زبیر



علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون:37247414

باراشاعت ——— اول
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— 200 روپے
بیرون ملک ——— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر



ISBN 978-969-517-320-6

Stokist:(U.K)
Azhar Enterprises
315, Dickenson Road
Longsight, Manchester, M13 ONR
Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر ہلکی سی لیکن مستقل دستک ہو رہی تھی۔ آنکھ اسی وجہ سے کھلی تھی۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا اور آہستہ سے پوچھا۔

"کون ہے باہر؟"

"میں ہوں۔" شہلا کی دھیمی آوازی آئی۔ "دروازہ کھولو۔"

گھڑی میں صبح کے چھ بج رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور شہلا عجلت میں اندر آئی۔ "اٹھو تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

اس دوران میں بیتو بھی اٹھ گیا تھا۔ شہلا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "کیا ہوا شوبی بھائی؟"

"کچھ نہیں ہمیں یہاں سے جانا ہے۔" میں نے شہلا کی طرف دیکھا۔ "تمہارے شوہر کو شک تو نہیں ہوا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں.......... اصل میں وہ عجلت میں کچھ فائلز لینے آیا تھا اور صبح سویرے کی فلائٹ سے چلا گیا۔"

"تو پھر اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ذرا آرام سے ناشتہ وغیرہ کر کے چلتے ہیں۔"

شہلا نے مجھے گھورا اس وقت اس نے ویلوٹ کا سادہ سوٹ پہن رکھا تھا گھر کے اندر اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں تھی لیکن باہر یقیناً خاصی سردی تھی۔ ہمارے لباس بھی عام سے تھے۔ پروفیسر بدبخت نے سب چھین لیا تھا۔ "ہم رک نہیں سکتے۔ ملازمہ اور اس کا شوہر میرے اعتماد کے ہیں لیکن ڈرائیور ناصر کا آدمی ہے وہ اسے بتا سکتا ہے اس کے آنے سے پہلے ہمیں یہاں سے جانا ہو گا۔"

"ناصر اب کب آئے گا؟"

"کل واپس آئے گا، اب چلو۔" شہلا بہت بے تاب تھی۔

بیتو سمجھ گیا کہ اس کی نیند کے دوران میں کوئی ایسی تبدیلی آئی تھی جس کی وجہ سے شہلا مجھ سے اس طرح بے تکلفی سے بات کر رہی تھی لیکن اس نے سوال نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ "چلو ہم تو تیار ہیں۔ ویسے دو گرم چادریں مل سکتی ہیں؟"

ہاں میں لے آئی ہوں اور وہ ریوالور مجھے واپس کر دو۔"

میں نے سوچا اور ریوالور اپنے کرتے کے دامن سے صاف کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''بہت چالاک ہو۔''

''بننا پڑتا ہے۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

''تم رکو اور واش روم سے فارغ ہو جاؤ تب تک میں آتی ہوں۔'' شہلا کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بیتو کے پوچھنے سے پہلے اسے رات کا احوال بتا دیا اور شہلا کے مشورے پر عمل کرنے کے لیے باتھ روم کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب تک بیتو بھی وہاں سے ہو آیا شہلا آ گئی۔ اس نے دو گرم چادریں میری طرف بڑھا دیں۔ ''زیادہ گرم تو نہیں ہیں لیکن گزارا ہو جائے گا۔''

''ہو جائے گا ویسے تم ہمیں کہاں لے جا رہی ہو؟''

''میں تمہیں کسی سڑک تک چھوڑ دوں گی۔ وہاں سے تم جہاں جانا چاہو۔''

میں چونکا۔ ''یعنی تم ہمیں جانے کی اجازت دے رہی ہو۔''

''اور کیا میں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے رکھنا ہے کیا؟'' وہ چڑ چڑے پن سے بولی۔

''اگر تم سڑک کے بجائے ہمیں آب پارہ میں اتار دو؟'' میں نے کہا۔ ''وہاں سے ہمیں آسانی ہو جائے گی۔''

''نہیں مجھے مخالف سمت میں جانا ہے۔'' اس نے انکار کر دیا۔ ''میں تمہیں سڑک تک اتار سکتی ہوں۔''

میں نے ایک چادر بیتو کی طرف بڑھا دی۔ اس نے میرے پاؤں کا معائنہ کیا۔ ''اب آپ بالکل ٹھیک چلتا ہے۔''

''ہاں میرے پاؤں کی چوٹ ٹھیک ہو گئی ہے۔''

بیتو کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ اس سے پہلے بھی کئی بار مجھے حیرت انگیز طور پر زخموں اور چوٹوں سے ٹھیک ہوتے دیکھا چکا تھا۔ البتہ شہلا کی حیرت بجا تھی۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں نے رات تمہارا گھٹنا دیکھا تھا۔ یہ اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گیا کیا تم نے کوئی دوا لی ہے؟''

''نہیں دوا تو وہی لی تھی جو ڈاکٹر نے دی تھی۔''

''پھر اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گیا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے اسے ٹالا۔ ''ممکن ہے چوٹ اتنی شدید نہ ہو جتنی شروع میں لگ رہی تھی۔''

شہلا کو عجلت تھی اس لیے اس نے سوال جواب میں مزید وقت ضائع نہیں کیا اور ہم اس کی کار میں بیٹھ کر کوٹھی سے باہر آ گئے۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور فضا پر ابھی دھند حاوی تھی۔ اس لیے شہلا سست روی سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ کل رات وہ تیز رفتاری کے چکر میں ایک حادثہ کر بیٹھی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد اس نے کار ایک سڑک کے کنارے روک دی اور اپنے پرس سے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھائی۔

''یہ رکھ لو...... اسے ہونے والی تکلیف کا ازالہ سمجھ لو یا جو تمہاری مرضی ہو۔ یہاں سے تم کو کوئی سواری مل جائے گی۔''

میں نے گڈی لے لی۔ اس میں کم سے کم چار ہزار روپے تھے اور رقم کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔

''شکریہ۔''

''بس اب اتر جاؤ۔'' شہلا نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے بہت جلدی ہو۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ پروفیسر کے پاس تو نہیں جا رہی تھی۔ میں اور بیتو نیچے آئے اور اس نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔ بیتو نے میری طرف دیکھا۔

''اب کیا کرنا ہے شوبی بھائی۔''

اس وقت میں کشمکش میں تھا اور ایک ٹیکسی نے آ کر میری کشمکش کا خاتمہ کر دیا۔ سواری نظر آتے ہی میں نے شہلا کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ٹیکسی خود آ کر ہمارے پاس رکی اور اس کے ڈرائیور نے سر نکال کر کہا۔

''بھاجی کتھے جانا اے؟''

میں بیتو سمیت عقبی نشست پر آ گیا۔ ''یار آگے ایک سیاہ ہنڈا اکارڈ جا رہی ہے۔ اس کے پیچھے چلنا ہے۔''

ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔ ''بھاجی کی مسئلہ اے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے یار۔'' میں نے کہا اور سو سو کے تین چار نوٹ اس کی گود میں ڈال دیئے۔ ''جلدی کرو کہیں وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔''

نوٹوں کی جھلک نے ڈرائیور کی زبان بند کر دی تھی اور اس نے عجلت میں ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ اس وقت سڑک صاف تھی۔ میں نے اسے رفتار تیز کرنے کو کہا کیونکہ شہلا کی کار خاصی آگے جا چکی تھی۔ یہ اسلام آباد کی مرکزی شاہراہ تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ شہلا کہیں اور نہ مڑ جائے لیکن ڈرائیور نے تیز رفتاری سے دو منٹ میں اس کی کار کو جا لیا تھا۔ وہ کار کے پاس پہنچا تو میں نے اشارہ کیا۔ ''یہی کار ہے بس مناسب فاصلے سے اس کے پیچھے رہو۔''

''بھاجی ابھی بتا دو کوئی چکر تو نہیں ہے۔ میں غریب آدمی ہوں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' ڈرائیور نے لجاجت سے کہا۔

''اول تو کوئی خطرناک چکر نہیں ہے دوسرے ہم کسی کا نقصان نہیں کرتے ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

دھند کی وجہ سے کار کے اندر بیٹھی شہلا واضح نظر نہیں آ رہی تھی ورنہ ٹیکسی والا مزید شک میں پڑ جاتا۔ نوٹوں نے اس کی زبان بند کر دی تھی لیکن اسے شک تھا کہ ہم ٹھیک لوگ نہیں تھے۔ پھر ہم نے گرم چادریں اوڑھ رکھی تھیں اور ان کے نیچے تو ایل ایم جی بھی چھپائی جا سکتی تھی۔ ذرا آگے جا کر شہلا کی کار راولپنڈی جانے والی سڑک پر گھوم گئی۔ مجھے یاد تھا کہ اس نے اسلام آباد کا ذکر کیا تھا۔ پروفیسر یہیں کسی کوٹھی کے چکر میں تھا اور اسے کرائے پر حاصل کرنے کے لیے شہلا کو آگے کر رہا تھا۔ شہلا ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیوی تھی اور اس کی ضمانت سب مان لیتے۔

کوئی دس منٹ بعد کار سیٹلائیٹ ٹاؤن میں داخل ہوئی جو امرا کی آبادی ہے۔ اس وقت سورج کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی اور فضا میں چھائی دھند تیزی سے تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ اب ٹیکسی ڈرائیور کو کار میں بیٹھی شہلا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ چونکا۔ ''یہ تو کوئی خاتون ہے جی۔''

''ہاں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں پورا

معاوضہ مل جائے گا۔"

اب اسے ہمارے بارے میں پختہ شبہ ہو چکا تھا کہ ہم ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔ ممکنہ طور پر جرائم پیشہ ہیں اور یقیناً مسلح بھی ہیں اسی خیال نے اس کی گھگی باندھ دی تھی اور میری بات سن کر وہ بلا چوں چراہ کیے ڈرائیو کرنے لگا۔ روشنی ہونے کی وجہ سے میں نے اسے دونوں گاڑیوں میں فاصلہ زیادہ کرنے کو کہا۔ اس نے ٹیکسی کو مزید پیچھے کرلیا۔ شہلا سُست روی سے کار ڈرائیو کر رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی خاص پتے کی تلاش ہو۔ ایک جگہ رک کر اس نے ایک کوٹھی کے چوکیدار سے کچھ پوچھا بھی تھا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ ایک کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ یہ سیٹلائیٹ ٹاؤن کا بھی انتہائی پوش علاقہ تھا اور یہاں کوئی کوٹھی دو کنال سے کم کی نہیں تھی۔ صاف ستھری کشادہ سڑکیں اور کھمبوں پر اس وقت بھی اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ گرین بیلٹ ہری بھری تھی۔ ہر کوٹھی کے ساتھ ساتھ الگ سے گرین بیلٹ تھی۔ شہلا کار سے اُتری اور اس نے گیٹ کے ساتھ لگی کال بیل بجائی۔

"ٹیکسی پیچھے روک دو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ ٹیکسی گلی کے کونے پر لے آیا۔ میں نے اترتے ہوئے بیتو سے کہا۔ "تم یہیں رکو میں ابھی آتا ہوں۔"

"بھاجی مینوں جانے دو۔" ٹیکسی والے نے دبی زبان میں کہا۔

"اوئے مرا کیوں جاتا ہے۔ تھوڑا انتظار کرلے ہمیں واپس بھی جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کا خیال رکھنا۔" میں نے بیتو سے کہا تو اس نے چادر کے نیچے یوں ہاتھ مارا جیسے کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہو۔

"آپ فکر نہ کرو۔"

میں ذرا آگے آیا اور درختوں کی آڑ لے کر اس کوٹھی کی طرف بڑھنے لگا۔ جس میں شہلا گئی تھی۔ وہ اندر جا چکی تھی۔ میں گیٹ تک پہنچا اور اندر جھانکا تو شہلا ایک چوکیدار نما شخص کے ساتھ نظر آئی۔ مرد نے ملیشیا کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ شہلا اس سے کہہ رہی تھی۔

"مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کوٹھی کا مالک سات بجے یہاں ملے گا لیکن وہ اب تک نہیں آیا۔ اب تو ساڑھے سات بج رہے ہیں۔"

"بس بیگم صاحبہ وہ آنے والا ہے۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "آپ کے لیے ڈرائنگ روم کھول دیتا ہوں آپ ادھر آرام سے بیٹھو۔"

شہلا نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے کھولو یہاں سردی بہت ہے۔"

اس نے اپنے بدن سے چپکے ویلوٹ کے سوٹ پر کچھ اور نہیں لیا تھا اور ایسے ہی چلی آئی تھی اس لیے سردی تو لگنا تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ چوکیدار حریص نظروں سے اس کے جسمانی نشیب و فراز کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کا انداز مجھے بے حد مشکوک لگا تھا۔ وہ شہلا کو لے کر کوٹھی کی طرف بڑھا۔ گیٹ اور عمارت کے درمیان میں لوئی سوفٹ کا لان تھا۔ اس کے بعد ٹیرس تلے کار پورچ تھا۔ چوکیدار نے کار پورچ کے سامنے دو پٹوں والا دروازہ کھولا اور شہلا کو اندر لے گیا۔ اب میرے لیے موقع تھا میں گیٹ پھلانگ کر اندر جا سکتا تھا۔ یہ گیٹ مشکل سے چھ فٹ اونچا تھا اور اس پر کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔

لیکن اس سے پہلے میں اپنے ارادے کو عملی جامع پہناتا بائیں طرف کہیں سے دو افراد نکل کر تیزی سے کوٹھی کی طرف گئے۔ حلیے سے وہ بھی نچلے طبقے کے لگ رہے تھے لیکن وہ پورچ والے دروازے سے اندر جانے کے بجائے کوٹھی کی بغلی سمت سے اندر کہیں غائب ہو گئے۔ ان کا انداز چوروں والا تھا۔ میرا شک مزید بڑھ گیا تھا۔ چوکیدار اور ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی اور نہ جانے وہ کس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہ پروفیسر کے آلہ کار بن گئے ہوں۔ ان کے لیے لاکھ روپے بھی بڑی رقم ہو سکتی تھی اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

ان کے اندر غائب ہونے کے بعد میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر گیٹ کے بجائے اس کے پاس موجود درخت تک آیا۔ گیٹ کھلی جگہ تھا اور سامنے کوٹھیوں سے صاف نظر آتا اس لیے میں نے گیٹ کے بجائے درخت کے ساتھ دیوار پھلانگنے کو ترجیح دی۔ یہ کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی لیکن درخت کی وجہ سے کام آسان ہو گیا تھا۔ اس کے تنے پر پاؤں جماتے ہوئے میں نے اچھل کر دیوار پکڑ لی اور اس پر چڑھ کر اندر کودنے سے پہلے میں نے چادر اتار کر کمر سے لپیٹ لی تھی۔ یہ حرکت کرنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ میں آرام سے اندر نرم گھاس پر کود گیا اور پھر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کوٹھی کی طرف جانے لگا۔

میں کھلی جگہ میں تھا اور کوئی سامنے سے نکل آتا یا اندر سے جھانک لیتا تو میں فوراً نظروں میں آجاتا لیکن اتنا خطرہ تو مول لینا تھا اور ویسے بھی میرا خیال تھا کہ کوئی اندر سے نہ تو نکلے گا اور نہ ہی جھانکے گا۔ میں دائیں طرف سے کوٹھی کی عمارت تک پہنچا اور اس طرف موجود باغ کے ساتھ عمارت کا معائنہ کیا۔ اس میں ایک ہی دروازہ تھا اور تمام کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی میں نے دروازے پر طبع آزمائی کی۔ وہ اندر سے بند نکلا میں عمارت کے عقب میں جا نکلا۔ ایک دروازہ یہاں بھی تھا اور یہ بھی بند نکلا تھا۔ اب میرے پاس سوائے سامنے والے دروازے سے اندر جانے کے اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ وہ بھی بند نکلتا تو میں کسی صورت اندر نہیں جا سکتا تھا۔ میں گھوم کر سامنے پورچ والے دروازے تک آیا اور جب میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو میری مایوسی بڑھ گئی۔ یہ بھی بند تھا اور اب اندر جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نہیں جان سکتا تھا کہ اندر شہلا پر کیا گزر رہی تھی۔ وہ خیریت سے تھی یا ان تین مردوں کے نرغے میں اس کی جان و آبرو خطرے میں تھی۔

میں ذرا پیچھے آیا اور اوپر والی منزل کا جائزہ لیا۔ یہ بہت اوپر تھی اور کوئی ایسا ذریعہ بھی نظر نہیں آرہا تھا جس کی مدد سے میں اوپر تک جا سکتا۔ ستون اور دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ کوٹھی کے بائیں طرف ایک لمبا سا باغ تھا اور گیٹ کے ساتھ ہی نیچی چھت والا ایک کمرہ بنا ہوا تھا یہ شاید چوکیدار کے لیے تھا اور وہ دو افراد اسی سے نکل کر عمارت کے اندر گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ چوکیدار ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس سے ملے ہوئے تھے۔ یہ جان کر مجھے شہلا کی عافیت مزید خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ میں نے چوکیدار کے کمرے کی طرف دیکھا تو مجھے اس کے ساتھ ہی ایک سیڑھی نظر آئی۔ یہ ایک ایسی سیڑھی تھی جو تہہ ہو کر چھوٹی ہو جاتی اور اس کے دو طرف کھلنے والے پایوں کی مدد سے اسے کہیں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میں نے قریب سے اس کا معائنہ کیا۔ یہ آٹھ فٹ اونچی تھی لیکن اس کی دوسری تہہ بھی کھول دی جاتی تو یہ سولہ فٹ لمبی سیڑھی بن جاتی اور یہ آرام سے دوسری منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ میں اسے سامنے والے ٹیرس تک لایا اور اسے کھول کر اوپر دیوار سے ٹکایا۔ یہ

اب بھی ٹیرس کی دیوار کے سرے تک نہیں پہنچی تھی لیکن اس سے کام چل سکتا تھا۔

میں اوپر پہنچا تو ٹیرس کی دیوار میرے ہاتھ سے کوئی دوفٹ اوپر تھی۔ اب میں نے خطرہ مول لیا اور صرف دیوار پر ہاتھ جما کر سیڑھی کے آخری تختوں پر قدم رکھنے لگا تھا۔ اگر سیڑھی سرک جاتی تو میں آرام سے کوئی سولہ فٹ نیچے جا پڑتا اور پختہ فرش میری کئی ہڈیاں اور پسلیاں برابر کر دیتا لیکن خیریت رہی اور میرا ہاتھ منڈیر تک جا پہنچا اس پر ہاتھ جما کر میں نے خود کو اوپر کیا اور ٹیرس میں کود گیا۔ اس طرف جو کمرہ تھا اس کی کھڑکیاں اور دروازہ ٹیرس میں ہی کھل رہا تھا۔ میں نے دروازہ دیکھا وہ لاک تھا لیکن ایک کھڑکی کا پٹ کھلا رہ گیا تھا اور اس میں گرل بھی نہیں تھی۔ میں آرام سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک شاندار قسم کا بیڈروم تھا اور یقیناً کسی عیاش آدمی کا تھا کیونکہ وہاں لائف سائز برہنہ مجسمے تھے اور دیواروں پر موجود مصوری کے نمونوں کو صرف فحاشی قرار دیا جا سکتا تھا۔ ایک خوب صورت آرٹ اتنا گھٹیا استعمال افسوس ناک ہی تھا۔ میں باہر نکلنے والے دروازے تک پہنچ گیا۔ اب تک مجھے کہیں سے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

میں کمرے سے نکل کر ایک وسیع لاؤنج میں آیا جس کی کھڑکیاں دائیں طرف کے باغ کی سمت کھل رہی تھیں۔ ایک طرف سے کشادہ سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں لیکن نیچے جانے سے پہلے میں نے اوپر کی تلاشی لینا مناسب سمجھا۔ بیڈروم میں مجھے کچھ نہیں ملا تھا۔ مجھے کسی ہتھیار کی تلاش تھی لیکن وہاں سوائے ایک پھل کاٹنے والی معمولی سی چھری کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے ہی اٹھا لیا۔ اوپر لاؤنج کے ساتھ ایک چھوٹا بیڈروم اور بھی تھا لیکن یہ معمولی انداز میں سجا تھا۔ اوپر کوئی نہیں تھا شہلا اور وہ تینوں یقیناً نیچے ہی تھے۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ یہاں بھی پُراسرار قسم کی خاموشی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرف کا رخ کروں کہ مجھے ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی۔ پھر کم سے کم دو مرد وحشیانہ انداز میں ہنسے اور میں نے سمت کا تعین کر لیا کہ آوازیں کس طرف سے آ رہی تھیں۔ میں اس طرف بڑھا اور ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا آوازیں اس طرف سے ہی آ رہی تھیں۔ شہلا چیخی اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اِس کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے۔ اب بات میری برداشت سے باہر تھی۔ میں نے دروازہ چیک کیا وہ کھلا تھا اور میں نے اسے ایک ٹھوکر کے ساتھ کھولا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے بیشتر حصے میں سوائے ایک دبیز قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بھی شاید فرشی ننگ روم تھا۔ وہ سب وسط میں تھے اور شہلا کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو کسی شیرنی کی طرف مچل رہی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور نہیں تھی بلکہ مضبوط اور ٹھوس جسم کی مالک تھی شاید وہ باقاعدگی سے ورزش یا تیراکی کرتی تھی۔ وہ ان کے قابو میں نہیں آئی تھی لیکن انہوں نے اس کے لباس کا حشر نشر ضرور کر دیا تھا۔ قمیص تو تقریباً غائب تھی۔ اس کے باوجود وہ جی داری سے اپنا دفاع کر رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ یہ سلسلہ کوئی دس منٹ سے جاری تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اندر آتے ہی اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ جس وقت میں اندر آیا ناکامی پر جھنجھلایا ہوا ایدارا اسے تھپڑ مار رہا تھا اور اس کے ساتھیوں نے شہلا کے ہاتھ پاؤں قابو کر رکھے تھے اگرچہ ان کو اس میں مکمل کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

دھڑام سے دروازہ کھلا اور میں اندر آیا تو وہ چونک کر اٹھے تھے۔ ان میں سے ایک غراتا اور بھونکتا ہوا میری طرف لپکا۔ ''اوئے کون ہے تُو تیری تو......''

وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا اس کے آگے کے باقی الفاظ دانتوں سمیت اس کے پیٹ میں اتر گئے تھے۔ میرا گھونسہ ایسا ہی زوردار تھا اور وہ اپنے ایک ساتھی پر جا گرا جو شہلا کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لڑھک گیا اور شہلا کو موقع مل گیا اس نے پہلے سر سے چوکیدار کی ناک کو نشانہ بنایا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بال پکڑ کر سر اپنی طرف کھینچا تھا۔ چوکیدار کراہ کر الٹ گیا۔ مشتعل شہلا نے اٹھتے ہی اس کے جسم کے درمیان کو پاؤں کا نشانہ بنایا۔ اس کی ٹھوکر بالکل درست مقام پر اور پوری قوت سے لگی تھی۔

''ہائے...... ماں۔'' چوکیدار چلایا اور پیٹ پکڑ کر لوٹنے لگا۔

''ماں کے......'' شہلا نے اسے ٹھوکریں مارنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اس بار وہ اس کے منہ کو نشانہ بنا رہی تھی۔ اسے چوکیدار کے ساتھ مصروف چھوڑ کر میں باقی دو کی طرف متوجہ ہوا۔ ان میں سے ایک اپنی قمیص کی طرف لپکا تھا جس میں شاید کوئی ہتھیار تھا اور میں اسے موقع دیئے بغیر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ میرا گھٹنا اس کے منہ پر لگا تو وہ قمیص اٹھانے کی حسرت لیے پیچھے الٹ گیا۔ جس کے منہ پر میں نے گھونسہ مارا تھا وہ ابھی تک اپنے دانتوں کو رو رہا تھا۔ منہ پر گھٹنا کھانے والے نے اس کی خاندانی تاریخ بعض ناپاک جانوروں کے ساتھ غلط ملط کرتے ہوئے چیخ کر کچھ کرنے کو کہا۔

''دیکھتا کیا ہے مار دے حرامی کو۔''

میں نے پہلے مشورہ دینے والے کو گردن سے دبوچا اور گھما کر ایک طرف دیوار پر دے مارا۔ وہ دھما کے کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مر چکا ہو۔ یہ دیکھ کر دانتوں کو رونے والی کی گھگی بندھ گئی تھی۔ میں نے جسے دیوار پر مارا تھا اس کا وزن کم سے کم ستر کلوگرام تھا اور میں نے اسے کھلونے کی طرح اٹھا کر مارا تھا۔ دوسرے نے ہاتھ اٹھا دیئے لیکن میں اسے معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ شہلا بری سہی لیکن ایک عورت تھی اور عورت کے ساتھ یہ سلوک کرنے والے مجھے دنیا میں سب سے زیادہ برے لگتے ہیں۔ میں نے اس کا اٹھا ہاتھ پکڑا اور اسے بھی کھینچ کر دیوار پر دے مارا۔ وہ بھی ایک دردناک کراہ کے ساتھ اپنے ساتھی پر ڈھیر ہو گیا۔ چوکیدار کو شہلا پہلے ہی ادھ موا کر چکی تھی اس کے پیروں نے چوکیدار کا ناک منہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں اسے ٹھوکریں مار رہی تھی۔

''بس کرو۔'' میں نے اس کا بازو پکڑا تو اس نے مجھے بھی خون خوار نظروں سے دیکھا اور جھٹکا دے کر بازو چھڑانے کی کوشش کی لیکن میری گرفت اتنی کمزور نہیں تھی۔

''چھوڑو وحشی۔'' وہ کراہی۔ ''تم یہاں کیسے آئے؟''

''میں تمہارا تعاقب کرتا یہاں آیا ہوں۔ میں پانی لاتا ہوں جب تک تم اپنا حلیہ درست کرو۔'' میں نے چادر اتار کر اسے دے دی اور کمرے سے باہر آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوش میں آ چکی ہے۔ اس لیے میں اس کی طرف سے مطمئن تھا اور اصل غلطی میں نے چھری وہاں چھوڑ کر کی۔ پانی مجھے کچن سے ملا تھا اور میں بوتل سمیت آ رہا تھا کہ مجھے کمرے سے کسی کے غرارے کرنے جیسی آواز آئی۔ میں بے ساختہ بھاگا۔ کمرے کے اندر بہت خوفناک منظر تھا۔ شہلا نے چوکیدار کی گردن چاقو سے کاٹ ڈالی تھی اور غرارے جیسی آواز اس کے کٹے گلے سے خون کے فوارے کے ساتھ نکل رہی تھیں۔ اس کا گلا کاٹنے کے دوران خود شہلا خون میں نہا گئی تھی لیکن اسے اس

کی کوئی پروانہیں تھی۔ اس نے میری دی ہوئی چادر تک لینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھے کمرے میں آتا دیکھ کر وہ چونکی اور باقی دو افراد کی طرف لپکی لیکن اس سے پہلے وہ ان میں سے کسی پر چھری آزماتی میں نے اس کا چھری والا ہاتھ قابو کر لیا۔ اس نے بل کھا کر مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا ہاتھ قابو میں رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر گھونسہ مارا اور وہ میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چاقو نکال کر اسے نیچے لٹا دیا۔ چوکیدار کا جسم نزع کے عالم میں جھٹکے کھا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ بس چند لمحے کا مہمان ہے۔ باقی دو بھی بے ہوش تھے یا بے ہوش بنے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا معائنہ کیا اور پھر ایک ایک ہاتھ ان کے سروں پر بھی جما دیا اس طرح ان کی بے ہوشی ذرا طویل ہو گئی تھی۔

میں نے شہلا کی چیتھڑے ہو جانے والی قمیص سے اس کا جسم صاف کیا اور اب اسے لے کر یہاں سے نکلنا تھا۔ اس حالت میں لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں اوپر والے بیڈ روم میں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں مجھے نسوانی ملبوسات مل جائیں گے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا ایک الماری میں کئی طرح اور سائز کے کپڑے موجود تھے۔ میں نے اندازے سے ایک سوٹ نکالا اور نیچے آیا۔ لباس تبدیل کرانا میرے بس سے باہر تھا اس لیے میں نے ٹھنڈا پانی شہلا کے منہ پر چھڑکا۔ اس کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا اور وہ ہوش میں آنے لگی لیکن اسے پوری طرح ہوش میں آنے میں کئی منٹ لگ گئے تھے۔ وہ آنکھیں کھول کر خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''شہلا اٹھو شاباش ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' میں نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ اٹھ بیٹھی پہلے اس نے خود کو دیکھا اور خود میں سمٹ گئی۔ میں نے جلدی سے اسے چادر اوڑھا دی۔ اب اس نے چوکیدار کی لاش دیکھی جو کٹی گردن کے ساتھ مرا پڑا تھا اس کا منہ بھیانک انداز میں کھلا تھا اور آنکھوں کے ڈیلے اوپر چڑھ کر سفید ہو گئے تھے۔ شہلا خوف زدہ نظر آنے لگی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''یہ تم نے کیا ہے۔''

''مم...... میں نے؟'' وہ ہکلائی۔

''شہلا ان باتوں کا وقت نہیں ہے جلدی سے کپڑے پہنو اور یہاں سے نکلو اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے۔''

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ واش روم میں گھس گئی۔ میں نے اس شخص کے انگلیوں کے نشانات چاقو پر ... یے اور چاقو کمرے میں ایک ایسی جگہ ڈال دیا جہاں سے وہ فوری طور پر کسی کی نظر میں نہ آ سکے۔ ان دونوں ... ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شہلا چند منٹ میں نکل آئی۔ میرا لایا سوٹ اس کے ... تنگ اور پھنسا ہوا تھا لیکن برا نہیں لگ رہا تھا کیونکہ آج کل اس قسم کے لباس عام ہیں جن میں پہننے والی کا ... ہو سکے۔

''اپنے کپڑے بھی رکھ لو یہاں کچھ نہیں چھوڑنا۔''

اس نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے تھے اور ان کو چادر میں باندھ لیا۔ ہم باہر آئے کیونکہ یہ قتل کا معاملہ تھا ... جہاں جہاں میرے ہاتھ لگے تھے میں نے وہ جگہیں ممکنہ حد تک صاف کر دیں۔ شہلا غور سے مجھے دیکھ ... ''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر رہا ہوں۔''

ہم باہر آئے اور میں نے سیڑھی کو اٹھا کر اسی جگہ رکھا۔ شہلا جھنجھلا گئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو یہاں سے نکل چلو۔''

''ضرور چلتے ہیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کیا ہوا تھا؟''

''کچھ نہیں مجھے اکیلا دیکھ کر چوکیدار اور اس کے ساتھیوں کی نیت خراب ہوگئی اور وہ مجھے دھوکے سے اندر لے گئے۔''

''تم یہاں کیوں آئی تھیں؟''

''اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''خوب میں نے آ کر تمہیں ان درندوں سے بچایا جو دوسری صورت میں تمہاری آبرو کی تکا بوٹی کر دیتے اور پھر تمہاری زخم زخم لاش کسی ویرانے میں پھینک آتے یا اسی کوٹھی میں دفن کر دیتے۔'' میں نے طنز کیا۔

''اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں۔'' وہ ذرا نادم ہوئی۔

''یہ وہی کوٹھی ہے جو تم پروفیسر کے لیے کرائے پر لینا چاہتی ہو؟''

وہ سمجھ گئی کہ اس معاملے میں مجھے بے وقوف نہیں بنا سکے گی مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ وہی کوٹھی ہے۔''

''لیکن وہ تو اسلام آباد میں تھی۔''

''ہاں لیکن اس کے مالک کا ارادہ بدل گیا یا پروفیسر کا ارادہ بدل گیا تو اس نے مجھے اس کوٹھی کو لینے کو کہا۔''

''یعنی تمہیں پروفیسر نے یہاں بھیجا ہے؟'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''کیا یہ اس کی حرکت نہیں ہو سکتی ہے؟''

''نہیں یہ ان لوگوں کی اپنی حرکت ہے۔'' شہلا کے لہجے میں طیش آ گیا تھا۔ ''جس حرامی نے منصوبہ بنایا تھا اسے تم نے ذبح کر دیا۔''

میں مسکرایا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسی حسین عورت اندر سے اتنی سفاک نکلے گی۔''

''اپنی عزت بچانے کے لیے مجھے حق حاصل ہے کہ میں کسی کو قتل کر دوں۔'' وہ بولی۔

''تمہاری عزت کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

وہ بھڑک گئی۔ ''ان غلیظ لوگوں نے ذرا سی دیر میں میرے کانوں میں جو گند ڈالی تھی اور جو حرکتیں کی تھیں وہ کسی طرح آبرو ریزی سے کم نہیں تھیں وہ میرے مجرم بن چکے تھے کاش میں بقیہ دو کا گلا بھی کاٹ سکتی۔''

''فکر مت کرو بچیں گے وہ بھی نہیں۔ میں نے ان میں سے ایک کے انگلیوں کے نشانات چاقو پر ڈال دیئے ہیں اور چاقو وہیں چھوڑ آیا ہوں پولیس کو جب ملا پھندا ان کے گلے میں فٹ کر دے گی۔''

وہ خوش ہوگئی۔ ''یہ تم نے اچھا کیا اب یہاں سے نکل چلو۔''

ہم باہر آئے اس کی کار پاس کھڑی تھی اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اس کا پرس اور اس میں موجود چیزیں محفوظ رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اچانک اس نے دروازہ کھولا اور منہ نیچے کر کے الٹی کر دی۔ اس کی طبیعت بگڑ رہی تھی۔ اس نے طیش میں آ کر ایک اضطراری قتل کر دیا تھا اور اب اس کے اثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ میں نے اس کی پشت سہلائی۔ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھی پانی کی بوتل

سے کلی کی اور چند گھونٹ لے کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈرائیونگ مجھے کرنے دو۔" میں نے کہا تو وہ خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر سرک آئی میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار گلی کے سرے کی طرف بڑھا دی جہاں ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیکسی کے پاس پہنچتے ہی مجھے گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا میں کار سے اتر کر اس کی طرف لپکا۔ عقبی سیٹ سے بیتو غائب تھا اور ڈرائیور آگے لڑھکا ہوا تھا میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اس کے سر پر گومڑ تھا اور وہ بے ہوش تھا۔ میں واپس آیا تو شہلا پریشان تھی۔

"کیا ہوا؟"

"ہم جس ٹیکسی میں آئے تھے اس کا ڈرائیور بے ہوش ہے اور میرا ساتھی غائب ہے۔" میں نے کہا اور پانی کی بوتل اٹھا کر ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے منہ پر پانی ڈالا اور پھر اسے تھپڑ مارے۔ ان کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا اور وہ ہوش میں آنے لگا۔ اس نے بڑبڑا کر کہا۔

"میکوں ٹھنڈ لگ ویسی۔"

"اٹھو۔" میں نے اسے جھنجھوڑا۔ "تم گھر میں نہیں ہو۔"

اس بار وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے وحشت سے چاروں طرف دیکھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"تم ٹیکسی میں ہو میرا ساتھی کہاں ہے جسے میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو تمہیں کیسے نہیں معلوم۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر ٹیکسی سے باہر کھینچ لیا۔ "شرافت سے بتاتے ہو یا......"

وہ عام آدمی تھا جسے اپنی جان اور مال دونوں پیارے ہوتے ہیں کیونکہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ہے۔ وہ کانپنے لگا تھا۔ "میں......سس......سچ کہتا ہوں جی مجھے نہیں معلوم۔"

"تب میرا ساتھی کہاں گیا؟" میں نے دھاڑ کر پوچھا

اب وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ "کوئی دو بندے آئے سی......تے میرے سر تے کچھ ماریا سی......فیر مینوں ہوش نئیں رہا۔" اس نے ملی جلی پنجابی اور اردو میں کہا۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا اور میں اس کے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ میں نے مزید سوالات کیے اور اس سے جو تصویر سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ اچانک ہی دو افراد عقب کی طرف آئے۔ اس سے پہلے ٹیکسی والا یا بیتو ہوشیار ہوتے وہ دائیں بائیں سے دروازہ کھول کر ٹیکسی کی عقبی نشست پر آ گئے اور اس سے پہلے کہ ٹیکسی ڈرائیور انہیں دیکھ پاتا ان میں سے کسی نے اس کے سر پر کچھ مارا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ کیا ہوا تھا۔

"یہ دیکھو میرا سر پھاڑ دتا۔" اس نے سر ملاحظے کے لیے پیش کیا۔

اس نے اپنے سر کی پڑی تھی اور مجھے بیتو کی۔ یقیناً ڈرائیور کو بے ہوش کرنے والے اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کہاں اور کس لیے لے گئے تھے؟ یہ سوال پریشان کن اور لاجواب تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں

تیزی سے شہلا کی کار کی طرف واپس آیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وہاں سے نکل گیا۔

''کیا بات ہے؟'' شہلا نے پوچھا۔

''کچھ لوگ ٹیکسی والے کو بے ہوش کر کے میرے ساتھی کو لے گئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کون لوگ ہو سکتے ہیں؟''

''یہ بتاؤ کیا پروفیسر نے بھی یہاں آنے کو کہا تھا؟ دیکھو غلط مت بولنا یہ میرے ساتھی کی زندگی کا سوال ہے۔''

وہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔''ہاں......اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آئے گا۔''

''اس کا مطلب ہے میرے ساتھی کو پروفیسر لے گیا ہے۔''

شہلا کو کسی قدر تعجب ہوا۔''پروفیسر......لیکن اسے تمہارے ساتھی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''کیونکہ وہ اس کوٹھی کے قریب موجود تھا میرا خیال ہے پروفیسر کو شک ہو گیا اور وہ اسے لے گیا۔''

''بات عقل میں نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔''سوال وہی ہے کہ پروفیسر کو اس کے بارے میں کیا معلوم اور وہ اسے کیوں لے جائے گا؟''

''وہ بہت چالاک آدمی ہے اور ٹیکسی کی موجودگی سے کھٹک گیا ہو؟''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔''تمہیں کیسے پتا کہ وہ چالاک آدمی ہے؟''

''تم نے تو بتایا ہے وہ جس طرح تمہیں بلیک میل کر رہا ہے اس طرح کوئی بے وقوف نہیں کر سکتا ہے۔'' میں نے بات بنائی اگرچہ شہلا بالکل بھی مطمئن نہیں تھی وہ بہت ذہین عورت تھی۔

''چلو مان لیا کہ پروفیسر کسی وجہ سے تمہارے ساتھی کو اغوا کر کے ساتھ لے گیا ہے اور اس میں اس کا کوئی مفاد بھی ہو گا تو اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''مجھے پروفیسر کا پتا درکار ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں اس کے بارے میں بالکل نہیں جانتی کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔''

''لیکن تمہارا اس سے رابطہ تو ہوتا ہے۔''

''ہاں میرے پاس ایک موبائل نمبر تو ہے لیکن اس کی مدد سے اس کا سراغ تو نہیں لگ سکتا۔''

''یہ بھی بہت ہے تم اس سے رابطہ کرو۔''

''میں اس سے رابطہ کر کے کیا کہوں؟''

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پروفیسر آیا تھا تو وہ یقیناً جان چکا ہے کہ تم کوٹھی میں داخل ہوئی تھیں اور خاصی دیر اندر رہی تھیں۔ اس لیے اب تمہیں اداکاری سے کام لینا ہو گا۔ تم اسے کال کر کے کہو کہ تم کوٹھی آئی تھیں اور وہاں کوئی نہیں تھا بیل بجانے کے بعد تم دروازہ کھلا دیکھ کر اندر چلی گئیں مگر اندر کوئی نہیں تھا اور کوٹھی بند تھی اس لیے تم واپس جا رہی ہو۔''

''یہ میں اس سے کہہ دوں گی اس کے بعد؟''

''اس کے بعد تم اس سے ملنے کو کہو گی۔''

''اگر اس نے انکار کر دیا تو؟''

''کیا تم اسے کسی طرح مجبور نہیں کر سکتیں؟''

''میں تو خود اس کے سامنے مجبور ہوں۔'' وہ تلخ انداز میں ہنسی۔ ''اسے کس طرح مجبور کر سکتی ہوں۔''

''تم اس سے کہہ سکتی ہو کہ اس کوٹھی سے متعلق بہت اہم بات معلوم ہوئی ہے اور وہ تم اسے دو بدو ہی بتا سکتی ہو۔''

''وہ بہت چالاک آدمی ہے اور پھر تمہارا ساتھی اس کے قبضے میں ہے تو وہ اس سے سب معلوم کر چکا ہو گا۔''

''میرے ساتھی سے زبان کھلوانا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''تم اس کے بارے میں نہیں جانتے وہ اس معاملے میں پورا شیطان ہے اس کے پاس نہ جانے کیسی دوائیں ہیں اگر وہ کسی آدمی کو کھلا دی جائیں تو اس کی قوتِ ارادی بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس سے جو کہا جائے وہ وہی کرتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے وہ میاں بیوی یاد آ گئے جو ہمیں اغوا کر کے لائے تھے اور انہوں نے ہم پر کوئی گیس آزمائی تھی۔ ''پھر بھی تم کوشش تو کرو۔''

اس نے پرس سے موبائل نکالا اور پروفیسر کا نمبر ملایا۔ خاصی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی۔ ''میں بات کر رہی ہوں وہاں گئی تھی لیکن وہاں تو کوئی نہیں ہے۔ مین گیٹ کھلا ہے اور کوٹھی اندر سے بند ہے۔''

میں نے کان موبائل کے قریب کیا تو شہلا نے میری سہولت کی خاطر اسپیکر فون آن کر دیا۔ پروفیسر کہہ رہا تھا۔ ''واقعی کیا تم اندر گئی تھیں؟''

''ہاں...... میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟''

''تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''نہیں تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''تم نے اسپیکر آن کیا ہوا ہے۔''

''ہاں ٹریفک کا شور ہے اس لیے صاف سنائی نہیں دے رہا تھا اس لیے آن کیا ہے۔'' شہلا نے ذہانت سے بات بنائی۔ ''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟''

''میں روز روز کے اس چکر کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔ تم وہ تصویریں میرے حوالے کر دو۔''

''اتنی آسانی سے۔'' پروفیسر ہنسا۔ ''ویسے تم کو پریشانی کیا ہے میں نے تمہیں کبھی ناجائز تنگ نہیں کیا ہے۔''

''میں دو مرتبہ خودکشی کرتے کرتے رہ گئی اور تم کہتے ہو تم نے مجھے تنگ نہیں کیا ہے۔'' شہلا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''تم ایک چیز طے کر لو کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور پھر وہ تصویریں میرے حوالے کر دو۔''

''کیا تم صرف اس لیے مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟''

''ہاں اور اگر آج تم نے مجھ سے ملاقات نہیں کی تو میں پھر کسی صورت تمہارے کام نہیں آؤں گی۔''

''تم مجھے انکار نہیں کر سکتی ہو۔''

''کر سکتی ہوں اگر میں خودکشی کر لوں تو کیا تم میری لاش سے اپنے مطالبات منواؤ گے۔''

پروفیسر کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا تھا پھر اس نے پوچھا۔''اس وقت تم کہاں ہو؟'' شہلا نے اپنی لوکیشن بتائی۔''او کے تم مری ہائی وے پر آ جاؤ بھارہ کہو کی آبادی دیکھی ہے؟''

''ہاں لیکن مجھے سڑک سے اترنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔''

''دائیں طرف جو پہاڑی ہے اس پر آ جاؤ۔ یہ بازار سے پہلے آتی ہے۔ پہاڑی پر ایک چھوٹی سی کوٹھی ہے۔ سڑک کے ساتھ ہے اس کے گیٹ پر سورج کی شبیہ بنی ہے۔ دائیں طرف ہے۔''

''میں آ رہی ہوں۔'' شہلا نے کہا اور کال کاٹ دی اور مجھ سے کہا۔''ڈرائیونگ مجھے دو۔''

''یہ کسی چکر میں ہے۔'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔''ورنہ تمہیں اتنی آسانی سے اپنا پتا نہیں بتاتا۔''

''پہلے تم پتا معلوم کرنا چاہ رہے تھے اور جب اس نے بتا دیا ہے تو شک کر رہے ہو۔'' وہ اکتائے انداز میں بولی اس نے کار آگے بڑھا دی تھی۔''ویسے تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اگر میرا ساتھی اس کے پاس ہے تو اسے چھڑانا چاہوں گا۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔''ورنہ اس سے مجھے اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

شہلا نے مجھے شک سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ گزشتہ رات بارش ہوئی تھی اور اسی وجہ سے ندیم کا فون خراب تھا۔ آب پارہ کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ندیم کے پاس سے ہوتا ہوا جاؤں۔ اس کے پاس میرے لیے کوئی اہم خبر تھی لیکن دل پر جبر کر کے میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ابھی بیتو کی بازیابی میرے لیے سب سے اہم تھی۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ بیتو کے اغوا میں پروفیسر ہی ملوث تھا لیکن میرا شک اس پر جا رہا تھا کیونکہ ایک تو وہ اس کوٹھی کی طرف آتا اور دوسرے وہ بیتو کا صورت آشنا تھا۔ اس نے ٹیکسی میں اسے دیکھا تو موقع سے فائدہ اٹھا لیا اور جب تک میں باہر آتا وہ اسے لے کر جا چکا تھا۔ بیتو اس کے لیے کوئی اہم شخصیت نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ میرا ساتھی تھا اور یقیناً پروفیسر اس کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالتا۔

''تم نے بتایا کہ پروفیسر کی بیوی مرشد ہاؤس سے بازیاب ہوئی تھی۔''

''اسے بازیابی نہیں کہہ سکتے کیونکہ پولیس نے چھاپہ نہیں مارا تھا بلکہ کسی کے توسط سے مرشد سے بات ہوئی تھی اور پروفیسر کی بیوی اور چند دوسری طالبات کو وہاں سے رہائی ملی تھی۔ وہ سب مرشد اور اس کے ساتھیوں کی درندگی کا شکار ہو چکی تھیں۔ ایک لڑکی تو بعد میں تاب نہ لاتے ہوئے اسپتال میں چل بسی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اسے ایک درجن سے زیادہ افراد نے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا لیکن رپورٹ دبا دی گئی تھی۔''

''ظاہر ہے معاملہ مرشد جیسے عزت مآب کا تھا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''پروفیسر کی بیوی دو دن بعد اپنے بیڈروم میں پنکھے سے لٹکی پائی گئی تھی۔ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی

اور بقول پروفیسر کے وہ راتوں کو اٹھ کر چیخیں مارتی تھی۔"
"جب اس کی بیوی کی لاش ملی تو خود پروفیسر کہاں تھا؟"
"اُس وقت وہ کالج میں تھا۔"
"تب اس پر شک کیوں کیا جاتا ہے؟"
"اس کی بیوی کی موت صبح کسی وقت ہوئی تھی لیکن پولیس کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔"
"اس کے بعد پروفیسر نے نوکری چھوڑ دی؟"
"ہاں اور وہ مرشد سے انتقام لینے کے چکر میں پڑ گیا۔"
"یہ کیسا انتقام ہے جس کا نشانہ مرشد کے بجائے دوسرے لوگ بن رہے ہیں۔"
"کبھی کبھی مجھے بھی شبہ ہوتا ہے کہ پروفیسر ڈرامہ کر رہا ہے اور وہ مرشد سے مک مکا کر چکا ہے۔"
"تم پروفیسر کو کیسے جانتی ہو؟"
"وہ اس کالج میں پروفیسر تھا جہاں میں نے تعلیم حاصل کی ہے۔" وہ پہلو بدل کر بولی۔
"تمہاری تصویریں اس کے ہاتھ کیسے لگیں؟"
"میں نہیں جانتی...... لیکن اگر وہ تصویریں منظر عام پر آ گئیں تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی اور شاید مجھے خودکشی کرنا پڑے۔" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔
"کالج کے بعد بھی پروفیسر سے تمہارا تعلق رہا تھا؟"
"نہیں میں تو اس کی اسٹوڈینٹ بھی نہیں تھی سائیکلو جی میرا مضمون نہیں تھا۔"
"پھر تم اس کے چنگل میں کیسے پھنسیں؟"
اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "پلیز یہ مت پوچھو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا میں خود سامنا نہیں کر سکتی ہوں۔ کسی اور کو بتانا ناممکن ہے۔"
"پروفیسر بلیک میلر بھی ہے؟"
"کم سے کم میرے لیے تو ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "کسی اور کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ پروفیسر کسی کو بھی بلیک میل کرتا ہے یا نہیں۔"
اس نے اپنے پھٹ جانے والے لباس کو ایک کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ اس کے جسم پر کسی اور کا لباس تھا اور وہ اس میں بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں ایک جگہ رکوں گی اور کپڑے بدل کر آ جاؤں گی۔"
"تمہاری مرضی...... ویسے اگر مجھے بھی کوئی گرم چیز مل جائے تو کیا بات ہوگی۔"
اس نے سر ہلایا۔ "میں دیکھوں گی۔"
اس نے گاڑی مری روڈ کے ساتھ ایک علاقے کی طرف موڑ دی۔ یہ اسلام آباد کی عام سی آبادی تھی۔ شہلا نے کار ایک چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے روک دی اور اتر کر کال بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک بچے نے جھانکا۔ شہلا نے اس سے کچھ کہا اور وہ اسے اندر لے گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شہلا کو اچھی طرح جانتا ہو۔ شہلا مشکل

سے دس منٹ میں واپس آ گئی اور اب اس کے جسم پر ایک مناسب قسم کا لباس تھا جو اسے پورا بھی آ رہا تھا۔ اصل میں وہ بہت خوش بدن عورت تھی اور ایسی عورتیں اگر اپنے ناپ سے ہٹ کر کوئی لباس پہن لیں تو وہ فوراً محسوس ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کوئی بھی لباس اس پر برا نہیں لگتا تھا۔ اس نے ایک شاپر بھی اٹھا رکھا تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور ہم روانہ ہو گئے۔

''یہاں کون رہتا ہے؟''

''میری ایک دوست ہے، کالج کے زمانے کی ہے اور اتفاق سے ہم دونوں کا ناپ ایک ہے۔ میں اسی کا سوٹ پہن کر آئی ہوں۔''

''اسے شک نہیں ہوا کہ تم اس طرح کیوں آئی ہو اور کار میں تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''ہوا تھا لیکن فی الحال میں اسے ٹال آئی ہوں بعد میں کوئی کہانی بنا کر اسے سنا دوں گی۔'' شہلا نے کہا اور ایک کچرے دان کے پاس سے گزرتے ہوئے ساتھ لایا شاپر اس میں ڈال دیا۔ ''سوری تمہارے لیے مجھے کوئی گرم چیز نہیں مل سکی ہے۔''

''میرا مقدر۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''شہباز۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم ایک معمولی مل ورکر ہو۔''

''اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟''

''تم نے جس ہوشیاری سے میرا تعاقب کیا اور پھر اس کوٹھی میں گھس کر مجھے بچا لائے۔ میں نے ایک آدمی کو تمہارے سامنے قتل کر دیا اور تم نے اس کا ذرا سا اثر بھی نہیں لیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے تمہارے لیے یہ معمول کی بات ہو۔''

''اس میں کون سی خاص بات ہے۔ میرے وطن میں قتل و غارت گری عام ہو گئی ہے اور میں بھی اس ملک کا رہنے والا ہوں۔''

''پھر بھی تمہارا انداز نارمل تھا۔ اور تم نے کتنے سکون سے مجھے سنبھالا میرے لیے لباس تلاش کر کے لائے۔ پھر چاقو پر سے میری انگلیوں کے نشان مٹا کر دوسرے آدمی کی انگلیوں کے نشان ڈالے۔ جب ہم باہر نکلے تب بھی تمہیں کوئی جلدی نہیں تھی اور تم نے اطمینان سے مجھ سے بات کرنے کے بعد وہاں سے نکلے تھے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ہاں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میرے اعصاب مضبوط ہیں۔''

''دوسرے تم نے کسی بھی معاملے میں پولیس کا نام تک نہیں لیا۔ تمہارا ساتھی غائب ہے اور تم خود اسے چھڑانے جا رہے ہو۔ پروفیسر ایک جرائم پیشہ شخص ہے اور اس کے پاس بدمعاشوں کی ایک فوج ہے تم اس سے کس طرح مقابلہ کرو گے؟''

وہ بڑی ذہانت سے صورتِ حال کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے مجھے پولیس کے پاس بھاگے جانا چاہیے تھا۔''

''ہاں ان حالات سے پولیس بہتر طور پر نمٹ سکتی ہے۔''

''اس کے برعکس پولیس اتنی دیر کر دے گی کہ میرے ساتھی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ تمہیں پروفیسر سے بہت دلچسپی ہے اور تم اس بارے میں جانتے بھی ہو۔''

''اگر ایسا ہے تو اس سے صورتِ حال پر کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اگر تم کچھ جانتے ہو تو مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو؟''

''تم بھی مجھ سے چھپا رہی ہو میں نے تو اس بارے میں تجسس نہیں کیا۔'' میں نے کہا تو وہ لاجواب نظر آنے لگی۔

''سوری شاید تمہیں برا لگا۔''

''نہیں لیکن اس وقت میں اپنے ساتھی کے لیے پریشان ہوں اور کسی اور معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔''

بھارہ کہو کی آبادی قریب تھی۔ میری دیکھی بھالی تھی اور میں کئی بار یہاں آچکا تھا۔ اس لیے جب بائیں طرف اوپر پہاڑی پر جانے والی سڑک آئی تو میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے یہاں اتار دو۔''

اس نے کار روک دی۔ ''کیوں؟''

''یہاں سے میں خود چلا جاؤں گا لوکیشن میں نے سمجھ لی ہے اور اب تم واپس جا سکتی ہو۔''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''لیکن میں پروفیسر سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ان حالات میں تمہاری اس سے ملاقات اچھی نہیں ہوگی ممکن ہے وہاں کوئی ہنگامہ ہو اور تم بلا وجہ اس میں ملوث ہو جاؤ۔''

ہنگامے کا سن کر وہ کسی قدر سہم گئی تھی اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں واپس چلی جاتی ہوں۔''

''ایک منٹ مجھے پروفیسر کا نمبر دے دو۔'' میں نے کہا۔

وہ ہچکچائی۔ ''یہ مناسب نہیں ہوگا اگر پروفیسر کو شک ہو گیا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گی۔''

''تم فکر مت کرو تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا یہ میرا وعدہ ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر سرد آہ بھر کر بولی۔ ''میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ مرد ذات پر کبھی بھروسہ نہیں کروں گی لیکن تم نے میری عزت اور جان بچائی ہے اس لیے میں تم پر بھروسہ کروں گی۔''

''اللہ نے چاہا تو تمہیں اس پر افسوس نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا اس نے ایک چٹ پر پروفیسر کا نمبر لکھ کر مجھے دے دیا اور کار واپسی کے لیے موڑ لی۔



اس کے جانے کے بعد میں اوپر کی طرف جانے کے بجائے پہلے بازار کی طرف بڑھ گیا۔ دس بج رہے تھے اور بازار کھل گیا تھا مجھے کپڑوں کی تلاش تھی اور اس کے لیے مجھے خاصا آگے جانا پڑا تھا۔ یہ ایک شاپنگ سینٹر تھا جو صرف کپڑوں کے لیے مخصوص تھا۔ زیادہ تر بچگانہ اور زنانہ کپڑوں کی دکانیں تھیں لیکن کچھ شاپس پر مردانہ کپڑے بھی دستیاب تھے۔ میں نے ایک عام سی پتلون اور قمیص لی۔ اس کے ساتھ ایک جیکٹ لی۔ میرے پیروں میں چپل تھی۔ ایک شوز شاپ سے جوتے لیے اور وہیں پہن لیے۔ جوتے میں نے ایسے لیے تھے جن میں مجھے بھاگ دوڑ میں دشواری نہ ہو۔ شہلا کی دی ہوئی رقم کام آ رہی تھی۔

ایک پی سی او سے میں نے ندیم کو کال کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر بدستور خرابی کا شکار تھا۔ لائن میں شور بہت آرہا تھا۔ اس کے گھر نہ جانے میں ایک رکاوٹ میرے دشمن تھے۔ مجھے خاصی حد تک یقین تھا کہ میری واپسی کے بارے میں جان کر انہوں نے ندیم کے گھر کی نگرانی شروع کردی ہوگی۔ میں وہاں جاتا اور پکڑا جاتا یا وہ پولیس کو اطلاع کردیتے۔ دونوں صورتوں میں، مَیں مشکل میں پڑ جاتا۔ اس وجہ سے میں ندیم سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس وقت میں نے خود کو کمزور محسوس کیا۔ میرے دست و بازو وسیم اور سفیر مجھ سے دور تھے۔ بیتو غائب تھا اور امکان یہ تھا کہ دشمن کے قبضے میں تھا۔ میں اکیلا پھر رہا تھا۔ سڑک پر چلتے ہوئے میرا ذہن سوچوں میں اتنا گم تھا کہ کئی بار میں گاڑی کے سامنے آتے آتے بچا۔ ڈرائیوروں نے سر نکال کر مجھے باتیں سنائیں تھیں۔ پھر میں نے خود کو سنبھال لیا اور سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایک جگہ ایک شخص دھاری دار اور خانوں والی گرم چادریں بیچ رہا تھا جیسا کہ نچلے طبقے کے لوگ پہنتے ہیں۔ میں نے بھی ایک چادر لے کر اس طرح اوڑھ لی کہ اس میں میرا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد میں پہاڑی پر جانے والی سڑک پر تھا۔ یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اصل میں یہ پہاڑی بلکہ اس جیسی اور پہاڑیاں امراء نے لے لی تھیں اور یہاں اپنے عالی شان گھر بنوا لیے تھے۔ اب تو یہاں زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے ورنہ ایک زمانے میں یہاں لوگوں نے زمین تقریباً مفت لے لی تھی۔ جب عالیشان بنگلے بنے تو زمین کی قیمت خود بہ خود بڑھ گئی اور اب یہاں عام طبقے کا فرد مشکل سے ہی زمین لے سکتا ہے۔

جیسے جیسے سڑک اوپر جارہی تھی آس پاس کا منظر واضح ہوتا جارہا تھا۔ بھارہ کہو مری ٹول پلازہ سے چند کلومیٹرز پہلے ایک دلکش پہاڑی سلسلے میں آباد ہے اور یہ پہاڑیاں مرگلہ کی پہاڑیوں سے جاکر مل جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں فطری حسن کی کمی نہیں ہے۔ اب تو یہاں مری ہائی وے کے ساتھ نت نئی آبادیاں اور اپارٹمنٹس بن رہے ہیں۔ میری نظر اس کوٹھی کو تلاش کررہی تھی جس کے گیٹ پر سورج کی شبیہ بنی تھی اور بقول پروفیسر کے وہ اسی کوٹھی میں مقیم تھا۔

تقریباً نصف کلومیٹر اوپر جانے کے بعد مجھے مطلوبہ کوٹھی نظر آگئی۔ اگرچہ اسے کوٹھی کہنا درست نہیں تھا یہ مشکل سے چھ سات مرلے پر بنا ایک مکان تھا جو سامنے سے خاصا اسٹائلش تھا اور شاید اسی مناسبت سے پروفیسر نے اسے کوٹھی کہا تھا۔ میں رکنے کے بجائے سامنے سے اسے دیکھتا ہوا گزر گیا اور آگے جہاں اس طرف پہلی گلی آئی میں اس طرف مڑ گیا تھا۔ اس طرف آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہاں مکانوں کی پشتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور یہ جاننا خاصا مشکل تھا کہ پروفیسر والا مکان اس گلی کے کس مکان کے پیچھے تھا۔ ایک خالی پلاٹ آیا اور میں نے اس کے ساتھ لگنے والے مکان پر غور کیا۔ مجھے لگا کہ یہ وہی مکان تھا کیونکہ اس کی باہر سے کلر اسکیم وہی تھی جو سامنے کی طرف سے تھی۔ عقب سے اس کی دیوار کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی لیکن اس پر کوئی گرل وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ یہاں سناٹا تھا اور کوئی آتا جاتا نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ آگے ایک مکان پر ایک لڑکی دھل جانے والے کپڑے خشک ہونے کے لیے لٹکا رہی تھی لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں پلاٹ میں آیا

اور ذرا دور سے بھاگ کر چھلانگ لگائی اور میرے دونوں ہاتھ دیوار پر جا ٹکے اس دوران میں میرا جسم دیوار سے ٹکرایا تھا لیکن میں نے چوٹ برداشت کر لی۔

کچھ دیر میں اسی طرح لٹکا رہا پھر میں نے خود کو اوپر کھینچا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا صحن تھا جسے واشنگ ایریا بھی کہہ سکتے ہیں اور اس طرف دو دروازے اور دو کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ میں دیوار پر چڑھا اور بے آواز اندر کود گیا۔ اندر کیونکہ فرش اونچا تھا اس لیے بلندی صرف چھ فٹ تھی اور مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ نیچے کودتے ہی میں جھک گیا کیونکہ ایک کھڑکی کھلی تھی اور اگر کوئی دوسری طرف کمرے میں موجود ہوتا تو میں اسے نظر آجاتا۔

میں کچھ دیر خاموشی سے سن گن لیتا رہا لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سناٹا طاری تھا۔ شاید اس طرف کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ یہ ایک سادہ سا بیڈروم تھا جس میں ایک بیڈ اور ایک ڈریسنگ ٹیبل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ البتہ دوسرے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھلا ہوا تھا اور اس کی کھڑکی اندر سے بند تھی اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ اندر کوئی ہے یا نہیں ہے۔ اللہ کا نام لے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ اس کمرے کو خالی پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ شاید فرشی نشست گاہ تھی یا کسی طرح سے استعمال ہونے والا کمرہ تھا کیونکہ یہاں پر ایک قالین بچھا ہوا تھا کمبل اور ساتھ میں تکیے پڑے تھے۔ ایک تکیے کے نیچے سے کالی سی دھاتی چیز جھانک رہی تھی میں نے اسے نکالا تو میرے شک کی تصدیق ہو گئی۔ یہ ماؤزر پستول تھا۔ اصل کی چینی نقل لیکن بہت اچھی قسم کی نقل تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے نوے فی صد یقین ہو گیا کہ اس مکان میں پروفیسر اپنے آدمیوں سمیت موجود ہے ورنہ اس پستول کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔ پستول لوڈ تھا میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے دوسری طرف سے کسی کے آہستہ سے بولنے کی آواز آئی لیکن وہ آہستہ سے نہیں بول رہا تھا بلکہ بند کمرے میں سے اس کی آواز کم آرہی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیئے اور مجھے پروفیسر کی آواز شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

''شہلا تم اب تک پہنچیں کیوں نہیں؟''

وہ یقیناً فون پر بات کر رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... تم مجھے بتا تو سکتی تھیں...... نہیں مجھے تمہاری ضرورت ہے...... اوہ نہیں بابا ان معنوں میں نہیں...... ویسے بھی اب تم میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں مجھے کسی بڑے مکان کی فوری ضرورت ہے...... میں اس حرامزادے سے رابطہ کر رہا ہوں لیکن اس کا موبائل بند جا رہا ہے...... ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... میں دیکھتا ہوں۔'' پروفیسر کا لہجہ بیزار ہو گیا تھا اور پھر اس نے فون بند کر کے کسی سے پوچھا۔ ''وہ آیا کہ نہیں؟''

''آنے والا ہے۔'' مجھے جان کی آواز آئی۔ پروفیسر کا روبوٹ نما باڈی گارڈ تھا۔ ''راستے میں ہے۔''

''اس نے شور تو نہیں مچایا۔ کیا نام ہے اس کا؟...... ہاں بیتو۔''

''نہیں سکون سے ہے۔'' جان نے جواب دیا۔

''ویسے میں اسے لانے کا مقصد نہیں سمجھ سکی۔'' اس بار دونیا کی آواز آئی۔ ''اصل آدمی تو شہباز ہے۔''

''ہاں لیکن وہ اس طرح سے قابو میں نہیں آئے گا اسے قابو کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے اس کے کسی ساتھی کو قابو کرلو اس کی خاطر وہ ہر بات ماننے کو تیار ہو جائے گا۔''

''کوٹھی سے تو وہ نکل بھاگنے میں کامیاب رہا اور اس نے چالاکی سے کام لے کر اپنے نشانات بھی صاف کر دیئے پولیس کو وہاں سے کچھ نہیں مل سکا۔''

''ہاں لیکن ایک بار مجھے ناکامی ہوئی ہے بار بار نہیں ہوگی۔'' پروفیسر نے یقین سے کہا۔ ''میں جلد اس جن کو قابو کر کے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کروں گا اور وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرے گا۔''

دونیا ہنسی۔ ''اس معاملے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دوسروں کو قابو کرنا آپ کو خوب آتا ہے۔ ویسے شہباز سے آپ کیا کام لیں گے؟''

''اس حرامزادے نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' پروفیسر مشتعل ہو گیا۔ ''وہ ڈیل کر کے مکر گیا ہے اب میں اسے مزہ چکھاؤں گا۔''

''اسی لیے آپ شہباز کو اپنے قابو میں کرنا چاہ رہے ہیں؟'' دونیا بولی۔

''ہاں وہ مرشد کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ جب وہ میرے قابو میں ہوگا اور میں اس کے ساتھیوں کو بھی بلوا لوں گا تو دیکھوں گا مرشد کیسے میری بات نہیں مانتا ہے۔''

''مرشد بہت ضدی اور کمینہ شخص ہے۔'' دونیا نے کہا۔ ''اس پر ذرا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے لیکن جب اس کی دکھتی رگ میرے قابو میں آئے گی تو وہ میری ہر بات مانے گا۔ اصل مسئلہ پولیس کا ہے ایک بار میری اس سے جان چھوٹ جائے تو میں مرشد کے ساتھ وہ کر گزروں گا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔'' پروفیسر کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔

''باس وہ دو گھنٹے بعد ہوش میں آجائے گا۔'' جان نے کہا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے۔''

''اسے پھر انجکشن فائیو دے دینا۔'' پروفیسر نے یقیناً بیتو کے لیے ہدایت کی تھی۔ اسے ان لوگوں نے بے ہوش کر کے رکھا ہوا تھا۔ میں نے جو سنا تھا اس سے میرے کئی خدشات کی تصدیق ہوگئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ پروفیسر کا مرشد سے کوئی تعلق ہے اور میرا شبہ درست نکلا تھا۔ وہ اس کا دشمن بھی تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی فکر میں بھی لگا ہوا تھا۔ شاید وہ خود پر قائم پولیس کیس ختم کرانا چاہتا تھا۔ مرشد ان دنوں حکومت میں شامل تھا اور اس کے لیے اس قسم کے کام مشکل نہیں تھے لیکن اس نے پروفیسر کو دھوکا دیا اور اب پروفیسر مجھ سے راہ و رسم بڑھا کر مرشد کو مجبور کرنا چاہتا تھا۔

لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے قابو کس طرح کرے گا اگر وہ بیتو کو قید رکھ کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا تو یہ حرکت بچگانہ تھی کیونکہ میں اس کی بات مان بھی لیتا تو موقع کا منتظر ہوتا اور جیسے ہی مجھے موقع ملتا میں بیتو کو نکال لے جاتا۔ پروفیسر کے منصوبے لمبے چوڑے تھے اور وہ میرے ساتھ میرے ساتھیوں کو بھی قابو کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جان شاید کمرے سے باہر چلا گیا تھا کیونکہ میں نے دونیا کی آواز سنی۔

''پروفیسر کیا خیال ہے؟'' اس کا لہجہ معنی خیزیت سے بھرپور تھا اور آواز کا لوچ اور نغمگی خود بتا رہی تھی کہ اس نے پروفیسر سے کس خیال کا پوچھا ہے لیکن پروفیسر کا ردِعمل سرد تھا۔

''لگتا ہے تمہیں پھر سے طلب ہونے لگی ہے۔''

دونیا مایوس ہوئی تھی۔ ''نہیں یہ بات نہیں ہے میں تو......''

''ڈیئر میں نے دنیا دیکھی ہے اور تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر تمہیں اپنی طلب سے مطلب نہ ہو تو تم پہلی فرصت میں مجھے چھوڑ جاؤ۔''

دونیا بولی تو اس کی آواز میں شکست خوردگی تھی۔ ''جب اتنا جانتے ہو تو میری طلب کے لیے مجھے اتنا کیوں تڑپاتے ہو؟''

اس وقت میرا ذہن کسی اور قسم کی طلب کی طرف گیا تھا لیکن پروفیسر کے جواب نے معاملہ کلیئر کر دیا۔

''ابھی احتیاط کی ضرورت ہے مجھے دوا بنانے میں کچھ وقت لگے گا اور اس کے لیے کسی پُرسکون جگہ کی ضرورت ہے۔ اسٹاک کم ہے اگر تم نے احتیاط نہیں کی تو خود مشکل میں پڑ جاؤ گی۔''

''میں خود...... پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا پلیز پوری نہیں تو آدھی گولی دے دو۔'' دونیا ملتجی لہجے میں بولی۔ ''میں مر رہی ہوں۔''

''او کے۔'' پروفیسر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میں ابھی آدھی گولی دوں گا لیکن تم کل سے پہلے پھر نہیں مانگو گی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' دونیا نے جلدی سے کہا۔

مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ دونیا جیسی جوان اور بہ ظاہر پڑھی لکھی نظر آنے والی لڑکی کسی منشیات کی لت کی وجہ سے پروفیسر جیسے شخص کے آگے مجبور تھی اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ پروفیسر کی داشتہ بھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ دیکھنے میں بالکل بھی کسی ایسے نشے کی عادی نہیں لگتی تھی۔ اس کے برعکس وہ تروتازہ اور زندگی سے بھرپور نظر آتی تھی۔ انسان کو اپنا عادی بنا لینے والا ہر نشہ سب سے پہلے اس کی تازگی چھین لیتا ہے۔ پروفیسر شاید اس کمرے سے کہیں اور گیا تھا۔ دونیا اس کمرے کی طرف آئی جہاں میں موجود تھا۔ آہٹ سن کر میں نے دروازے کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ہینڈز اَپ کرانے کا وقت نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ اندر آئی میں نے اس کی گردن پر ہاتھ مارا اور پھر اسے پکڑ لیا ورنہ وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اسے ایک طرف اس طرح لٹا دیا جیسے وہ آرام کر رہی ہو اور اس کے سر کے نیچے ایک تکیہ بھی رکھ دیا۔

یہ مکان اندر سے گرم نہیں تھا پھر بھی یہاں سردی اتنی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے دونیا نے وہی مختصر سی ہلکے کپڑے کی شرٹ اور بہت چست جینز پہن رکھی تھی۔ میرا وار کاری تھا اور اس کے دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میرا ارادہ پروفیسر کے آنے کی صورت میں اسے بھی دونیا کے برابر میں لٹانے کا تھا۔ اس کے بعد میں بیتو کو لے کر یہاں سے نکل جاتا۔ اس لیے جب دروازے پر آہٹ ہوئی تو میں بالکل تیار تھا۔

مگر اس بار میرا اندازہ غلط نکلا وہ پروفیسر نہیں بلکہ جان تھا۔ وہ اندر آیا اور میں نے اس کی گردن پر وار کیا۔ وہ دراز قامت تھا اور اس کا قد کم سے کم بھی چھ فٹ چار انچ تھا اس لیے میرا وار اس کے شانے پر لگا اور وہ بے خبری کی وجہ سے ذرا سا لڑکھڑا کر آگے چلا گیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے پستول نکالا اور اسے جان لیوا طور سے سر پر آزمانے کی کوشش کی۔ مگر اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہو گیا تھا اس نے جھکائی دی اور پستول کا دستہ اس

کے شانے پر لگا۔ اس نے اپنی بائیں کہنی پیچھے کی طرف اچھالی جو میرے سینے سے ٹکرائی اور مجھے لگا جیسے میرا سانس رک گیا ہو میں دروازے سے ٹکرایا اور دروازہ بند ہو گیا۔

میں نے سنبھل کر اسے لات ماری اور یہ میری غلطی تھی۔ اس نے میری ٹانگ پکڑ لی اور مجھے آگے کی طرف کھینچا۔ میں پشت کے بل گرا اور سر بچانے کی کوشش میں پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس سے پہلے جان میرے جکڑے پاؤں سے کوئی فائدہ اٹھاتا میں نے دوسری لات اس کے گھٹنے پر ماری۔ وہ لڑکھڑایا میں نے دوسری ضرب لگائی تو وہ نیچے گرا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ ورنہ وہ شور کرتا تو پروفیسر یا اس کے دوسرے ساتھی اس کی مدد کو آ سکتے تھے۔ شاید اسے خود پر اعتماد تھا کہ وہ مجھے قابو کر لے گا۔ گرنے کے باوجود اس نے میری ٹانگ نہیں چھوڑی تھی بلکہ اسے بغل میں دبا کر اس پر زور دے رہا تھا۔ یہ وہی ٹانگ تھی جس پر شہلا کی کار سے چوٹ آئی تھی اور جب اس نے اسے دبایا تو مجھے شدید تکلیف نے تڑپا دیا تھا۔ میں نے گھوم کر پاؤں پر دباؤ کم کرنے کے ساتھ دوسرے پاؤں سے اسے ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن یہاں گنجائش کم تھی اس وار کا اس پر خاص اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ لات ماری اور تیسری بار مارنے پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تھی میں نے اپنی ٹانگ چھڑا کر اسے پیروں پر رکھتے ہوئے اچھال دیا اور وہ بے ہوش پڑی دونیا پر جا گرا تھا۔

اپنے وار میں ناکامی نے اسے مشتعل کر دیا تھا اور وہ غراتا ہوا اٹھا تو اس کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اگر وہ میرے اوپر گرتا تو اس کے وزن سے میرا حشر ہو جاتا لیکن میں نے بر وقت کروٹ لی اور وہ میرے برابر میں گرا۔ اس سے پہلے وہ اٹھتا میں نے دوبارہ کروٹ لی اور اس پر سوار ہو گیا۔ عقب سے ہاتھ ڈال کر اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اٹھنے کے لیے زور لگا رہا تھا ساتھ ہی خنجر والا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے منہ سے آواز نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اسے اپنے وزن تلے دبائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا کیونکہ وہ دیوزاد ایک بار اٹھ جاتا تو اسے قابو کرنا مشکل ہو جاتا۔

جان کو قابو کرنے کے چکر میں، مَیں اپنے عقب سے غافل ہو گیا تھا اور مجھے نہیں معلوم کہ کب پروفیسر اندر آیا اور اس نے خاموشی سے میری گردن میں انجکشن اتار دیا۔ میں تڑپا اور فوراً ہی سن ہو کر نیچے گر پڑا۔ میرا جسم مکمل طور پر بے حس تھا لیکن میرے حواس بحال تھے۔ جان حیران ہوا تھا کہ میں اچانک کیسے گر گیا۔ وہ اٹھا اور پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔

''بس اب ضرورت نہیں ہے یہ مفلوج ہو گیا ہے۔''

پروفیسر نے ہاتھ میں تھامی سرنج کو احتیاط سے کیپ لگا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور جھک کر دونیا کا معائنہ کیا۔ ''یہ بے ہوش ہے۔''

''اس نے کیا ہے۔'' جان نے مجھے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ ''مجھے بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم نے آواز کیوں نہیں نکالی؟''

''میں نے سوچا میں اسے قابو کر لوں گا۔''

''تمہیں مجھے خبردار کرنا چاہیے تھا۔'' پروفیسر کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''سوری باس۔'' جان نے شرمندگی سے کہا۔

''ان دونوں کو اٹھا کر لڑکے والے کمرے میں لاؤ۔'' پروفیسر نے حکم دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں قالین پر کروٹ کے بل بے حس و حرکت پڑا تھا۔ بیتو کو چھڑانے آیا تھا اور خود پھنس گیا تھا۔ جان نے میرا معائنہ کیا اور پہلے دونیا کو اٹھا لیا۔ اسے اٹھانے میں جان نے خاصا اشتیاق دکھایا۔ اسے کہیں چھوڑ کر وہ مجھے لینے آیا اور مجھے بے زاری سے بوری کے انداز میں شانے پر لاد لیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لایا جہاں لائن سے کئی چھوٹے بیڈ بچھے تھے اور بیتو بھی وہیں موجود تھا۔ اس کے برابر والے بیڈ پر دونیا دراز تھی اور اس کے برابر میں مجھے لٹا دیا گیا۔ پروفیسر بیتو کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دونیا کا معائنہ کیا اور اسے ایک انجکشن دیا اور پھر میری طرف آیا اس نے ذرا جھک کر کہا۔

''شہباز مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم یہاں آ جاؤ گے۔ یقیناً یہاں کا پتا تمہیں شہلا نے دیا ہے۔ اس سے میں بعد میں نمٹوں گا۔''

میں نے بولنے کی کوشش کی اور ناکام رہا پروفیسر نے بھانپ لیا اس نے کہا۔ ''میں نے تمہیں جو انجکشن دیا ہے اس کے اثر سے تم کم سے کم چار گھنٹے مفلوج رہو گے اور دو گھنٹے سے پہلے بات نہیں کر سکو گے۔ اس لیے تم ابھی آرام کرو میں بعد میں بات کروں گا ابھی تو میں شہلا کو بلاتا ہوں۔''

پروفیسر کمرے سے چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میرا سر سیدھا تھا اور میں اپنی مرضی سے سر گھما کر دائیں بائیں نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے صرف چھت تکتا رہا۔ میرا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسی صورت حال کا شکار ہو چکا تھا جب میرے دشمنوں نے مجھے جسمانی طور پر مفلوج کر دیا تھا اور میں اپنی قوت ارادی سے کام لے کر بچ نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔

اس وقت بھی مجھے خیال آیا اور میں نے اپنی سوچیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ میں اپنے جسم کو حرکت دے سکتا ہوں۔ یہ آسان کام نہیں ہوتا ہے لیکن لگا تار کوشش سے میں خیال کو مرکوز کرنے میں کامیاب رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کتنی دیر گزری تھی سب سے پہلے میں نے اپنے منہ کو قابو کرنے کی کوشش کی اور بڑی دیر بعد میں ہونٹوں کو حرکت دینے میں کامیاب رہا۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ میں پروفیسر کے حربے کا توڑ کرنے میں کامیاب رہا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ میں دو گھنٹے سے پہلے نہیں بول سکتا تھا لیکن میں بول سکتا تھا اپنی مدہم آواز میں نے خود سنی تھی۔ اس کے بعد میں نے اپنے سر کو حرکت دینے کی کوشش شروع کر دی۔

نہ جانے پروفیسر نے مجھے کون سی دوا انجکٹ کی تھی۔ میں نے آج اس کی اور دونیا کی جو باتیں سنی تھیں ان سے لگ رہا تھا کہ پروفیسر دواؤں اور کیمیائی ایجنٹس کا ماہر تھا اس کے پاس کوئی ایسا نشہ تھا جس کی مدد سے اس نے دونیا اور شاید جان کو بھی اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ پھر یہ دوا جس نے مجھے سن کر دیا تھا۔ مجھے پروفیسر کی بات یاد آئی کہ وہ کوئی نشہ تیار کرتا تھا اور غالباً اسی کام کے لیے اسے کوئی بڑی جگہ درکار تھی۔ اس نے شہلا کو اس کوٹھی کے حصول کے لیے آگے کیا تھا لیکن جب شہلا وہاں پہنچی تو مالک کا ارادہ کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا اور چوکیدار اور اس کے ساتھیوں کی رال شہلا پر ٹپک گئی تھی۔ ان کا مذموم ارادہ میری مداخلت سے ناکام ہو گیا اور چوکیدار مارا گیا جب کہ اس کے ساتھی اور کوٹھی کا مالک یقیناً مصیبت میں پڑنے والے تھے۔

مجھے افسوس ہوا کہ میری وجہ سے شہلا بھی پروفیسر کے عتاب کا شکار ہونے والی تھی۔ پروفیسر کے پاس اس

کی کچھ ایسی تصاویر تھیں کہ جن کے ہوتے وہ پروفیسر کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی اگر وہ اسے یہاں آنے کا حکم دیتا تو اسے تعمیل کرنا ہی پڑتی۔ ساتھ ہی مجھے پروفیسر پر حیرت تھی ایک طرف تو اس کے اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ اسے ملک میں میرے داخلے کا علم تھا اور اس نے فوری طور اپنے آدمیوں کو میرے استقبال کے لیے روانہ بھی کر دیا تھا تو دوسری طرف وہ کسی معقول ٹھکانے کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا جہاں وہ سکون سے کچھ کام کر سکے اور اس پر بھی اس کے ارادے مجھے اور میرے ساتھیوں کو قابو کر کے مرشد سے کوئی ڈیل کرنے کے تھے۔ یہ ڈیل پہلے ہو کر مرشد کی بدعہدی کی نظر ہو چکی تھی اور اس بار پروفیسر میری مدد سے اس ڈیل کو پایا تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنے دشمن سے وہ کیا چاہتا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔

میری کوشش مسلسل جاری تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا سر ہل رہا ہے اور وہ واقعی ہل رہا تھا میں نے اسے دونیا اور بیتو کی طرف گھمایا۔ مجھے دونیا نظر آنے لگی۔ وہ چت لیٹی تھی اور اس کا سینہ بڑی آہستگی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ اس سے پرے بیتو تھا اور وہ بھی بے ہوش تھا۔ میں نے کوشش کر کے سر سیدھا کر لیا۔ اب میں ہاتھ پیر ہلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری کوشش جاری تھی کہ دروازہ کھلا اور پروفیسر اندر آیا میں یک دم ساکت ہو گیا اور اپنا سر اور آنکھیں سیدھی کر لی تھیں۔ پروفیسر میرے قریب آیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''میں نے شہلا کو کال کر دی ہے وہ یہاں آنے والی ہے۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ میں شاید اسے مار دوں گا یا اسے کوئی سخت جسمانی سزا دوں گا۔ نہیں میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔'' اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا۔ ''میں اسے صرف ایک گھنٹے کے لیے جان کے حوالے کر دوں گا۔ تم نے دیکھا ہے وہ دیو ہے اور پھر عورتوں کا دیوانہ بھی ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں شہلا کا وہ حشر کرے گا جو وہ ایک سال بعد بھی نہیں بھول سکے گی۔''

فی الحال تو مجھے شہلا کے بجائے اپنی فکر تھی۔ اس لیے میں نے پروفیسر کی بکواس پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی میں نے اپنی کوشش پھر سے شروع کر دی۔ اس بار مجھے ہاتھ ہلانے میں کامیابی ہوئی تھی۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ مجھے انجکشن لگے صرف ایک گھنٹہ ہوا تھا اور اس دوران پروفیسر کے دعویٰ کے برعکس میں نے نہ صرف بولنے میں کامیابی حاصل کی تھی بلکہ کسی حد تک اپنا جسم بھی ہلانے لگا تھا اور اگر میں اسی طرح کوشش جاری رکھتا تو وقت سے پہلے اپنے جسم پر قابو پا سکتا تھا۔

اگلی بار پروفیسر کوئی نصف گھنٹے بعد آیا تھا۔ وہ خوش نظر آ رہا تھا اور اس نے مجھے مطلع کیا۔ ''شہلا آ گئی ہے اور میں اسے ایک گھنٹے کے لیے جان کے حوالے کر آیا ہوں۔ یہ ایک گھنٹہ اسے ایک سال کے برابر لگے گا۔'' وہ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''شہباز ملک تم سوچ رہے ہو گے کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ تو اب میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ جب دن کی روشنی میں مرشد کے غنڈے میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے اور اسے بے حرمت کر کے واپس کیا تو میں نے اس وقت سوچ لیا تھا کہ اب میں عام آدمی کی زندگی بسر نہیں کروں گا بلکہ مرشد بنوں گا میں کسی کو اپنے ساتھ زیادتی کی اجازت نہیں دوں گا۔

پروفیسر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔ ''میں اصل میں ایم

ایس سی تھا اور میں نے کیمیا کے بعض شعبوں میں بہت اچھا کام کیا تھا لیکن جب بیرون ملک سے آنے والی اسکالرشپ مجھے ملنے کے بجائے ایک سرکاری افسر کے نالائق بیٹے کو مل گئی تو میں نے بددل ہو کر یہ شعبہ چھوڑ دیا اور سائیکلوجی کی طرف آ گیا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے میں نے کالج میں نوکری کر لی۔ پھر میں جرم کی راہ پر نکلا۔ ایم ایس سی کے دوران میں نے کچھ کیمیائی مرکبات ایجاد کیے تھے جو انسانی جسم پر حیرت انگیز اثر کرتے تھے۔ میں نے ان مرکبات سے کام لیا۔ ان میں ایک نشہ ہے جو ایک بار اسے استعمال کر لیتا ہے وہ فوراً اس کا عادی بن جاتا ہے اور یہ بہ ظاہر آدمی کی صحت پر برا اثر نہیں ڈالتا ہے۔ اس کا کوئی ذائقہ، بو اور رنگ نہیں ہے۔ یہ نشے میں ہیروئن سے بہتر ہے لیکن یہ ہیروئن کی طرح تباہ کار نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا بھی جسم پر اثر ہوتا ہے لیکن بہت کم اگر اسے مسلسل کئی سال استعمال کیا جائے تب کہیں جا کر اس کے مضر اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔

مزے کی بات ہے اسے بنانے کے لیے ہیروئن اور کوکین کی طرح خاص خام مال کی ضرورت نہیں پڑتی ہے جو آسانی سے نہیں ملتے ہیں اور ساری دنیا میں ان کی کاشت پر پابندی ہے۔ بلکہ یہ چند عام دستیاب کیمیائی مرکبات کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسے گولی، انجکشن اور گیس تینوں صورتوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں یہ نشہ مغرب تک لے جاؤں تو یہ ہیروئن اور کوکین کو پیچھے چھوڑ دے گا اور میں چند سالوں میں دنیا کا امیر ترین آدمی بن جاؤں گا کیونکہ مغرب میں نشے کا کاروبار ایک ہزار ارب ڈالرز سالانہ کا ہوتا ہے۔ یہ نشہ سوائے میرے کوئی تیار نہیں کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے اجزا عام ہوتے ہیں لیکن اسے تیار کرنا آسان نہیں ہے۔

جب میں نے اپنی بیوی کا انتقام لینے کی کوشش کی تو جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں مرشد جیسے آدمی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے دس کروڑ روپے دے دے تو میں اپنی بیوی والا واقعہ بھول جاؤں گا۔ مرشد مان گیا لیکن یہ اس کی چال تھی۔ اس نے دس کروڑ روپے دینے کے بجائے پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا اب صورت حال یہ ہے کہ مجھے رقم کی ضرورت ہے اور مجھ پر جو کیسز ہیں ان کو ختم ہونا چاہیے۔ یہ دونوں کام مرشد کر سکتا ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے تمہیں کیوں اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ میری طرف جھکا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن میں کیا کروں میرے لیے سب سے اہم اپنا مفاد ہے۔ جب جان شہلا سے نمٹ لے گا تو میں اسے یہاں چھوڑ کر تمہیں اور تمہارے ساتھی کو لے جاؤں گا۔ شہلا بعد میں خود یہاں سے چلی جائے گی۔ میں مرشد سے بات کر کے اس کے سامنے اپنے مطالبات رکھوں گا اور جیسے ہی میرا کام ہو گا میں تم دونوں کو اس کے حوالے کر کے یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

وہ مزید بکواس کرتا رہا تھا اور مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اتنا بے غیرت نکلے گا اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس نے مرشد سے اپنی بیوی کی آبرو اور زندگی دونوں کا سودا کر لیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اب تک اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔ مرشد نے اسے دھوکا دیا تھا اور وہ خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ میرا سودا کر کے مرشد سے اپنا مفاد حاصل کر لے گا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مرشد کس قدر عیار شخص تھا۔ وہ کبھی اسے دس کروڑ نہیں دے گا اور نہ ہی اس پر سے کیس ختم کرائے گا ہاں وہ اسے ایسا کرنے کا دھوکا ضرور دے سکتا ہے اور جیسے ہی پروفیسر اس کے قابو میں آئے گا وہ اسے دوسری دنیا کا راستہ دکھائے گا۔ مجھے افسوس ہوا میں پروفیسر کو جتنا گھٹیا سمجھ رہا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ

گھٹیا ثابت ہوا تھا اور وہ جتنا گھٹیا تھا اس سے کہیں زیادہ احمق ثابت ہوا تھا جو مرشد جیسے شخص کو ٹھگنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم کسی قدر میرے قابو میں آتا جا رہا ہے لیکن میں پروفیسر کے سامنے حرکت کر کے اسے چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے پھر انجکشن لگا کر سن کر دیتا۔ میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ بکواس بند کرے اور یہاں سے دفع ہو جائے لیکن فی الحال اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ جان کو اپنے ارمان دل کھول کر نکالنے کا موقع دے رہا تھا۔ حالانکہ جتنی دیر گزر چکی تھی اسے اپنے ارمان نکالنے کا کافی موقع مل چکا تھا مجھے شہلا کی تقدیر پر افسوس ہوا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے میں نے اسے تین افراد سے بچایا تھا اور اب وہ ایک اور مرد کے جبر کا شکار ہو گئی تھی۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو اپنی مدد نہیں کر سکتا تھا اس کی کیا کرتا۔

بات کرتے ہوئے پروفیسر چونکا اور اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''اوہ...... کافی وقت ہو گیا ہے۔ ابھی ہمیں یہاں سے جانا بھی ہے۔''

وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے جسم ہلانے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ میں اپنے ہاتھ ہلانے پر قادر ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ حرکت معمولی تھی اور ابھی مجھ میں اتنا قابو نہیں آیا تھا کہ میں ہاتھ اٹھا سکتا لیکن میں نے پروفیسر کے دعوے کے برعکس دو گھنٹے میں اپنے جسم کو ہلانا شروع کر دیا تھا۔ سر تو میرا دونوں طرف آسانی گھوم رہا تھا۔ پروفیسر کو گئے ہوئے تقریباً دس منٹ ہونے کو آئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو میں ساکت ہو گیا۔ آنے والا پروفیسر ہی تھا لیکن اس کی حالت عجیب سی تھی۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ فوراً ہی اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔

یہ تباہ حال شہلا تھی۔ جس کے بکھرے بال اور خراشوں سے بھرا چہرہ بتا رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک اس پر کیا گزر رہی تھی لیکن اب وہ اس پوزیشن میں تھی اپنی عزت کے مجرموں سے بدلہ لے سکے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول تھا اور اس کا رخ پروفیسر کی طرف تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کمرے کے باہر کوئی انقلاب آ گیا تھا۔

پروفیسر نے اس کی طرف دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا۔ ''شہلا جو کچھ ہوا وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔''

''غلط فہمی۔'' شہلا نے دانت پیس کر کہا اور اچانک فائر کر دیا۔ میں اچھل پڑا تھا پہلے میں سمجھا اس نے پروفیسر کو شوٹ کر دیا ہے لیکن گولی پروفیسر کی ران میں لگی تھی اور وہ فرش پر گر کر کراہنے لگا۔ گولی چلنے کی آواز نہیں آئی تھی اس کا مطلب تھا کہ پستول پر سائلنسر لگا تھا۔ میرا اچھلنا شہلا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ پروفیسر کی طرف ہی متوجہ رہی۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''یہ غلط فہمی تھی جو تُو نے مجھے اس درندے کے حوالے کر دیا تھا۔''

''میں نے اسے یہ سب کرنے کو نہیں کہا تھا۔'' پروفیسر رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''تم نے اچھا کیا جو اسے شوٹ کر دیا ورنہ میں خود اسے یہی سزا دیتا۔''

تو شہلا نے جان کو مار دیا تھا اور شاید اسی وجہ سے پروفیسر کی گھگی بندھی ہوئی تھی کیونکہ جان اس کا دست و بازو تھا۔ اس کے بغیر وہ نہتا تھا۔ وہ خود مار دھاڑ والا شخص نہیں تھا اور صرف ذہنی برتری رکھتا تھا۔ شہلا نے ایک نظر ہم سب کو دیکھا۔

''انہیں کیا ہوا ہے؟''

''یہ سب ایک دوا کے اثر سے مفلوج پڑے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شہلا نے اپنے اوپر قابو پا لیا تھا۔ اس نے بے ترتیب سے انداز میں سوٹ پہنا ہوا تھا جو کئی جگہ سے مسک گیا تھا۔ ''پروفیسر اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو مجھے وہ تصویریں اور ان کے نیگٹیو دے دو۔''

''وہ یہاں نہیں ہیں ایک محفوظ مقام پر رکھے ہیں۔'' پروفیسر نے کراہ کر کہا۔ وہ نیچے پڑا تھا اس لیے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

''کہاں پر ہیں تم بتا دو میں حاصل کر لوں گی۔''

''تم نہیں حاصل کر سکتیں۔ وہ ایک بنک لاکر میں ہیں جہاں میں اپنی تمام اہم چیزیں رکھتا ہوں۔''

''اس کی چابی کہاں ہے؟''

''چابی میرے پاس ہے لیکن میں نے کہا نا کہ لاکر سے صرف میں نکال سکتا ہوں۔''

شہلا نے پستول ایک طرف رکھا اور پروفیسر کی تلاشی لے کر وہ چابی برآمد کر لی۔ ''تم فکر مت کرو میں اس لاکر سے نکال لوں گی چاہے اس کے لیے مجھے وہاں ڈکیتی کیوں نہ مارنی پڑے۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے تم سچ کہہ رہے ہو یا نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' پروفیسر کی خوف زدہ آواز آئی۔

اس کے بعد شہلا نے اس سے سچ معلوم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ اتنا خوفناک نکلا کہ میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے پروفیسر کے دوسرے پاؤں پر بھی گولی ماری اور پوچھا۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

پروفیسر دھاڑیں مار کر رونے لگا تھا۔ ''ہاں...... ہاں......کتیا یہ سچ ہے۔''

شہلا نے اس کے ہاتھ میں گولی ماری پھر دوسرے ہاتھ میں پھر ایک شانے میں اور پھر دوسرے شانے میں ہر بار وہ ایک ہی سوال کرتی اور پروفیسر ایک ہی جواب دیتا تھا۔ دوسرے شانے میں گولی لگنے کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ یہ سب مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے بعد میں دیکھا۔ اس دوران میں، مَیں نے خود کو بالکل ساکت رکھا۔ تا کہ شہلا کو شک نہ ہو کہ میں کچھ دیکھ یا سن رہا ہوں۔ جب پروفیسر بے ہوش ہو گیا تو وہ میرے پاس آئی اور اس نے میرا معائنہ کیا پھر بولی۔

''شہباز مجھے یقین نہیں ہے کہ تم بے ہوش ہو۔ میرا خیال ہے تم ہوش میں ہو اور سب سن رہے ہو۔'' اس نے مجھے ذرا سا ہلایا۔ ''دل تو کرتا ہے کہ تمہیں بھی موت کی نیند سلا دوں کیونکہ آج میرے ساتھ جو ہوا ہے اس میں تمہارا ہاتھ بھی ہے تم نے پروفیسر کو بتایا تھا کہ میں نے تمہیں یہاں کا پتا دیا ہے لیکن کیا کروں مجھے تمہارا صبح کا احسان یاد آ رہا ہے۔ اس لیے تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔ ہوش میں آتے ہی یہاں سے چلے جانا اور اس کے بعد کبھی میرے سامنے مت آنا۔''

شہلا کی سفاکی کا نمونہ میں صبح دیکھ چکا تھا اور ابھی جو اس نے کیا تھا اس کے بعد اس میں کیا شک تھا کہ وہ مجھے بھی قتل کر سکتی تھی لیکن یہ اس کی عنایت تھی کہ وہ ایسا نہیں کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر ایک بار مجھے غور سے

دیکھا اور مجھے آنکھیں ساکت رکھنے میں بڑی دشواری پیش آئی تھی کیونکہ جسم کو ساکت رکھنا آسان ہوتا ہے لیکن آنکھوں کو ساکت رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے خاص طور سے جب کوئی آنکھوں میں جھانکے تو یہ بے ساختہ ردِعمل ظاہر کر دیتی ہیں۔

شہلا اٹھی اور کمرے سے نکل گئی اس نے پروفیسر پر مزید کوئی گولی نہیں چلائی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے خود کو حرکت میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔ جان مارا جا چکا تھا اور پروفیسر بھی شاید مر گیا تھا یا مرنے کے قریب تھا لیکن دونیا زندہ تھی اور میرے حساب سے جلد ہوش میں آنے والی تھی اس لیے میں اس کے ہوش میں آنے سے پہلے یا کسی اور کے آنے سے پہلے بیتو سمیت یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اب مجھے اپنے ہاتھ پر اتنا قابو آ گیا تھا کہ میں اسے اونچا کر سکتا تھا اور میرے پیر بھی ہلنے لگے تھے۔

شہلا کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ ہونے کو آیا تھا اور وہ یقیناً یہاں سے جا چکی تھی اس نے آج کے دن میں تین افراد کو اس دنیا سے رخصت کر دیا تھا اور میں نے آج تک اتنی مرد مار عورت نہیں دیکھی تھی۔ میری خوش قسمتی کہ میں اس کا چوتھا شکار بننے سے بچ گیا تھا۔ اب میں اتنی حرکت کر سکتا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ جاؤں۔ میں بڑی مشکل سے بستر پر اٹھ کر بیٹھا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ابھی مجھے اپنے جسم پر قابو کرنے کے لیے مزید آدھا گھنٹہ درکار تھا۔ اٹھ کر بیٹھنے پر مجھے پروفیسر کی حالت نظر آئی اس کے جسم سے بے تحاشہ خون نکل کر فرش پر پھیل گیا تھا اور وہ اس خون میں ساکت پڑا تھا۔ اس کا سانس رکا ہوا لگ رہا تھا اور بہ ظاہر وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

دونیا کی کراہ نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی اور میری حالت ابھی ایسی نہیں تھی کہ میں اس پر قابو پا سکتا الٹا وہ مجھے ہوش میں پا کر لٹا دیتی۔ میں نے سوچا اور دوبارہ بستر پر لیٹ کر ہاتھ پاؤں اور سر سیدھا کر لیا۔ میں ایک بار پھر خود کو ہوش و حواس سے بیگانہ ثابت کر رہا تھا۔ دونیا کچھ دیر کراہتی رہی اور پھر اٹھ بیٹھی۔ اس کے بعد جیسے ہی اس کی نظر پروفیسر کی لاش پر گئی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ بستر سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔

''میرے خدا۔'' اس نے سسکی لی۔ ''یہ کیا ہو گیا...... اب کیا ہو گا؟''

میں اس کی حالت سمجھ رہا تھا اسے پروفیسر کے مرنے کا غم نہیں تھا بلکہ اس نشے سے محرومی کا غم تھا جو پروفیسر اسے مہیا کرتا تھا۔ اس نے شاید پروفیسر کی نبض دیکھی اور زیر لب بولی۔ ''مر گیا...... ذلیل بالکل مر گیا...... اب مجھے گولی کون دے گا۔''

پھر ایسی آوازیں آئیں جن سے لگا کہ وہ پروفیسر کی لاش کی تلاشی لے رہی ہے۔ اسے گولی مل گئی تھی اس نے کلکاری ماری۔ ''ہاں ہے...... یہاں ہے...... جھوٹ بولتا تھا کمینہ پوری شیشی ہے۔''

اسے پروفیسر کے پاس سے نشے کی گولیوں کی پوری شیشی مل گئی تھی۔ وہ اس کی مزید تلاشی لے رہی تھی پھر س نے حیرت سے کہا۔ ''لاکر کی چابی کہاں ہے؟''

گویا اسے بھی لاکر کا علم تھا۔ ''میرے خدا سب اسی میں تو ہے۔'' وہ کراہی۔ اس کے حواس ابھی تک قابو بں نہیں آئے تھے ورنہ اسے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ پروفیسر کو اس انجام تک کس نے پہنچایا تھا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہ ہو اور یہاں سے چلی جائے۔ میری خواہش پوری ہوئی وہ اٹھی اس نے ایک نظر مجھے

اور بیتو کو دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ بھی یہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھی اس لیے ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں اٹھ بیٹھا اب مجھے انجکشن لگے کوئی تین گھنٹے ہونے کو آرہے تھے اور اس کا اثر بڑی حد تک زائل ہو گیا تھا لیکن میری جسمانی حرکات فی الحال سُست تھیں اور یہاں سُستی کا مطلب موت تھا اس لیے مجھے جلد از جلد اپنے جسم پر مکمل کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ میں کھڑا ہوا تو میرا جسم ڈگمگایا لیکن میں گرا نہیں تھا۔

میں نے حرکت شروع کی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر کسی روبوٹ کے انداز میں چلنے لگا۔ میں سب سے پہلے دروازے تک گیا اور اسے اندر سے بند کر لیا اب کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اسی اثنا میں بیتو بھی ہلنے لگا۔ اسے بھی ہوش آ رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی۔ کچھ دیر میں ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا جتنی دیر کرتے خطرہ اتنا ہی زیادہ ہوتا۔ جیسے جیسے میں جسم کو حرکت دے رہا تھا میرا خود پر قابو بڑھ رہا تھا۔ وہاں ایک طرف میز پر جگ میں پانی موجود تھا میں نے اس سے پانی پیا تو میری حالت اور بھی بہتر ہوئی تھی۔ پھر میں نے بیتو کے منہ میں پانی ٹپکایا تو اس کی جسمانی حرکات بڑھ گئی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد ہوش میں آ جائے۔ میں نے کچھ پانی اس کے منہ پر بھی چھڑکا تھا۔ اس کا خاطر خواہ ردِعمل ہوا تھا اور دس منٹ میں بیتو مکمل ہوش میں آ گیا میں نے اسے ہونٹ پر انگلی رکھ کر بولنے سے منع کیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور آس پاس دیکھا۔ ''ہم کدھر ہے؟''

''تمہیں یاد ہے تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

اس نے ذہن پر زور دیا۔ ''ہاں ہم ٹیکسی میں تھا کہ دو آدمی اندر گھس آیا ایک نے ڈرائیور کے سر پر کچھ مارا اور دوسرے نے ہم کو کچھ چبھو دیا پھر ہم کو ہوش نہیں رہا۔''

''تم نے ان کی شکلیں دیکھی تھیں؟''

اس نے انکار کیا۔ ''نہیں دونوں نقاب پوش تھا پر ایک بہت بڑا سا تھا جس نے ڈرائیور کے سر پر کچھ مارا تھا۔''

میرا اندازہ تھا کہ یہ کارروائی خود پروفیسر اور جان نے کی تھی وہ نقاب لگا کر ٹیکسی میں گھسے تھے اور پروفیسر نے بیتو کو انجکشن لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ پھر اسے یہاں لے آئے تھے۔ میں اپنے جسم پر سو فی صد تو نہیں لیکن نوے فی صد کنٹرول حاصل کر چکا تھا اور بیتو بھی فٹ تھا وہ ویسے بھی دوا کی مدت پوری کر کے بیدار ہوا تھا اس لیے چاک و چوبند تھا وہ اٹھا تو اسے پروفیسر کی لاش دکھائی دی۔

''یہ مر...... گیا؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں اور ابھی وقت نہیں ہے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت آ جائے۔'' میں نے کہا اور کمرے کا معائنہ کیا لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا۔ یہاں سے نکل کر ہی کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی میں نے دل پر جبر کر کے پروفیسر کی لاش کی تلاشی لی اور اس کا بٹوا نکال لیا۔ دل ہی دل میں اس سے معذرت بھی کی تھی کیونکہ وہ پہلے ہی دو بار تلاشی کے عمل سے گزر چکا تھا اور پھر اس جہان سے گزر گیا۔

پروفیسر کے پرس میں ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی صورت میں خاصی موٹی رقم تھی میں نے رقم نکال کر اپنی جیب میں رکھی اور بٹوے کا معائنہ کیا۔ اس میں ایک اے ٹی ایم کارڈ بھی تھا اور میرے لیے بے کار تھا اس کے علاوہ اس میں کام کی اور کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے پرس پر سے انگلیوں کے نشان صاف کر کے اسے پروفیسر کی لاش کے پاس پھینک دیا اس کے بعد میں نے کمرے میں جہاں جہاں میرا ہاتھ لگا تھا اس جگہ کو بھی صاف کر دیا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ کمرہ ایک نشست گاہ میں کھلتا تھا یہ عجیب سا مکان تھا جس میں اندر ہی اندر کمرے بنے تھے ایک کمرے کا دروازہ دوسرے میں کھلتا تھا اور دوسرے کا تیسرے میں۔ میں نشست گاہ میں آیا تو مجھے دونیا کی آواز آئی وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا یہاں کوئی اور بھی تھا۔ میں نے بیتو کو اسی جگہ رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھا نشست گاہ ایک طرف کھلے دروازے سے کسی اور کمرے سے ملا تھا میں نے پردے کے کنارے سے اس طرف جھانکا تو مجھے ڈائننگ میز نظر آئی۔ یہ کچن کے ساتھ کھانے والا حصہ تھا۔

دونیا کسی سے موبائل فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں دبے قدموں اس کی طرف بڑھا۔ ''اوکے آئی ایم ویٹنگ...... بٹ بی کوئیک...... اوکے۔'' اس نے کہا اور جیسے ہی موبائل بند کیا میں نے عقب سے ہاتھ ڈال کر اس کی گردن جکڑ لی۔ اس نے تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا لیکن وہ بس تڑپ کر رہ گئی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس سے موبائل چھین لیا۔ اس کا ہاتھ ڈائننگ ٹیبل پر رکھی چھری کی طرف گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا اور نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہی تھی میں نے اس پر توجہ دیئے بغیر بیتو سے کہا۔ ''دیکھو مکان میں کوئی اور ہے...... کوئی ہتھیار دیکھو اور باہر کا دروازہ بند کر دو۔''

بیتو سر ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے دونیا سے کہا۔ ''شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ نقصان ہوگا۔ پولیس آ گئی تو ہم دونوں خسارے میں رہیں گے اس لیے شور کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

اس نے سر ہلا کر اپنی آمادگی کا اظہار کیا تو میں نے اسے آزاد کر دیا۔ اس نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے خون خوار نظروں سے مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔ ''یہاں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ابھی تم کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''میرا ایک دوست ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ یہاں آ رہا ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اس لیے میں نے اسے بلایا ہے۔''

''جان کہاں ہے؟''

''وہ مر چکا ہے۔'' اس نے یوں سرسری سے انداز میں کہا جیسے جان کہیں چلا گیا ہے اور ابھی آ جائے گا۔

''پروفیسر بھی مر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے دیکھ لیا ہے۔''

''تمہیں افسوس نہیں ہوا ویسے تو تم اس کی بہت وفادار بنتی تھیں۔''

''یہ سارے معاملات زندگی تک چلتے ہیں اب وہ مر چکا ہے اور اسے میری وفاداریوں کی ضرورت نہیں

ہے۔''

''پھر بھی وہ تمہارا محبوب بھی تو تھا۔'' میں نے طنز کیا۔ ''کیونکہ وہی تمہیں نشہ بنا کر دیتا تھا۔''

وہ چونکی۔ ''تم جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح بے بی۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے بے وقوف مت بناؤ پروفیسر ایک مجرم شخص تھا اور تم اس کی ساتھی ہو۔ اس کے تمام جرائم میں برابر کی شریک ہو اور تمہیں پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

وہ فکر مند ہو گئی۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''ہاں میں ایسا نہیں کروں گا بشرطیکہ تم میرے چند سوالوں کا جواب دو۔'' میں نے کہا۔

اس دوران میں بیتو آ گیا وہ ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا کھا رہا تھا اور اس نے منہ چلاتے ہوئے رپورٹ دی۔

''یہاں اور کوئی نہیں ہے ایک کمرے میں دیوزاد کی لاش پڑا ہے بالکل ننگا، ہم نے باہر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''

''گڈ اب تم وہ بریف کیس تلاش کرو جو ان لوگوں نے ہم سے چھین لیا تھا۔''

''وہ بریف کیس یہاں نہیں ہے۔'' دونیا نے کہا۔

''تم اس کی بات پر دھیان مت دو، جا کر تلاش کرو اور ہاں اگر کچھ ڈبل روٹی ہے تو مجھے بھی دو میرا بھوک سے دم نکلنے والا ہے۔''

بیتو نے مجھے ڈبل روٹی کے کئی ٹکڑے لا دیئے جنہیں میں بے تابی سے ایسے ہی نگلنے لگا۔ شام کے چار بج رہے تھے اور میں نے آخری کھانا شہلا کے گھر میں رات کو کھایا تھا۔ اس لیے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے ریس لگانے میں حق بجانب تھے۔ دونیا میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''اگر وہ بریف کیس یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟''

''پروفیسر نے ایک بینک لاکر لے رکھا ہے اور وہ بریف کیس بہت ساری دوسری چیزوں کی طرح اس میں ہے۔''

''مزید کن چیزوں کے ساتھ؟''

''بہت کچھ ہے، پروفیسر کی بنائی دوائیں اور اس نشے کے فارمولے ہیں اس کی کمائی ہے اور بھی بہت کچھ ہوگا جس کے بارے میں سوائے پروفیسر کے کوئی نہیں جانتا ہے۔''

''اگر وہ لاکر پروفیسر کا تھا تو اسے سوائے اس کے اور کوئی نہیں کھول سکتا ہے؟''

''ہاں اسے سوائے اس کے اور کوئی نہیں کھول سکتا ہے۔'' دونیا کے لہجے میں مایوسی آ گئی۔

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ اگر یہ درست تھا کہ بریف کیس لاکر میں تھا اور اس کی چابی یقیناً شہلا لے جا چکی تھی تو اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ بریف کیس مجھے واپس مل سکے۔ اگرچہ وہ براہِ راست میری ذمے داری نہیں تھا لیکن کیونکہ وہ میرے پاس سے غائب ہوا تھا اس لیے میں کسی حد تک خود کو ذمے دار محسوس کر رہا تھا۔ اس بریف کیس کو حاصل کر کے چینی حکومت تک پہنچا کر میں اپنی ذمے داری سے سبک دوش ہو سکتا تھا لیکن فی الحال یہ کام مشکل لگ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے تم پڑھی لکھی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں نے گریجویشن کیا ہے۔''

''پروفیسر کے چکر میں کیسے آئیں؟''

''میں نہیں جانتی لیکن اس نے کہیں مجھے دیکھ لیا تھا اور پھر اس نے مجھے اس نشے کا عادی بنا دیا اور تب سے میں اس کے ساتھ ہوں۔''

''تمہارے گھر والے؟''

''ماں باپ مر چکے ہیں ایک بھائی تھا وہ کہیں باہر نکل گیا اب میرا اس دنیا میں سوائے پروفیسر کے کوئی نہیں تھا۔''

''اب تو وہ بھی نہیں رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ دیر پہلے تم نے ایک دوست کا ذکر کیا تھا۔''

''ہاں وہ مجھے پسند کرتا ہے پہلے بھی مجھے ساتھ رہنے کی آفر کر چکا ہے لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔''

''تم نے پروفیسر کے ساتھ رہ کر کچھ جمع کیا ہے؟''

اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ''وہ ہمیں صرف استعمال کرتا تھا کچھ دیتا نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کے منصوبے بہت لمبے چوڑے تھے اور وہ ان کو پورا کیے بغیر مر گیا۔''

''اس نے جو کمایا وہ کہاں رکھا ہے؟''

''وہ اپنے ساتھ کچھ نہیں رکھتا تھا اس کا سارا سرمایہ بینک لاکر میں محفوظ ہے۔''

بیتو نے نصف گھنٹے میں پورے مکان کی تلاشی لے لی لیکن اسے نہ تو بریف کیس ملا اور نہ ہی کوئی اور کام کی چیز ملی تھی۔ اسلحہ سارا شہلا ساتھ لے گئی تھی کیونکہ وہاں پر کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا۔ یقیناً شہلا کا ارادہ یہ اسلحہ ضائع کرنے کا تھا۔ کیونکہ یہاں چھوڑنے کی صورت میں شاید اس کا شہلا سے کوئی تعلق ثابت کیا جا سکتا تھا۔ بیتو نے اس دوران میں مجھے کھانے پینے کی کچھ چیزیں اور بھی لا دی تھیں۔ میں نے دونیا سے پوچھا۔

''پروفیسر یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا اس کا کوئی اور ٹھکانہ بھی ہے؟''

''مجھے اس بارے میں نہیں معلوم۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ممکن ہے اس کا کوئی اور ٹھکانہ ہو جہاں وہ جا رہا ہو۔''

''وہ ہمیں بھی لے جا رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے تمہاری بے ہوشی کے دوران یہاں کیا ہوا ہے؟''

نہیں بھلا مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔''

بیتو آ گیا تھا میں نے اسے اور دونیا کو ایک ہی بار ساری کہانی سنائی۔ دونیا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں یہ جان کر کہ جان اور پروفیسر کو شہلا نے قتل کیا ہے اور وہی پروفیسر کے بینک لاکر کی چابی لے گئی تھی اس نے بے ساختہ اسے گالی دی۔ ''کتیا کہیں کی۔''

''پروفیسر نے اس کے ساتھ بہت غلط کیا تھا۔ کوئی عورت اپنی بے حرمتی برداشت نہیں کرتی ہے۔''

''وہ کون سی پاکباز تھی؟'' دونیا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اس کا کردار اپنی جگہ لیکن کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس پر جبر کرے۔ کیا تم یہ بات برداشت کرو گی؟'' میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ لاکر کی چابی کیوں لے گئی ہے؟''

''اس لاکر میں اس کی تصویریں ہیں جن کی مدد سے پروفیسر اسے بلیک میل کر رہا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''لیکن وہ لاکر تو نہیں کھول سکتی ہے۔''

''وہ تو تم بھی نہیں کھول سکتی ہو لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں اس کی بڑی فکر ہے۔'' میں نے طنز کیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''تیار ہو جاؤ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''میں کیوں؟'' وہ سہم گئی تھی۔

''میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ بتاؤ یہاں کوئی گاڑی ہے؟''

''ہاں سامنے سفید رنگ کی سوک کار کھڑی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم ہمارے ساتھ چلو گی۔''

''مجھے کیوں لے جا رہے ہو؟'' اس نے مزاحمتی لہجے میں کہا۔

''مجھے شبہ ہے کہ تم نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہے۔ ویسے یہاں رکنا بے کار ہے شہلا نے کہیں سے پولیس کو کال کر دی تو وہ آنے والی ہو گی۔''

دونیا جانے کے لیے راضی نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ہمارے آگے مجبور ہے۔ گاڑی کی چابیاں جان کے پاس سے برآمد ہوئی تھیں۔ شہلا نے اسے گردن پر گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ وہ پستول جان کا تھا جس سے شہلا نے اس کی اور پروفیسر کی جان لی تھی۔ ہم سامنے والے دروازے سے باہر آئے۔ دونیا نے اپنا پرس ساتھ رکھنے کی اجازت مانگی تھی جو میں نے پرس کا معائنہ کر کے دے دی اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔ میں نے اس کا موبائل بھی واپس کر دیا تھا جب تک وہ اس سے کال نہیں کرتی ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کار پرانی تھی لیکن بہت اچھی حالت میں تھی۔ بیتو نے مکان کا دروازہ بند کر کے باہر ایک عدد تالا لگا دیا جو اسے اندر کہیں سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کی چابی کہاں ہے؟''

بیتو نے دانت نکالے۔ ''ہم کو کیا پتا یہ تالا کھلا ملا تھا ہم نے لگا دیا اب جس نے اندر جانا ہو وہ چابی تلاش کرلے۔''

تالے کی وجہ سے پروفیسر اور جان کی لاشیں فوری دریافت ہونے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ ہاں کوئی خاص طور سے پولیس کو اطلاع کرتا تو اور بات ورنہ جب تک ان لاشوں کی بو نہیں پھیلتی کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اندر دو عدد لاشیں موجود ہیں۔

ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ میرا ارادہ ندیم کے گھر جانے کا تھا اور پھر اس سے اس کے پہاڑی کاٹیج کی چابی لے کر ہم وہاں چھپ سکتے تھے لیکن میں ندیم کے گھر براہِ راست نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک جگہ پڑا کا بورڈ دیکھ

کر بیتو نے کہا۔ ''شوبی بھائی ہم کو بھوک لگا ہے۔''

''اور وہ جو ابھی کھایا تھا؟''

''وہ تو کب کا ہضم ہو گیا۔'' اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ''ایسا لگ رہا ہے ہم نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

میں نے گاڑی پزا شاپ کی طرف موڑ دی اور اس سے کچھ پہلے روک دی۔ میں نے بیتو کو چند بڑے نوٹ دیئے۔ ''دو بڑے پزے اور کولڈ ڈرنک لے آنا اور ہاں یہاں کم سے کم بولنا ورنہ لوگ تمہارے بولنے کے انداز سے چونک جائیں گے۔''

''آپ فکر مت کرو ہم جان گیا ہے ادھر کس طرح سے بولنا ہے۔'' وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولا اور پزا شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ دونیا میرے برابر میں بیٹھی تھی اور باہر نکل کر اسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے منمنا کر کہا۔

''سنو تمہارا کام ہو گیا ہے اب مجھے جانے دو میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے تم اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ ہم کہیں سکون سے بیٹھیں تو تم سے بات ہوتی ہے۔ اس وقت تک تمہاری یادداشت بھی بہتر ہو جائے گی۔''

''تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔'' اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''ابھی میں شور مچا دوں تو تم نکل بھی نہیں سکو گے۔''

''میں نکل جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور اچانک اس کی گردن دبوچ لی۔ ''لیکن اس سے پہلے میں تمہارا کام تمام کر جاؤں گا۔ تمہیں مرنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے جب تمہاری گردن کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔''

میں نے اس کی گردن ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دی اتنی دیر میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سانس رک گئی تھی۔ پاس کھڑی ایک کار میں ایک معمر جوڑے نے یہ منظر دیکھا لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ میں نے دیکھا کہ بڑے میاں کچھ سرد آہیں بھر رہے تھے اور غالباً پچھتا رہے تھے کہ انہوں نے اپنی زوجہ سے جوانی میں یہ سلوک کیوں نہیں کیا۔ اگر ان کو عمر قید ہوتی تب بھی وہ اب تک آزاد ہو چکے ہوتے۔ جب کہ بڑی بی مجھے غلط نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور اگر بڑے میاں نے ان کو روک نہ رکھا ہوتا تو وہ اب تک شور مچا چکی ہوتیں۔ دونیا خاموشی سے اپنی گردن سہلا رہی تھی اور اس نے سمجھ لیا تھا میں صرف دھمکی نہیں دے رہا تھا بلکہ سچ مچ بھی ایسا کر سکتا تھا اس لیے عافیت اسی میں تھی کہ وہ چپ کر کے بیٹھی رہے۔

بیتو دس منٹ بعد لوٹ آیا تھا اور اس نے کولڈ ڈرنک کے ساتھ پیک کافی بھی لے لی تھی۔ یہ کاغذی کپوں میں تھے جن کو اوپر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا کور اتار کر کافی پی جا سکتی تھی۔

''یہ کام کیا ہے تم نے برخوردار۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

بیتو عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور کچھ دیر بعد ایک پارک کے ساتھ کھڑی گاڑیوں میں اپنی گاڑی بھی کھڑی کر دی۔ جب میں نے پزے کا پہلا ٹکڑا لیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر بھوکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو کھایا تھا اس کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ دونیا نے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ کھا پی کر ہم نے کافی لی

اور پھر تازہ دم ہو کر روانگی کے لیے تیار ہوئے۔ میں نے گاڑی کا رخ ندیم کے گھر کی طرف کر دیا تھا۔ راستے میں بیتو سے کہا۔

''میں تم کو ندیم کے گھر سے کچھ دور اتار دوں گا اور وہاں سے تم پیدل اس کے گھر تک جاؤ گے۔ اندر جانے سے پہلے تم آس پاس کا جائزہ لو گے۔''

بیتو نے سر ہلایا۔ ''ہم سمجھ گیا ادھر دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہوگا۔''

''غالب امکان یہی ہے اور وہ تمہیں نہیں پہچانتا ہے۔ اس لیے میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔''

بیتو نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''وضاحت کیوں کرتا ہے شوبی بھائی تم بے خنک ہم کو آگ میں کود جانے کا کہو ہم پلٹ کر نہیں پوچھے گا تم نے ایسا کیوں کہا ہے۔''

''میں جانتا ہوں لیکن میں اپنے ساتھیوں کی جانیں خود سے قیمتی سمجھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ میرا حکم ہے اگر تم کوئی خطرہ دیکھو تو فوراً واپس آ جانا۔''

''ہم ایسا ہی کرے گا لیکن آپ ندیم بھائی کو فون کر کے دیکھ لو ہو سکتا ہے اس کا فون ٹھیک ہو گیا ہو۔''

''نہیں آج صبح بھی میں نے کوشش کی تھی لیکن فون ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی ندیم کی گلی سے پہلے روک لی۔ ''وہ سامنے جس گلی کے کونے پر کھمبا ہے اس میں الٹے ہاتھ پر ساتواں مکان ہے۔ ساتواں یاد رکھنا کیونکہ ندیم کو اپنے مکان کا رنگ ہر سال بدلنے کا خبط ہے اس سال نہ جانے کون سا رنگ کرایا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بیتو نے کہا اور نیچے اتر گیا۔ وہ ٹہلتا ہوا گلی کی طرف بڑھا اور پھر گلی میں غائب ہو گیا۔ دونیا جو اب تک خاموش بیٹھی تھی بولی۔

''تمہارا یہ ساتھی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''میرے تمام ساتھی مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اگرچہ میں اتنی محبتوں کے قابل نہیں ہوں۔''

''شاید اسی وجہ سے تم کامیاب رہتے ہو اور ناکامی تمہارے دشمنوں کے حصے میں آتی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں کئی برسوں سے پروفیسر کے ساتھ ہوں اور شاذ ہی اس نے کسی معاملے میں ناکامی کا منہ دیکھا ہو لیکن تم سے واسطہ پڑتے ہی تقدیر نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اور اس کا باڈی گارڈ دونوں ایک عورت کے ہاتھوں مارے گئے۔''

''شاید ایسا ہی ہو لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو کہ پروفیسر اور جان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں اور ویسے بھی میں جان چکی ہوں کہ تم بلاوجہ کسی کی جان نہیں لے سکتے اور تمہارے ہاتھ سے وہی مرتے ہیں جنہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے درست کہا نا؟''

''ہاں اکثر لوگ میرے ہاتھ سے ہنگامی حالات میں مارے گئے ہیں لیکن تم اس سے یہ نتیجہ مت نکالنا کہ میں کسی کو ارادتاً قتل نہیں کر سکتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر میں بالکل ایسا بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے اسے خبردار کیا

''سنو۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم نے مجھ سے جو پوچھنا ہے ابھی پوچھ لو میں اپنے ماں باپ کی قسم کھاتی ہوں کہ جو کہوں گی سچ کہوں گی اور پھر تم مجھے جانے کی اجازت دے دو۔''

''دونیا یہ کام جلدی کا نہیں ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں آرام سے تم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تم پر تشدد کروں گا لیکن تم نے غلط بیانی کی تو مجھے معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تم مجھے ابھی جانے کی اجازت نہیں دو گے؟''

''ہاں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''فی الحال اسے بھول جاؤ۔''

بیتو کو گئے ہوئے دس منٹ سے اوپر ہو گیا تھا اور اتنی دیر میں اسے آ جانا چاہیے تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیتو ندیم کے لیے اجنبی تھا اور وہ آسانی سے اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے سورج غروب ہو چکا تھا اور فضا میں تاریکی پر پھیلا رہی تھی۔ مزید دس منٹ بعد مجھے شک ہونے لگا کہ بیتو کسی مشکل میں پھنس گیا ہے اور آدھا گھنٹا گزرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ بیتو کسی ٹریپ میں آ چکا ہے۔ میں نے دونیا سے کہا۔

''نیچے اترو۔''

''کیوں؟''

''سوال مت کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

ہم گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ میں دونیا کے ساتھ گلی کے کونے کی طرف بڑھا۔ میں نے دونیا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا کہ کہیں وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار نہ ہو جائے۔ وہ بادلِ ناخواستہ میرے ساتھ کھنچی چلی آ رہی تھی۔ میں نے گلی کے کونے سے جھانکا مجھے گلی میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد میں گلی میں داخل ہو گیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی بیتو یا کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ دس بارہ سال کے دو کھلنڈرے بچے ابھی تک گلی میں فٹ بال سے کھیل رہے تھے۔ میں ندیم کے گھر تک آیا۔ یہ دس مرلے کے پلاٹ تھے اور یہاں گلیاں بھی کشادہ تھی۔ میں نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا۔ پورچ میں کوئی نہیں تھا البتہ ندیم کی کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گھر پر ہی تھا۔ ندیم کاہل آدمی تھا اور اسے گلی کے کونے تک بھی جانا ہوتا تھا تو وہ کار ضرور نکالتا تھا۔ میں نے پہلے بیل بجانے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے دروازہ چیک کیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔ بیتو اندر گیا اور غائب تھا۔ ندیم کی کار کھڑی تھی اور اس کے قیامت خیز بچے یوں چپ تھے جیسے سو رہے ہوں حالانکہ وہ سب کو سلا کر سوتے تھے اور بحالت بیداری ایک منٹ کو بھی چپ نہیں بیٹھتے تھے۔ بے چاری ندیم کی بیوی ان سے عاجز رہتی تھی۔ پہلے چار تھے اور آخری اطلاعات کے مطابق ان میں مزید ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دشمن یقینی طور پر اندر تھا اور ایسے میں سامنے سے جانا خود کو دشمن کے سامنے پیش کرنے کے مترادف تھا میں نے پیچھے ہونا چاہا تھا کہ میری پشت سے کوئی چیز آ لگی اور کسی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اندر چلو...... یہ شاٹ گن ہے۔''

وہ نہ جانے کہاں سے آیا تھا اور اس نے مجھے ہینڈز اَپ کرا لیا تھا۔ اس وقت دشمن مجھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا وہ سکون سے ندیم کے گھر میں میرا انتظار کر رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میں یہاں ضرور آؤں گا۔ البتہ میں یہ نہیں جان سکا کہ مجھے ہینڈز اَپ کرانے والا گلی میں کہاں چھپا تھا کیونکہ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اور اس دوران

میں میری نگاہیں مسلسل دائیں بائیں دیکھتی رہی تھیں۔ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے اس سے پوچھ لیا۔

''تم آئے کہاں سے ہو دائیں طرف سے یا بائیں طرف سے اور کس رفتار سے آئے ہو میں تمہیں بالکل نہیں دیکھ سکا تھا۔''

''میں پیچھے سے آیا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ جو اس گھر کے سامنے کھنڈر اسوز وکی کھڑی ہے میں اس میں تھا۔ اب اندر چلو اور مجھے مجبور مت کرنا میں گولی چلاتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاؤں گا۔''

مجبوراً میں نے اندر قدم رکھا سہمی ہوئی دونیا میرے ساتھ تھی۔ جیسے ہی ہم اندر آئے سامنے سے ایک مسلح شخص اور نمودار ہوا تھا اور اس نے بھی چھوٹی نال کی لیکن جدید ترین شاٹ گن تھام رکھی تھی۔ اس نے آگے آنے کا اشارہ کیا اور مجھے لانے والے شخص سے کہا۔ ''اس کی تلاشی لو۔''

اس نے عقب سے ہاتھ مار کر میرے جسم کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''لڑکی کی تلاشی بھی لو۔'' اندر سے آنے والے نے حکم دیا۔

اس نے دونیا کی تلاشی ذرا تفصیل سے اور ذرا دیر تک لی۔ ''نہیں جی اس کے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔''

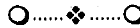
''چلو اندر۔'' اب کے اس نے مجھ سے کہا۔

''کیا تم مرشد کے کتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

ایک لمحے کو اس کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار نظر آئے تھے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ ''تمہیں جلد پتا چل جائے گا ہم کس کے کتے ہیں۔''

عقب والے نے رائفل کی نال سے مجھے دھکا دیا۔ ''چل اندر بڑا آیا مرشد کا سگا۔''

اس کے الفاظ سے مجھے یقین ہو گیا کہ ان لوگوں کا مرشد سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ اس کے آدمی مر کر بھی اس کی شان میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتے تھے۔



میں اندر داخل ہوا اور ٹھٹک گیا۔ کیونکہ نشست گاہ میں سامنے ہی صوفے پر فتح خان بیٹھا بڑے اسٹائل سے پیگ لگا رہا تھا اس کے عقب میں دو مسلح افراد اور کھڑے تھے۔ کمرے میں ایک طرف بیتو دونوں ہاتھ سر پر رکھے کھڑا تھا اور بہ ظاہر ٹھیک نظر آ رہا تھا اس کے پیچھے بھی ایک مسلح شخص موجود تھا۔ میں ابتدائی شاک سے سنبھل کر آگے بڑھا۔

''مبارک ہو۔'' میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

''کس بات کا؟''

''اب تم کام کرنے والوں سے ترقی کر کے باس وغیرہ بن گئے ہو اور تمہاری جگہ یہ لفنگے کام کر رہے ہیں۔'' میں نے حقارت سے کہا۔ ''لیکن کیا اس سے تمہاری اصلیت بدل جائے گی۔''

میرے عقب میں کھڑے آدمی نے اشتعال میں آ کر کوئی حرکت کرنا چاہی لیکن فتح خان نے اسے روک دیا اس نے غصے میں دھاڑ کر کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے۔''

''حرامی بکواس کر رہا ہے۔''

''اس کا زبان چل رہا ہے اس لیے تمہارا ہاتھ چلنے کو بے تاب ہے۔'' فتح خان نے زہریلے انداز میں کہا۔

''ایسے آدمی کا میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس سے رائفل لے لو اور تم گاڑی میں بیٹھو۔''

یہ وہی تھا جو مجھے ہینڈز اَپ کرا کے لایا تھا اور اب ذلت کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے کہا۔ ''ندیم اور اس کے گھر والے کہاں ہیں؟''

وہ مسکرایا۔ ''وہ لوگ کہیں گیا ہوا ہے۔''

''بکواس...... اس کی کار یہاں کھڑی ہے۔''

''وکیل صاحب کا پریکٹس اور بچہ لوگ دونوں بڑھ رہا ہے اس لیے نیا گاڑی لینا پڑا۔ اس میں گیا ہے تم کو یقین نہیں ہے تو گھر دیکھ لو۔''

میں نے سچ مچ گھر دیکھ لیا۔ ندیم اور اس کی فیملی سچ مچ یہاں نہیں تھے لیکن اس سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی فتح خان ان کو کہیں اور بھی بھیج سکتا تھا۔ فتح خان نے کہا۔ ''اوہ یارا یقین کرو وہ گیا ہوا ہے۔ تبھی ہم اتنے مزے سے یہاں بیٹھا ہوا ہے۔''

میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''اس حرکت کا مطلب؟ کیا تم اب بھی پروفیسر کے لیے کام کر رہے ہو۔''

اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''اس کا بات مت کرو وہ ایک گھٹیا آدمی ہے۔''

''اچھا پہلے تو تم اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔'' میں نے طنز کیا۔

''اس وقت میرے کو اس کے بارے میں پتا نہیں تھا وہ بالکل بکواس آدمی ہے۔''

''تو چلو یہ بتا دو کہ اب تم کس بکواس آدمی کے لیے کام کر رہے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں اب کسی کے لیے کام نہیں کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔''

''کہاں اور کیوں؟''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلاس اپنے ایک آدمی کو تھما دیا۔ جسے رخصت کر دیا تھا اس کے علاوہ بھی فتح خان کے ساتھ چار آدمی تھے۔ فتح خان خود بھی مسلح تھا۔ ہم باہر نکلے تو فوراً گلی کے سرے سے ایک پرانے ماڈل کی اسٹیشن ویگن آئی اور ہم سب اس میں سوار ہو گئے اس میں گنجائش خاصی ہوتی ہے۔ اور کھڑکیوں پر پردے تھے اس لیے باہر سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فتح خان ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پیچھے کوئی سیٹ نہیں تھی بلکہ فرش ہی سیٹ تھا۔ اس پر ایک خستہ حال قالین بچھا تھا اور اس پر ہم گھس گھسا کر بیٹھ گئے۔ چار مسلح افراد میرے، بیتو اور دونیا کے دونوں طرف تھے اور ہم ان کے نرغے میں تھے۔

''تم کب واپس آئے؟'' میں نے فتح خان سے پوچھا۔

''دو دن ہوئے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تمہیں پروفیسر کی دوسری ٹیم نے پکڑ لیا ہے اور پھر تم اس کی قید سے فرار ہو گیا ہے۔''

''فرار نہیں ہوئے تھے بلکہ اس نے مجھے ایک غریب چوکیدار کے قتل کے جرم میں پھنسانے کی کوشش کی

تھی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔'' مجھے شبہ ہے وہ مرشد کا دشمن نہیں بلکہ اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔''
خلاف توقع فتح خان نے میری تائید کی۔'' میرے کو بھی یہی شبہ ہے اور اسی لیے میں نے اس کے لیے مزید کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''پروفیسر کا کہنا تھا کہ تمہارے ساتھ آنے والے تین آدمیوں نے مجھے قتل کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ان کا ذاتی فعل تھا اور اس نے مجھے مارنے کا حکم نہیں دیا تھا۔''

''یہ درست ہے یہ ان تین احمقوں کا اپنا فیصلہ تھا اور تم نے اس کا اچھا سزا دیا اب سب اسپتال میں رہے گا تین چار مہینے تک۔''

''کیا ان کو پروفیسر کے حکم سے قتل نہیں کیا تم نے؟''

فتح خان اس الزام پر بدمزہ ہوا۔'' اپنے آدمیوں کو کون اتنا اتنا بات پر قتل کرتا ہے اور یہ کوئی آسان کام ہے کیا؟''

''پروفیسر نے تو یہی کہا تھا۔''

''جھوٹ بولتا ہے وہ تخم خنزیر۔'' فتح خان بھڑک گیا۔

''اب تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔

''جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔'' اس نے کہا۔'' تم اطمینان رکھو مجھ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

گزشتہ کچھ عرصے سے فتح خان کا رویہ خاصا بدلا ہوا تھا اور وہ مسلسل مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا ا۔ اب وہ میرا دشمن نہیں رہا ہے۔ بھارت میں بھی اس نے میرے ساتھ نرم رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے اس ے کہا۔'' ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن اس کے لیے یوں میرا تعاقب کرنے اور اتنے لاؤ لشکر ے ساتھ میرے دوست کے گھر قبضہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''مجبوری تھا دوست...... تمہارا سراغ نہیں تھا پر اتنا معلوم تھا کہ تم ادھر ہی آئے گا۔''

اسٹیشن ویگن نہ جانے کن راستوں پر دوڑتی رہی۔ ایک بار ایسی بو آئی جیسے پاس پانی کا کوئی ذخیرہ ہو۔ ا لی کی اپنی ایک مخصوص مہک ہوتی ہے۔ پھر جنگلی نباتات کی بو آنے لگی۔ ہم آبادی سے نکل آئے تھے کیونکہ ہاں روشنیاں بھی نہیں تھیں۔ پر ویگن کسی احاطے میں داخل ہوئی ایک منٹ کے لیے دروازہ کھلوانے کو رکی تھی۔ ا ... رکی تو سب اتر آئے۔ فتح خان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔'' ان کو اندر لے جاؤ اور کوئی غلط حرکت نہیں کرے ... نہ ام کھال اتار دے گا۔''

نہ جانے اس نے یہ دھمکی کس وجہ سے دی تھی۔ بہر حال اس کے آدمی ہمیں گھیر کر ایک چھوٹی سی عمارت لہ اندر لے آئے۔ یہ ایک بڑا سا احاطہ تھا جس کی دیوار کچی تھی اور اس میں کئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بنی تھیں۔ یہ ... سے بنی تھیں اور ان پر سیمنٹ کی شیٹیں تھیں۔ ہمیں جس کمرے میں لایا گیا اس میں کئی چارپائیاں بچھی ں۔ جن پر روئی کے گدے اور دیسی ساختہ اون سے بنے کمبل پڑے تھے۔ ہمیں اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے ... گیا۔ یہ لکڑی کے تختوں سے بنا مضبوط دروازہ تھا۔ میں ایک چارپائی پر دراز ہو گیا۔ بیتو بھی بے فکر تھا ... ہم آئے دن ایسے حالات سے گزرتے تھے بلکہ کچھ دن دشمنوں سے واسطہ نہ پڑے تو طبیعت بے لطف سی

ہو جاتی تھی۔

البتہ دونیا سخت متوحش تھی۔ ایک تو اس کا اس قسم کے حالات سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا دوسرے وہ لڑکی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کیا جائے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس بات سے؟''

''یہ لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے؟''

''یہ بات تو یہی لوگ بہتر بتا سکتے ہیں۔ ویسے کوئی اپنے دشمن یا قیدی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اس کا تو تمہیں بھی اچھی طرح اندازہ ہوگا۔'' میں نے ہلکا سا طنز کیا۔ اس پر وہ دوسری چارپائی پر جا بیٹھی تھی۔ میں نے بیتو کی طرف دیکھا۔

''برخوردار تم کیسے ان کے ہاتھ آئے؟''

''جیسے آپ آیا۔'' وہ مسکرایا۔ ''گلی خالی دیکھ کر ہم مزے سے اندر آ گیا اور گیٹ سے اندر جھانک رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر ایک آدمی نے ہم کو ہینڈز اَپ کرا لیا اور پھر اندر لے آیا۔ ادھر فتح خان بیٹھا تھا۔''

''اس نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کیا؟''

''نہیں بس ہم کو ایک کونے میں کھڑا کر دیا۔''

کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا اور ایک ہی کھڑکی تھی۔ دونوں بند تھے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو باہر سے سرد ہوا اندر آئی تھی میں نے جلدی سے اسے بند کر دیا۔ ویسے اس میں خاصی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک آدمی نے اندر جھانکا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

''خان تم کو بلا رہا ہے۔''

خان سے مراد یقیناً فتح خان تھی۔ اس کے ساتھیوں میں سارے مقامی لوگ تھے وہ واحد خان تھا۔ میں باہر آیا تو اس آدمی نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے اسی عمارت کے دوسرے کمرے میں لایا۔ یہ ذرا بہتر طریقے سے سیٹ تھا اس میں ایک دیسی ساختہ بھاری مسہری اور اس کے ساتھ بھدی سی ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف ایک صوفہ سیٹ لگا تھا اور فتح خان صوفے پر براجمان تھا۔ اس وقت بھی وہ وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہے۔

''بیٹھو شہباز خان۔'' اس نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا۔ فتح خان کے پاس بہ ظاہر کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی کمرے میں کوئی اور تھا۔ یہ فتح خان کی طرف سے مجھ پر اعتماد کا مظاہرہ تھا ورنہ فتح خان بھی جانتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح بلانے کا مقصد کچھ خاص ہی ہوگا۔

''تم کیا پیئے گا؟''

''اگر ممکن ہو تو چائے یا کافی منگوا دو۔''

فتح خان نے آواز دی۔ ''او مر جانا...... کدھر مر گیا ہے؟''

جواب میں ایک دبلا سا آدمی اندر آیا۔ ''جی خان جی۔''

''اچھا سا چائے بنا کر لاؤ...... جلدی۔''

وہ چلا گیا تو فتح خان نے اپنے لیے دوبارہ گلاس میں وہسکی ڈالی۔ میں نے بہت کم اسے پیتے دیکھا تھا اور اس طرح تو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چند منٹ میں چائے آ گئی۔ دبلا آدمی میرے سامنے کپ رکھ کر چلا گیا۔ فتح خان اپنی بات کہنے کے لیے بے تاب تھا اس نے پہلو بدلا۔

''شہباز خان تم جانتا ہے آج میں تم سے کیا کہنے والا ہوں؟''

''نہیں میں نجومی نہیں ہوں۔'' میں نے چائے چکھی ذائقہ اچھا تھا۔

''اگر میں کہوں کہ تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں؟''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''تمہاری اور میری فطرت بالکل الگ ہے اور ہمارے درمیان دوستی ممکن نہیں ہے۔ ہاں میں تم سے بارہا پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارے درمیان دشمنی بھی نہیں ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تم نے اچھا کیا جو صاف بات کر دیا۔ اب سنو میرا مرشد سے دشمنی ہو گیا ہے۔''

''اس میں تعجب کی بات تو نہیں ہے کیونکہ تم دونوں کا ساتھ اصل میں مفاد کے لیے تھا اور کسی مفاد کے ٹکراؤ پر تم میں دشمنی ہو سکتی ہے لیکن میں پھر صاف گوئی سے کہوں گا مجھے اس بات پر اعتبار نہیں آیا ہے۔''

''جلد آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ سچ ہے مرشد اب میرا دشمن ہے۔ اگرچہ وہ میرے پیچھے تو نہیں ہے۔ جیسا تمہارے پیچھے ہے لیکن اسے موقع مل گیا تو وہ مجھے پکڑ لے گا۔''

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ ''پکڑ لے گا مارے گا نہیں۔''

فتح خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''شہباز خان تم ذہین آدمی ہے تم سمجھ سکتا ہے مرشد میرے کو کیوں پکڑے گا اور مارے گا کیوں نہیں۔''

اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی۔ ''ہیروں کا معاملہ ہے وہی برٹ شا والے؟''

''تم واقعی ذہین ہے۔'' فتح خان نے خوش ہو کر کہا۔ ''خدا تمہارا بھلا کرے یہی بات ہے۔''

''مرشد تم سے کیا چاہتا ہے۔ ہیرے تمہارے پاس ہیں؟''

فتح خان کا منہ لٹک گیا۔ ''نہیں...... وہ خانہ خراب ابھی تک پاگل بنا ہوا ہے۔''

''میرا تو خیال ہے وہ سچ مچ پاگل ہو گیا ہے تم سوچو کہ کوئی اتنے عرصے تک ایک جگہ قید رہے تو کیا پاگل نہیں ہو جائے گا؟''

''تم ان خانہ خراب گوروں کو جانتا نہیں ہے۔'' فتح خان نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے مطلب کے لیے پاگل بن بھی سکتا ہے اور پاگل بنا بھی سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے ہیرے تمہارے ہاتھ نہیں لگے ہیں لیکن کیا مرشد یہ بات جانتا ہے کہ برٹ شا تمہارے قبضے میں ہے؟''

''نہیں یہ بات تو ڈیوڈ شا بھی نہیں جانتا ہے لیکن مرشد کو کسی طرح پتا چل گیا کہ ہیرے مل سکتے ہیں بس وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔''

''اس نے تم سے براہِ راست ہیرے طلب کر لیے؟''

''نہیں لیکن اس نے دوسرا طریقہ استعمال کیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے میرے کو اٹھا لیا۔ کئی دن ایک جگہ بند کر کے مجھے مارتے رہے اور ہیروں کا پوچھتے رہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ مرشد کے آدمی ہیں؟''

''بس پتا چل گیا۔'' فتح خان نے کہا اور اپنی بائیں ہاتھ کی آستین الٹ کر اوپر کی۔ نصف کلائی سے کہنی تک ہاتھ جگہ جگہ سے کاٹنے اور جلانے کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ ''ایسا ہی نشان ہمارا پشت اور پیروں پر بھی ہے۔ ایک دن موقع پا کر ہم بھاگ نکلا۔''

''تم نے مرشد سے اس حرکت کا جواب طلب نہیں کیا؟''

''نہیں ہم نے اسے مکاری کی مار مارنے کا سوچا ہے۔ میں نے اسے کچھ نہیں کہا اور یہی بتایا کہ نا معلوم لوگ ہم کو اٹھا کر لے گیا تھا لیکن اس کے بعد ہم اس کی طرف سے محتاط ہو گیا۔ اس کا سارا لوگ جو ہمارے ساتھ تھا ان کو دور کر دیا۔ اِدھر سے اپنا لوگ بھرتی کیا۔''

''یہ سب تمہارے اعتماد کے بندے ہیں۔''

''پورا تو نہیں لیکن ہم کو بھروسہ ہے کوئی دھوکا دینے سے پہلے کئی بار سوچے گا۔ مرشد کا کوئی آدمی نہیں ہے۔''

''تم مرشد سے دور ہو گئے ہو کیا وہ کھٹک نہیں جائے گا؟''

''کھٹک تو جائے گا لیکن وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔'' فتح خان مسکرایا۔ ''اس کا بدمعاش لوگ میرے سامنے کچھ نہیں ہے۔ وہ بس دھوکا دے سکتا ہے۔''

''تم نے مرشد کو چھوڑ دیا تو کیا اب ڈیوڈ شا سے بھی تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے؟''

''نہیں ابھی تو نہیں ہے۔ وہ میرے سے کام لیتا ہے۔ جب ضرورت پڑتا ہے تو کال کرتا ہے ورنہ پوچھتا بھی نہیں ہے۔''

''مرشد نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تم نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی؟''

''ابھی تو نہیں میں نے کہا نا میں اسے مکاری کی مار مارے گا۔'' فتح خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابھی تو وہ میری طرف سے ہوشیار ہے۔''

''ابھی تو وہ حکومت میں بھی ہے۔ تم نے کچھ کیا تو تمہارے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ بات بھی ہے...... پر ابھی میں اسے کچھ کہے گا تو بات بے کار ہو گی۔ جب وہ کسی مسئلے میں ہو گا اور تب میں کچھ کرے گا تب مزہ آئے گا۔''

''چلو میں نے مان لیا کہ تمہاری اور مرشد کی دشمنی ہو گئی ہے اور تم اس پر وار کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہو لیکن سوال یہ ہے کہ تم نے مجھے کیوں پکڑا ہے اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

اس نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ''شہباز خان چاہتا تو تم سے دوستی کرنا ہے پر تم مانے گا نہیں نہ اس لیے میں نے تیرے کو بلا کر سارا معاملہ سامنے رکھ دیا۔ اب میرا حساب الگ ہے اور مرشد کا حساب الگ ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس کی بات کے پس پشت کوئی خاص وجہ تھی۔ وہ ایسے ہی یہ بات نہیں کر رہا تھا لیکن وہ مجھے فی الحال اصل بات بتا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ آئندہ مرشد میرے خلاف کوئی کارروائی کرے تو تمہیں اس سے الگ سمجھا جائے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں یہی کہہ رہا ہوں۔''

میں نے شک سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے مجھ سے صرف یہ کہنے کے لیے اتنی زحمت کی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو میں چاہتا ہوں تم اپنے دشمنوں کی فہرست سے میرا نام نکال دو۔''

''میرے دشمنوں کی کوئی فہرست نہیں ہے کیونکہ میں نے کسی سے دشمنی نہیں پالی ہے میں نے جب بھی کچھ کیا ہے صرف اپنے دفاع میں کیا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''میں جانتا ہے تم ایک اچھا آدمی ہے کتنی بار موقع ملنے پر بھی تم نے اپنا دشمن کو معاف کر دیا۔ مجھے معاف کر دیا۔''

میں حیران تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی فکر مند بھی تھا۔ فتح خان کا رویہ معمول سے بالکل ہٹ کر تھا۔ میرا یہ احساس قوی ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی خاص بات ہے۔

''ٹھیک ہے اب بات صاف ہو گئی ہے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو قید میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تم ہمیں جانے کی اجازت دو۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟''

میرا خیال تھا کہ وہ دونیا کے بارے میں جانتا ہو گا جیسے دونیا اس کے بارے میں جانتی تھی۔ اس کی بات نے مجھے حیران کیا لیکن یہ حیرت میں نے اپنے انداز سے ظاہر ہونے نہیں دی تھی۔ ''یہ ایک لڑکی ہے۔''

''وہ تو ہے پر کون ہے؟''

''فتح خان اس سے تمہارا تعلق نہیں ہے۔'' میں نے کسی قدر کھردرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سی بات کا؟'' وہ انجان بنا

میں نے تحمل سے اپنی بات دھرائی۔ ''اگر تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو جانے دو۔''

''اتنی جلدی کیا ہے تم کچھ دن آرام سے یہاں رہو۔ ابھی تم ملک میں آیا ہے۔''

''میرے آرام کی تم فکر مت کرو یہ بتاؤ کہ تم مجھے جانے دے رہو ہو یا نہیں؟'' میں نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

''اگر میں تیرے کو کچھ دن کے لیے روک لے؟''

''تو اس کا مطلب ہوگا کہ تم اب تک جھوٹ بولتے آئے ہو۔ مجھ سے تمہاری دشمنی برقرار ہے۔''

''نہیں شہباز خان ایسا بات نہیں ہے میں تو تمہارے خیال سے تمہیں روک رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی بہتر ہے تم دو تین دن اِدھر رکے پھر تم جدھر کہے گا اُدھر چھوڑ دے گا۔''

''میں تمہارا محتاج نہیں ہوں۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔ ''میں تمہاری بات پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جب تک تم مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دو گے۔''

میری بات سن کر وہ کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میری چھٹی حس ایک بار پھر خبردار کرنے لگی تھی کہ کوئی خاص بات ہے اور فتح خان مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا اور بولا۔ ''شہباز خان تمہیں کچھ دن یہاں رکنا ہوگا۔''

میرے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ ''فتح خان یہ کہو کہ تم مجھے نیا دھوکا دینا چاہ رہے تھے لیکن اب میں تمہیں اچھی طرح جان گیا ہوں میں تمہارے کسی دھوکے میں نہیں آؤں گا۔''

''تم جلد جان جائے گا کہ فتح خان نے تم کو دھوکا نہیں دیا وہ تمہارا مخلص ہے۔''

''تم شاید اس لفظ کے معنی سے بھی واقف نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا ابھی تم نے یقین نہیں کیا ہے لیکن جلد تم جان جائے گا۔'' فتح خان نے کہا اور بلند آواز میں بولا۔ ''لطیف خاناں اِدھر آؤ۔''

وہی مسلح آدمی اندر آیا جو مجھے فتح خان کے پاس لایا تھا۔ ''جی خان؟''

''اسے لے جاؤ اور خیال رکھنا۔''

''جی خان...... آؤ جی۔'' لطیف نے مجھ سے کہا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''فتح خان مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

فتح خان نے میری طرف دیکھا اور پھر لطیف کو واپس جانے کا اشارہ کیا وہ باہر چلا گیا۔ ''ہاں بولو۔''

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ''میں جب سے پاکستان آیا ہوں مجھے لگ رہا ہے یہاں میری غیر موجودگی میں کوئی بات ہوئی ہے۔ میرے حوالے سے کوئی بری خبر ہے لیکن یہ خبر مجھ سے چھپی ہوئی ہے میں نے کئی بار ندیم سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ اب مجھے لگ رہا ہے تم بھی یہ بات مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

فتح خان نے گہری سانس لی اور سوچنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمایاں تھے۔ پھر اس نے کہا۔ ''شہباز خان خبر تو واقعی ہے اور تمہارے لیے برا ہے۔''

''کیا خبر ہے؟''

''سچی بات ہے میں سناتے ہوئے ڈرتا ہے۔''

''تم مجھ سے کیوں ڈر رہے ہو کیا اس خبر کی وجہ تم ہو؟''

''نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی ڈر لگتا ہے کہیں تم میرے کو اس کا ذمے دار نہ سمجھ لے۔''

''فتح خان تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو مجھے اصل بات بتاؤ۔'' میں نے کہا تو میرے لہجے میں وحشت در آئی تھی۔ ''وہ بری خبر کیا ہے؟''

''آرام سے آرام سے شہباز خان۔'' اس نے کہا۔ ''خبر تمہارے بھائی شاہد کے حوالے سے ہے۔''

میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ''کیا...... کیا ہوا شاہد بھائی کو؟''

فتح خان کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''دس دن پہلے کوہاٹ سے آتے ہوئے کسی نے اسے گاڑی میں شوٹ کر دیا۔ وہ وہیں مر گیا تھا۔''

فتح خان کے الفاظ جیسے گولیوں کا برسٹ بن کر میرے جسم سے ٹکرائے تھے۔ اور میں کسی بگولے کی طرف اس پر جا گرا میں نے ایک جنون کے عالم میں اس کی گردن دبوچ لی تھی اور شاید چلا بھی رہا تھا۔ فتح خان کی آنکھوں میں موت نظر آنے لگی اور پھر کسی نے عقب سے میرے سر پر وار کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے یک دم ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس اندھیرے کے پیچھے سے فتح خان کا قہقہہ سنائی دیا تھا۔



میں نہ جانے کتنی دیر دنیا و مافیہا سے بے خبر رہا تھا۔ میرے سر کی ضرب شدید تھی۔ بے ہوش ہوتے وقت مجھے لگا تھا جیسے میرے سر کے ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ یقیناً فتح خان کی جان خطرے میں دیکھ کر اس کے کسی آدمی نے عقب سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ فتح خان نے بات ہی ایسی کی تھی جس کے بعد میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ شاہد بھائی مجھ سے سات سال بڑے تھے۔ بھائیوں میں اتنی عمر کا فرق خاص نہیں ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیا بات تھی میں جس قدر شجاع بھائی کے نزدیک اور بے تکلف تھا شاہد بھائی سے میری وہ بے تکلفی نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں وہ شاید ہی کبھی میرے ساتھ کھیلے ہوں اور نہ ہی ہماری کوئی مشترکہ سرگرمی تھی۔ جب میں بہت چھوٹا تھا۔ شاید تین سال کا تب شاہد بھائی کیڈٹ اسکول چلے گئے تھے اور پھر صرف چھٹیوں میں گھر آتے تھے وہ بھی کم دنوں کے لیے کیونکہ گرمیوں کی چھٹی میں اسکول کی جانب سے کوئی پروگرام ہوتا تھا جس میں سارے لڑکے کہیں گھومنے پھرنے جاتے تھے۔ پھر وہ سردیوں کی چھٹی میں آتے تھے اس میں بھی انہیں گھر میں رکنے کا موقع کم ملتا تھا۔

لیکن کیڈٹ اسکول اور کالج میں تو شجاع بھائی بھی پڑھے تھے بلکہ وہ میری پیدائش سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ وہ بھی اسی طرح گرمی اور سردی کی چھٹیوں میں گھر آتے تھے۔ مگر مجھے انہوں نے ہمیشہ وقت دیا۔ وہ میرے ساتھ کھیلتے تھے اور مجھے گھمانے پھرانے لے جاتے تھے۔ گاؤں کی نہر میں تیراکی کرنا انہوں نے سکھایا۔ پھر مطالعے کا شوق ان کی وجہ سے ہوا۔ پہاڑوں پر جانا ان کی وجہ سے ہوا۔ میری زندگی پر شجاع بھائی کی چھاپ جتنی گہری ہے شاہد بھائی کی چھاپ اتنی ہی کم ہے۔

یہ نہیں ہے کہ شاہد بھائی مجھ سے یا میں ان سے محبت نہیں کرتے تھے محبت تو اتنی ہی تھی لیکن نہ جانے کیا بات ہم دونوں میں کچھ جھجک تھی۔ جو ہمیں آپس میں گھلنے ملنے اور ایک ہونے سے روکتی تھی۔ بھائیوں والی محبت کے باوجود ہم ایک دوسرے سے دور دور تھے۔ شاید قدرت ہمیں اس آنے والے امتحان کے لیے تیار کر رہی تھی جس سے ہمیں گزرنا ہی تھا۔ سویرا جو میرے زندگی میں محبت کا سویرا بن کر آئی تھی۔ وہ میرے بھائی کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔

یہ سب بابا کا کرتا تھا انہوں نے صرف ضد میں آ کر یہ فیصلہ کیا تھا کیونکہ میں نے ان کی حکم عدولی کی تھی۔ انہوں نے مجھے سویرا سے محروم کر دیا۔ ورنہ وہ کم سے کم اتنا تو جانتے تھے کہ میں سویرا کو پسند کرتا ہوں۔ البتہ انہوں نے میری پسند کو عام بازاری محبت سمجھا تھا اور ایک بار مجھے سویرا سے دور رہنے کی وارننگ بھی دی تھی۔ پھر جب میں حویلی میں نہیں تھا تو سویرا کا رشتہ شاہد بھائی سے طے کر دیا گیا۔ ان دنوں میں ماسٹر میں مصروف تھا۔ جب مجھے یہ اطلاع ملی تب ہی میں نے حویلی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس پر آج تک قائم تھا مجھے نہیں معلوم کہ کن حالات میں سویرا اور شاہد بھائی کا رشتہ طے ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سو فی صد بابا کی ضد کا نتیجہ ہوگا کیونکہ ماں جی نہ سہی صغراں آپا تو جانتی تھیں کہ میں سویرا کو پسند کرتا ہوں اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ انہوں نے بابا کو بتانے کی کوشش کی ہوگی اور بابا اپنی ضد پر اڑے رہے ہوں گے۔

یوں شاہد بھائی اس ہستی کے مالک بن بیٹھے جسے میں نے جسم و جان کی تمام شدتوں سے چاہا لیکن خدا کی قسم اس کے باوجود میرے دل میں شاہد بھائی کے لیے کہیں ہلکا سا میل بھی نہیں آیا۔ ایک تو وہ اس معاملے میں بے خبر تھے ورنہ کسی صورت اس شادی پر رضامند نہ ہوتے۔ دوسرے وہ میرے بھائی تھے۔ جب مجھے سویرا اور شاہد بھائی کا خیال آتا میرے دل سے دونوں کی خوشیوں کے لیے دعا نکلتی تھی۔

ہوش میں آتے ہی مجھے سب سے پہلا خیال شاہد بھائی کا آیا تھا اور میں نے تڑپ کر سوچا کہ کاش فتح خان نے بکواس کی ہو۔ وہ میرا دشمن تھا اور دشمن ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے لیکن ساتھ ہی میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا فتح خان نے جھوٹ نہیں کہا تھا اس کا انداز مجھے اذیت دینے والا نہیں تھا بلکہ وہ پریشان تھا کہ مجھے یہ خبر کس طرح سنائے اور جب میں نے خود پوچھا تو اس نے مجبوراً اگل دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد میں نے آنکھ کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ پہلے میں نے آس پاس کے ماحول کو محسوس کیا۔ میں ایک نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سر میں معمولی سی تکلیف تھی۔ یعنی مجھے بہت اچھا ٹریٹ کیا گیا تھا اور فتح خان کا گلا دبانے کی سزا نہیں دی گئی تھی۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا اور سردی کی وجہ سے میرا جسم ہلکے کمبل تلے تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا کم سے کم میں نے محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر مجھے شدید جھٹکا لگا۔



جب میں چھوٹا تھا تو بابا نے حویلی کی مرمت اور آرائش کرائی تھی۔ اس آرائش میں چھت پر پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے نقش و نگار بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں اس کا رواج شہروں میں بھی بہت کم تھا۔ دیہات میں تو اس کے بارے میں کوئی جانتا ہی نہیں تھا لیکن بابا نے یہ کام کروایا تھا لوگ دیکھتے اور حیران ہوتے تھے۔ میرے کمرے کی چھت پر جو نقش و نگار تھے وہ میری پسند کے تھے۔ رات جب میں سونے کے لیے لیٹتا تو ہلکی روشنی میں یہ نقش و نگار بہت دل فریب لگتے تھے اور میں ان کو دیکھتے دیکھتے نیند کی گہرائیوں میں کھو جاتا۔

آج آنکھ کھلتے ہی مجھے چھت پر وہ نقش و نگار دکھائی دیئے تھے۔ کیا میں حویلی میں تھا؟ میں نے سوچا اور پھر سر گھما کر دیکھا۔ یہ میرا ہی کمرہ تھا اور سب کچھ ویسا ہی تھا۔ شیشم کی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل جسے منظور پانے بنایا تھا۔ منظور پا بالکل ان پڑھ اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا شخص تھا ذات کا ترکھان تھا لیکن اس کی اہمیت اتنی تھی کہ بڑے بڑے ملک اور خان اسے ساتھ بٹھاتے تھے اور اس سے کام کرانے کے لیے منہ مانگا معاوضہ دینے

کو تیار رہتے تھے لیکن وہ موڈی آدمی تھا۔ جب دل ہوتا تو کام لیتا ورنہ انکار کر دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی ہاں کو نہ میں نہیں بدل سکتی تھی۔ ایک بار ایک مقامی زمیندار ملک عادل نے اس کے انکار کو اَنا کا مسئلہ بنا لیا اور اپنے آدمیوں سے منظور پا پر تشدد بھی کرایا تھا لیکن اس کا ردِعمل اتنا شدید ہوا تھا کہ ملک عادل نے بعد میں خود منظور پا سے معافی مانگی تھی۔ حالانکہ نہ تشدد کا اس پر اثر ہوا تھا اور نہ ہی اس معافی کا ہوا تھا۔ اصل میں وہ تھوڑا سا مجذوب بھی تھا اور اس کی زبان میں ایسی بات تھی کہ جو کہتا وہ خدا پورا کر دیتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ کسی نے اس سے کام کرانا ہوتا تھا تو پورے ادب و احترام کے ساتھ درخواست کرتا تھا اور ساتھ ہی منظور پا کو خوش کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا اس پر بھی وہ انکار کر دیتا تو کام کرانے کا خواہش مند اسے اپنی بدنصیبی سمجھتا تھا۔

منظور پا کے ہاتھوں میں اللہ نے ایسی کاری گری رکھی تھی کہ وہ ٹیڑھی میڑھی لکڑی سے ایسا فرنیچر تراشتا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں اور مزے کی بات تھی کہ وہ نہ تو کہیں سے ڈیزائن لیتا تھا اور نہ ہی سوچتا تھا کہ چیز کیسی بنانی ہے لیکن جب چیز بنتی تھی تو وہ کوئی شاہکار ہوتا تھا۔ چند معمولی اوزاروں سے منظور پا کام کرتا تھا اور اکیلا ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ مددگار رکھ لیتا تھا جب کام بھاری ہوتا تھا۔ جب وہ کسی کے کام کے لیے راضی ہو جاتا تو اسے دو چیزیں درکار ہوتی تھیں ایک لکڑی اور دوسرا اس لکڑی سے کیا بنایا جانا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں کسی کی معمولی سی مداخلت بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اوزاروں کے علاوہ باقی سارا سامان کام کرانے والے کو مہیا کرنا پڑتا تھا۔

جب بابا نے حویلی کی آرائش کرائی تو انہوں نے نیا فرنیچر بنوانے کا فیصلہ بھی کیا۔ خاص طور سے ہم بھائیوں اور صغراں آپا کے کمروں کا سارا فرنیچر نئے سرے سے بنوانے کا سوچا اور منظور پا سے درخواست کی۔ اس نے انکار کر دیا۔ بابا کو مایوسی ہوئی۔ انہوں نے پھر کوشش کی تھی لیکن حسبِ توقع منظور پا کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ اس لیے بابا نے علاقے میں کام کرنے والے دوسرے کاریگروں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ حویلی میں ایک بہت پرانا شیشم کا درخت تھا۔ شاید سو سال پرانا تھا۔ ایک بار شدید آندھی آئی تو یہ گر پڑا اور پھر اپنی جگہ پڑے پڑے خشک ہو گیا۔ بابا نے اس کی خشک لکڑی نکلوا کر رکھ لی تھی اور اب اسی سے فرنیچر بنوانے کا ارادہ تھا۔

جب مجھے پتا چلا کہ منظور پا نے انکار کر دیا ہے تو مجھے غصہ آیا تھا کیونکہ اس نے میرے اسکول کے ایک ساتھی لڑکے کے گھر میں فرنیچر بنا کر دیا تھا اور وہ فرنیچر مجھے بہت پسند آیا تھا میری خواہش تھی کہ منظور پا ہمارے لیے بھی فرنیچر بنائے۔ جب مجھے اس کے انکار کا پتا چلا تو اگلے روز میں اسکول سے اس کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

منظور پا کا ڈیرہ گاؤں سے ذرا باہر نہر کنارے تھا اور کچی جھونپڑی پر مشتمل تھا۔ حیرت انگیز بات تھی کہ ہر قسم کا فرنیچر بنانے والے منظور پا کی جھونپڑی میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ چٹائی پر سوتا تھا اور اس کی ساری چیزیں تھیلوں اور مٹی کے برتنوں میں رکھی تھیں۔ صندوق تک نہیں تھے اس کی جھونپڑی میں۔ وہ اس وقت بھی اپنی چٹائی پر لیٹا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ منظور پا کی سب سے بڑی تفریح سگریٹ نوشی تھی اور وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ دھوئیں میں اُڑا دیا کرتا تھا۔

''کی اے پتر۔'' اس نے مجھے جھونپڑی کے دروازے پر دیکھ کر کہا۔

''منظور پا میں ایاز ملک کا بیٹا شہباز ملک ہوں۔''

''اچھا جی فیر۔'' وہ لیٹے لیٹے بولا۔ وہ کوئی پچاس برس کا استخوانی بدن کا جھری دار شخص تھا جھریاں صرف اس کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ پورے بدن پر تھیں۔ میں اندر آیا۔

''منظور پا میں چاہتا ہوں تم ہمارا فرنیچر بناؤ۔''

''اوئے کاکے میں تیرے باپ کو نا کر چکا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے باپ کو کی ہے لیکن یہ تو میں کہہ رہا ہوں۔''

وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔'' کاکے تُو مجھے کام دے رہا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے جرأت کر کے کہا۔'' اگر تم کر دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

وہ چند لمحے نظریں جما کر مجھے دیکھتا رہا۔'' کاکے معاوضہ دے گا۔''

''ہاں جو تم مانگو گے۔'' میں نے کہا۔

''منظور پا نے آج تک کسی سے کچھ نہیں مانگا جس نے جو دیا لے لیا تُو بھی جو مرضی ہو دے دینا۔''

میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ منظور پا اتنی آسانی سے مان جائے گا مجھے تو سرے سے امید ہی نہیں تھی۔ منظور پا درست کہہ رہا تھا کہ اس نے آج تک کسی سے معاوضہ نہیں مانگا تھا۔ جو لوگ دیتے چپ کر کے بے نیازی سے لے لیتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ کئی مہینے تک کام کرا کے کسی نے اسے چند سو پکڑا دیئے تو اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور کسی نے ایک مہینے کے کام کے اسے ہزاروں دے دیئے تو اس نے بنا کسی شکریے کے جیب میں رکھ لیے۔ میں نے اس سے کہا۔

''چلو ابھی چلو۔''

''چلتا تو ہوں لیکن بتا دوں جو دینا ہے تُو نے دینا ہے تیرے باپ سے کچھ نہیں لینا اس سے لے کر دے گا تب بھی نہیں لوں گا۔''

میرا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔'' پر چاچا میں کہاں سے دوں گا ابھی تو میں کما تا نہیں ہوں۔''

''اس کی فکر نہ کر تُو جو دے گا لے لوں گا لیکن دینا تو اپنے پاس سے ہے۔''

میں دس سال کا تھا اور اتنی عمر میں کہاں سے کما سکتا تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ بعد میں حل کیا جا سکتا تھا اس لیے میں نے ہامی بھر لی اور اسے حویلی لے آیا۔ بابا اور دوسروں کو پتا چلا تو وہ حیران رہ گئے۔ بابا نے کہا۔'' منظور پا تُو نے مجھے تو صاف انکار کر دیا تھا اور میرے بیٹے کی مان گیا۔''

منظور پا نے چٹکی سی راکھ جھاڑی اور ایک کش لے کر بولا۔'' ملک صاحب بندے بندے کی بات ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے لیے اندر سے ناں نکلتی ہے تو ناں کر دیتا ہوں اور بعض کے لیے ہاں نکلتی ہے تو ہاں کہہ دیتا ہوں۔''

بابا کے لیے یہی کافی تھا کہ منظور پا مان گیا تھا اس لیے انہوں نے زیادہ بحث نہیں کی ورنہ کوئی ان کے سامنے ان کی اولاد کو زیادہ اہمیت دے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے۔ منظور پا نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کام ان

کے لیے نہیں میرے لیے کر رہا ہے اس لیے وہ اس سے کچھ نہیں سکتے ہیں۔ اس کی یہ بات بھی مان لی گئی اور اس نے فرنیچر بنانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس نے صغراں آپا کے کمرے کا فرنیچر بنانا شروع کیا۔ تین مہینے میں اس نے پورے گھر کا فرنیچر بنا دیا تھا اور جب اس نے کام مکمل کر لیا اور میں نے اپنی ساری جمع پونجی نکالی تو وہ کل سترہ روپے اور آٹھ آنے تھی۔ اس وقت مجھے روزانہ کی جیب خرچی ایک روپیہ ملتی تھی اور میں اس میں سے کبھی پچیس پیسے اور کبھی پچاس پیسے بچا کر اپنے مٹی کے گلے میں ڈال دیتا تھا۔ اس وقت بابا کا خیال تھا کہ معاوضہ وہی دیں گے۔ اس لیے جب انہوں نے ایک لفافے میں منظور پا کو معاوضہ دینا چاہا تو اس نے بے نیازی سے لفافہ واپس کر دیا۔

''ملک صاحب میں نے آپ کا کام نہیں کیا ہے تو معاوضہ آپ سے کیوں لوں؟''

''تو کس کا کام کیا ہے؟''

''کاکے شہباز کا وہی معاوضہ دے گا۔''

بابا ہنسے وہ اسے مذاق سمجھ رہے تھے۔ ''یہ کہاں سے دے گا؟''

''جہاں سے بھی دے اور جتنا بھی دے بس اسی سے لینا ہے۔''

بابا نے مجھے بلا لیا۔ ''شہباز پتر یہ تجھ سے معاوضہ مانگ رہا ہے۔'' وہ اب بھی مذاق کے موڈ میں تھے لیکن جب میں نے ساڑھے سترہ روپے نکال کر منظور پا کو دیئے تو اس نے جیب میں ڈالے اور کھڑا ہو گیا۔

''اچھا جی سلاماں لیکم۔''

اس سے پہلے بابا یا کوئی اسے روکتا وہ جا چکا تھا تین مہینے کی صبح شام محنت کا معاوضہ صرف ساڑھے سترہ روپے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ بعد میں بابا نے اسے رقم دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور اس کا یہ انکار کبھی اقرار میں نہیں بدلا تھا۔ الماری اور ڈریسنگ ٹیبل دیکھ کر مجھے یہ سب یاد آ گیا۔ یہ دونوں چیزیں آج بھی اس طرح چمک رہی تھیں جیسے آج ہی بنی ہوں۔ ان کے ساتھ میرا بیڈ، ایک رائٹنگ ٹیبل اور اس کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک کتابوں کا ریک بھی بنا تھا میں نے سر گھما کر کتابوں کے ریک طرف دیکھنا چاہا تو میری نظر کرسی پر لیٹی اور بے خبر سوتی ایک نوجوان لڑکی پر گئی۔ میں کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ صغراں آپا پھر سے کمسن ہو گئی ہوں اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں شمی کو دیکھ رہا تھا۔ پانچ چھ سال میں وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ جب میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا تو وہ بارہ تیرہ سال کی شوخ و شنگ بچی تھی جو پوری حویلی میں دوڑتی اور شور کرتی پھرتی تھی۔ اس وقت وہ بہت دبلی سی اور چھوٹی سی تھی۔ گاؤں کی عام لڑکیوں کے برعکس اس پر بارہ تیرہ سال کی عمر میں نوجوانی نہیں آئی تھی۔ وہ اس وقت بھی بچی لگتی تھی لیکن اب اس کا روپ بدل گیا تھا۔ قد ماشاءاللہ اچھا نکلا تھا اور جسامت بھی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ دوپٹہ لیے سو رہی تھی اور ظاہر ہے وہ کب سے میرے پاس بیٹھی تھی تب ہی تھک کر سو گئی تھی۔

اس کا مطلب ہے میں حویلی میں تھا لیکن یہاں تک کیسے آیا مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ یہ کام شاید میرے دوستوں کا تھا یا شاید فتح خان جیسے دشمنوں کا۔ میں نے سرہانے رکھے جگ سے گلاس میں پانی نکال کر پیا۔ میرے خشک گلے کو تری مل گئی تھی۔ میں نے شمی کو جگانے کا سوچا لیکن میری ہمت نہیں ہوئی میں اس وقت کو ٹالنا

چاہتا تھا جب فتح خان کی بدخبری کی تصدیق ہو جاتی۔ اس وقت میری خواہش تھی کہ کاش یہ خبر ہمیشہ خبر ہی رہے اور کبھی اس کی تصدیق نہ ہو۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ کمرے سے باہر بالکل سناٹا تھا جس میں کبھی کبھی واہمے نما سرسری سی آوازیں آتی تھیں جن کے بارے میں آدمی کو شبہ ہوتا ہے کہ یہ آوازیں سچ ہیں یا اس کا وہم ہیں۔ میرا جسم بالکل سن ہو رہا تھا ممکن ہے یہ کسی درد کش انجکشن کا اثر ہو یا اس اطلاع کا جو مجھے فتح خان نے دی تھی۔ میں ساکت لیٹا تھا کہ دروازے کی طرف سے آہٹ ہوئی میں نے سر گھما کر دیکھا۔

وہ سویرا تھی چوکھٹ سے ٹکی ہوئی ستے ہوئے چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، سفید مخصوص لباس میں جو ہمارے ہاں عورت کو اس کے شوہر کے مرنے پر پہنا دیا جاتا ہے۔ وہ کمزور لگ رہی تھی۔ اس کے کھلے لمبے بال دوپٹے سے بغاوت کر کے اس کی کمر سے نیچے آ رہے تھے۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے شمی کے ملنے کی آواز آئی میں نے اس کی طرف دیکھا وہ جاگ رہی تھی اور میں نے پھر دروازے کی طرف دیکھا تو چوکھٹ خالی تھی۔ شمی جاگ گئی تھی اس نے مجھے بیدار دیکھا تو بے تابی سے میری طرف آئی۔

''شیبی۔''

میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ سویرا کی حالت اور شمی کا رونا دیکھ کر میرا رہا سہا شک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کب میں بھی رونے لگا۔ شمی نے روتے ہوئے کہا۔ ''شاہد ماموں......''

''بس اب کچھ نہیں کہنا۔'' میں مارے وحشت کے اٹھ بیٹھا۔ شمی میرے شانے سے سر ٹکائے دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ اس کی دھاڑیں سن کر صغراں آپا، ماں جی اور شجاع بھائی کی بیوی عائشہ بھابی آ گئیں تھیں۔ وہ سب ہی مجھ سے چمٹ گئی تھیں اور کمرہ آہ و بکا سے گونج اٹھا تھا خاص طور سے ماں جی کی حالت خراب تھی۔ وہ بے ہوش ہونے لگیں تو میں نے جلدی سے ان کو پانی پلایا۔ شاہد بھائی کی وفات نے جیسے ان کو نچوڑ دیا تھا۔ صغراں آپا جب بیوہ ہو کر آئیں تو ان کی آنکھیں اکثر نم اور سوجی رہتی تھیں پھر رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے غم پر قابو پا لیا تھا۔ مگر آج پھر ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھی۔ عائشہ بھابی بھی غمگین تھیں لیکن انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ درحقیقت اس کڑے وقت میں انہوں نے ہی سب کو سنبھالا تھا۔ وہ میرے ماموں کی بیٹی تھیں۔ اور سسرال میں ان کا رویہ مثالی تھا۔ بڑی بہو ہونے کے ناطے انہوں نے از خود بہت ساری ذمے داریاں اپنے شانوں پر لے لی تھیں۔ شادی کے بعد وہ شجاع بھائی کے ساتھ چلی گئی تھیں لیکن تب بھی وہ سال میں چار پانچ مہینے حویلی میں گزارتی تھیں اور انہوں نے شادی کے بعد کچھ عرصے میں سب کو اپنا اتنا عادی بنا لیا تھا کہ جب وہ حویلی میں نہ ہوتیں تو سب کو حویلی سنسان لگتی تھی۔

پانی پی کر ماں جی کی حالت ذرا سنبھلی تو انہوں بھرائی آواز میں کہا۔ ''شہباز تُو کہاں چلا گیا تھا۔''

''میں نے کہاں جانا تھا ماں جی یہیں تھا۔'' میں نے سر اس کی آغوش میں رکھ دیا۔ جو دنیا میں میری سب سے بڑی جائے پناہ تھی۔ ''میں دور ہو کر بھی آپ کے پاس تھا۔''

''لیکن شاہد......تو چلا گیا...... ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر۔'' ماں جی پھر رونے لگیں۔ اور سب ان کو سنبھالنے لگے۔ صغراں آپا اب رونے کے بجائے بار بار مجھے پیار کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔

''بس اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔''

کمرے میں سب آ گئے تھے سوائے بابا، شجاع بھائی اور سویرا کے۔ آنے والوں میں دو لڑکے بھی تھے ایک چار سال کا اور دوسرا شاید دو سال کا تھا۔ چھوٹا والا عائشہ بھابی کے پہلو سے لگ کر کھڑا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ ''یہ دونوں......؟''

''شجاع کے بیٹے ہیں۔'' صغراں آپا نے بالترتیب بڑے اور چھوٹے کا تعارف کرایا۔ ''یہ شعیب ہے اور یہ شبیر۔''

میں نے ان کو پاس بلایا تو وہ جھجک کر چلے آئے اور پھر میرے سینے سے لگ گئے تھے۔ دونوں بہت پیارے سے اور شرمائے ہوئے تھے ماں کے کہنے پر انہوں نے بڑی مشکل سے سلام کیا۔ شجاع بھائی بابا پر گئے تھے ذرا کھردرے نقوش اور ہلکا سانولا رنگ لیکن دونوں بیٹے بھابی پر گئے تھے جس کے نقوش صبیح اور رنگ گلابی تھا۔ میں ان کی طرف دیکھا۔ ''شکر ہے میرے بھتیجے آپ پر گئے ہیں۔''

بھابی شرما گئیں۔ ''سب یہی کہتے ہیں۔''

''اور شمی کتنی بڑی ہو گئی ہے۔'' میں نے شمی کی طرف دیکھا۔

''آپ نے دیکھا بھی تو کتنے عرصے بعد ہے۔'' شمی بولی۔ ''آپ مجھے بہت یاد آتے تھے۔''

''بس تم یاد کرتی تھیں اور کوئی یاد نہیں کرتا۔'' میں نے بے خیالی میں کہا میرا ذہن سویرا کی طرف چلا گیا تھا۔

''نہیں تو سب یاد کرتے تھے۔ نانی، امی، ماموں اور سب۔'' شمی نے جواب دیا۔

''بابا، شجاع بھائی کہاں ہیں؟''

''وہ قبرستان گئے ہیں۔'' صغراں آپا بھرائی آواز میں بولیں تو ماں جی اور عائشہ بھابی کے ضبط کے بندھن پھر ٹوٹ گئے تھے اور اس بار شمی اور بچے بھی رونے لگے تھے۔ شاید میں بھی رو رہا تھا۔ اس رونے دھونے کا اثر یہ ہوا کہ میرے اندر کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اب میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ شاہد بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا لیکن میں ان میں کسی کے سامنے یہ بات نہیں پوچھ سکتا تھا۔ ماں جی نے ہمت کر کے خود کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ وہ اپنے بچوں سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھیں۔ ان کی سب سے واضح محبت شجاع بھائی کے لیے تھی لیکن شاہد بھائی بھی ان کے کم لاڈلے نہیں تھے۔ دراصل ماں جی ایک ایسی ماں تھیں جن کے سامنے ان کا جو بچہ ہوتا وہ اس پہ صدقے واری جاتی تھیں اور بچہ سمجھتا کہ وہ اسے ہی سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ میں باہر جانے کے لیے اٹھا تو ماں جی نے مجھے پکڑ لیا اور بے قراری سے بولیں۔

''شہباز کہاں جا رہا ہے؟''

''ماں جی میں یہیں ہوں۔'' میں نے ان سے کہا۔ ''حویلی میں ہی رہوں گا ذرا دیکھوں بابا آ گئے ہیں یا نہیں۔''

ماں جی اور باقی وہیں رہ گئے تھے لیکن شمی سمجھ گئی کہ میں کس لیے باہر جا رہا ہوں۔ ویسے بھی وہ جوان اور سمجھدار ہو گئی تھی۔ وہ میرے پیچھے آئی۔ ''شیبی آپ سویرا مامی سے ملنا چاہتے ہیں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا

''ہاں وہ کہاں ہے؟''

''اپنے کمرے میں ہیں۔'' شمی نے بتایا۔ ''شاہد ماموں والا کمرہ ہے۔''

میں سمجھ گیا تھا میں شاہد بھائی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ بند تھا میں نے دستک دی تو اندر سے سویرا کی آواز آئی۔ ''آجائیں۔''

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ چادر اوڑھے بستر پر دوزانوں بیٹھی تھی۔ اس نے گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ گویا وہ جانتی تھی کہ میں تھا۔ میں تذبذب کھڑا تھا کہ اسے کیا کہوں۔ رشتے میں وہ میری بھابی تھی اگر چہ اب یہ رشتہ نہیں تھا لیکن ہمارے معاشرے میں ایسے رشتے آدمی کے جینے مرنے سے مشروط نہیں ہوتے ہیں۔ بھابی بھائی کے مرنے کے بعد بھابی ہوتی ہے لیکن سویرا سے میرا ایک تعلق اور بھی تھا۔ میں اس کا نام لینا چاہتا تھا اور میرے منہ سے یہ نام نکل نہیں رہا تھا۔ سویرا خاموش بیٹھی تھی۔

آخر میں ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''سویرا...... مجھے شاہد بھائی کا بہت دکھ ہے۔''

وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں بے قرار ہو گیا۔ ''پلیز سویرا، مت۔''

''میں...... ایک بار...... پھر...... اجڑ گئی۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ ''میرے...... نصیب میں...... سوائے...... آنسوؤں کے...... اور کیا ہے؟''

''میں جانتا ہوں یہ دکھ بہت بڑا ہے میں نے بھائی کھویا ہے لیکن تم نے جیون ساتھی کھو دیا ہے پر اب سوائے صبر کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔''

وہ خود پر قابو پانے لگی۔ شادی کے پانچ سال بعد بھی اس کا جسم ویسا ہی چھریرہ سا تھا۔ وہ سسکی لیتی تو پوری لرز جاتی تھی۔ اس نے آنسو صاف کیے اور پہلی بار میری طرف دیکھا۔ ''آپ دوبارہ نہیں آئے، شاہد اور سب آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن بابا کے ڈر سے کوئی میرا نام بھی نہیں لیتا ہوگا۔''

''ایسا نہیں ہے وہ بھی آپ کو یاد کرتے تھے بس سب کے سامنے ذکر نہیں کرتے تھے۔''

میں بابا کی فطرت سے واقف تھا وہ بلا کے ضدی اور اَنا پرست تھے۔ میں نے ہچکچا کر کہا۔ ''کیا شاہد بھائی کو علم تھا کہ ہم ایک دوسرے کو......'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''نہیں کم سے کم شادی کے وقت ان کو علم نہیں تھا لیکن بعد میں مجھے کبھی کبھی شبہ ہوتا کہ وہ جان گئے تھے۔'' سویرا نے آہستہ سے کہا۔

''شبہے کی وجہ؟''

''بس ان کا رویہ بعض اوقات عجیب سا ہو جاتا تھا مجھے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن وہ بہت چپ ہو جاتے تھے۔''

''شاید وہ اسے خود پر بوجھ سمجھتے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''شاہد بھائی ایسے ہی انسان تھے وہ اپنے اندر کی بات بہت کم ہی کسی سے شیئر کرتے تھے۔''

''تم دونوں کے تعلقات ٹھیک تھے؟''

''نارمل تھے جیسے عام میاں بیوی کے ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن خدا گواہ ہے شادی کے بعد میں نے ان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھا تھا اور باقی سب بھول گئی تھی۔''

''میں...... شاید ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اب حویلی کا رخ نہ کروں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن سویرا خدا گواہ ہے میں نے ہمیشہ تمہارے اور شاہد بھائی کی خوشیوں کے لیے دعا کی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' سویرا نے کہا۔

میں نے سوچا کہ شاہد بھائی کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں اس سے پوچھوں لیکن پھر یہ مناسب نہیں لگا تھا۔ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔ ''میں حویلی کیسے آیا؟''

''مجھے نہیں معلوم شاید کوئی کال آئی تھی شجاع بھائی جا کر آپ کو کہیں سے لائے تھے۔ یہ آج صبح کی بات ہے۔''

میں فتح خان کے پاس گزشتہ شام تھا گویا رات ہی میں مجھے حویلی پہنچا دیا گیا تھا اور اب اگلے دن کی شام ہو رہی تھی۔ سویرا عدت میں تھی اور حویلی کا فرد ہونے کے باوجود میرا زیادہ دیر اس کے کمرے میں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

وہ بے قرار ہو گئی۔ ''کہاں...... کیا حویلی سے جا رہے ہیں؟''

''نہیں فی الحال تو نہیں ابھی بابا کا موڈ دیکھوں گا۔ ویسے تم لوگوں کو پتا تو ہوگا کہ میرے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے اور میں پولیس کو مطلوب ہوں؟''

''ہاں معلوم ہے کچھ لوگ آپ کے دشمن بن گئے ہیں۔ ایک بار وہ لوگ حویلی آئے تھے بابا اور شاہد سے ملے تھے۔''

''کون تھے؟''

''ان میں ایک مرشد علی نامی آدمی بھی تھا اس نے بڑا عجیب سا لباس پہن رکھا تھا۔''

میں حیران ہوا مرشد علی یہاں آیا تھا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''شاید دو مہینے ہو گئے ہیں۔''

''اس کی بابا سے کیا بات ہوئی تھی؟''

''پتا نہیں...... میں نے شاہد سے بھی پوچھا تھا لیکن وہ ٹال گئے۔''

مرشد علی حویلی تک آ گیا تھا۔ اس اطلاع کے بعد شاہد بھائی کی موت مجھے مشکوک لگنے لگی تھی۔ میں کمرے سے باہر آیا تو شمی میری منتظر تھی۔ میں نے اس سے شجاع بھائی اور بابا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''ابھی نہیں آئے ہیں۔''

''میرے بارے میں حویلی والوں کے علاوہ کوئی جانتا ہے کہ میں یہاں ہوں؟''

''نہیں میرا خیال ہے کوئی نہیں جانتا ہے کیونکہ شجاع ماموں نے سختی سے کہا ہے آپ کی یہاں موجودگی کے بارے میں باہر کے کسی فرد سے ایک لفظ نہیں کہنا ہے۔ شجاع ماموں آپ کو دکھانے کے لیے ڈاکٹر بھی کہیں دور سے لائے تھے اور ابھی جاتے ہوئے کہہ کر گئے ہیں کہ آپ کو باہر نکلنے سے منع کیا جائے۔'' شمی نے پوری

رپورٹ دی اور بولی۔ ''شیبی آپ ایسا کریں نہالیں میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔''
شمی نے کہا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے بھوک لگی تھی لیکن حالات نے مجھے اس کی طرف توجہ دینے نہیں دی تھی۔ میں کمرے میں آیا تو بھابی اور صغراں آپا جا چکی تھیں۔ ماں جی بستر پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔
''شہباز اپنے بھائی کے لیے دعا نہیں کرے گا۔'' ماں جی نے کہا تو میں شرمندہ ہو گیا۔ میں بھائی کا سوگ منا رہا تھا اور اب تک اللہ سے اس کی مغفرت کی دعا نہیں مانگی تھی۔ میں ماں جی کے پاس دو زانوں بیٹھ کر شاہد بھائی کے لیے دعا کرنے لگا۔ جب تک میں نے دعا مانگی شمی نے میرے کپڑے نکال دیئے تھے۔
''شیبی آپ نہانے جائیں۔''
شمی کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی وہ صرف جسمانی طور نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی بڑی ہو گئی تھی اسے ذمے داریاں نبھانا آ گئی تھیں۔ میں نے اس کے بال بکھیرے۔ ''شمی لگتا نہیں ہے تو وہی والی شمی ہے۔''
میں بچپن میں اس کے بال بکھیر دیتا تھا اور وہ بہت شور مچاتی تھی کوئی اس کے بالوں کو چھیڑے اسے بالکل گوارا نہیں تھا۔ ابھی بھی اسے پسند نہیں تھا اس نے منہ بنایا۔ ''آپ بالکل نہیں بدلے۔''
کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ حویلی کا ایک فرد کم ہو گیا تھا اور ایک فرد آ گیا تھا۔ آنے والی کی کمی پوری ہونے والی نہیں تھی اور جانے والے کی کمی بھی پوری نہیں ہوتی۔ میرا سر پھٹا نہیں تھا اس لیے نہانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نہا کر اور کپڑے بدل کر آیا۔ یہ میرا ایک پرانا شلوار سوٹ تھا جو اب تک اس طرح سنبھال کر رکھا تھا کہ نیا ہی لگ رہا تھا۔ صرف کپڑے ہی نہیں میرے کمرے کی ایک ایک چیز اُسی طرح سلیقے اور طریقے سے صاف ستھری حالت میں موجود تھی۔ شمی ٹرے میں کھانا لے آئی تھی۔ ساتھ میں پانی کا جگ اور گلاس بھی تھا۔
''میرے کمرے کی دیکھ بھال کون کرتا رہا ہے؟''
''سویرا مامی۔''
میں کھاتے کھاتے رک گیا۔ ''لیکن یہاں کی حالت سے تو لگ رہا ہے کہ شاید اس کمرے کی دن میں دو بار صفائی کی جاتی تھی۔''
شمی نے کن انکھیوں سے ماں جی کی طرف دیکھا جو سورہ یٰسین پڑھ رہی تھیں اور آہستہ سے بولی۔ ''سویرا مامی روز کئی کئی گھنٹے یہاں رہتی تھیں۔''
میرے جانے کے بعد بھی سویرا نے میرے کمرے کو غیر آباد رہنے نہیں دیا تھا۔ مجھے ایک خیال آیا۔ ''وہ شاہد بھائی کے ساتھ پوسٹنگ والی جگہ نہیں رہتی تھی۔''
''نہیں شادی کے بعد وہ ایک بار بھی ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ شاہد ماموں حویلی آتے تھے۔''
یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ سویرا ایک بار بھی شاہد بھائی کے ساتھ رہنے نہیں گئی تھی اور وہی حویلی آتے تھے۔ اگلا سوال کرتے ہوئے میں جھجک گیا۔ ''شاہد بھائی کی ......کوئی اولاد؟''
''نہیں قدرت نے ان کو اولاد نہیں دی۔'' شمی نے افسردگی سے کہا۔ ''سویرا مامی کو اولاد کی بہت خواہش تھی۔''

میں نے سرد آہ بھری۔ ''بعض لوگوں کے نصیب میں خوشیاں کم ہوتی ہیں۔''

شمی خاموش ہوگئی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''شیبی آپ واپس نہیں جائیں گے نا؟''

''ابھی سے کیا کہہ سکتا ہوں گڑیا۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ میں نے سچ کہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس حویلی میں میرا کیا مقام تھا میں خود نہیں آیا تھا بلکہ مجھے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ مجھے پہنچانے والے کون تھے اور ان کے عزائم کیا تھے میں اس سے بالکل بے خبر تھا۔ پھر میں پولیس کو مطلوب مجرم تھا اور اگر پولیس کو یہاں میری موجودگی کا پتا چل جاتا تو وہ مجھے گرفتار کرنے آجاتی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا۔ یہ مشکل ہی تھا کہ میں کسی جگہ ٹک کر بیٹھ سکوں۔ میرے دشمن جس طرح میرے ملک میں آتے ہی میرے خلاف سرگرم عمل ہو گئے تھے اس سے صاف ظاہر تھا وہ مجھے چین سے بیٹھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں نے کھانا کھا لیا تو شمی برتن اٹھا کر لے جانے لگی۔ اس نے پوچھا۔

''آپ کے لیے چائے یا کچھ اور لاؤں۔''

''چائے لے آؤ۔'' میں نے کہا۔ ماں جی بدستور سورہ یٰسین پڑھنے میں مصروف تھیں۔ میں لیٹ کر ان کو دیکھنے لگا۔ یہ چہرہ مجھے پورے پانچ سال بعد دیکھنے کو ملا تھا۔ ایک بار سورہ مکمل کر کے انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر جھک کر میرا ماتھا چوم لیا۔

''شہباز تجھے ماں کی یاد بھی نہیں آئی؟''

''کیوں نہیں آئی ماں جی۔ میں کیا بتاؤں آپ اور سب کے لیے کتنا تڑپتا تھا لیکن آ نہیں سکتا تھا۔''

''آ نہیں سکتا تھا لیکن خیریت کی اطلاع تو دے سکتا تھا۔''

''وہ تو میں ہر ہفتے شجاع بھائی کو کال کرتا تھا۔''

''مجھے تو نہیں کی نا...... صرف تیری خاطر حویلی میں فون لگوایا۔ جب اس کی گھنٹی بجتی تو مجھے لگتا کہ تیرا فون ہے۔''

میں عرقِ ندامت میں غرق ہونے لگا تھا۔ شجاع بھائی نے مجھے حویلی کا نمبر دیا تھا اور میں نے کئی بار کال کرنے کا سوچا بھی تھا لیکن پھر میری ہمت جواب دے جاتی تھی اور میں تین سال میں ایک بار بھی فون نہیں کر سکا تھا۔ فون کی تار کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے سے ہمارے گھر تک آ رہی تھی۔ ملکوال میں آج بھی گیس نہیں آئی تھی اور فون بھی بہت مشکل سے لگتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''ماں جی کیا کہوں سوائے اس کے کہ میں ہوں ہی نا خلف۔''

''نہیں تُو میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔'' ماں جی نے پھر ماتھا چوم لیا۔ ''میں تو تجھے بتا رہی تھی کہ تیرا کتنی بے تابی سے انتظار کیا ہے۔ میں نے ہی نہیں سب نے۔''

''میں جانتا ہوں ماں جی لیکن بدقسمتی کے ساتھ کچھ مجبوریاں بھی تھیں۔''

''میرے بچے تُو کن چکروں میں پھنس گیا ہے۔ چھوڑ ان کو۔''

''ماں جی میں تو چکروں کو چھوڑتا ہوں لیکن چکر مجھے نہیں چھوڑتے ہیں میرے دشمن بن جانے والے لوگ بہت طاقتور اور فرعون ذہنیت رکھتے ہیں۔''

''اللہ نے ہر فرعون کے لیے موسیٰ اتارا ہے۔ اللہ نے چاہا تو دشمن نامراد رہے گا۔''

''ماں جی آپ میرے لیے دُعا کریں۔'' میں نے کہا۔ ''جو کام دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی وہ ماں کی دعا کر دیتی ہے۔''

''میں تیرے لیے ہر وقت دعا کرتی ہوں میری کوئی نماز تیرے لیے دعا سے خالی نہیں جاتی ہے۔''

''یہی وجہ ہے کہ دشمن بہت زبردست ہونے کے باوجود میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا ہے۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''شہباز اگر تُو راستی اور حق پر ہے تو کوئی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔''

شمی چائے لے آئی۔ اس نے کپ مجھے تھما کر کہا۔ ''نانا اور ماموں آ گئے ہیں۔''

بابا آ گئے ہیں۔'' میں کپ رکھ کر اٹھ گیا۔ ''پہلے ان سے مل لوں۔''

میں حویلی کے مردانے کی طرف آیا۔ بابا وہیں ہوتے تھے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو بابا وہاں نہیں تھے۔ صرف شجاع بھائی تھے۔ میں ان کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا اور پھر ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگا۔ ابھی تک مجھے غم منانے کے لیے کوئی شانہ نہیں ملا تھا۔ ماں جی، صغراں آپا، بھابی اور سویرا تو خود کمزور تھیں مجھے کیا سہارا دیتیں۔ شجاع بھائی مجھ سے بڑے اور میرا سہارا تھے۔ اس لیے میں کمزور پڑ گیا۔ وہ مجھے سینے سے لگائے تھپکتے رہے اور رفتہ رفتہ میری سسکیاں رک گئیں۔ شجاع بھائی بھی غم سے نڈھال تھے۔ شاہد بھائی کی حویلی میں اگر کسی سے بے تکلفی تھی تو وہ شجاع بھائی تھے۔ ان کا غم بھی اس لحاظ سے سوا تھا۔ ان سے الگ ہو کر مجھے بابا کا خیال آیا۔

''شجاع بھائی بابا کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' وہ بولے۔

''میں ان سے وہیں مل لیتا ہوں۔''

''شہباز۔'' شجاع بھائی کسی قدر تذبذب کے ساتھ بولے۔ ''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا انہیں؟'' میں بے قرار ہو گیا تھا۔ ''میں دیکھتا ہوں جا کر۔''

انہوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ ''شہباز ابھی وہ کسی سے نہیں مل سکتے ہیں۔ ان کو آرام کی ضرورت ہے۔''

میں کچھ دیر ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر میں نے کہا۔ ''کسی یا صرف مجھ سے نہیں ملنا چاہتے ہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''ایسی ہی بات ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''بابا آج بھی میری صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔''

''شہباز تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' شجاع بھائی نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نہیں جانتے یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔''

''میں واقعی نہیں جانتا۔ ابھی چند دن پہلے میں ملک سے باہر تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولے۔ ''تمہارے بارے میں ایک فائل بن چکی ہے۔ اس میں بیرون ملک کے

تمہارے سارے کارنامے درج ہیں۔''

''آپ لوگ بہت کچھ جانتے ہیں۔''

شجاع بھائی نے سر ہلایا۔''نہ صرف بیرون ملک بلکہ اندرون ملک بھی تمہارے بارے میں فائل میں بہت کچھ درج ہے۔''

''تب آپ جانتے ہیں میں بے گناہ ہوں۔''

''اس کے لیے مجھے کسی فائل کی ضرورت نہیں ہے۔''شجاع بھائی نے سگار سلگایا۔''تم میرے بھائی ہو اور میں تم کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن اصل مسئلہ قانون کا ہے۔''

''قانون کے رکھوالوں نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔''میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔''کیونکہ وہ مرشد جیسے کرپٹ سیاستدانوں کے غلام ہیں۔''

شجاع بھائی فکر مند تھے۔''تمہاری غیر موجودگی میں ہم کوشش کر رہے تھے کہ قانونی مسائل کا حل نکل آئے اس صورت میں مرشد سے بات کرنا آسان ہوتا لیکن اس کے لیے ضروری ہے پہلے تم عدالت کے سامنے پیش ہوتے۔''

''میں گرفتاری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''میں نے بایاں ہاتھ آگے کیا۔''ایک بار پکڑے جانے پر انہوں نے مجھے اس ہاتھ سے تقریباً محروم کر دیا تھا وہ خدا کو اسے بچانا منظور تھا ورنہ ڈاکٹر اسے کاٹنے کی تیاری بھی کر چکے تھے۔اب میں ان کے ہاتھ آتا ہوں تو وہ پہلے تو اپنا حساب برابر کریں گے اور اس کام میں پولیس ان کی مددگار ہوگی۔''

''مرشد علی کچھ عرصے پہلے یہاں آیا تھا۔اس وقت میں جرمنی میں تھا بابا اور شاہد سے ملاقات ہوئی تھی۔''

میرا دل دھڑک اٹھا مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ مرشد یہاں حویلی میں آیا تھا لیکن میں نے ظاہر نہیں کیا۔''کیوں آیا تھا وہ؟''

شجاع بھائی نے بجھ جانے والا سگار پھر سلگایا۔''وہ صلح کی بات کرنے آیا تھا لیکن اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ تم خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔''

''اس کا اصل مقصد یہی ہے کہ میں کسی طرح ایک بار پولیس کی تحویل میں آجاؤں جہاں وہ اپنے زر خریدوں کی مدد سے مجھے اپنی مرضی کے سلوک کا نشانہ بنا سکے۔''

''شاہد نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔''شجاع بھائی بولے۔''اس پر اس کی مرشد سے تلخ کلامی ہوئی تھی اور مرشد نے اسے بھی دھمکیاں دی تھیں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے سوال کیا۔''شاہد بھائی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''وہ ان دنوں کوہاٹ میں تھا۔ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر آنے کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن وہ گھر نہیں پہنچا۔ پولیس کو اس کی باڈی سڑک کے ساتھ اس کی کار میں ملی تھی۔ بظاہر رہزنی کی واردات لگ رہی تھی۔''

''پولیس کا کیا کہنا ہے؟''

''اس نے نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف رپورٹ درج کی ہے کیونکہ شاہد کے پاس سے اس کا بٹوہ، گھڑی

اور موبائل غائب تھا۔"

"نامعلوم ڈاکو۔" میں نے تلخی سے سوچا۔"اس کیس کی تفتیش کو ہاٹ پولیس کر رہی ہے؟"

"بالکل واردات ان کے علاقے میں ہوئی تھی۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔"شجاع بھائی آپ نے سوچا کہ یہ کام مرشد کا ہوسکتا ہے۔"

انہوں نے سر ہلایا۔"امکانات پر غور کیا ہے۔ میں نے براہِ راست تو نہیں لیکن ایک رپورٹ الگ سے کرائی ہے کہ ان دنوں کچھ لوگ ہمارے خاندان کے دشمن ہو رہے ہیں اور یہ کارروائی ان کی ہوسکتی ہے۔ رپورٹ کے ساتھ تمہارے وکیل ندیم کی جانب سے فراہم کردہ دستاویزات بھی لگائی ہیں۔"

"اس کا فائدہ؟"

"بہ ظاہر تو نہیں ہے لیکن ان لوگوں پر دباؤ بڑھانے کے کام آئے گی۔"

"یہ لوگ سرے سے قانون کو مانتے ہی نہیں ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے شہباز قانون کی چکی سُست ضرور چلتی ہے لیکن ایک بار کوئی اس کی گرفت میں آجائے تو اس کی گلوخلاصی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"پتا نہیں بھائی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔"میں نے تو ان لوگوں کو ہر غیر قانونی کام کر کے صفائی سے بچتے دیکھا ہے۔"

"اتنی مایوسی ٹھیک نہیں ہے انصاف مشکل سے ملتا ہے لیکن ملتا ضرور ہے۔ اس پر میرا ایمان ہے بشرطیکہ آدمی ہمت نہ ہارے۔"

"میں یہاں تک کیسے پہنچا؟"

"تمہارے بارے میں ایک فون کال سے اطلاع آئی تھی۔ تم ملک وال سے کچھ دور ایک سڑک کے کنارے موجود ہو۔ میں اور بابا فوراً روانہ ہوئے اور تم بیچ بچ ہمیں سڑک کے کنارے بے ہوش مل گئے تھے۔ ہم بروقت پہنچے ورنہ وہاں جمع ہونے والے لوگ تمہیں اسپتال لے جانے والے تھے۔"

"فون کہاں سے آیا تھا؟"

"حویلی کے فون پر ایک نزدیکی پی سی او سے کال کی گئی تھی لیکن پی سی او والا کال کرنے والے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔"

میں نے سر ہلایا۔"میں جس شخص کے قبضے میں تھا اس نے کچا کام نہیں کیا ہے۔"

شجاع بھائی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے ان کو فتح خان کے بارے میں بتایا۔"وہ انتہائی شاطر آدمی ہے۔"

"اس کے بارے میں سنا ہے۔ یہ اونچے درجے کا جرائم پیشہ ہے اور سیاسی لوگوں کے لیے کام کرتا ہے۔"

"یہ مرشد اور ایک غیر ملکی ڈیوڈ شا کے لیے کام کرتا رہا ہے لیکن اب اس کا دعویٰ ہے کہ اب وہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ اس نے یہی کہنے کے لیے مجھے اٹھایا تھا اور غالباً اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے مجھے حویلی تک پہنچوا دیا لیکن مجھے اس کی بات کا ایک فی صد بھی یقین نہیں ہے اس میں بھی ضرور اس کی کوئی چال ہوگی۔"

''ممکن ہے وہ اس طرح تمہیں یہاں سے گرفتار کرانا چاہتا ہو۔'' شجاع بھائی نے کہا۔ ''لیکن پولیس نے کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی تو مجھے اطلاع ہو جائے گی۔''

میں ہچکچایا۔ ''پھر بھی میرا حویلی میں موجود ہونا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ میں ایک مطلوب مجرم ہوں اور یہاں پولیس ریڈ کی صورت میں بدنامی ہوگی۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے لیکن بابا چاہتے ہیں کہ تم فی الحال حویلی میں رکو۔''

''اور وہ خود مجھ سے ملنا نہیں چاہتے ہیں۔''

''میں نے کہا نا اس معاملے میں کچھ مسائل ہیں۔''

''شجاع بھائی میں بے شک بابا کو معتوب سہی لیکن ہوں تو ان کا بیٹا کیا مجھے معلوم کرنے کا حق نہیں ہے کہ میری ذات سے وابستہ یہاں کیا مسائل ہیں؟''

شجاع بھائی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''اصل میں شاہد کی ڈیتھ کے دو دن بعد بابا کو ایک کال آئی تھی اور کال کرنے والے نے دھمکی دی تھی کہ اب بھی تمہیں قابو نہیں کیا گیا تو ہمیں مزید صدموں کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ اس گفتگو کے بعد میرے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ شاہد بھائی کے قتل کے پیچھے کون لوگ تھے اور اب وہ ذلالت پر اُتر آئے تھے۔ میں نے دانت پیسے۔ ''شجاع بھائی میں نے کبھی جان بوجھ کر قانون ہاتھ میں نہیں لیا لیکن اب لگ رہا ہے مجھے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔''

''احمقانہ باتیں نہ کرو۔'' وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''ہم شریف لوگ ہیں اور وہ بدمعاش ہیں ہم ان کا مقابلہ ان کی سطح پر آکر نہیں کر سکتے ہیں۔''

''آپ نہیں کر سکتے لیکن میں اس دوران میں جو دیکھ چکا ہوں اور جو بھگت چکا ہوں۔ اب میں ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''دیکھو یہ صرف ایک مفروضہ ہے کہ شاہد کے قتل میں مرشد ملوث ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''تب آپ بتائیں شاہد بھائی کا اور کون دشمن ہو سکتا ہے۔''

''کیا تم دعوے سے کہتے ہو کہ تمہارا دشمن صرف مرشد ہے؟''

''دشمن تو اور بھی ہیں لیکن وہ سب اسی کے آدمی ہیں اور ان میں سے کوئی اس حد تک نہیں جا سکتا ہے۔ پھر مرشد کے بھائی نادر کو نقصان ہوا ہے وہ ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگنے کی وجہ سے مکمل طور پر معذور ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس میں بھی میرا قصور نہیں تھا لیکن یہ فرعون صفت لوگ مجھے ذمے دار قرار دے کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اس بات کا پورا امکان ہے کہ یہ مرشد کی کارروائی ہے اور اس نے اس کے لیے وقت بھی ایسا منتخب کیا جب میں کئی مہینے بعد وطن واپس آیا۔''

''پھر بھی ہمیں اس معاملے میں سکون سے انتظار کرنا چاہیے۔'' شجاع بھائی نے اصرار کیا۔

''باوجود اس کے کہ وہ دھمکی دے چکے ہیں۔'' میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

''دھمکی دینے والے کا مطالبہ تھا کہ تمہیں حویلی تک محدود کر دیا جائے۔ اس صورت میں وہ مزید کوئی

کارروائی نہیں کرے گا۔"

تو اس لیے بابا مجھے حویلی میں محدود رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے سوچا لیکن دشمن کی یہ چال مجھے اپنے اندر کئی معنی سمیٹے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ آخر ان کا مقصد کیا تھا۔ اگر میں حویلی محدود ہو جاتا تو اس سے کیا ہوتا؟ کیا اس سے دشمن کے کسی معاملے میں اسے مدد ملتی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس دوران میں آزادانہ گھوموں پھروں۔ اس لیے اس نے مجھے حویلی تک پہنچا دیا تھا لیکن بیتو کو اپنے قبضے میں رکھا تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی اگر میں پھر بھی اس کے عزائم کو ناکام بنا کر حویلی سے نکل جاتا تو وہ بیتو کو استعمال کر سکتے تھے اور میں بیتو کی جان بچانے کے لیے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا۔ میں نے شجاع بھائی سے پوچھا۔

"کیا میرے ساتھ کوئی اور نہیں تھا؟"

"نہیں تم اکیلے ملے تھے۔" انہوں نے جواب دیا۔

واپس آنے کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ مجھے سکون سے سوچنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اور شاید دشمن بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ شاہد بھائی کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ تاکہ میں ذہنی طور پر منتشر رہوں اور سوچ سمجھ کر کچھ کرنے کے قابل نہ رہوں لیکن ساتھ ہی اس نے یہ غلطی کی تھی کہ مجھے حویلی بھیج دیا تھا۔ بے شک حالات مشکل سہی اور شاہد بھائی کے بچھڑنے کا دکھ الگ تھا لیکن حویلی کے ماحول نے مجھے وہ چیز لوٹا دی تھی جس کے لیے میں پانچ برس سے ترس رہا تھا لیکن بابا کا رویہ مجھے ڈرا رہا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔

"شجاع بھائی کیا بابا شاہد بھائی کی موت کا ذمے دار مجھے سمجھ رہے ہیں؟"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے لیکن وہ کسی سوچ میں ہیں اور تم جانتے ہو بابا اپنی سوچ کسی کو نہیں بتاتے ہیں۔"

"تب آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں سوچ رہے ہیں؟"

"میری ان سے اس موضوع پر بات ہو چکی ہے۔ بابا نہ جانے کیوں تم سے کترا رہے ہیں لیکن اس کی وجہ بہرحال یہ نہیں ہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ کوئی بھی فیصلہ یا کام سکون سے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ میں نے تمہارے وکیل ندیم بھٹی کو اطلاع کر دی ہے وہ شاید ایک آدھ دن میں حویلی کا چکر لگائے گا۔"

"اس نے مجھے شاہد بھائی کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی لیکن اتفاق سے میں نے جب اس سے بات کرنا چاہی تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ سامنے آگئی۔ آخر میں اس کے گھر گیا تو وہاں فتح خان میرا منتظر تھا۔"

"تم نے کھانا کھایا؟"

"جی کھا لیا۔" میں نے کہا۔ "میں شاہد بھائی کی...... قبر پر جانا چاہتا ہوں۔"

"فی الحال یہ مناسب نہیں ہے۔" وہ بولے۔ "حویلی میں تمہاری موجودگی ایک راز ہے اگر تم باہر نکلے تو ایک گھنٹے میں پورے گاؤں کو تمہاری موجودگی کا پتا چل جائے گا۔"

"عام لوگوں کو پتا چلنے یا نہ چلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اوہ یار تم جانتے نہیں ہو گاؤں کے لوگوں کی نیچر...... ایک ایک بندہ پوچھنے آجائے گا کہ تم کہاں تھے اور

کیا کرتے رہے۔ کچھ لوگ پولیس والے معاملات سے بھی باخبر ہیں۔''
شجاع بھائی ٹھیک کہہ رہے تھے، اس بارے میں، مَیں نے سوچا نہیں تھا کہ پورا گاؤں جانتا ہوگا کہ میں پانچ برس سے گاؤں نہیں آیا تھا اور اس کی کئی وجوہات تھیں۔ لوگ ان وجوہات کی جڑوں تک جانے کے لیے بے چین ہوں گے۔ میرا حویلی میں روپوش رہنا ہی مناسب تھا جب تک میں یہاں سے چلا نہیں جاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے فتح خان نے یہاں بھجوایا تھا تو اسے اس سے کیا غرض تھی کہ میں حویلی تک محدود رہوں یا نہ رہوں اور اگر وہی دھمکی دے رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ شاہد بھائی کی موت میں اس کا ہاتھ تھا۔ گویا فتح خان نے مرشد علی سے الگ ہونے کے بارے میں جو کہا تھا وہ ایک دھوکے سے زیادہ نہیں تھا۔
اگر مجھے یہاں تک بھیجنے میں فتح خان کا ہاتھ نہیں تھا اور اس کے پس پشت مرشد تھا تو اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ میرے خون کا پیاسا تھا اور ایک بار میں اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ مجھے پُرعذاب طریقے سے قتل کرنے کے بعد بھی مطمئن نہ ہوتا۔ اس نے مجھے حویلی کیوں بھیج دیا تھا۔ سوچ سوچ کر میرے سر میں درد ہونے لگا تھا لیکن یہ گورکھ دھندا میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شجاع بھائی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔
''تم فکر مت کرو اور ابھی آرام کرو میں دیکھ رہا ہوں تمہاری صحت بہت گرگئی ہے۔''
''کیسے آرام کروں یقین کریں اس چکر میں پھنسنے کے بعد شاید ہی مجھے کبھی سکون سے چوبیس گھنٹے گزارنے کا موقع ملا ہو۔'' میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''شہباز ابھی تمہارے بڑے موجود ہیں اور ہم تمہارے مسئلے کا حل نکال لیں گے۔'' شجاع بھائی نے پھر سگار سلگایا۔ ''اگر تم پہلے مجھ سے رابطہ کر لیتے تو شاید خرابی اس حد تک نہیں آتی۔''
میں ان کو کیا بتاتا کہ میں نے اس چکر سے بچنے کی کس حد تک کوشش کی تھی لیکن مرشد، نادر ٹولہ مجھے یکے بعد دیگرے پھنساتا رہا کیونکہ وہ بلاوجہ مجھ سے دشمنی پر اتر آئے تھے۔ میرا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ سفیر، ندیم اور مونا میرے ساتھ نہ کھڑے ہو جاتے اور بعد میں راجا صاحب اور وسیم جیسے دوست مدد کو نہ آتے تو میں شاید اب تک اپنی قبر میں خاک ہو چکا ہوتا۔ سب سے بڑھ کر قدرت نے مجھے ان لوگوں سے مقابلے کا حوصلہ دیا اور میں نے ان کے سامنے ہار نہیں مانی لیکن کسی بھی موقع پر میں نے ان سے از خود الجھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ خود ہی اب تک شکاری کتوں کی طرح میرا پیچھا کرتے رہے تھے اور کہیں مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ انہوں نے خود بھی نقصان اٹھایا۔ نادر زندگی بھر کے لیے معذور ہو کر بستر تک محدود رہ گیا تھا اور میں اپنے کاروبار سے محروم ہو کر در بدر پھر رہا تھا۔ اگر چہ مالی طور پر میں نقصان میں نہیں رہا تھا۔ انڈیا سے ملنے والے ہیروں کی مالیت ایک کروڑ ڈالرز کے لگ بھگ تھی اور وہ سفیر کے پاس موجود تھے۔ پاکستانی کرنسی میں ان کی مالیت اس وقت کوئی پچپن چھپن کروڑ بنتی تھی اور اگر میں اس کا تیسرا حصہ بھی لیتا تو یہ میرے کاروبار کی کل مالیت سے کئی گنا زیادہ تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی میں وہ اپنی زندگی کھو چکا تھا جس نے مجھے کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔
مجھے نہیں معلوم تھا کہ حویلی بھیجنے میں میرے دشمنوں کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ میرے دوست تتر بتر ہو چکے تھے۔ راجا صاحب انڈیا میں غائب تھے اور پھر ان کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ سفیر اور مونا دبئی میں تھے اور شادی کر چکے تھے۔ پھر وسیم اور سادھنا بھی ان کے پاس چلے گئے۔ باقی رہ گئے تھے میں اور بیتو تو اب بیتو بھی غائب تھا۔

وہ یقیناً فتح خان کے قبضے میں تھا اور تمرشد یا کسی اور کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ بیتو کی گمشدگی، مجھے حویلی بھیجنا، اور میرے گھر والوں کو شاہد بھائی کے قتل کے بعد دھمکانا ظاہر کرتا تھا کہ میرے دشمن منظم اور آپس میں ملے ہوئے تھے۔ وہ پروفیسر کی صورت میں ایک نیا مہرہ سامنے لائے تھے لیکن اس کی قضا آئی تھی وہ اپنی حرکتوں کی نظر ہو گیا تھا۔ دونیا بھی فتح خان کے قبضے میں تھی۔

پھر مجھے چین سے ساتھ آنے والے بریف کیس کا خیال آیا۔ میں اسے اکثر بھول جاتا تھا۔ وہ بریف کیس پروفیسر کے کسی بینک لاکر میں تھا اور اس کی چابی شہلا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ کسی اور طریقے سے بینک لاکر کو کھولنے کا ارادہ رکھتی تھی کیونکہ اس میں وہ تصاویر بھی تھیں جن کی مدد سے پروفیسر اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ اگر وہ لاکر کھول لیتی تو یقیناً بریف کیس بھی اس کے ہاتھ آ جاتا۔ اس بریف کیس میں کیا تھا میں نہیں جانتا تھا لیکن چین میں اسے جس طرح ایک اعلیٰ افسر حفاظت سے لے کر جا رہا تھا اس سے پتا چلتا تھا اس میں کوئی بہت اہم چیز یا دستاویز تھی۔ میری براہِ راست ذمے داری تو نہیں بنتی تھی لیکن میں سمجھتا تھا کہ ایک دوست ملک ہونے کے ناطے اور ہر مشکل گھڑی میں پاکستان کے ساتھ کھڑے ہونے کی وجہ سے میرا فرض بنتا تھا کہ میں چین کے مفاد کا بھی اسی طرح خیال رکھوں جس طرح اپنے ملک کے مفاد کا خیال رکھ سکتا ہوں۔ اگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے وطن کو کوئی نقصان ہو رہا ہے اور میں اسے روک سکتا ہوں تو میں لازمی طور پر اسے روکوں گا۔ اس لیے وہ بریف کیس واپس حاصل کرنا اور اسے چین کے سفارت خانے کے حوالے کرنا میں اپنی ذمے داری سمجھ رہا تھا۔

اس موقع پر میں نے وسیم اور سفیر کی کمی شدت سے محسوس کی۔ وہ دونوں میرے دو بازو تھے جن کے ہوتے ہوئے میرا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا تھا۔ اب میں اکیلا اتنے سارے معاملات سے نہیں نمٹ سکتا تھا۔ شجاع بھائی تھے لیکن ان کو میرے ہر معاملے کا اور میرے دشمنوں سے جاری جنگ کے ہر پہلو کا علم نہیں تھا۔ میں ان سے اس سلسلے میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک ذمے دار فوجی افسر تھے جو ایک حد سے آگے جا کر میری مدد نہیں کر سکتے تھے ان کے نزدیک قانون اور اس کی برتری اہم تھی جب کہ میرے دشمن قانون سے بالکل ماورا تھے اور ان سے لڑنے اور اپنی جان بچانے کے لیے مجھے بھی قانون کے راستوں سے ہٹ کر سفر کرنا پڑتا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں حویلی بھیجنے اور بابا کی تحویل میں دینے کا مقصد یہی تو نہیں ہے کہ دشمن مجھے بے دست و پا کرنا چاہ رہا تھا اور اس دوران میں وہ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کے بعد دوبارہ مجھ سے نمٹنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شجاع بھائی میری طویل خاموشی سے کچھ اور سمجھے۔

''میرا خیال ہے اب تم آرام کرو۔ میں بھی کل سے تھک گیا ہوں۔ تم جانتے ہو ہمارے ہاں دسواں بیسواں نہیں ہوتا پھر بھی بہت لوگ آئے تھے اور آج بھی کئی ملنے والے تھے۔''

''ٹھیک ہے آپ آرام کریں۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا میں نے ماں جی کے کمرے میں جھانکا تو سب کے ساتھ سویرا کی جھلک بھی نظر آئی تھی میں پلٹ کر جانے لگا تو عائشہ بھابی نے دیکھ لیا۔ وہ میرے پیچھے آئیں۔ ''شہباز کہاں جا رہے ہو؟''

میں رک گیا۔ ''کہیں نہیں......''

''تو اندر آؤ نا'' انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہم تو تم سے بات کرنے اور تمہارے پاس بیٹھنے کو ترس

گئے ہیں۔"

میں ہچکچایا۔ "وہ سویرا ہے......"

"تو کیا ہوا تم تو اپنے ہو پردہ تو باہر والوں سے ہوتا ہے آؤ۔" وہ مجھے پکڑ کر اندر لے آئیں۔ سویرا نے پہلے کی طرح ہلکا سا گھونگھٹ کر لیا تھا۔ میں ماں جی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب پہلے سے بہتر نظر آ رہی تھیں۔ ویسے بھی آج شاہد بھائی کے انتقال کو بارہ دن ہو گئے تھے اور اللہ انسان کو صبر دے دیتا ہے۔ آج بھی رونا دھونا شاید میری آمد کی وجہ سے تھا۔ ماں جی نے میری طرف دیکھا۔

"کتنا کمزور ہو گیا ہے تو۔"

"نہیں ٹھیک تو ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں لگتا ہے تو صحیح سے کھاتا ہے اور آرام کرتا ہے۔"

شمی بولی۔ "شیبی لگتا ہے آپ نے کئی دن سے شیو بھی نہیں بنائی۔"

میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "ان دنوں تو سانس لینے کا موقع بھی مشکل سے ملتا ہے۔ شیو کہاں سے کرتا۔"

"چلیں پھر شیو کر لیں۔" شمی بولی۔

"میرے پاس شیونگ کا سامان نہیں ہے۔"

"آپ نے شاید واش روم میں غور سے نہیں دیکھا وہاں پر ہر چیز ہے۔" شمی نے کہا۔ "آیئے میں آپ کو دکھاؤں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے تجھے؟" آپا نے اسے گھورا۔ "ابھی تو آیا ہے میرا بھائی اسے سانس تو لینے دے۔"

شمی نے منہ بنایا۔ "مجھے یوں اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔"

میں خود وہاں سے اٹھنا چاہ رہا تھا۔ سویرا بیٹھی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میری موجودگی سے کچھ بے چین ہے وہ بالکل ساکت اور خاموش تھی۔ شاید وہ میری آمد سے گھبرا گئی تھی۔ اس لیے جب شمی نے اصرار کیا تو میں کھڑا ہو گیا۔ "میں شیو کر ہی لوں ورنہ یہ چڑیل مانے گی نہیں۔"

شمی نے منہ بنایا۔ "میں چڑیل ہوں۔"

"ہاں بچپن سے چڑیل ہو یاد نہیں مجھے کیسے سارا دن چمٹی رہتی تھیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ ہم دونوں وہاں سے نکل آئے۔

"اچھا" شمی نے اشتیاق سے کہا۔ "امی بتاتی ہیں کہ میں آپ کو اسکول بھی نہیں جانے دیتی تھی۔"

میں مسکرایا۔ "ہاں ان دنوں کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں جب تم آئیں تو اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور تم اس وقت مشکل سے دو سال کی تھیں۔ تم فوراً مجھ سے مانوس ہو گئیں اور پھر سارا دن میری گود میں رہا کرتی تھیں۔ اسکول کھلے تو تم نے مجھے اسکول جانے ہی نہیں دیا اور اتنا ہنگامہ کیا کہ میں تین چار دن مزید چھٹی کے مزے لیتا رہا تھا۔ چھٹیوں کے بعد اسکول جانا سب سے مشکل کام تھا۔"

"پھر اگلے سال آپ کیڈٹ اسکول چلے گئے۔ میرے ساتھ کتنا کم رہے۔"

میں نے گہری سانس لی۔ ”گڑیا ان دنوں تو میں خود بھی اپنے ساتھ نہیں ہوتا تھا اپنے وجود کا ایک حصہ حویلی میں چھوڑ جاتا تھا۔ تم سب کی یاد آتی تھی۔“

”مجھے بھی آپ کی بہت یاد آتی تھی۔“ اُس نے واش روم میں آئینے کے پیچھے لگی چھوٹی سی کیبنٹ کھولی جس میں شیو کا مکمل سامان تھا۔ ”بس اب آپ جلدی سے شیو کر لیں۔“

میں نے بڑھی شیو پر ہاتھ پھیری۔ ”لیکن مزہ اس طرح زیادہ آرہا ہے۔“

”کوئی نہیں جی۔“ اس نے مجھے شیونگ کا سامان تھمایا۔ ”اب آپ جلدی سے تیار ہو کر آجائیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد کھانا لگا دوں گی۔ آج میں نے آپ کا پسندیدہ پلاؤ بنایا ہے۔“

میں واش روم میں آیا میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ کسی زمانے میں سادہ سا واش روم اب جدید ترین شہری اسٹائل کے ٹائلز اور بیسن سمیت بہترین مکسچر سے بالکل بدل گیا تھا۔ بس اس میں ہاتھ ٹب کی کمی تھی۔ ورنہ ڈبلیو سی کے ساتھ کموڈ بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے شیو کی اور پہلی بار سکون سے آئینے میں دیکھ کر کیا۔ واقعی میں بہت بدل گیا تھا۔ بھاگ دوڑ بے آرامی اور ایک مسلسل اعصاب کشیدہ زندگی نے اپنے سارے اثرات میرے چہرے پر چھوڑے تھے۔ ستا ہوا چہرہ اور آنکھوں کے گرد ہلکے آگئے تھے۔ رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ چہرے پر لگنے والی کچھ چوٹوں کے نشان ابھی بھی باقی تھے اور سر کے بال کسی قدر بے ترتیب ہو گئے تھے۔ آخری بار مجھے نیپال میں بال بنوانے کا موقع ملا تھا جہاں ایک انڈین نژاد طوائف کے کوٹھے پر ایک لڑکی نے بڑی مہارت سے میرے بال تراشے تھے۔ شیو کر کے میں باہر آیا تو شمی نے میرے لیے ہاف سویٹر نکال دیا تھا کیونکہ سردی واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ میں اب تک جتنی سردی بھگتا ہوا آیا تھا اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھی اور مجھے موسم خوشگوار لگ رہا تھا لیکن بہرحال سردی کا موسم آگیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ بابا کھانے کے کمرے میں آئیں گے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو سب تھے سوائے بابا کے۔ شمی اور عائشہ بھابی کھانا لگا رہی تھی۔ بعد میں ماں جی اور سویرا بھی آگئی تھیں۔ میں نے ماں جی سے بابا کا پوچھا۔ وہ چپ ہو گئیں پھر آہستہ سے بولیں۔

”آج کل وہ اپنے کمرے سے کم نکلتے ہیں کھانا بھی وہیں کھاتے ہیں۔“

”میری وجہ سے؟“

”نہیں تیری وجہ سے کیوں؟“ ماں جی نے جلدی سے تردید کی ان کا انداز ایسا تھا جیسے مجھ سے زیادہ وہ خود کو یقین دلانا چاہ رہی تھیں۔

”ماں جی میں بچہ نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں بابا نے آج تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔“

ماں جی نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”تُو اپنے باپ کو جانتا ہے نا؟“

میں ماں جی کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اس بات پر گھٹ رہی تھیں لیکن مجھے وہ اس گھٹن سے بچانا چاہتی تھیں۔ صرف ان کی خاطر میں نے موضوع بدل دیا۔ ”شمی کہہ رہی تھی آج اس نے پلاؤ بنایا ہے مجھے تو آپ کے ہاتھ کا کھانا تھا۔“

”میں ضرور بناتی پر جوڑوں کے نامراد درد نے کسی کام جوگا نہیں چھوڑا ہے۔“ ماں جی نے ٹھنڈی سانس

لی۔

''جوڑوں کا درد کب ہوا آپ کو؟'' میں پریشان ہو گیا تھا۔

''تین سال پہلے شروع ہوا تھا پھر بڑھتا گیا۔ شجاع مجھے آرمی کے اسپتال لے گیا تھا۔ علاج کرایا تو چلنے پھرنے کے قابل تو ہوں لیکن کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔''

میں نے پہلی بار غور سے دیکھا ماں جی کی کلائیوں اور ٹخنوں پر ہلکی ہلکی سی سوجن تھی۔ ان کو یقیناً کوئی کام کرتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہو گی۔ سویرا سن رہی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ماں جی کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے ہم ہیں نا۔''

''ہاں اللہ رکھے تم سب کو۔'' ماں جی بولیں۔ ''لیکن بندے کے اپنے ہاتھ پاؤں بھی چلنے چاہئیں ورنہ وہ بے کار ہو جاتا ہے۔''

''اتنا تو چلتی پھرتی ہیں پھر ڈاکٹر کی بتائی ایکسر سائز الگ کرتی ہیں بس کام نہیں کرتیں لیکن اس سے زیادہ ہی محنت کر لیتی ہیں۔''

سویرا دھیمے لہجے میں سنبھل کر بول رہی تھی۔ پتا نہیں وہ اسی طرح بولنے لگی تھی یا میرے سامنے ایسے بات کرتی تھی۔ شمی اور عائشہ بھابی کھانا لگا چکی تھیں۔ آپا اور شجاع بھائی بھی آ گئے۔ بابا کا کھانا ان کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ شمی نے پلاؤ واقعی لاجواب بنایا تھا بالکل ماں جی کے ہاتھ کا ذائقہ پایا تھا میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ اس نے چہک کر کہا۔

''کل میں آپ کو دال چاول بنا کر کھلاؤں گی۔''

آپا نے اسے گھورا۔ ''پھر چاول...... تو چاولوں کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہے۔ وزن بڑھ جائے گا۔''

''ٹھیک تو ہے آپا بلکہ دبلی ہے۔ اچھا ہے کچھ وزن بڑھ جائے گا۔''

''دیکھا سب مجھے دبلا کہتے ہیں بس آپ ہی مجھے موٹا سمجھتی ہیں۔'' شمی نے منہ بسور کر کہا۔ وہ واضح طور پر چاولوں کی شوقین تھی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان کی آب و ہوا چاول اگانے کے لیے تو موزوں ہے لیکن چاول یہاں کے لوگوں کے لیے مناسب خوراک نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کو موٹا کرتا ہے۔ البتہ یہی چاول ایشیا کے استوائی اور بارانی علاقوں میں عام خوراک ہے۔ جیسے بنگلہ دیش، برما، انڈونیشیا، فلپائن، چین، تھائی لینڈ اور ویت نام جیسے ممالک کے لوگ دنیا میں فی کس سب سے زیادہ چاول استعمال کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ موٹے نہیں ہوتے ہیں۔ پلاؤ کے ساتھ مکھنڈی حلوہ بھی تھا۔ شجاع بھائی اور عائشہ بھابی تھکے ہوئے تھے اور پھر شاید انہوں نے کچھ اور کام بھی نمٹانے تھے اس لیے وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ گئے تھے۔ برتن شمی اور سویرا نے اٹھائے تھے۔ آپا نے سویرا کو منع بھی کیا تھا لیکن وہ نہیں مانی۔ ماں جی بھی اٹھ گئیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا۔

''پتر اب سوؤں گی تہجد کے لیے اٹھنا ہو گا۔''

''جی ماں جی۔'' میں نے کہا اور ان کے ساتھ ان کے کمرے تک آیا تھا۔ ماں جی لیٹ گئیں تو میں کمرے سے نکل آیا۔ آپا اپنے کمرے میں تھیں اور شمی و سویرا کچن میں تھیں میں نے موقع غنیمت جانا اور بابا کے کمرے کی طرف آیا۔ بابا اور ماں جی کی الگ کمروں نہیں رہتے تھے۔ بلکہ ماں جی والا کمرہ ہی اصل میں بابا کا کمرہ تھا۔ بابا

جس کمرے میں تھے وہ مردانے میں ان کے لیے مخصوص تھا۔ میں بابا کے کمرے تک آیا۔ میں نے دستک دی تو اندر بابا کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''بابا میں ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو اندر خاموشی چھا گئی تھی بابا نے پھر کچھ کہا اور نہ دروازہ کھولا یا مجھے اندر آنے کی اجازت دی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد کہا۔ ''بابا میں آپ کو اپنی شکل دکھانے نہیں آیا ہوں میری صرف اتنی گزارش ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں میں اپنے کمرے میں محدود رہتا ہوں اور کھانا بھی وہیں کھاؤں گا میری وجہ سے آپ باقی گھر والوں کو اپنی ذات سے محروم نہ کریں۔''

میں کہہ کر واپس آنے لگا تو میں نے سویرا کی جھلک دیکھی وہ تیزی سے واپس جا رہی تھی۔ شاید وہ کسی وجہ سے بابا کے کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کا سوچا لیکن مجھے برسوں پرانی وہ بات یاد آ گئی جب میں نے سویرا سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور بابا نے آدھی ادھوری بات سن کر مجھ پر فیصلہ لگا دیا تھا اور شاید آج تک وہ اپنی اس رائے پر قائم تھے۔ میں آج بھی ان کی نزدیک ایک غلط انسان تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے کمرے میں آ جاؤں۔ حالانکہ اس وقت میرا دل کر رہا تھا کہ برسوں پہلے کی طرح ایک بار پھر خاموشی سے حویلی سے نکل جاؤں۔ میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ حویلی میں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ سناٹا میرے اندر تھا۔

میں نے دیکھا کہ اب کوئی ملازمہ نہیں تھی ورنہ جب میں چھوٹا تھا تو حویلی میں دو مستقل ملازمائیں اور ایک ملازم فضل کام کرتا تھا لیکن شاید اتنی خواتین کی موجودگی میں ملازموں کو رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا اور فضل کو بھی شاید اسی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ بہر حال شمی اور ماں جی کی دونوں بہوؤں نے گھر بہت اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ دونوں ملازمائیں آتی تھیں لیکن میری آمد کے بعد ان کو عارضی طور پر چھٹی دے دی گئی تھی۔ البتہ فضل کا انتقال ہو گیا تھا اس کا اپینڈکس پھٹ گیا تھا اور جب تک بابا اسے شدید بارش میں نزدیکی اسپتال تک لے جاتے زہر اس کے جسم میں پھیل گیا تھا۔ مجھے جان کر افسوس ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد شمی نے کمرے میں جھانکا تو میں سوتا بن گیا تھا۔ اس وقت میں کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ شاید اگلے دن میری بات کا کوئی نتیجہ نکلے گا اور بابا شاید کمرے سے باہر آ جائیں لیکن ان کی روٹین وہی رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ بابا غیر جذباتی اَنا پرست تھے۔ اگر وہ کسی بات پر قائم ہو جاتے تو کوئی کسی طرح سے ان کو ان کی بات سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ دنیا میں واحد ماں جی ایک ہستی تھیں جن کے آگے وہ نرم پڑ جاتے تھے اور اپنی ضد چھوڑ دیا کرتے تھے لیکن ایسا بھی عام قسم کے معاملات میں ہوتا تھا۔ اگر کبھی کوئی خاص بات ہوتی تو ماں جی بھی ان سے بات کرنے سے گریز کرتی تھیں اس طرح ایک رویہ بن گیا تھا کہ بابا کی بات یا فیصلے کے آگے کسی نے چوں بھی نہیں کرنی ہے اور شاید اسی وجہ سے بابا اپنی بات کے خلاف کچھ برداشت نہیں کرتے تھے۔

شروع کے تین دن میرا اور سویرا کا سامنا کم ہوا تھا۔ وہ صرف کھانے کے وقت ہی اپنے کمرے سے باہر آتی تھی۔ حالانکہ شمی اور باقی سب اسے باہر لانے کی کوشش کرتے تھے لیکن اکثر ان کی یہ کوشش ناکام رہتی تھی۔

ہاں اگر ماں جی کہتیں تو وہ باہر آ جاتی تھی لیکن ماں جی بھی ایسا کم ہی کرتی تھیں۔ یوں بابا اور سویرا دو ایسی ہستیاں بن گئے تھے جو اس حویلی میں ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دور تھے۔ ان کی ذات میرے لیے شجرِ ممنوعہ بن گئی تھی۔

ماں جی اور آپا زیادہ تر اپنے معمولات میں ہوتی تھیں۔ ماں جی کو نمازوں اور اپنے کاموں کے بعد جو وقت ملتا تھا اس میں درود و وظائف کرتی تھیں اور آپا حویلی کے کاموں میں رہا کرتی تھیں۔ ان کے ذمے تمام کاموں کی نگرانی تھی۔ کام زیادہ تر شمی، عائشہ بھابی اور سویرا کرتے تھے یا نوکرانیاں تھیں لیکن ان دنوں نوکرانیوں کی چھٹی تھی اور سویرا عدت میں تھی اس لیے شمی اور عائشہ پر کام کا بوجھ زیادہ تھا جسے وہ پیشانی پر بل لائے بغیر ہنسی خوشی پورا کرتی تھیں۔

میں ان دنوں میں حویلی کی عمارت سے باہر نہیں نکلا تھا۔ حد یہ کہ صحن تک میں نہیں گیا تھا لیکن مجھے کچھ باتوں کا علم ہوا تھا ایک تو حویلی کی حفاظت اور نگرانی کے لیے تین مسلح گارڈز رکھے گئے تھے۔ یہ گارڈز شجاع بھائی نے کسی اچھی سکیورٹی کمپنی سے بلوائے تھے اور سابق آرمی کمانڈوز تھے۔ دوسرے حویلی کی چار دیواری اونچی کرا کے اس پر خاردار تار کی دوہری باڑ لگا دی گئی تھی۔ اس سے پہلے حویلی کہ دیوار صرف چھ فٹ اونچی تھی۔ اب اسے نو فٹ اونچا کر دیا گیا تھا۔ مین گیٹ پر نئی فولادی شیٹ اور اینگل آئرن ویلڈ کرا کے اسے مزید مضبوط کر دیا گیا تھا۔ گیٹ سے اندر مردانے تک ایک انٹر کام سسٹم تھا۔ اس کا ایک ایکس ٹینشن اندر بھی تھا۔ اگر کوئی باہر سے آتا تو پہلے اندر اس کی اطلاع کی جاتی تھی۔ یہ انتظامات بتاتے تھے کہ بابا اور بھائیوں نے مرشد علی کی دھمکیوں کو سنجیدگی سے لیا تھا لیکن اس بزدل شخص نے وہاں وار کیا جہاں بابا یا بھائیوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ان چند دنوں میں، مَیں نے اس معاملے پر جتنا بھی سوچا تھا میرا یقین بڑھتا جا رہا تھا کہ شاہد بھائی کا قتل مرشد کے اشارے پر ہوا تھا۔ اس کے پاس اس کام کے لیے بدمعاشوں کی کمی نہیں تھی۔

تنہائی میں جب میں اس معاملے پر سوچتا تھا تو مجھے غصے کے ساتھ بے بسی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ مرشد ایک طاقتور شخص تھا اور براہِ راست اس سے صرف دو تین بار ہی میرا سامنا ہوا تھا۔ اب تک میں اس کے چیلوں اور بدمعاشوں سے نمٹتا آیا تھا اس کی اصل طاقت یہی بدمعاش اور چیلے تھے ورنہ وہ بذاتِ خود کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اس کی موٹی گردن توڑ سکتا تھا لیکن مرشد اپنے درجنوں محافظوں کے حصار میں محفوظ تھا اس لیے وہ خود کو کسی کے خلاف کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد سمجھتا تھا۔ اسے خوف نہیں تھا کہ کوئی اس کی سطح پر آ کر اس کے خلاف کچھ کرنا بھی چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے حفاظتی حصار میں محفوظ تھا۔ میں کوشش بھی کرتا تو شاید اس حفاظتی حصار کو توڑ کر اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ میں نے آج تک ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ میں تو ایک مدافعانہ جنگ لڑ رہا تھا کیونکہ اس میں خطرہ میرے اور میرے ساتھیوں کی جان کو تھا اس لیے میں نے کبھی مرشد یا دوسرے دشمنوں کے خلاف جارحانہ کارروائی نہیں کی تھی۔

شاہد بھائی کے قتل نے مجھے بتایا کہ دشمن اب میری اور میرے دوستوں کی ذات سے آگے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ اتنے بے خوف تھے کہ انہوں نے ایک آرمی آفیسر کی جان لینے سے گریز بھی نہیں کیا تھا۔ ان کی دیدہ دلیری کی انتہا تھی کہ یہ کام انہوں نے دن دیہاڑے اور ایک مصروف شاہراہ پر کیا تھا۔ شجاع بھائی کو پولیس انکوائری کی رپورٹ مل رہی تھی اس کے مطابق کچھ افراد نے ایک سیاہ بڑی جیپ کو شاہد بھائی کی گاڑی کا تعاقب

کر کے اسے روکتے دیکھا تھا لیکن انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ گاڑی روکنے والوں نے سوار کے ساتھ کیا کارروائی کی ہے۔ ان افراد کو پولیس نے ٹول پلازہ کے ریکارڈ کی مدد سے ڈھونڈ نکالا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا ان کی گواہی کسی کام کی نہیں تھی کیونکہ انہوں نے نہ تو کسی ملزم کو دیکھا تھا اور نہ گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ہائی وے پر دونوں طرف ٹول ٹیکس والوں کے پاس اس دن کسی سیاہ بڑی جیپ کا ریکارڈ موجود نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ کہیں اور سے ہائی وے پر آئی تھی اور اس میں سوار افراد اپنا کام کر کے اسی راستے سے واپس چلے گئے تھے۔ موٹر وے کے علاوہ پاکستان کی ہر سڑک کھلی ہوتی ہے اس پر کہیں سے بھی آنا جانا ممکن ہے۔

تیسرے دن شام کے وقت ندیم آیا تھا۔ میں کمرے میں لیٹا اس دن کا اخبار دیکھ رہا تھا کہ مجھے اس کی آمد کی اطلاع ملی۔ میں مردانے کی نشست گاہ میں آیا تو ندیم صوفے پر بیٹھا تھا مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر گلے لگ گیا۔ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بنا کہے ہی میرے دکھ میں شامل تھا۔ پھر ہم بیٹھ گئے۔

''میں نے تجھے بتانے کی کوشش کی تھی لیکن بدقسمتی سے جتنی بار بات ہوئی فون لائن خراب تھی۔''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''پھر تجھ تک پہنچنے میں بھی کئی رکاوٹیں آ گئی تھیں۔''

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ پاکستان آنے کے بعد مجھ پر کیا گزری اور جب میں نے اسے اس کے گھر کے بارے میں بتایا جہاں سے مجھے اور بیتو کو دونیا سمیت اغوا کیا گیا تھا تو وہ چونک گیا۔ ''میرے گھر سے لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تُو بیوی بچوں سمیت کہیں باہر تھا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں یاد آیا۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا تھا میں نے سوچا اکیلا کیوں بور ہوں بیوی بچوں کو بھی لے گیا تھا لیکن میں تین گھنٹے سے زیادہ نہیں رکا تھا۔''

''اتنا وقت کافی تھا اتفاق سے میں بھی اسی دوران میں وہاں پہنچ گیا اور ان کو موقع مل گیا مجھے قابو کرنے کا۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن اگر تو آ جاتا تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تجھے بھی قابو کر لیتے۔''

''اتنا آسان نہیں ہوتا ایک وکیل سے پنگا لینا۔ انہوں نے چالاکی سے کام لیا میرے آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئے اور جاتے جاتے سب کچھ صاف بھی کر گئے تھے۔''

''یعنی تجھے بالکل شک نہیں ہوا کہ تیرے پیچھے کوئی کارروائی ہوئی ہے؟''

''شک ہوتا تو میں نے مقامی پولیس کو ہلا نہ دیا ہوتا۔ خاص طور سے میری گلی کے لیے رات کو ایک پولیس موبائل چکر لگاتی ہے۔''

''کیا فائدہ ہوا انہوں نے دن میں کارروائی ڈال دی۔'' میں نے سر ہلایا۔

''خیر چھوڑ اسے، سانپ نکل گیا اب لکیر پیٹنے کا فائدہ؟'' ندیم نے کہا۔ ''یہ بتا یہاں کیا صورتِ حال ہے؟''

''اچھی نہیں ہے۔ بابا کی صورت ابھی تک نہیں دیکھی ہے لیکن میرے دشمن مجھے ان کی کسٹڈی میں دے گئے ہیں۔''

''یعنی فی الحال تُو حویلی سے باہر نہیں جا سکتا۔'' ندیم نے میری بات پر غور کیا۔

''ہاں تُو اسے اخلاقی دباؤ سمجھ سکتا ہے میرے دشمن سمجھتے ہیں کہ وہ طاقت کے بل پر مجھے نہیں روک سکتے ہیں اس لیے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ میرے دشمن مجھے حویلی میں کیوں قید رکھنا چاہتے ہیں؟''

''اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے ان دنوں الیکشن قریب ہیں اور مرشد اس بار ایم این اے کی سیٹ کے لیے انتخاب لڑ رہا ہے۔''

''حیرت ہے وہ تو دوسروں کو لڑاتا ہے اس بار خود کھڑا ہو رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں سنا ہے وہ سرکاری پارٹی کی طرف سے لڑ رہا ہے اس اور اس کا ارادہ مذہبی امور کی وزارت حاصل کرنے کا ہے۔ اس نے اسی شرط پر سرکاری پارٹی میں شمولیت اختیار کی ہے۔'' ندیم نے بتایا۔ ''اس صورت میں اس کی کوشش ہے کہ کوئی پھڈے والی بات نہ ہو۔ جب سے الیکٹرانک میڈیا آیا ہے سیاست دانوں کے کرتوت بے نقاب ہونے لگے ہیں اور سب اس میڈیا سے ڈرتے ہیں۔''

''مرشد جیسے لوگ کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔''

''تجھے اندازہ نہیں ہے پچھلے ایک دو سال میں میڈیا بہت بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے اور اب اس سے سب ڈرتے ہیں۔''

''یعنی مرشد مجھے حویلی میں قید کر کے سکون سے اپنی الیکشن مہم چلانا چاہتا ہے؟''

''بالکل اور معاملہ صرف ایک سیٹ کا نہیں ہے۔ مرشد اینڈ پارٹی اس علاقے میں کم سے کم دو قومی اور پانچ صوبائی نشستوں پر اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ یہاں جاہل ووٹروں کی بڑی تعداد ہے جو مرشد کے اشارے پر آنکھ بند کر کے شیطان کو بھی ووٹ دے سکتی ہے۔''

''جب وہ الیکشن جیت جائے گا اور سرکاری پارٹی میں باضابطہ طور پر شامل ہو کر مزید طاقتور ہو جائے گا تو اسے میرے خلاف کارروائی سے کون روک سکے گا؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' ندیم نے صاف گوئی سے کہا۔ ''فی الحال وہ ذرا مجبور ہے لیکن بعد میں اسے ایسی کوئی مجبوری بھی لاحق نہیں رہے گی۔''

''گویا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا تو اس کے مقصد کی تکمیل ہو جائے گی۔''

ندیم نے میری طرف دیکھا۔ ''تُو کیا کر سکے گا؟''

''میرا حویلی میں طویل مدت تک قیام کا کوئی ارادہ نہیں ہے لیکن ابھی میں دشمن کی خواہش کے مطابق نہیں رہوں گا۔''

''میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ اگر پولیس نے تیرے خلاف کارروائی کرنا بھی چاہی تو وہ براہِ راست نہیں کر سکتی ہے کیونکہ مقامی پولیس میں تیرے خلاف کوئی کیس نہیں ہے۔ تجھے گرفتار کرنے کے لیے پولیس راولپنڈی سے آئے گی تیرے خلاف سارے کیس وہیں کے ہیں۔''

''میں اس خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے فی الحال میرے دشمن بھی مجھے پولیس سے دور رکھنا چاہتے ہیں ورنہ میری آنکھ حویلی میں نہیں کسی تھانے میں کھلتی۔''

''مجھے سفیر کی کال آئی تھی۔ میں نے اسے تیرے بارے میں بتا دیا ہے۔'' ندیم بولا تو میں چونک گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں تو پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔

''ان کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''وسیم کا معاملہ تو سیٹ ہے وہ مقامی شہری ہے لیکن اس کے ساتھ جو خاتون ہے اس کا معاملہ ذرا پیچیدہ ہے کیونکہ وہ دشمن ہوش وخرد ایک دشمن ملک سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے لیے جعلی کاغذات بنوانے ہوں گے تب ہی وہ اس ملک میں آ سکے گی۔''

''تو بنوالے۔''

ندیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بیٹے یہ اتنا آسان نہیں رہا ہے جب سے شناختی دستاویزات کی تیاری کمپیوٹرائزڈ ہوئی ہے اس قسم کے معاملات بہت مشکل ہو گئے ہیں۔''

''مشکل ہوں یا آسان یہ کام تو کرنا ہی ہے۔'' میں نے زور دیا۔

''یار اتنی جلدی مت کرو مجھے اس بارے میں ذرا سوچنے دو پھر میں کوئی معقول مشورہ دے سکوں گا۔ فی الحال وہ دبئی میں آرام سے ہیں ان کو وہاں آرام سے رہنے دو۔''

''یار میں وسیم اور سفیر کے بغیر خود کو ادھورا سمجھ رہا ہوں۔''

''تو ان کو یہاں بلانے کے بجائے تو خود ان کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔''

''قانونی طریقے سے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''چل غیر قانونی طریقے سے سہی۔ دو تین کے مقابلے میں ایک فرد کے جعلی کاغذات تیار کرانا آسان ہے۔''

''تیرا مطلب ہے آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں میں اس بارے میں معلوم کر رہا ہوں۔ جیسے ہی کوئی محفوظ طریقہ نظر آیا میں تیرے کاغذات تیار کرا دوں گا اور تُو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہاتھ سے ہوائی جہاز اُڑنے کا اشارہ کیا۔ ''سفیر وہاں کوئی سیٹ اَپ بنا رہا ہے۔''

''سیٹ اپ؟'' میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں شاید کسی بزنس کے چکر میں ہے سنا ہے تم لوگ اب کنگلے نہیں رہے ہو کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے؟''

میں نے ندیم کو بھارت کے دنوں کی مختصر رُوداد کے ساتھ ہیروں کے بارے میں بتایا۔''

''ایک کروڑ ڈالرز مالیت کے ہیرے۔'' وہ دنگ رہ گیا تھا۔ ''یہ رانا ویاس نے تجھے بے وقوف تو نہیں بنایا ہے ممکن ہے ہیرے اس سے زیادہ مالیت کے ہوں۔''

''ممکن ہیں ہوں لیکن ہمارے پاس بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ ویسے ایک کروڑ ڈالرز کم نہیں ہوتے ہیں۔''

''دو یا دس کروڑ ڈالرز سے کم ہی ہوتے ہیں۔'' ندیم بولا۔

مجھے بیتو کا خیال آیا۔ ''یار تُو بیتو کے بارے میں معلوم کر...... کہیں وہ پولیس کے ہاتھ نہ آ گیا ہو۔''

''مجھے بھی یہی خیال ہے اسے پولیس کے حوالے کر کے تیرے دشمنوں نے اس سے اپنی جان چھڑا لی ہو گی۔ اس کے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے اور اگر اس نے پولیس کی مار کی تاب نہ لا کر اپنی اصلیت بتا دی ہو گی تو اس وقت کسی ایجنسی کی تحویل میں ہوگا۔''

''اگر پولیس نے اسے کسی ایجنسی کی تحویل میں دیا ہو تو کیا اس کا ریکارڈ ہوگا؟''

''مشکل ہے کیونکہ اس قسم کے کیسز کی صورت میں ریکارڈ صاف کر دیا جاتا ہے ورنہ عدالت میں کیس جانے کی صورت میں پولیس مشکل میں پڑ جاتی ہے۔''

''چل تو پھر بھی اس بارے میں معلوم کر اور بیتو کہیں ہے تو اسے دماغی مریض وغیرہ بنا کر وہاں سے نکلوانے کی کوشش کر۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' ندیم نے سر ہلایا۔ پھر اس نے اپنے بریف کیس سے ایک چھوٹا سا خاکی لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''یہ تیرے لیے ہے اسے بعد میں آرام سے دیکھنا اور کوشش کرنا کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔''

میں نے لفافہ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ لفافے میں ایک چھوٹی چوکور چیز تھی اور اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ میں نے پوچھا نہیں۔ پھر ندیم نے ایک عدد نوٹوں کی گڈی برآمد کی۔ یہ ہزار کے نوٹ تھے۔ ''یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔ سفیر نے کچھ رقم بھیجی ہے۔''

میں نے گڈی بھی لے لی۔ ''تجھ سے اگر فوری رابطہ کرنا ہو تو؟''

''لفافے میں موجود چیز سے تجھے سب مل جائے گا۔''

ندیم جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اس دوران میں اس نے صرف ایک گلاس سادہ پانی اور ایک کپ چائے لی تھی۔ میں نے کھانے پر رکنے کو کہا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے؟''

''جلدی ہے۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی رات سے پہلے گھر پہنچنا ہے اور پھر بیتو کے لیے کچھ اور یاں ہلانی ہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسے ہی اس کے بارے میں معلوم ہو مجھے ضرور مطلع کرنا۔'' میں نے کہا اور اسے مردانے کے باہر تک چھوڑنے کے لیے آیا۔

''اب میں یہاں نہیں آؤں گا سب جانتے ہیں میں تیرا وکیل ہوں۔''

''جن کے لیے اس بات کی اہمیت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں یہاں ہوں۔''

''پھر بھی تجھے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

ندیم کو رخصت کر کے میں کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ شمی مل گئی۔ ''آپ کے دوست کہاں گئے؟ ماں جی نے ان کے لیے کھانا بنوالیا ہے۔''

''اسے جلدی تھی واپس اسلام آباد جانا تھا۔'' میں نے کہا مجھے لفافہ دیکھنے کی جلدی ہو رہی تھی اس لیے میں نے شمی سے کہا۔ ''میں تھک گیا ہوں ذرا آرام کروں گا۔''

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

''بہت چالاک ہوگئی ہے۔'' میں نے اس کے بال چھیڑے اور کمرے کی طرف بڑھ گیا عقب سے اس کی خفگی آمیز چیخ سنائی دی تھی۔ بچپن میں جب اس کے بال چھیڑتا اوران کو بکھیر دیتا تو وہ اسی انداز میں چیخ مارتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوکر میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور سب سے پہلے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اندر سے ایک سیل فون نکلا تھا۔ یہ ایک چھوٹا لیکن طاقتور بیٹری والا سیل فون تھا۔ ندیم نے ڈبا پیک لیا تھا اور کھول کر مجھ تک لایا تھا۔ میں نے اسے آن کیا اور اس کی فون بک دیکھی حسبِ توقع اس میں ندیم اور سفیر کے نمبرز تھے۔ ندیم موبائل اسی مقصد کے تحت لایا تھا۔ لفافے میں ایک عدد چارجر تین مختلف موبائل کمپنیوں کی سمز اور ان سمز کے ہزار والے دو دو کارڈز تھے۔ میں نے ایک سم لگائی اور اس کے سگنل چیک کیے اس کے سگنل کمزور تھے اور بار بار غائب ہورہے تھے۔ دوسری سم کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا البتہ تیسری سم کی کارکردگی بہتر تھی۔ میں نے کارڈ لوڈ کیا اور سب سے پہلے ندیم کا نمبر ملایا۔

''تُو نے موبائل ایکٹو کرلیا۔'' اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ ''جب ضرورت ہو مجھے کہہ دیا کر میں تجھے کارڈ نمبر ایس ایم ایس کردوں گا۔''

''شکریہ یار تُو نے واقعی کام کا کام کیا ہے۔''

''بیٹے میں ہمیشہ کام کا کام کرتا ہوں۔''

''جیسے بچہ سازی۔'' میں بولا۔ ''جب تیرے گھر آؤ ایک نئے نمونے کا اضافہ ہوتا ہے۔''

''پانچ ہوگئے ہیں۔'' وہ ہنسا۔ ''گھر والی سے کہا ہے کہ بس کرو، میں وکیل ہوں بادشاہ نہیں ہوں آج کل تو بادشاہ بھی اتنے بچے افورڈ نہیں کرسکتے ہیں لیکن وہ مانتی ہی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے تو بچے اور کیس سنبھال اور جاتے ہی بیتو کو تلاش کرنا۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے جلدی سے موبائل آف کرکے لفافے میں ڈالا اور لفافے کو الماری میں رکھ دیا پھر دروازہ کھولا تو سامنے شمی کھڑی تھی اور مشکوک انداز میں گھور رہی تھی۔

''شیبی آپ کسی سے بات کررہے تھے؟''

میں مسکرایا۔ ''خود سے بات کررہا تھا...... اکیلے رہ رہ کر عادت سی پڑ گئی ہے۔''

شمی نے پھر کچھ کہا تو نہیں لیکن اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شفاف بھوری آنکھوں میں شک برقرار تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''آپ کو شجاع ماموں بلا رہے ہیں۔ ضروری بات ہے۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ندیم اور میری ملاقات کا احوال جاننا چاہتے ہیں۔ میں نے شمی سے کہا۔ ''ایک منٹ میں آتا ہوں۔''

میں نے لفافہ الماری میں ذرا اندر کرکے رکھا کیونکہ شمی کپڑے رکھتی اور نکالتی تھی۔ وہ بے تکلفی سے میری الماری کھول لیتی تھی۔ اس کی نظر لفافے پر پڑ جاتی تو وہ اسے بھی دیکھتی اور ابھی میں موبائل کی موجودگی چھپانا چاہتا تھا۔ میں منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر باہر آیا۔ شمی جاچکی تھی میں شجاع بھائی کے کمرے کی طرف آیا۔ وہ بستر پر دراز تھے۔

''آؤ شہباز۔'' انہوں نے کہا اور پاؤں سمیٹ لیے میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''جی شجاع بھائی آپ نے مجھے یاد کیا ہے؟''

انہوں نے سر ہلایا وہ سگار پی رہے تھے اور کسی قدر پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں خاموش رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد بولے۔ ''کل رات بابا کو ایک کال آئی۔''

''کیسے...... میرا مطلب ہے فون لائن تو......''

''ایکسٹینشن بابا کے کمرے میں ہے۔'' شجاع بھائی بولے تو میرے ذہن گھنٹی سی بجی۔ یہ انتظام کیا میری خاطر تھا کہ میں آزادی سے فون استعمال نہ کر سکوں۔

''کال کس نے کی تھی؟''

''کسی نامعلوم شخص نے۔'' وہ بولے۔ ''اس نے بابا کو دھمکی دی کہ وہ ایک بیٹے سے محروم ہو چکے ہیں اور اگر شہباز حویلی سے باہر نکلا تو وہ بھی مارا جائے گا۔''

میں مسکرایا۔ ''بابا نے اس شخص سے پوچھا نہیں کہ اسے ان سے ایسی کیا ہمدردی ہے جو وہ ان کے دوسرے بیٹے کو بچانا چاہتے ہیں۔''

''معاملہ تمہارا ہے۔'' شجاع بھائی نے سگار کا گہرا کش لیا تو کمرے میں اس کی غیر محسوس خوشبو پھیل گئی۔ ''وہ چاہتے ہیں تم کسی صورت حویلی سے باہر نہ جاؤ۔''

''یہ تو واضح ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کو مجھ سے کوئی ہمدردی ہے۔ فی الحال میرا باہر جانا ان کے مفاد میں نہیں ہے۔''

''اس کی وجہ؟''

''الیکشن۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مرشد اور اس کے آدمی اس بار الیکشن میں بھرپور حصہ لے رہے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ میں باہر آؤں اور ہنگامے ہوں تو اس کی الیکشن مہم خراب ہو۔''

شجاع بھائی نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''کیا تم اس کی الیکشن مہم خراب کر سکتے ہو؟''

''میں نہیں وہ خود کرے گا۔ میں باہر جاؤں گا تو اس کے گرگے میرا پیچھا کریں گے اور اس دوران میں جو ہنگامے ہوں گے اس کا اثر اس کی ذات پر بھی پڑے گا۔''

شجاع بھائی سوچ میں پڑ گئے۔ وہ میری بات سمجھ رہے تھے۔ میں نے کھل کر نہیں کہا تھا لیکن میرا مطلب یہی تھا کہ جب دشمن میرے پیچھے پڑے گا تو مجھے اپنا دفاع کرنا ہوگا اور اس دوران میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ''شہباز میرا خیال ہے تمہیں فی الحال حویلی سے نکلنے سے گریز کرنا چاہیے۔''

''آپ کا خیال ہے یا بابا کا؟'' میں نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔

''بابا کا بھی یہی خیال ہے۔''

''مجھے کب تک حویلی میں رہنا ہوگا؟''

''جب تک شاہد کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگ جاتا۔''

''معاف کیجئے گا شجاع بھائی اس ملک میں کبھی اندھے قتل کا سراغ لگا ہے۔ یہاں تو وزیر اعظم کے قاتل نہیں پکڑے جاتے سرِعام ان کو موت کے گھاٹ اتار کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے شاہد کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جائیں گے۔''

''بہت مشکل ہے کیونکہ قانون ان کو پکڑنا ہی نہیں چاہے گا۔''

''پھر کون پکڑے گا؟''

''اگر اللہ نے موقع دیا تو میں ان کو پکڑوں گا ان سے حساب لوں گا۔''

''فرد کے انصاف لینے کا کوئی تصور نہیں ہے۔'' شجاع بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا صرف قبائلی معاشروں میں ہوتا ہے۔''

''ہمارا ملک قبائلیت سے بھی بدتر حالت میں ہے وہاں آدمی اپنے زور بازو پر بھروسہ کر سکتا ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''لیکن اس مہذب معاشرے میں لوگوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے اور وہ اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو لیکن اس مسئلے کا یہ حل نہیں ہے۔ ہمیں بالآخر قانون کی راہ اپنانا ہو گی۔''

''درست ہے لیکن انصاف نہیں ملے گا۔ انصاف صرف صاحب اختیار کو ملتا ہے۔''

''ایسا نہیں ہے شہباز معاشرہ رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہا ہے اس تبدیلی کی رفتار سست ہے لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ تبدیلی سب کو محسوس ہو گی۔''

میں سوچ رہا تھا کہ شجاع بھائی مجھے قائل کر رہے تھے کہ میں حویلی میں رک جاؤں اور جب تک ان کی اور بابا کی طرف سے اجازت نہ ملے میں باہر نکلنے کا سوچوں بھی نہیں۔ جب کہ میرے دشمن بھی یہی چاہتے تھے۔ عجیب بات تھی میرے جان کے گاہک اور میری جان کے خیر خواہ ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''شجاع بھائی آپ کے خیال میں کیا اس مسئلے کا حل یہی ہے؟''

وہ چونکے۔ ''تو تمہارا خیال کیا مختلف ہے؟''

''جی ہاں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ دشمن کبھی آپ کا بھلا نہیں چاہ سکتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اس کا مفاد ہے اور جیسے ہی اس کا مفاد پورا ہو گا وہ پوری قوت سے حرکت میں آ جائے۔ اس وقت وہ مجھ سے کوئی رعایت نہیں کرے گا اور اسے معلوم ہے کہ میں کہاں ہوں۔''

شجاع بھائی نے سر ہلایا۔ ''اتنا تو میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے اس لیے تم یہاں رہ سکتے ہو اس دوران میں ہم مل کر کوئی تدبیر سوچ سکتے ہیں۔''

''دشمن بے وقوف نہیں ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ مجھے یہاں بھیج کر مطمئن نہیں ہو گا بلکہ میری نگرانی کا کوئی نہ کوئی بندوبست کیا ہو گا۔''

''وہ بھی دیکھ لیں گے۔ حویلی میں تم محفوظ ہو یہاں تین افراد حفاظت کے لیے موجود ہیں اور کم سے کم دو افراد مستقل پہرے پر ہوتے ہیں لیکن ان کو بھی تمہاری موجودگی کا علم نہیں ہے۔''

''یہ آپ کے اعتماد کے لوگ ہیں؟''

''ہاں میرا ایک واقف کار کرنل ان دنوں اسلام آباد میں سکیورٹی ایجنسی چلا رہا ہے یہ بندے وہیں سے آئے ہیں سب اس کے چنے ہوئے لوگ ہیں۔''

''چنے ہوئے لوگ بھی بک جاتے ہیں۔'' میں نے دبی زبان میں کہا۔ ''خیر آپ کو اعتماد ہے تو ٹھیک ہو گا۔''

''ان کے ہوتے ہوئے کوئی حویلی میں نہیں گھس سکتا ہے۔'' شجاع بھائی نے اعتماد سے کہا۔ ''باقی معاملات میں دیکھ رہا ہوں تم مجھ پر بھروسہ رکھو ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم کسی سے رابطہ بھی نہیں کرو گے۔'' شجاع بھائی نے اگلا مطالبہ کیا۔ وہ رفتہ رفتہ کھل رہے تھے۔

''کسی سے کیا مراد ہے ندیم جانتا ہے کہ میں کہاں ہوں؟''

''کسی سے مراد تمہارے وہ دوست اور ساتھی ہیں جو اس لڑائی میں تمہارے شانہ بہ شانہ رہے ہیں۔'' شجاع بھائی نے واضح کہا۔ ''ان کی یہاں موجودگی تمہارے دشمنوں کو اکسا سکتی ہے اور بابا حویلی یا گاؤں میں کوئی ہنگامہ برداشت نہیں کریں گے۔''

''شاہد بھائی کا قتل میرے آنے سے پہلے ہو چکا تھا۔'' میں نے ان کو یاد دلایا۔ ''گویا میں یہاں ہوں یا نہ ہوں میرے دشمنوں کو چین نہیں ہوگا اور میں ان سے کسی رعایت کی توقع بھی نہیں کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں لیکن میں جو کہہ چکا ہوں اسے بابا کا حکم سمجھنا۔'' شجاع بھائی کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''اور تم جانتے ہو بابا اپنے حکم کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتے ہیں۔''

''جی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میرے انداز میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔ ''میں بابا کی بات کا خیال رکھوں گا۔''

شجاع بھائی نے میرے اندر موجود کبیدگی کو محسوس کر لیا تھا اس لیے انہوں نے موضوع بدل دیا۔ ''کل میں اور عائشہ جا رہے ہیں۔''

''کیا چھٹی ختم ہو گئی ہے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ہاں بچوں کے اسکول بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا کافی حرج ہو چکا ہے۔''

میں نے کمرے میں آتی عائشہ بھابی کی طرف دیکھا۔ ''میں بدنصیب انسان ہوں جو اتنے اچھے لوگوں سے دور ہوں۔''

''ایسا مت کہو۔'' وہ بولیں۔ ''اگر تم نے ہمیں مس کیا تو ہم نے تمہیں اس سے کئی گنا زیادہ مس کیا ہے اس حویلی میں اور ہماری زندگی میں شاید ہی کوئی پل ایسا ہو جب ہمیں تمہاری یاد نہ آتی ہو۔ شادی کے بعد میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے لیکن تمہارا اتنا ذکر سنا اور کیا ہے کہ تم ایک لمحے کو بھی نامانوس نہیں لگے۔ یوں لگا جیسے ہمیشہ سے ہمارے ساتھ رہتے آئے ہو۔''

''اب آپ چلے جائیں گے اور حویلی سونی ہو جائے گی۔''

''اللہ نہ کرے۔ یہاں سب ہیں، شمی، باجی، بابا، ماں جی اور......سویرا بھی ہے۔''

''ہم بھی دو مہینے بعد چکر لگائیں گے۔'' شجاع بھائی بولے۔ ''مجھے ایک ایکسرسائز پر کوئٹہ جانا ہے۔ عائشہ اور بچے یہاں آ کر چھوڑ جاؤں گا بچوں کے اسکول بھی بند ہو جائیں گے۔''

دو مہینے، میں نے سوچا اس کا مطلب تھا کہ کم سے کم دو مہینے مجھے روکنے کا ارادہ تو تھا ویسے بھی الیکشن میں ابھی چار مہینے تھے۔ جب سانپ کے کینچلی بدلنے کا وقت آتا ہے تو وہ سُست اور کمزور ہو جاتا ہے اس وقت اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جائے جہاں اس کے دشمن اس تک رسائی حاصل نہ کر سکیں اور وہ آرام سے کینچلی بدل کر دوبارہ سے طاقتور اور چست ہو جائے۔ مرشد کے کینچلی بدلنے کا وقت تھا اور وہ اس وقت خود کو کمزور پا رہا تھا اس لیے اس کی کوشش تھی کہ مجھ جیسے دشمن سے دور رہے جو اب پہلے کی طرح کمزور نہیں رہا تھا بلکہ میں نے بھارت اور پھر نیپال میں اپنے دشمنوں کے ساتھ جو کیا تھا اس نے یقیناً مرشد کا دل دہلا دیا تھا اور وہ مجھے خود سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ میری خوش فہمی نہیں تھی۔ مرشد کبھی بھی مجھ سے غافل نہیں رہا اور اسے ڈیوڈ شا اور فتح خان کے توسط سے میرے بارے میں معلومات ملتی رہی تھیں کہ میں کیا کارنامے انجام دے رہا ہوں۔ ایک ملک کی مسلح فوج سے اُس کی سرزمین پر لڑنا خودکشی سے کم نہیں ہوتا ہے لیکن میں یہ بھی کر گزرا۔ چھوٹے موٹے معرکے تو لاتعداد تھے۔ جن میں خدا نے ہر بار مجھے سُرخروئی عطا کی۔ مرشد کے علم میں یہ سب آتا رہا تھا۔ اسے یقیناً احساس ہو گیا تھا کہ جس شخص کو وہ ایک معمولی بزنس مین سمجھ رہا تھا اس کی کرم نوازیوں کے بعد وہ معمولی بزنس مین نہیں رہا تھا اب میں جانوں کا تاجر بن گیا تھا اور زندگیوں کا سودا کرتا تھا۔ مرشد جیسا بزدل اور حفاظتی حصاروں میں رہنے کا عادی بھلا ایک ایسے دشمن سے سامنا کرنے کو کیوں تیار ہوتا جو آگ و آہن کے میدان سے گزرنا سیکھ گیا ہو۔

میں سوچ رہا تھا اس دوران میں شمی اور باجی بھی آ گئیں۔ سویرا ماں جی کے پاس تھی۔ وہ دونوں عائشہ بھابی کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ ان کا سامان خاصا تھا۔ شجاع بھائی آرمی جیپ میں واپس جاتے۔ ان کو لینے ان کا اردلی آنے والا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ نے راستے میں حفاظت کے لیے کوئی محافظ لیا ہے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''میرے پاس پسٹل ہے اور نواز ایس ایم جی کے ساتھ آئے گا۔ وہ تربیت یافتہ آدمی ہے۔''

''پھر بھی آپ محتاط رہیے گا اور کوشش کریں گے ذرا دن چڑھے روانہ ہوں۔''

''ہم صبح نو بجے نکلیں گے۔'' وہ بولے۔

شجاع بھائی ان دنوں سرگودھا میں تھے۔ میانوالی سے دو گھنٹے کا سفر تھا۔ اس لیے زیادہ فکر کی بات نہیں تھی لیکن مرشد جیسے کمینے دشمنوں سے انسان ہر بات کی توقع کر سکتا ہے۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ الیکشن کے بعد پوری قوت سے میرے خلاف حرکت میں آئے گا اور اس وقت وہ صرف مجھے نہیں بلکہ مجھ سے متعلق ہر فرد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ شاہد بھائی کا قتل اس کی ایک مثال تھی۔ یہ قتل اس نے صرف ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے کرایا تھا۔ شجاع بھائی اور بابا اس کے دباؤ میں آ گئے تھے اور اب ان کو میری خاندان کے باقی افراد کی فکر تھی۔

یہ صرف مرشد کی ایک چال تھی۔ اس نے ایک تیر سے کئی شکار کیے تھے۔ اس نے اپنے بھائی کا بدلہ معہ سود کے لے لیا تھا۔ اس نے مجھے سزا دی تھی اور میرے گھر والوں کو ڈرا کر مجھے حویلی میں قید کرا دیا تھا اس طرح اس نے اس سر درد سے بھی نجات حاصل کر لی تھی۔ پھر جب اسے میری ضرورت پڑتی تو میں حویلی میں اسے

دستیاب ہوتا لیکن ساتھ ہی مجھے شک تھا کہ مرشد اتنی پلاننگ سے کام کر سکتا تھا۔ یقیناً اس پلاننگ کے پیچھے فتح خان اس کے اعزازی والد ڈیوڈ شا کا ہاتھ تھا۔ فتح خان بہ ظاہر مرشد سے کم رتبہ اور حیثیت کا آدمی تھا لیکن اس نے اپنی ذہانت اور بے خوفی سے ڈیوڈ شا کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ فتح خان اور ڈیوڈ شا میرے دشمن ہوتے ہوئے بھی میرے خون کے پیاسے نہیں تھے۔ جیسا کہ فتح خان نے بھی کہا تھا کہ وہ اب میرا دشمن نہیں ہے۔ اسی طرح ڈیوڈ شا مجھے مارنے کے بجائے مجھ سے کام لینے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔

لیکن عجیب بات تھی کہ مرشد میری جان کا دشمن تھا اور فتح خان بھی ایک زمانے میں میرے خون کا پیاسا رہا تھا۔ اگرچہ آج کل وہ مجھے اپنے بے ضرر ہونے کا یقین دلانا چاہ رہا تھا اور اپنی دشمنی سے دستبردار ہو چکا تھا لیکن میں اس شاطر پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ فتح خان کسی لومڑی کی طرح مکار اور کسی لکڑ بھگے کی طرح سفاک تھا۔ لکڑ بھگا اس وقت اپنے شکار پر جھپٹتا ہے جب وہ اس کے سامنے بے بس ہو چکا ہو۔ مگر میں نے بہت کم ان دونوں دشمنوں سے خوف محسوس کیا تھا لیکن ڈیوڈ شا ایک ایسا شخص تھا جس سے میں ان دونوں سے زیادہ خطرہ محسوس کرتا تھا۔ میرا اس سے تین چار مرتبہ ہی سامنا ہوا ہے لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اندر سے انتہائی سرد مزاج اور سفاک انسان ہے۔ ایک ایسا شخص جو برسوں پرانے دوست کو قتل کر کے اس کی لاش کے پاس بیٹھ کر کھانا بھی کھا سکتا ہے اور سکون سے سو بھی سکتا ہے۔

مجھے حویلی میں قید کرنے کا منصوبہ ممکنہ طور پر ڈیوڈ شا یا فتح خان کا تھا اور مرشد کسی وجہ سے ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ اس نے مجھے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن جہاں اس کا داؤ چلا اس نے کام کر دیا۔ یعنی شاہد بھائی کا قتل۔ اب وہ سکون سے انتظار کر رہا تھا کہ کب الیکشن میں کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کے بعد اپنی باقی حسرتیں نکالے گا۔ یہ سارے امکانات میرے ذہن میں موجود تھے۔ جب تک میں حویلی سے نکل کر میدان عمل میں نہیں آتا مجھے درست طور پر معلوم نہیں ہوتا۔

رات کے کھانے کے بعد شجاع بھائی اور عائشہ بھابی کچھ دیر ہم سب سے بات کرتے رہے تھے پھر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے صبح جلدی اٹھ کر جانا تھا۔ ماں جی ویسے ہی جلدی سو جانے کی عادی تھیں اور باجی بھی اپنے کام نمٹا کر سونے چلی جاتی تھیں۔ شمی اور سویرا کو اتنی جلدی نیند نہیں آتی تھی اس لیے وہ رات ذرا دیر تک جاگتی تھیں لیکن گیارہ بجے تک حویلی کا ہر فرد سو چکا ہوتا تھا۔ میں گیارہ بجے اپنے کمرے میں آیا۔ اس وقت تک سب کمروں کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے موبائل نکالا اور اسے آن کیا۔ میں نے پہلے ندیم کو کال کی۔

''کیا بات ہے تجھے چین نہیں ہے۔'' اس نے میری آواز سن کر کہا۔

''ایک بات تجھ سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ نادر علی کا کیا ہوا؟''

''میں بھی بتانا بھول گیا تھا۔ اسے علاج کے لیے دبئی بھیجا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ واپس آ گیا تھا اور یہاں کسی نیم حکیم کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے اسے ایسے کشتے کھلائے کہ اس کا کولیسٹرول لیول بہت بڑھ گیا اور اب اسے فالج بھی ہو گیا ہے۔ اس کا جسم مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہے اور وہ بات بھی بڑی مشکل سے کرتا ہے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔'' ندیم نے تفصیل سے بتایا۔

میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''شاید ایک مہینہ ہوا ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''تُو کیوں پوچھ رہا ہے لعنت بھیج اس پر۔''

''ہاں بھیج دی۔'' میں نے بے خیالی میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔ ایک مہینہ پہلے نادر علی فالج کا شکار ہوا اور شاید اس کی صحت یابی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ ایسے میں مرشد کا غیض وغضب کا شکار ہونا لازمی تھا۔ میں اس کی دسترس سے دور تھا۔ سفیر، مونا اور وسیم بھی اس کی پہنچ میں نہیں تھے اس لیے اس کے اندھے انتقام کا رخ میرے گھر والوں کی طرف مڑ گیا۔ مرشد کی کمینگی اور خباثت پر مجھے پہلے بھی شک نہیں رہا تھا وہ ہر حد سے گزر جانے والا شخص تھا جس کے لیے اپنی ذات کے علاوہ کسی چیز کی اہمیت نہیں تھی۔ میرے جبڑے بھنچ گئے تھے اور میں نے اتنی سختی سے موبائل فون پکڑ رکھا تھا کہ اگر یہ مضبوط دھات کا نہ ہوتا تو یقیناً میری گرفت میں چرمرا جاتا۔ اچانک اس کی بیل بجی تو میں چونکا تھا اور میرا جسم نرم پڑ گیا۔ میں نے اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ یہ باہر ملک کا تھا اور کوڈ شاید یو اے ای کا تھا لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو کون بات کر رہا ہے؟''

''شوبی...... میں سفیر بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے کسی نے کہا لیکن مجھے اس کی آواز اجنبی سی لگی تھی۔

''ہاں سفیر ہی ہے؟''

''ہاں یار۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے میری جان۔''

وہ یقیناً شاہد بھائی کا افسوس کر رہا تھا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ ''ہاں یار ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے۔''

''یہ یقیناً اسی حرامزادے کا کام ہوگا؟'' سفیر اب خود پر قابو پا چکا تھا۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے لیکن کنفرم نہیں ہے۔ تُو کہاں سے بات کر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو سفیر یہی کہتا کہ منہ سے بات کر رہا ہوں تُو کہاں سے بات کرتا ہے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا وہ میرے بھائی کی تعزیت کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دبئی میں ہوں میں نے یہاں کا بزنس ویزہ لے لیا ہے اور ساتھ ہی مکان بھی خرید لیا۔ اب میں یہاں بلا کھٹکے رہ سکتا ہوں۔''

''یہ تُو نے اچھا کیا۔'' میں خوش ہو گیا۔ ''وسیم اور سادی کا کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں...... فی الحال تو جیسے آئے تھے ویسے ہی چل رہا ہے۔ میں نے ان کے سلسلے میں ندیم سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے ان کا پاکستان آنا مناسب نہیں ہے خاص طور سے سادی کا تو بالکل مناسب نہیں ہے۔ تُو سمجھ رہا ہے نا؟''

''ہاں ندیم آیا تھا آج، مجھے بھی یہی مشورہ دیا ہے اور میں اس سے متفق ہوں۔''

''لیکن میں متفق نہیں ہوں۔'' وسیم کی آواز آئی۔ ''میں ہر صورت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔''

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔''

''مناسب غیر مناسب کا مجھے نہیں پتا۔'' وسیم کا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا۔ ''لیکن میں اب آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ

سکتا۔''

''یار یہاں صورتِ حال الجھ گئی ہے اور جب تک یہ واضح نہ ہو جائے تمہارا یا کسی کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہو گا۔''

''شہباز صاحب مجھے یقین ہے آپ اس وقت خطرے میں ہیں۔''

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن میں پہلے خطرے کی نوعیت سمجھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میرے گھر والے پہلے ہی ناقابلِ تلافی نقصان اٹھا چکے ہیں اور میں اس نقصان میں مزید اضافہ نہیں چاہتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ رہا ہوں۔'' وسیم کے جذباتی لہجے میں نرمی آئی تھی۔

''اس لیے میں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن شہباز صاحب آپ سے دوری برداشت نہیں ہوتی ہے۔'' وسیم نے بے بسی سے کہا۔

''مجھے یقین ہے ہم بہت جلد ایک ساتھ ہوں گے۔ ابھی تو مجھے بیتو کو بھی تلاش کرنا ہے۔''

''بیتو کہاں ہے؟'' وسیم چونک گیا۔

میں نے اسے تفصیل سے خود پر گزرنے والی سنائی۔ ''بیتو کے بارے میں مجھے یقین ہے وہ فتح خان کے قبضے میں ہے۔''

''لیکن اسے بیتو کو قبضے میں رکھنے سے کیا ملے گا؟''

''غالباً وہ بیتو کو قبضے میں رکھ کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے کہ میں حویلی سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''کیا آپ کو اس سلسلے میں کوئی دھمکی ملی ہے؟''

''نہیں مجھے تو براہِ راست کسی نے دھمکی نہیں دی ہے لیکن میرے والد اور بھائی سے جن لوگوں نے بات کی ہے انہوں نے بھی بیتو کے حوالے سے دھمکی نہیں دی ہے۔''

''تب ممکن ہے بیتو کو فتح خان نے اپنے کسی مقصد کے تحت روک لیا ہو۔'' وسیم بولا۔

''ممکن ہے لیکن نہ جانے کیوں میری چھٹی حس خبردار کر رہی ہے کہ معاملہ یہی ہے۔ بہرحال دیکھتے ہیں۔''

وسیم کے بعد مونا اور سادی نے بھی بات کی اور ظاہر ہے ان کی تمام گفتگو انتہائی جذباتی اور بغیر سر پیر کے تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں یا تو ان کے پاس آجاؤں یا وہ پاکستان آرہی ہیں۔ مونا نے رو کر کہا۔ ''پلیز شوبی ہم تمہیں بہت مس کر رہے ہیں۔''

''مس تو میں بھی کر رہا ہوں لیکن کیا کر سکتے ہیں۔ تم حالات جانتی ہو میں قانونی طریقے سے نہیں آسکتا ہوں اور غیر قانونی مناسب نہیں ہو گا۔''

''ہم تو آسکتے ہیں۔''

''یہ جاننے کے باوجود کہ میرے دشمن حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔'' مجھے کسی قدر غصہ آگیا۔ ''اب میں

مزید کوئی نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے یہ میرا حکم ہے میری مرضی کے بغیر کوئی معمولی سی حرکت بھی نہیں کرے گا۔''

سفیر نے اپنے فون کا اسپیکر آن کردیا تھا اس لیے سب سن رہے تھے۔ جب میں نے کہہ کر بات ختم کردی تو وہ سب اپنی سنانے لگے۔ سفیر نے جو بزنس ویزہ لیا تھا اس کی بنیاد پر وہ مزید چار افراد کو باہر سے بلا سکتا تھا اس لیے اس نے وسیم اور سادی کو ویزہ دلوادیا تھا اور اب وہ آرام سے بنا کسی کھٹکے کے دبئی میں رہ سکتے تھے۔ سفیر نے وقت گزاری کے لیے کام بھی شروع کردیا تھا۔ اس نے کچھ پاکستانی فرم سے رابطہ کرلیا تھا اور پاکستان سے تازہ سبزیاں اور پھل منگوا کر دبئی کی مارکیٹ میں فراہم کررہا تھا۔ پاکستان میں اس کے کاروباری ساتھی اس کے چچا زاد بھائی تھے اس لیے اسے کوئی خدشہ بھی نہیں تھا۔ اس نے دوسودوں میں اچھا خاصا کما لیا تھا۔

''یوں سمجھ لیں کہ اتنا کما لیا ہے کہ چھ مہینے بیٹھ کر آرام سے کھا سکتے ہیں۔''

سفیر نے مکان دبئی کی ایک مضافاتی بستی میں چھوٹا سا دومنزلہ مکان لے لیا تھا جس میں چار بیڈروم ایک ڈرائنگ روم اور ایک لاؤنج تھا۔ ایک بیڈ ڈرائنگ اور لاؤنج معہ کچن کے نیچے تھا جب کہ تین بیڈروم اوپر تھے ان کے ساتھ ایک اوپن ٹیرس تھا۔ یہ مکان سفیر کو پانچ لاکھ درہم میں ملا تھا اور اس نے مزید کوئی ایک لاکھ درہم خرچ کرکے اسے شاندار طریقے سے فرنش بھی کرلیا۔ مونا اور سفیر کی شادی کو دو مہینے سے زیادہ ہوچکے تھے۔ میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے تم لوگوں کی طرف سے ابھی کوئی خوشی کی خبر نہیں آئی ہے۔''

اس سوال پر سفیر نے قہقہہ مارا کیونکہ مونا اٹھ کر بھاگ گئی تھی۔ پھر سادی نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سفیر نے کہا۔ ''تیرا دماغ خراب ہے۔ شادی کرنے کا اور یہاں گھر لینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم نے نارمل زندگی شروع کردی ہے۔ تُو جانتا ہے شادی میں نے گناہ کا امکان ختم کرنے کے لیے کی ہے اور گھر لینا مجبوری ہے۔ ورنہ تیرے بغیر ہم نارمل زندگی کا سوچ ہی نہیں سکتے ہیں۔ بچے وغیرہ کا ابھی کوئی امکان نہیں ہے۔''

''سفیر میرے چکر میں تُو اپنی خوشیوں کو پسِ پشت مت ڈال......'' میں نے کہنا چاہا تو سفیر نے فون وسیم کو تھما دیا۔

''اب تم بات کرو یہ بہک رہا ہے۔''

وسیم نے فون لیا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں شہباز صاحب آپ کے بغیر کوئی بھی نارمل زندگی کا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔''

میں اور وسیم کچھ دیر بات کرتے رہے پھر خدا حافظ کہہ دیا۔ دبئی سے کال بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اگرچہ سفیر کو رقم کا مسئلہ نہیں تھا لیکن پھر بھی فضول خرچی سے گریز ضروری تھا۔ موبائل فون آف کرکے میں نے اسے الماری میں مخصوص جگہ چھپا دیا۔ بستر پر دراز ہوکر میں کروٹیں بدلتا رہا خاصی دیر بعد جا کر نیند آئی تھی۔ مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی اس لیے میں نے کمبل نہیں لیا رات کسی وقت سردی لگی تو میں سکڑ سمٹ کر لیٹ گیا۔ نیند میں مجھے کمبل کا خیال نہیں آیا پھر میں نے محسوس کیا کہ کسی نے بہت آہستہ سے کمبل میرے اوپر کردیا تھا۔

اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے سویرا کو پاس دیکھا تھا۔ اس کے سنہری ہاتھ میرا کمبل درست کررہے تھے

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''تم اس وقت یہاں......؟''

گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ سویرا گھبرا گئی۔ ''وہ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑی اور جانے لگی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نے تم سے کوئی وضاحت نہیں مانگی ہے۔''

اس نے سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں مجھے جانے دیں کوئی آ گیا تو......؟''

لیکن میں نے اس کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ''سویرا تم مجھ سے کیوں کتراتی ہو؟''

وہ ہلکی سی مزاحمت کر رہی تھی میرا سوال سن کو اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ ''آپ نے ایسا کیوں کہا؟''

''یہ سچ ہے۔''

''یہ سچ نہیں ہے لیکن آپ خود سوچیں کہ کیا آپ سے ملنا مناسب ہے صغراں آپا، شمی اور عائشہ بھابی ہمارے تعلق کے بارے میں جانتی ہیں۔''

''ماں جی اور بابا؟''

''مجھے نہیں معلوم......لیکن شاید وہ بھی جانتے ہیں۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑے رکھا۔ ''سویرا تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا؟''

''میرا مستقبل؟'' اس نے جیسے خود سے کہا اور پھر بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''میرا مستقبل کیا ہے۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں ہے۔'' میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''تم ایک خود مختار عورت ہو۔ اب تم نادان اور کمسن لڑکی نہیں ہو جس پر بابا اپنی مرضی مسلط کر دیں۔''

''وہ آج بھی مجھ پر اختیار رکھتے ہیں۔'' سویرا نے تردید کی۔ ''وہ میرے بارے میں کسی بھی فیصلے کے مجاز ہیں۔''

''یہ درست کہہ رہی ہے۔'' اچانک بابا کی آواز آئی اور ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں بابا کھڑے شرربار نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے آتی دھوپ بتا رہی تھی کہ صبح ہو چکی تھی اور میرے جسم پر کمبل پڑا تھا۔ وہ سب خواب تھا لیکن جسم پر پڑا کمبل خواب نہیں تھا۔ کوئی رات کو آیا تھا اور اس نے مجھ پر کمبل ڈالا تھا۔ میں اٹھا تو بستر پر ایک نگ جیسا نظر آیا۔ یہ شیشے کا سبز نگ تھا اور کسی زیور سے نکلا تھا۔ میں نے اٹھا کر اسے جیب میں ڈال لیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' میں نے بلند آواز سے کہا تو شمی اندر آئی۔

''گڈ مارننگ شیبی۔'' اس نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ ''آج تو آپ لمبی تان کر سوتے رہے۔''

''ہاں شاید کئی دن کی تھکن اتر رہی تھی۔'' میں نے کہا۔

''آپ فریش ہو جائیں میں ناشتہ لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ باقی لوگ ناشتہ کر چکے تھے۔ سردی ہو یا گرمی حویلی میں ناشتہ صبح سویرے کر لیا جاتا تھا۔ بابا اور ماں جی تو فجر کی نماز کے بعد ہی ناشتہ

کر لیتے تھے۔ اس وقت ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے۔ مجھے شجاع بھائی کا خیال آیا اور واش روم سے نکل کر میں ان کے کمرے میں آیا تو وہ بھابی اور بچوں سمیت جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ ''اپنا خیال رکھنا اور حویلی سے باہر مت جانا۔''

''آپ فکر مت کریں آپ بھی پہنچ کر اطلاع کر دیجئے گا۔'' میں نے کہا۔ بھابی سے سلام دعا کر کے میں نے بچوں کو پیار کیا۔ چند منٹ بعد شجاع بھائی روانہ ہو گئے۔ میں ان کو مردانے تک چھوڑنے آیا۔ وہاں وہ کچھ دیر کے لیے بابا کے کمرے میں گئے اور پھر باہر نکل گئے۔ ان کا اردلی سامان پہلے ہی جیپ پر بار کر چکا تھا۔ ماں جی، آپا اور شمی کے ساتھ سویرا بھی انہیں رخصت کرنے آئی تھی۔ ان کے جانے پر سب اداس تھے اور پھر یہ اداسی سناٹا بن کر حویلی میں پھیل گئی سب اپنے اپنے حصوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے سویرا کو دیکھا تو حسبِ معمول اس نے چادر سے خود کو پوری طرح لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے شمی سے کہا۔

''ناشتہ ماں جی کے کمرے میں لا دو۔''

میں ماں جی کے ساتھ آ گیا۔ وہ شجاع بھائی کے جانے سے اداس تھیں۔ انہوں نے گہری سانس لی۔ ''یہ اولاد بھی کیا ہوتی ہے، دکھ زیادہ دیتی ہے اور سکھ کم دیتی ہے۔''

''یہ شاید فطرت کا قانون ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ماں باپ اولاد کو سکھ دیتے ہیں لیکن اولاد ان کو دکھ ہی دیتی ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے میرے بچے اس معاملے میں بہت اچھے ہیں لیکن اولاد کے دکھ بھی تو اپنے ہوتے ہیں۔'' ماں جی نے کہا اور چادر سے آنکھ صاف کرنے لگیں۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''ماں جی کیا بابا کو بھی ہمارے دکھ کا احساس ہوتا ہے؟''

ماں جی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''کیوں نہیں ہوتا آخر وہ تم لوگوں کے باپ ہیں۔''

''ماں جی مجھے تو ایسا نہیں لگتا ہے۔''

''شہباز بکواس نہ کر۔'' ماں جی کو غصہ آ گیا تھا۔ ''تُو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا وہ تو اولاد سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ اس کے لیے جان بھی دے دیں۔''

''تب وہ مجھ سے کیوں نہیں ملتے؟''

''یہ تو وہی جانتے ہیں۔'' ماں جی کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ ''لیکن یہ خیال دل سے نکال دے کہ وہ تجھ سے محبت نہیں کرتے ہیں۔''

میں دل میں سوچ کر رہ گیا کہ نہ جانے یہ کیسی محبت ہے جو وہ چھ سال بعد بھی میری صورت دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شمی ناشتہ لے آئی اور میں کھانے لگا لیکن میرا دل بجھ گیا تھا میں نے چند لقمے لے کر ہاتھ کھینچ لیا۔ ماں جی نے کہا۔ ''شہباز اتنا سا کیوں کھایا ہے صحیح سے کھا پتر۔''

''بس ماں جی بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''شمی مجھے چائے کمرے میں لا دو۔''

''ابھی لائی۔''

میں باہر راہداری میں آیا اور سویرا کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگا تو رک گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا

اور سویرا آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ اس کے ہلکے براؤن رنگ کے لمبے اور گھنے بال کمر سے بھی نیچے آ رہے تھے۔ وہ برش پھیر رہی تھی تب میری نظر اس کی کلائی میں موجود کنگن پر گئی جس میں سبز رنگ کے نگ لگے تھے۔ مجھے اس نگ کا خیال آیا جو صبح بستر پر ملا تھا میں نے اسے جیب سے نکالا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے نگ سویرا کی کلائی کے کنگن میں لگے تھے۔

میں اندر داخل ہوا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر کرسی پر رکھا دوپٹہ سر پر ڈال لیا۔ ''آپ......؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا اور اس کے پاس آ گیا۔ ''رات کوئی میرے کمرے میں آیا تھا۔''

اس کا رنگ بدلا تھا لیکن وہ انجان بن کر بولی۔ ''کون آیا تھا؟''

''آیا تھا کوئی بنا اجازت کے اس لیے میں نے بھی اندر آتے ہوئے اجازت نہیں چاہی۔''

اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''آپ کے کمرے میں بنا اجازت کے آنے والے نے غلط کیا لیکن اس کمرے میں آنے کے لیے آپ کو کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جو آیا تھا اسے بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہے لیکن افسوس وہ رات کو بالکل خاموشی سے آیا اور بنا احساس دلائے چلا گیا لیکن جاتے جاتے ایک نشانی چھوڑ گیا تھا۔''

وہ فکر مند ہو گئی۔ ''کیسی نشانی؟''

میں نے اس کا ہاتھ اٹھایا اور اس کی گلابی ہتھیلی پر سبز نگ رکھ دیا۔ ''یہ نشانی......''

اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں اور میں کمرے سے نکل آیا۔ شمی چائے سمیت کمرے میں تھی اس نے شوخی سے کہا۔ ''آپ کہاں رہ گئے تھے؟''

''ایک جگہ رک گیا تھا۔'' میں نے اس سے کپ لے لیا۔ میرے کمرے کی کھڑکی عقبی صحن کی طرف کھلتی تھی جہاں شہتوت اور نارنگی کے چند چھوٹے درخت تھے اور سردی میں ان کے پتے جھڑ رہے تھے۔

''کہاں رک گئے تھے؟''

''سویرا کے کمرے میں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

شمی بستر پر تکیہ گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے جھجک کر کہا۔ ''شیی آپ کو پتا ہے میں آپ کے اور سویرا مامی کے بارے میں جانتی ہوں؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں معلوم ہے۔''

''جب سویرا مامی اور شاہد ماموں کی شادی ہوئی تو میں چھوٹی تھی اور اس وقت بہت خوش تھی مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا پھر کچھ عرصے پہلے میں نے امی اور سویرا مامی کی باتیں سن لیں اور تب مجھے پتا چلا کہ وہ آپ سے...... میرا مطلب ہے آپ کو پسند کرتی تھیں۔ تب مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ہمارے نصیب میں ملنا نہیں تھا۔''

''ہاں لیکن شیی اب ان کو آپ کی ضرورت ہے۔'' شمی نے ہمت کر کے کہا۔ ''آپ ان کو سہارا دے سکتے ہیں۔''

''گڑیا ابھی تو میں خود بے سہارا ہوں میرے پیروں تلے زمین نہیں ہے اور خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہا

ہوں۔"

"پھر بھی آپ ان کو سہارا دے سکتے ہیں۔" شمی نے اصرار کیا۔ "آپ ان کو تسلی تو دے سکتے ہیں وہ اس تسلی کے سہارے ہمیشہ آپ کا انتظار کر سکتی ہیں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا کبھی سویرا سے تمہاری بات ہوئی ہے؟"

"نہیں یہ میں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں اور میں جانتی ہوں وہ بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہوں گی۔" شمی نے یقین سے کہا۔ "پلیز شیھی آپ ایک بار ان سے بات کر کے تو دیکھیں۔"

میں نے سوچا کہ شمی ٹھیک کہہ رہی ہے مجھے ایک بار سویرا سے بات تو کر کے دیکھنا چاہیے۔ ٹھیک ہے ابھی میرے حالات خراب تھے۔ میں پولیس کو مطلوب تھا اور دشمن میرے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن ایسا ہمیشہ تو نہیں ہوتا مجھے خدا سے امید تھی کہ وہ میرے دن بدلے گا اور ایک بار پھر پہلے کی طرح آزادی اور بے فکری سے اپنی مرضی کی زندگی گزار سکوں گا۔ تب تک سویرا میرا انتظار کر سکتی تھی۔ مگر یہ تو اس صورت میں ممکن تھا جب وہ میرے لیے دل میں وہی جذبہ رکھتی ہو جو شادی سے پہلے تھا۔ درمیان میں چھ طویل سال آ چکے تھے اور سویرا ایک شادی شدہ عورت بن گئی تھی۔ اس دوران میں اس نے پوری وفاداری کے ساتھ شاہد بھائی کا ساتھ نبھایا تھا۔ کیا اس کے دل میں میرے لیے پرانا جذبہ باقی تھا۔

شمی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "شیھی آپ بے فکر رہیں عورت کبھی بھی اپنی پہلی محبت فراموش نہیں کرتی ہے۔ بدلے حالات میں وہ اسے کسی خزانے کی طرح دل کی گہرائیوں میں دبا دیتی ہے لیکن اس سے دستبردار نہیں ہوتی ہے۔"

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ "تجھے ان معاملات کا اتنا سینس ہے۔"

وہ شرما گئی تھی۔ "میں بھی تو لڑکی ہوں اور مجھے معلوم ہے لڑکیاں کس طرح سوچتی ہیں۔ آپ سویرا مامی سے بات کریں۔"

"اگر اس نے انکار کر دیا تو......؟"

"وہ کبھی انکار نہیں کریں گی اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی تو یہ انکار دل سے نہیں ہوگا۔ آپ ان کو قائل کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات مان جائیں گی۔"

سویرا کے انداز سے مجھے بھی لگا تھا کہ وہ اس مشکل وقت میں میری طرف سے کسی سہارے کی منتظر ہے اس نے ایک بار مجھے کھو دیا اور اب کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں شمی کی بات پر غور کرتا رہا۔ لڑکیاں اٹھارہ انیس برس کی عمر میں کتنی میچور ہو جاتی ہیں مجھے اس کا اندازہ شمی کی باتوں سے ہوا تھا۔ اس نے وہ سب محسوس کر لیا جو دوسرے محسوس نہیں کر سکے تھے یہی نہیں اس نے جرأت کر کے مجھ سے بات بھی کر لی تھی۔ میں نے کپ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ "چڑیل اب تیرا بھی بندوبست کرنا ہوگا تو بڑی سیانی ہوگئی ہے۔"

"جی نہیں میں نے نانو سے وعدہ لیا ہے وہ مجھے ماسٹر کرنے دیں گے اور اس کے بعد ہی میرے بارے میں سوچیں گے۔"

میں ہنسا۔ "میں نے ٹھیک کہا نا تو بڑی سیانی ہوگئی ہے۔"

''نانو میری ہر بات مانتے ہیں۔'' اس نے فخر سے کہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کاش وہ میری بھی بات مان لیتے۔''

''آپ کی بھی مانیں گے۔''

''پتا نہیں وہ وقت کب آئے گا۔''

''آجائے گا پہلے آپ مامی سے تو بات کریں۔'' اس نے اصرار کیا۔

''اوکے اس بارے میں سوچوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میرے کپڑے نکال دو میں نہانے جا رہا ہوں۔''

حویلی میں گیس نہیں تھی۔ ایل پی جی کا سلنڈر استعمال ہوتا تھا اور اکثر چیزیں تندور اور اس کے ساتھ لکڑیوں والے چولہے پر بنتی تھیں۔ گرم پانی کے لیے بابا نے ایک بھٹی لگوائی تھی۔ اوپر ٹنکی سے گرم پانی کی لائن اس بھٹی سے گزرتی تھی جس سے پانی گرم ہو جاتا تھا۔ اسے گیزر کا متبادل کہہ سکتے ہیں۔ اس بھٹی میں لکڑیاں جلائی جاتی تھیں۔ میں نے واش روم میں جا کر پانی کھولا۔ کیونکہ پانی بہت زیادہ بھی گرم ہو جاتا تھا اس لیے اس سے براہِ راست نہانا ممکن نہیں تھا۔ پہلے بالٹی یا ٹب میں ملا کر معتدل بنانا پڑتا تھا تب کہیں جا کر یہ نہانے کے قابل ہوتا تھا۔ شمی نے کپڑے استری کر کے باہر لٹکا دیئے تھے۔

میں کپڑے بدل رہا تھا کہ اچانک الماری سے موبائل فون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور میں الماری کی طرف لپکا۔ چھپی جگہ سے لفافے سے موبائل نکالا تو اس پر کسی اجنبی نمبر سے کال آ رہی تھی میں نے جلدی سے کال ریسیو کی اور دھیمی آواز میں بولا۔

''کون ہے؟''

''میں ندیم بات کر رہا ہوں۔'' ندیم کی آواز آئی۔ ''یہ میرے دفتر کا نمبر ہے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ نمبر دیکھ کر میں خدشے کا شکار ہو گیا تھا کہ میرے دشمنوں کو شاید اس نمبر کا سراغ مل گیا تھا۔ ''ہاں کیا ہوا بیتو کا پتا چلا؟''

''نہیں یار کل سے اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ میرے قابلِ اعتماد ذرائع نے بتایا کہ اس حلیے یا نام والا کوئی نوجوان پولیس کی تحویل میں نہیں آیا ہے۔''

''ممکن ہے مرشد اینڈ کمپنی نے اسے غائب کر دیا ہو؟'' میں نے فکر سے کہا۔ ''تُو جانتا ہے پولیس میں ان کا کھانچہ فٹ ہے۔''

''نہیں بیٹے کھانچے میرے بھی کم نہیں ہیں۔ ہر تھانے میں مخبر رکھا ہوا ہے یہ مجھے کام کی اطلاع دیتے ہیں۔''

''ایجنسی کا معاملہ بھی نہیں ہے؟''

''اگر براہِ راست کسی ایجنسی نے اٹھا لیا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا ہوں لیکن پولیس نے اسے کسی ایجنسی کے حوالے بھی نہیں کیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ ابھی تک فتح خان کی تحویل میں ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''میں بڑی دیر سے کوشش کر رہا تھا لیکن تیرا نمبر بند جا رہا تھا۔''

''میں بند ہی رکھتا ہوں آئندہ کال مت کرنا میں دن میں خود دو تین بار تجھے کال کر لوں گا۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ کر فون بند کر دیا۔ مجھے یاد تھا کہ آخری بار استعمال کے بعد میں نے موبائل بند کر دیا تھا پھر اسے آن کس نے کیا؟ میرا ذہن شمی کی طرف گیا تھا اس نے ابھی میرے کپڑے نکالے تھے اور شاید اس نے موبائل دیکھ لیا تھا۔ یعنی اب میرے پاس موبائل کی موجودگی راز نہیں رہی تھی لیکن ابھی یہ راز شمی تک محدود تھا اگر وہ اسے اپنے تک رکھتی تو مسئلہ نہیں تھا لیکن بابا تک بات پہنچ جاتی تو شاید مسئلہ بن جاتا۔

میں شمی کی تلاش میں باہر آیا۔ آپا نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی اور اندر آیا تو وہ کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر چونکی اور پھر خوش ہوگئی۔ ''آپ پہلی بار میرے کمرے میں آئے ہیں شیبی۔''

''شیبی کی بچی یہ بتاؤ یہ الماری کی تلاشی کس خوشی میں لیتی ہو۔''

وہ گھبرا گئی۔ ''نہیں میں...... نے تلاشی نہیں...... لی تھی۔ وہ......ازار بند نہیں......مل رہا تھا تو اس کی...... تلاش میں اس خانے میں ہاتھ مارا تھا۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''پھر تم نے موبائل آن کر دیا؟'' میں نے کہا۔

اس نے سر جھکا لیا۔ ''ہاں وہ میں دیکھ رہی تھی تو آن ہو گیا۔'' وہ شرمندہ نظر آنے لگی۔ ''سوری شیبی آپ کو برا لگا؟''

''نہیں برا تو نہیں لگا لیکن میں نے موبائل سب سے چھپا رکھا ہے اب تم یہ بات خود تک محدود رکھو گی۔''

''پکا وعدہ...... آپ کی قسم کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے اور دوبارہ موبائل بھی آن نہیں کرو گی؟''

''موبائل بھی آن نہیں کروں گی۔'' اس نے وعدہ کیا۔ ''اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔''

''ہاں اب نہیں ہوں لیکن یہ معافی فری میں نہیں ہے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ ''آپ جو کہیں گے وہ بنا کر کھلاؤں گی۔''

''تم نے جو پہلے دن پلاؤ بنایا تھا۔''

''سچ۔'' وہ خوش ہوگئی۔ ''میں آج ہی بناتی ہوں۔''

شمی چاول کی شوقین تھی اور میرے بہانے اسے بھی کھانے کا موقع مل جاتا۔ وہ فوراً اٹھ گئی۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شمی کسی کو یہ بات نہیں بتائے گی۔ مجھے نیند آ رہی تھی اس لیے میں پھر سو گیا۔ مسلسل طویل عرصے تک آرام کی طلب اب پوری ہو رہی تھی۔ میں سو کر اٹھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے اور مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں باہر آیا تو کچن والے حصے میں کچھ تلنے کی خوشبو آ رہی تھی میں نے جھانک کر دیکھا تو شمی سموسے تل چکی تھی اور پکوڑے تل رہی تھی۔

''واہ تو یہ کام ہو رہا ہے۔'' میں اندر آ گیا۔

''آپ کے لیے ہو رہا ہے صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور نہ دوپہر کا کھانا کھایا۔'' اس نے پکوڑے اتارتے ہوئے کہا۔

''اور پلاؤ؟''

''وہ اس کے بعد تیار کروں گی۔''

اس نے چٹنی کے ساتھ گرما گرم سموسے اور پکوڑے میرے سامنے رکھے اور میں وہیں کچن میں چوکی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ بھوک میں یہ اور بھی مزہ دے رہے تھے۔ اس دوران میں آپا، ماں جی اور سویرا بھی وہیں آ گئے تھے۔ اس دن سویرا ذرا تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھوں میں کنگن کی جگہ اس کی سونے کی چوڑیاں تھیں۔ ہمارے خاندان میں ہندووانہ رسم و رواج کے برعکس بیوائیں صرف چند دن کا سوگ مناتی ہیں اور اس کے بعد واپس اپنی معمول کی زندگی میں لوٹ آتی ہیں۔ ماں جی نے سویرا کی بلائیں لیں۔

''میری دھی کتنی سوہنی لگ رہی ہے۔ تُو نے کان کیوں خالی رکھے ہیں؟''

''بُندے اندر رکھے تھے وہ کل نکال لوں گی۔'' سویرا نے جواب دیا۔

''کل تُو ریشمی لباس پہنے گی۔'' ماں جی نے اسے حکم دیا۔

''جی ماں جی۔''

حویلی میں صرف صبح اور رات کی چائے کا رواج تھا لیکن شمی نے میرے لیے چائے بنا دی۔ ''کیسے بنے سموسے اور پکوڑے؟''

''لاجواب۔'' میں نے رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''چڑیل تُو سب بہترین بناتی ہے۔ مجھے یقین ہے شادی کے چند سال بعد تیرا شوہر کولیسٹرول کا مریض بن جائے گا۔''

''جی نہیں۔'' شمی شرما گئی۔

''کیا نہیں؟'' میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

وہ چمک کر بولی۔ ''جناب بھول رہے ہیں آپ کے بھی کچھ راز ہیں میرے پاس......''

''اچھا بابا تم تو بلیک میلنگ پر اتر آئی ہو حالانکہ نہ تو بلیک ہو اور نہ میل۔''

ماں جی سمجھیں نہیں اور سادگی سے بولی۔ ''کالی اور میلی تو میری دھی ہو نہیں سکتی صفائی کا بہت خیال رکھتی ہے۔''

اس پر سب ہی ہنس پڑے تھے اور ماں جی خفا ہو گئیں۔ ''لو کیا میں نے لطیفہ سنایا ہے۔''

''نہیں ماں جی ہمیں تو شمی پر ہنسی آ رہی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ویسے یہ اتنی صاف بھی نہیں رہتی ہے۔ یاد ہے بچپن میں کتنی مشکل سے نہانے کے لیے تیار ہوتی تھی پکڑ پکڑ کر لانا پڑتا تھا۔''

شمی نے منہ بسورا۔ ''وہ بچپن کی بات تھی۔ اب میں بہت صفائی پسند ہو گئی ہوں۔''

آپا نے سر ہلایا۔ ''ہاں کہو تو دوسرے تیسرے دن اب بھی نہا لیتی ہے۔''

ہم سب پھر ہنسے تو اس نے احتجاج کیا۔ ''جی ایسی بات نہیں ہے امی تو بس میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔''

اسی ہنسی مذاق میں سموسے اور پکوڑے ختم ہوئے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پہلی بار سویرا کو ہنستے سنا تھا۔ جب وہ ہنستی تو جیسے کانچ کی گولیاں فرش پر بکھر جاتی تھیں۔ شجاع بھائی اور بھابی و بچوں کے جانے کی اداسی دھل گئی تھی۔ رات تک سب نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ پہلے ماں جی کمرے میں گئیں پھر آپا گئیں اور پھر سویرا

اور شمی بھی اٹھ گئے تھے۔ میں نشست گاہ میں بیٹھا رہا تھا۔ ابھی کمروں میں روشنیاں تھیں اور کھٹ پٹ کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں انتظار کرتا رہا کہ روشنیاں بجھ جائیں اور آوازیں سناٹے میں بدل جائیں۔ ساڑھے گیارہ بجے تک روشنیاں بند ہوگئیں اور آوازیں بھی معدوم ہوگئیں تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے میں آیا۔ واش روم کی چھت اور اوپر کی چھت میں ایک چھوٹا سا خلا تھا۔ اس قسم کے خلا عام طور سے فالتو سامان رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب میں یہاں تھا تو اپنی ایسی اشیا بکسوں میں بھر کر یہیں رکھتا تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے میں نے دوچھتی کے پٹوں کے نیچے کرسی رکھی اور اس کی مدد سے اوپر چڑھ گیا۔

دوچھتی میں سامان بھرا ہوا تھا اور اس پر جمی گرد بتا رہی تھی کہ برسوں سے اس دوچھتی میں کسی نے جھانکا بھی نہیں ہے۔ مجھے اطمینان ہوا اور نہ خدشہ تھا کہ اس دوران میں کسی نہ کسی نے سامان کو چھیڑا ہوگا۔ وہاں ایک چھوٹی سا چرمی کیس رکھا تھا۔ اس پر بھی مٹی کی موٹی تہہ موجود تھی۔ میں نے اسے باہر نکالا اور پھر نیچے اتر آیا۔ کیس پر سے مٹی کی تہہ صاف کر کے میں نے اس کو کھولا۔ اس میں میری کچھ خاص چیزیں تھیں۔ ان میں ایک فوجی ساختہ خنجر جو کوئی فٹ بھر لمبا تھا اور چمڑے کی نیام میں تھا۔ کچھ اور چیزیں بھی تھیں لیکن میری توجہ کا مرکز وہ دوربین تھی جو میں نے پشاور میں ایک شخص سے خریدی تھی۔ یہ خنجر بھی اسی سے لیا تھا۔ وہ افغان جنگ کا سامان فروخت کرتا تھا۔ دوربین اور خنجر دونوں روسی ساختہ تھے۔ دوربین کی خاص بات یہ تھی کہ یہ نائٹ ویژن بھی تھی۔ میں نے دونوں چیزیں نکالیں اور کیس واپس دوچھتی میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

کپڑے اور لائٹ آئل کی مدد سے میں نے دونوں چیزیں صاف کیں اور یہ یوں جگمگانے لگیں جیسے ابھی بن کر تیار ہوئی ہوں۔ خنجر میں نے الماری میں رکھ دیا۔ پھر گرم چادر لی اور کمرے سے نکل کر حویلی کے عقبی حصے میں آیا یہاں چھت پر جانے والا زینہ تھا میں چھت پر آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور اب مجھے گرم چادر میں بھی سردی لگ رہی تھی بہرحال یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔ چادر سیاہ رنگ کی تھی اور اس میں دور سے نظر آنے کا امکان نہیں تھا ویسے بھی یہ بغیر چاند کی تاریک رات تھی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس کے عام شیشوں سے تو کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن جب میں نے اسے نائٹ ویژن موڈ پر کیا تو پورا ماحول ہلکے ہرے رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔ ہر چیز اپنی حرارت کے لحاظ سے کم یا زیادہ نظر آرہی تھی۔

نائٹ ویژن دوربین یا آلات اصل میں انفراریڈ لہروں کی مدد سے کام کرتے ہیں۔ ان کے مخصوص لینس انفراریڈ لہروں کو دیکھ لیتے ہیں جو اجسام سے حرارت کے حساب سے خارج ہوتی ہیں۔ جو جسم زیادہ حرارت خارج کرتے ہیں وہ زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ حویلی کے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ یہ بھی ہماری ملکیت تھا۔ اس میں جا بجا برگد، نیم اور شیشم کے درخت لگے تھے۔ دائیں اور بائیں کھیت تھے۔ یہ مشترک تھے یعنی ہماری خاندانی ملکیت تھے اور اس میں بابا کے چچا زاد بھائیوں کا حصہ بھی تھا۔ عقب میں ایک ریتیلا میدان تھا جس میں جھاڑ جھنکاڑ اُگا ہوا تھا اور یہ کاشت کے قابل نہیں تھا۔ اس زمین کا حویلی کے ساتھ لگا حصہ ہماری ملکیت تھا اور کبھی بابا نے یہاں زمین ٹھیک کرا کے کینو کا باغ لگانے کا سوچا تھا لیکن پھر ان کو فرصت نہیں ملی۔ اس لیے یہاں اب بھی جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک چھوٹا سا برساتی نالہ ہے جو بارش کے پانی کو آگے نہر تک پہنچا دیتا ہے۔ اس میدان میں یہ نالہ جھاڑیوں میں اس طرح رُوپوش تھا کہ اس کا پتا بھی نہیں چلتا

تھا۔

میں نے پہلے حویلی کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ فوراً ہی مجھے دو روشن جسم نظر آئے یہ گارڈ تھے جو حویلی کے مین گیٹ پر چوکس موجود تھے۔ ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا گیٹ کے آس پاس ٹہل رہا تھا جب کہ تیسرا یقیناً اس وقت آرام کرر ہا تھا۔ پھر کرسی پر بیٹھا ہوا گارڈ اٹھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ گشت لگا رہا تھا۔ شجاع بھائی نے ٹھیک کہا تھا یہ پیشہ ور اور چوکس گارڈ تھے جو اپنی ڈیوٹی پوری مستعدی سے سر انجام دے رہے تھے۔ سامنے میدان میں کوئی شخص نہیں تھا ورنہ وہ لازمی دوربین میں نظر آجاتا بے شک وہ کسی آڑ میں کیوں نہ ہوتا۔

میں نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا۔ اس طرف گندم کے کھیتوں میں کچھ جانور ضرور دکھائی دیئے تھے مگر کوئی انسان نہیں تھا۔ پھر میں عقب میں واقع جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے میدان کی طرف آیا اور یہاں مجھے فوراً ہی کچھ دھبے نظر آگئے لیکن ان کی ساخت ایسی تھی کہ یہ جاننا مشکل ہو رہا تھا وہ انسان تھے یا جانور تھے۔ اگر انسان تھے تو گول مول ہو کر بیٹھے تھے۔ ان دھبوں کی تعداد چار تھی اور یہ حویلی سے کوئی پچاس گز دور تھے۔ میں دوربین ان پر جما کر کھڑا ہو گیا۔ کبھی کبھی ان میں حرکت کا احساس ہوتا تھا لیکن وہ بھی اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ کوئی دس پندرہ منٹ میں ان روشن دھبوں کو دیکھتا رہا۔ اگر وہ انسان تھے تو اس سردی میں اس ویرانے میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا ہاں جانور یہاں ضرور پناہ لے سکتے تھے۔ یہاں گیدڑ اور لومڑیاں عام ملتی ہیں اور وہ اسی طرح جھاڑیوں میں ٹھکانہ بنا کر رہتے ہیں۔

میں نے کچھ دیر بعد باقی میدان کا جائزہ لیا لیکن اس کے سوا اور کہیں روشن جسم نہیں تھے۔ جب ان جسموں نے نصف گھنٹے تک کوئی حرکت نہیں کی تو مجھے یقین آگیا کہ یہ جانور تھے۔ جانور ہی اتنی ثابت قدمی سے ایک جگہ بیٹھ سکتے ہیں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں واپس نیچے آگیا۔ میرا مقصد ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا جو حویلی کی نگرانی کر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ حویلی یعنی میری نگرانی کی جارہی تھی کہ میں حویلی سی نکل نہ جاؤں اور میرے دشمنوں کے عزائم خاک میں مل جائیں۔ میں خاموشی سے حویلی کے اندر آیا اور اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا کہ سویرا کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ اندر سے سسکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ بہت دھیمی تھیں لیکن سردی کے سناٹے میں واضح سنائی دے رہی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں گزر جاؤں لیکن میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا اور دستک دینے کے بجائے ہینڈل گھمایا دروازہ کھلا ہوا تھا میں آہستہ سے اندر آیا تو سویرا بستر پر کروٹ کے بل سمٹی حالت میں لیٹی ہوئی دھیمی آواز میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاگ رہی ہوگی لیکن جب میں گھوم کر سامنے آیا تو اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ نیند میں تھی۔ اس کی سسکیوں میں ایسا درد تھا کہ میرا دل کٹنے لگا۔ وہ بن ماں کی بچی تھی ابھی کمسن تھی کہ باپ بھی چل بسا اور رشتے دار اس کی دولت اور جائیداد کی وجہ سے چاروں طرف سے مردار خور گدھوں کی طرح جمع ہونے لگے۔ سویرا کے باپ کو پہلے ہی اندازہ تھا اس لیے اس نے بابا کو سویرا کا گارجین مقرر کر دیا۔ اس پر سویرا کے رشتے داروں نے بہت شور مچایا تھا لیکن وہ بابا کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

سویرا ہمارے ہاں آئی تو ایک ڈری سہمی اور اعتماد سے محروم ہستی تھی لیکن رفتہ رفتہ حویلی کے اپنائیت سے پر ماحول نے اسے سنبھال لیا۔ ماں جی اسے بیٹی کی طرح چاہتی تھیں تو بابا اسے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آپا اور ہم سب اس سے محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے جلد خود کو سنبھال لیا اور پورے اعتماد سے حویلی کے ماحول میں رچ بس گئی۔ چند سال بعد وہ شاید بھول بھی چکی تھی کہ اس سے ہمارا کوئی خون کا رشتہ نہیں ہے۔ پھر میرے اور اس کے درمیان ایک لطیف اور خوب صورت تعلق پروان چڑھنے لگا۔ دل کا یہ رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ پختہ ہوتا گیا۔

مگر ملن ہماری قسمت میں نہیں تھا ایک معمولی سے واقعے نے بات کو یوں بگاڑا کہ پھر یہ سنور نہ سکی۔ بابا نے ضد میں آ کر ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے میری اور سویرا کی راہیں جدا کر دی تھیں۔ اس وقت مجھے لگا تھا کہ یہ راہیں ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہیں لیکن شاہد بھائی کی ناگہانی موت نے صورتِ حال بدل دی تھی۔ میں بستر کے کنارے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک موٹا کھیس لیے لیٹی تھی جو اوپری جسم سے سرک گیا تھا لیکن خدا گواہ ہے ایک لمحے کو بھی میرے ذہن میں کوئی ایسا خیال نہیں آیا تھا جس پر مجھے خود سے شرمندہ ہونا پڑتا۔ میں اس کے معصوم چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کی سسکیاں مدہم ہوتے ہوتے تھم گئیں۔ میں نے جھک کر آہستہ سے اس کا کھیس درست کیا اور پھر اس کے رخسار پر موتیوں کی طرح آنسو صاف کیے۔ پاؤں کی طرف ایک تہہ شدہ کمبل بھی تھا لیکن اسے کھولنے کی صورت میں سویرا کی آنکھ بھی کھل سکتی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت یہاں اپنے کمرے میں دیکھے۔ اس لیے میں نے کھیس درست کیا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ عقب سے سویرا کی غنودہ آواز آئی۔

''شہباز آپ......؟''

میں نے مڑ کر دیکھا وہ اٹھ گئی تھی اور حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں واپس آیا۔''ہاں میں...... تمہارے کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ تمہارے سسکیاں لینے کی آواز آئی تو بے چین ہو کر اندر چلا آیا۔ پھر تم چپ ہو گئیں تو واپس جا رہا تھا۔''

''آپ کو وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اٹھ بیٹھی۔''میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو اس کمرے میں آنے کے لیے کبھی بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

میں مسکرایا۔''اس لیے میں اندر آ گیا۔''

اس نے کھیس اپنے گرد لپیٹتے ہوئے دونوں گھٹنے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیے۔ اس کی بکھری زلفیں اس کے شانوں پر پریشان تھیں۔ اس لمحے وہ مجھے کسی اور دنیا کی مخلوق لگی تھی۔ میں بے ساختہ اس کے سامنے بستر کے پاس فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ میری نظروں کو محسوس کر کے اس کے رخسار دہکنے لگے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی میں کہا۔

''سویرا......''

''جی۔''

''سویرا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں درمیان میں جدائی کے آنے والے سالوں کو بھول جائیں۔''

''یہ تو ممکن نہیں ہے۔ یہ سارا وقت ایک ٹھوس حقیقت کی طرح ہمارے اردگرد موجود ہے۔''

''لیکن ہم تو اسے بھول سکتے ہیں۔'' میں نے اصرار کیا۔ ''کچھ دن پہلے تک میرا اور تمہارا رشتہ بالکل مختلف تھا اور میں تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے بھی گھبراتا تھا لیکن اب حقائق بدل چکے ہیں۔''

''لیکن پہلے اور اب میں بہت فرق ہے۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''چھ سال پہلے میں ایک نوجوان لڑکی تھی اور میرے دل میں صرف آپ تھے۔ آج میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ میں نہ تو نوجوان ہوں اور نہ ہی کنواری ہوں۔''

''پلیز سویرا۔'' میں بے تاب ہو گیا۔ ''تم میرے لیے اپنی ذات کو اتنے معمولی پیمانوں سے مت ناپو۔ تم اور تمہاری ہستی ان سب باتوں سے بہت بلند ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے چھ سال پہلے جو کچھ تھا اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے ہاں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ میرے جذبوں کو کنوارے اور کمسن جسم کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔''

''کیا یہ ممکن ہے؟'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیوں نہیں ممکن ہے۔'' میرا لہجہ تیز ہو گیا۔

''ایک بار پہلے بھی یہ ناممکن ہو چکا ہے۔''

''اس وقت کی بات اور تھی۔ جو ہوا اتنا اچانک تھا کہ میں اور تم کچھ کر ہی نہیں سکے لیکن اب نہ تو تم وہ سویرا ہو جس کے ساتھ اپنی مرضی کی جا سکے اور نہ میں وہ شہباز ہوں جو اپنی محبت چھن جانے کو برداشت کر جائے۔''

سویرا کی آنکھوں میں غرور آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ یہ مسکراہٹ بتا رہی تھی اسے میری بات کا یقین تھا کہ اب میں اسے کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔ اس نے کسی قدر شوخی کے ساتھ کہا۔ ''کیا کر لیں گے آپ؟''

''اگر ایسی کوئی صورتِ حال ہوئی جس میں تمہیں مجھ سے ایک بار پھر دور کرنے کی کوشش کی گئی تو میں تمہیں لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں آپ ایسا کر سکتے ہیں آپ طاقتور اور مرد ہیں لیکن کیا آپ نے سوچا کہ میں ایک کمزور عورت ہوں جسے حالات مجبور کر دیتے ہیں۔''

''اب تمہاری طاقت میں ہوں۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو میں طوفانوں کے سامنے بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔''

''بس مجھے تمہاری یہی یقین دہانی چاہیے۔''

''لیکن شہباز آپ جن حالات سے گزر رہے ہیں وہ کب تک ٹھیک ہوں گے۔'' وہ بے چین ہو گئی۔

''یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا ممکن ہے چند مہینے میں سب ٹھیک ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کئی سال لگ جائیں۔''

''کئی سال۔'' وہ بجھ گئی تھی۔ ''شہباز میں اتنا طویل انتظار کیسے کروں گی۔''

''تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میری خاطر کرنا ہوگا۔''

اس نے سر اوپر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ''ٹھیک ہے میں آپ کی خاطر انتظار کروں گی۔''

میرا دل چاہا کہ ان آنسوؤں کو سمیٹ لوں یہ قیمتی موتی یوں بے قدر نہ ہوں لیکن میں دل مسوس کر رہ گیا۔ سویرا ابھی عدت میں تھی اور جب تک اس کی عدت ختم نہیں ہو جاتی میں اسے چھونے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ روتی رہی اور میں اس کے پاس بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں نے آپ کی مشکلات کے بارے میں جو سنا ہے مجھے لگتا ہے وہ اصل سے بہت کم ہے کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ آپ پر کیا گزری ہے؟''

''کیوں نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''ایسے نہیں آپ کرسی پاس کر لیں۔ یوں مت بیٹھیں۔'' اس نے کہا تو میں نے کرسی کھینچ لی اور اسے اپنی داستان سنانے لگا۔ سویرا کی آنکھوں کی حیرت بتا رہی تھی کہ اسے اس بارے میں بہت کم پتا تھا جیسے جیسے میری کہانی آگے بڑھ رہی تھی اس کی حیرت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس میں نت نئے کرداروں کی شمولیت اسے سوالات پر اکساتی تھی۔ پھر ایمن شا کا ذکر آیا تو وہ چوکنا ہو گئی۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ ایک انگریز برٹ شا کی بیٹی ہے تمہیں یاد ہو گیا جب میں گھر سے بھاگ نکلا تھا اور شمال کی ایک وادی چلا گیا تھا یہ مجھے وہاں ملی تھی۔''

''اس وقت تو آپ نے بتایا نہیں تھا۔''

''اس وقت تم سے فرصت سے بیٹھ کر بات کرنے کا موقع کب ملا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو یہ آپ سے دوبارہ ملی؟''

میں نے ایمن کے حوالے سے کہانی میں مناسب تبدیلی کر دی تھی اور اصل بات گول کر گیا تھا لیکن سویرا کی مخصوص نسوانی حِس نے بھانپ لیا تھا کہ ایمن کے معاملے میں دال میں بہت کچھ کالا ہے۔ اگر چہ میں نے کبھی ایمن میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اس کی دلکشی نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن بس اس حد تک جیسے کوئی تر و تازہ کھلا ہوا گلاب کسی دیکھنے والے کو متاثر کرتا ہے اور وہ اسے نظر و دل میں سراہتا ہے اور بس۔ اس سے آگے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ ایمن کے بارے میں مجھے سخت شبہ تھا کہ وہ مجھ میں دلچسپی رکھتی ہے۔ بہ ظاہر تو وہ ڈیوڈ شا کی وجہ سے میرے ساتھ تھی کیونکہ ڈیوڈ شا اس کے باپ کی میراث ہڑپ کر کے اس کا دشمن بن گیا تھا لیکن مجھ سے تعلق میں اس کے دل کے معاملات بھی شامل تھے۔

میں نے سر ہلایا۔ ''کئی بار ملی...... لیکن یہ ملاقاتیں ہمیشہ ہنگامی حالات میں ہوتی رہی ہیں۔''

''ہنگامی حالات۔'' سویرا نے پوچھا۔ ''باوجود اس کے کہ وہ آپ کے پیچھے پاکستان اور پھر انڈیا چلی آئی۔''

''میرے پیچھے نہیں اپنے کام کے سلسلے میں۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''وہ ایک ماحولیاتی صحافی بھی ہے۔''

میری کہانی آگے بڑھی اور اس میں سادی کا ذکر شامل ہوا تو سویرا نے اسے خاص اہمیت نہیں دی البتہ اس

کے بارے میں سوالات ضرور کیے، مونا کے بارے میں وہ پہلے بھی جانتی تھی۔ اسے مونا اور سفیر کی شادی کا سن کر خوشی ہوئی تھی۔ راجا عمر دراز اور اس سے منسوب پُراسرار وادی سویرا کی دلچسپی کی چیزیں نہیں تھیں اس لیے میں نے ان کا ذکر محدود رکھا لیکن اسے مرشد اور فتح خان کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ ان کی سفاکیاں سن کر وہ کسی قدر خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ''اتنے خطرناک لوگ ہیں یہ.....؟'' اس نے جھرجھری لی۔

''اس سے بھی زیادہ یوں سمجھ لو کہ ان کی درندگی کے سامنے درندے بھی شرمائیں۔''

میں نے اسے سب بتا دیا تھا۔ جب میں چپ ہوا تو اس نے کہا۔ ''شہباز مجھے ایک خیال آ رہا ہے...... کہیں یہ حقیقت تو نہیں کہ شاہد......''

وہ کہتے ہوئے رک گئی تھی لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی مضبوط شبہ ہے۔ شاہد بھائی کے قتل میں مرشد ملوث ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے پاگل ہو رہا ہے اور فی الحال اس نے اشارہ کیا ہے کہ وہ میرے اور میرے گھر والوں کے بارے میں کیا عزائم رکھتا ہے۔''

سویرا سہم گئی۔ ''اس کا مطلب ہے ہم سب خطرے میں ہیں۔ آپ، بابا، شجاع بھائی اور باقی سب۔''

''ہاں سب خطرے میں ہیں۔''

''تو ہم اس سے کس طرح بچ سکتے ہیں؟''

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ابھی تو مجھے اس سے شاہد بھائی کا حساب لینا ہے۔''

''آپ اس سے لڑیں گے۔'' وہ پریشان ہوگئی۔ ''نہیں وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''تو میں اب تک کیا کرتا آ رہا ہوں اس سے لڑ ہی رہا ہوں اور تم فکر مت کرو میں اس کے لیے تر نوالہ نہیں ہوں بلکہ اب وہ مجھ سے ڈر رہا ہے۔ اسی لیے تو مجھے حویلی میں قید کرایا ہے۔''

''حویلی میں قید؟'' وہ چونکی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا میں بے ساختہ اس کے سامنے یہ بات کہہ گیا۔

''میرا مطلب ہے اس نے مجھے حویلی بھجوایا ہے۔''

''نہیں شہباز آپ نے جو کہا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کیا آپ پر بابا یا شجاع بھائی کی طرف سے کوئی پابندی ہے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ وہ مجھے جانتی تھی اور میں اس سے جھوٹ کہتا تو وہ پکڑ لیتی۔ اس لیے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا اور اسے سب بتا دیا وہ دم بخود سے سن رہی تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔

''آپ کے ساتھ یہ سلوک کیوں؟''

''کیونکہ دشمن نے دھمکی دی ہے اور میرے خیال میں فی الحال مجھے حویلی سے نہیں نکلنا چاہیے۔''

''لیکن دشمن کو معلوم ہو کہ آپ کہاں ہیں تو یہ بھی تو اچھی بات نہیں ہے آپ پولیس کو بھی مطلوب ہیں۔'' اس نے ذہانت سے نکتہ اٹھایا۔

''ابھی مجھے خطرہ نہیں ہے۔ ہاں جب الیکشن ہو جائیں گے تب وہ میرے خلاف حرکت میں آ جائیں گے۔''

''آپ کو اس سے پہلے اپنی حفاظت کا بندوبست کر لینا چاہیے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''یہ سب میرے ذہن میں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''تم اس بارے میں فکر مت کرو۔''

''آپ مجھ سے ایسا نہیں کہہ سکتے کہ میں آپ کے بارے میں فکر نہ کروں جب تک میں زندہ ہوں آپ کے بارے میں فکر کروں گی۔''

حویلی آنے کے بعد میں سویرا سے بہت کم ملا تھا اور جتنی بار بھی ملاقات ہوئی تھی میں نے محسوس کیا کہ وہ شاہد بھائی کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتی ہے۔ پہلے میرا خیال تھا شاید وہ میری وجہ سے ایسا کرتی ہے لیکن اب میرا خیال بدل گیا تھا میں نے محسوس کیا کہ اس کے اور شاہد بھائی کے تعلقات ویسے نہیں تھے جیسے عام میاں بیوی کے ہوتے ہیں۔ اسے ان کی موت کا دکھ تھا لیکن اس کے انداز میں سوگ نہیں تھا۔ ابھی مجھے موقع ملا تھا تو میں نے پوچھ لیا۔

''سویرا ایک سوال ہے اگر تم جواب دینا پسند کرو؟''

''آپ ایسا مت کہیں میں آپ کے ہر سوال کا جواب دے سکتی ہوں۔'' اس نے مجھے زخمی نظروں سے دیکھا۔

''تمہارے اور شاہد بھائی کے تعلقات کیسے تھے؟''

وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھیک تھے لیکن آپ نے کیوں پوچھا؟''

''کیونکہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی گڑبڑ تھی لیکن خیر تم جواب نہیں دینا چاہتیں تو......''

''یہ بات نہیں ہے۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ آپ میری تکلیف میں شامل ہوں۔''

''کیونکہ جب میں ہر چیز میں تمہارا ساتھی ہوں تو تمہارے دکھ مجھ سے الگ کیوں ہوئے۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ کچھ اچھی یادیں نہیں ہیں۔ بس ایک ہی بات ان میں اچھی ہے ان کے بارے میں کسی اور کو بالکل نہیں معلوم ہے مجھے حیرت ہے آپ نے چند دنوں میں یہ بات جس طرح محسوس کر لی جو دوسرے برسوں میں نہیں جان سکے تھے؟''

''شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک شاہد بھائی تھے تب تم دونوں مکمل اداکاری سے کام لیتے ہو گے لیکن ان کے بعد تم نے اداکاری سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اسی سے مجھے احساس ہو گیا۔''

''ہاں یہ سچ ہے شاہد کے بعد میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اپنا رویہ نارمل کر لیا۔'' سویرا نے اعتراف کیا۔ ''لیکن یہ بات کسی اور نے محسوس نہیں کی۔''

''شاید اس لیے کہ گھر والے غم کا شکار تھے یا انہوں نے محسوس کیا تب بھی ظاہر ہونے نہیں دیا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' وہ بے خیالی میں بولی۔ ''شادی کے شروع دنوں میں شاہد کا رویہ ایک عام محبت کرنے والے شوہر کا سا تھا۔ ان دنوں وہ گلگت پوسٹنگ پر تھے اور وہاں کے سخت موسم کی وجہ سے انہوں نے مجھے ساتھ رکھنے سے گریز کیا تھا میں حویلی میں رہی تھی۔''

''تم ایک بار بھی شاہد بھائی کے ساتھ نہیں رہیں؟''

''میری خواہش تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا گلگت میں تو موسم کی وجہ سے انکار کیا تھا۔ایک سال بعد ان کے رویے میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔''

''کیسی تبدیلی؟''

سویرا کی رنگت ذرا سرخ ہوئی تھی۔''انہوں نے......مجھ سے گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔پہلے میں نے غور نہیں کیا لیکن دوبارہ وہ کئی دن کے لیے گھر آنے کے باوجود مجھ سے گریزاں رہے تو میں کھٹک گئی تھی۔بہ ظاہر سب کے سامنے وہ ایک اچھے محبت کرنے والے شوہر رہا کرتے تھے لیکن کمرے کی تنہائی میں آتے ہی وہ مجھ سے بیگانہ ہو جاتے تھے۔''

''تم نے ان سے وجہ پوچھی؟''

اس نے سر ہلایا۔''جب انہوں نے دوسری بار بھی ایسا ہی کیا تو میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔میں نے شکوہ کیا کہ وہ بلا وجہ مجھ سے کیوں گریز کر رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔کوئی خاص بات نہیں ہے۔مگر میں مطمئن نہیں تھی۔اس سے پہلے انہوں نے کبھی مجھ سے گریز نہیں کیا تھا۔جب میں نے پھر پوچھا تو انہوں نے بہت رکھائی سے کہا۔

''سویرا ہماری زندگی کی گاڑی جس طرح چل رہی ہے اسے اسی طرح چلنے دو۔''

میں حیران ہوئی۔''لیکن کیوں آپ کے اس رویے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟''

''کوئی وجہ نہیں ہے اور برائے مہربانی اب مجھ سے اس موضوع پر بات مت کرنا۔'' انہوں نے کہہ کر بات ختم کر دی۔

''تم نے دوبارہ نہیں پوچھا؟''

''پوچھا کئی بار پوچھا لیکن ہر بار ان کا رویہ پہلے سے زیادہ خراب ہوتا گیا اور آخری بار انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا اور بہت خراب لہجے میں کہا کہ ان کی یہی مہربانی کافی ہے کہ وہ مجھے بیوی بنا کر رکھے ہوئے ہیں اگر میں نے ان کو مجبور کیا تو وہ مجھے طلاق دے دیں گے۔''

میں حیران ہوا تھا۔''شاہد بھائی نے تمہیں طلاق کی دھمکی دی تھی تم نے یہ بات گھر میں کسی کو بتائی نہیں؟''

''میں کیسے یہ بات کہتی جب کہ سب کے سامنے ان کا رویہ مجھ سے بہترین ہوتا تھا۔وہ میرے لیے ڈھیروں چیزیں لاتے تھے اور میرا ایسا خیال رکھتے تھے جیسے کوئی محبت کرنے والا شوہر رکھتا ہے۔'' سویرا نے افسردگی سے کہا۔''کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔''

''تمہارے خیال میں شاہد بھائی کے اس رویے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟'' میں نے غور سے سویرا کو دیکھا۔

''میری سمجھ میں ایک ہی وجہ آتی تھی۔شاید ان کو کسی طرح میرے اور آپ کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔گھر میں آپا اور ماں جی اس بات سے واقف تھے۔ماں جی کو شبہ تھا لیکن آپا کو یقینی طور پر علم تھا کیونکہ وہ بعض اوقات اس حوالے سے مجھے چھیڑتی بھی تھیں۔''

''جب بابا نے تمہاری اور شاہد بھائی کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو آپا یا ماں جی نے ان کو بتایا نہیں۔''

''میرا خیال ہے آپا نے بات کی تھی لیکن بابا فیصلہ کر چکے تھے۔''

''ہاں جب وہ فیصلہ کر لیں تو وہ پتھر پر لکیر ہو جاتا ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''چاہے اس کی وجہ سے ان کی اولاد کی زندگی اجڑ جائے۔''

''پلیز شہباز۔'' سویرا نے التجا کی۔ ''جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب اس پر اپنا موڈ مت آف کریں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''کوشش تو کرتا ہوں لیکن کیا کروں انسان ہوں نا ماضی کی یادوں کی تلخی جاتی نہیں ہے۔''

سویرا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''اس کے بعد میرے اور شاہد کے تعلقات کبھی معمول پر نہیں آئے وہ دن بہ دن مجھ سے بیگانہ ہوتے چلے گئے تھے۔''

''گھر میں کسی نے اس بات کو محسوس نہیں کیا؟''

''نہیں جب شاہد کسی کو احساس ہونے نہیں دیتا تو میں نے بھی سوچ لیا کہ اپنی طرف سے کسی کو احساس ہونے نہیں دوں گی۔ میں بھی ان کی طرح اداکاری پر اتر آئی تھی۔ سب کے سامنے میں بھی محبت کرنے والی اور شوہر کا خیال رکھنے والی بیوی بن کر رہتی تھی اور جب کمرے میں آتی تو ان سے لاتعلق ہو جاتی تھی۔''

میرے ذہن میں ایک سوال آیا لیکن میں کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ''سویرا کیا شاہد بھائی تمہارے پاس نہیں آتے تھے میرا مطلب ہے......؟''

اس کی آنکھیں جھک گئیں لیکن اس نے جواب دیا۔ ''آپ کا اندازہ درست ہے۔ پہلے سال جب ان کا رویہ تبدیل ہوا تو اس کے بعد وہ پھر میرے پاس نہیں آئے تھے۔''

میں حیران رہ گیا تھا۔ سویرا پانچ سال سے شاہد بھائی کے ساتھ ایسے ہی رہ رہی تھی۔ یہ ایک عورت کی ہمت و برداشت سے کہیں زیادہ تھا اور اس دوران میں اس نے ایک بار بھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ خاموشی سے اپنی فطرت کو کچلتی رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''تم نے خود پر یہ ظلم کس طرح برداشت کیا؟''

''میں نہیں جانتی شاید شاہد کی طرح میں بھی اندر سے پتھر کی ہو گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں کم سے کم ماں جی کو بتا دوں، لیکن پھر میری ہمت نہیں ہوئی۔''

''تم نے اچھا کیا ماں جی اس بات کو برداشت نہیں کر پاتیں۔''

''وہ تو دن رات ہماری خوشیوں اور اولاد کے لیے دعا مانگتی تھیں۔''

''کبھی ایسا ہوا کہ تمہیں شاہد بھائی کی باتوں سے کچھ اندازہ ہوا ہو کہ وہ ہمارے بارے میں جان گئے تھے۔''

''نہیں انہوں نے مجھ سے کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔'' سویرا نے نفی میں سر ہلایا۔

''اب یہ ماضی کا باب ہے۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''اسے بند ہو جانا چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے تلخ یادوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ ''رات بہت ہو گئی ہے۔''

سویرا بستر سے اتر آئی تھی۔ ''شہباز میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اگر آپ مجھ سے بات نہ

کرتے تو شاید میں ایک دو دن میں سب کو بتا بھی دیتی۔"

"تم کہاں جاتیں؟"

"اپنے ماں باپ کے گھر، ان کا سب کچھ مجھے مل گیا ہے۔ میرے آبائی گھر اور زمینوں کی دیکھ بھال بھی بابا کرتے ہیں۔"

"اور اب......؟"

اس کے لبوں پر حیا آمیز مسکراہٹ آ گئی تھی۔ "اب مجھے کہاں جانا ہے اب یہی میرا گھر ہے۔"

سویرا مجھ سے کچھ دور تھی۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے وہاں بابا کو کھڑے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا رخ میری طرف تھا۔ سویرا نے چونک کر دیکھا اور پھر تیزی سے میرے سامنے آ گئی۔ بابا کے چہرے پر شدید غصہ تھا اور میں جانتا تھا وہ غصے میں اپنے حواس کھو بھی سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کا پستول والا ہاتھ بلند ہونے لگا تھا اور سویرا میرے آگے ڈھال بنی ہوئی تھی۔

بابا ساکت کھڑے تھے ان کا ہاتھ ضرور اٹھا تھا لیکن پستول کا رخ ہماری طرف نہیں ہوا تھا۔ اس لیے مجھے احساس ہوا کہ ان کے غصے کی وجہ کچھ اور ہے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "شہباز میرے ساتھ آؤ۔"

"بابا ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔" سویرا تڑپ کر آگے گئی۔ وہ کچھ اور بھی تھی۔

"سویرا اندر جاؤ اور دروازہ اندر سے بند رکھنا۔" بابا نے سرد لہجے میں کہا۔ "شہباز تم نے سنا نہیں۔"

میں کسی کھلونے کی طرح حرکت میں آیا تھا۔ سویرا نے مجھے روکنا چاہا تو میں نے نرمی سے کہا۔ "تم پریشان مت ہو معاملہ کچھ اور ہے اور دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھنا جب تک میری یا بابا کی آواز نہ سنو ہرگز مت کھولنا سمجھ گئیں۔"



بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن وہ ابھی بھی خوف زدہ تھی۔ البتہ جیسے ہی میں باہر آیا اس نے عقب سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ بابا کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے ان کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا اور میں ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ پستول بدستور ان کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہاں تو بابا نے اپنے کمرے کا دروازہ مجھ پر بند کر رکھا تھا بلکہ کمرے سے ہی باہر نہیں آتے تھے اور اب مجھے خود لے کر جا رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے پر رکے اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔

''حویلی کے عقبی طرف کچھ لوگ ہیں اور وہ حویلی میں گھسنے کی فکر میں ہیں۔''

میں حیران ہوا جو بات مجھے چھت پر جانے کے باوجود معلوم نہیں ہوئی تھی وہ بابا کو کمرے میں بیٹھے کیسے معلوم ہوگئی۔ میں نے ان سے سوال کیا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''اندر آؤ۔'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولے۔ میں ان کے پیچھے اندر آیا اور فوراً سمجھ گیا کہ بابا کو باہر موجود لوگوں کی آمد کا کیسے پتا چلا تھا۔ وہاں کمرے میں چار عدد مانیٹرز رکھے تھے جن سے کوئی درجن بھری ٹی ایکس کیمرے منسلک تھے اور یہ کیمرے حویلی کے چاروں طرف کا منظر دکھا رہے تھے ان میں رات میں دیکھنے کی صلاحیت تھی کیونکہ عقبی طرف تاریکی تھی اس کے باوجود وہاں موجود چار افراد صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مسلح تھے اور انہوں نے حویلی کی دیوار پھلانگنے کی تیاری بھی مکمل کر لی تھی۔ ان کے پاس رسیاں اور آنکڑے دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ عام چور یا ڈاکو نہیں لگ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ اس طرح سے تیاری کر کے نہیں آتے ہیں۔'' بابا نے خشک لہجے میں کہا۔ گزشتہ پانچ سال میں وہ بوڑھے ضرور ہوئے لیکن ان کی صحت اور دم خم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے مجھے اتنے عرصے بعد بھی دیکھ کر کوئی جذباتی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

''گیٹ پر موجود محافظوں کو ان کی خبر ہے؟''

''بالکل ہوگی کیونکہ چوکیدار والے کمرے میں بھی ایسا ہی نظام لگایا گیا ہے دونوں کو ایک کیمرے اور مائیک سے آوازیں پہنچتی ہیں۔''

''تب ان سے رابطہ کر کے معلوم کریں کہ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟''

"میں نے معلوم کرلیا ہے وہ ان کو پکڑنے کے لیے جال بچھا رہے ہیں۔"

"کیا تینوں پیچھے کی طرف ہیں؟" میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

"اتنے بے وقوف نہیں ہیں ان میں سے دو پیچھے ہیں اور دو سامنے ہیں۔" بابا بولے۔

"کوئی ایک گھنٹہ پہلے میں نے حویلی کی چھت سے رات میں دیکھنے والی دوربین کی مدد سے دیکھا مجھے عقبی میدان میں چار جاندار دکھائی دیئے تھے لیکن میں ان کو جانور سمجھا تھا۔"

"شاید وہ یہی تھے۔" بابا نے ان کی طرف اشارہ کیا جواب رسی میں بندھا آنکڑا دیوار کی طرف اچھال رہے تھے۔ ان کی کوشش کامیاب رہی اس سے لگ رہا تھا وہ اپنے کام میں ماہر تھے۔ ان میں سے ایک دیوار پر چڑھا اور وہ کیمرے کی حد سے نکل گیا اس پر بابا نے ایک بٹن دبایا اور اسکرین پر دوسرے کیمرے سے منظر دکھائی دینے لگا تھا وہ شخص دیوار پر چڑھ گیا تھا۔ پھر اس نے نیچے والوں کو کلیئر کا سگنل بھیجا اور نیچے اتر گیا۔ اس نے اترنے کے لیے دوسری رسی استعمال کی تھی۔ اس کے اترتے ہی دوسرا چڑھنے لگا تھا۔

"دونوں گارڈز کہاں ہیں؟" میں نے اضطراب سے کہا۔

"سکون سے رہو وہ یہیں ہیں۔"

"یہ اندر آگئے تو سکون نہیں رہے گا۔" میں نے رسی چڑھنے والے کی طرف اشارہ کیا۔ مگر بابا نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا مطلب تھا وہ اپنے حفاظتی انتظامات سے مطمئن تھے۔ اس دوران میں دو افراد اندر آچکے تھے اور تیسرا چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی اندر اتر گیا اور اس کے ایک منٹ بعد چوتھا بھی اندر آچکا تھا انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اور اگر نائٹ ویژن کیمرہ نہ ہوتا تو وہ کسی صورت نظر نہ آتے۔ نیچے آنے کے بعد وہ دم سادھ کر دیوار کے پاس بیٹھ گئے تھے میں نے بابا کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اندر آگئے ہیں آپ کے گارڈز کیا کر رہے ہیں؟"

"دیکھتے جاؤ۔" بابا بولے۔

اتنے میں آنے والوں نے خاموشی سے انداز لگایا کہ کسی کو ان کی آمد کی خبر نہیں ہوئی ہے تو انہوں نے ...ت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی وہ چاروں دیوار سے ذرا آگے ہوئے۔ اچانک صحن میں فرش میں بچھے پتوں ...لت ہوئی اور کوئی شے ان کو سمیٹتی ہوئی دیوار کی طرف کھینچ کر لے گئی۔ وہ اس میں گڈ مڈ ہو کر رہ گئے تھے۔ م...اں ایک طرف سے تیز روشنی ہوئی اور اسپیکر سے کسی کی مدہم آواز نکلی۔ "خبردار اپنے ہتھیار پھینک دو ایک بھی ...ہا تو سب مارے جائیں گے۔"

بولنے والے یہاں سے نظر نہیں آرہے تھے لیکن جال میں جکڑے جانے والوں نے ان کو دیکھ لیا تھا اور ...وں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ میں نے جال میں سے ان لوگوں کو پستول اور ریوالور ...دیکھا لیکن ان کو پھانسنے والے گارڈز اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ اس جال میں آکر ان کے سامنے آجاتے ...وں نے جال کے پاس کوئی چیز پھینکی اور اس میں سے دھواں نکلنے لگا۔ ان میں سے کسی نے چیخ کر گالی دی اور ...ے بولنے کی ان کو مہلت نہیں ملی تھی کیونکہ دھویں نے آناً فاناً جال میں پھنسے لوگوں کو گھیر لیا تھا اور وہ کھانسنے

''یہ ایس ایس جی کے تربیت یافتہ لوگ ہیں۔'' بابا نے فخر سے کہا۔

میری نظر اسکرین پر مرکوز تھی۔ تین چار منٹ بعد دھواں چھٹا تو وہ سب جال میں بے حال پڑے تھے اگر وہ ہوش میں بھی تھے تو ان میں ہلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دو افراد سامنے آئے اور ان لوگوں کو جال کھول کر نکالا۔ کیونکہ یہاں جال کو ہوا میں کھینچنے کا انتظام نہیں تھا اس لیے اس کا لیور دیوار کے ساتھ لگا تھا جیسے ہی ان لوگوں نے جال کے ٹریپ پر پاؤں رکھا وہ ان سب کو سمیٹتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ بے ہوش اور بے دم افراد کے پاس سے مزید ہتھیار نکلے تھے۔ یہ سب کر کے ان کے ہاتھ پشت پر کر کے ان میں ہتھکڑی ڈالی اور پھر ان کو باری باری اٹھا کر لے جانے لگے۔ اس دوران میں بابا دوسری اسکرینوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے شاید ان کو خدشہ تھا کہ ان کے علاوہ بھی مزید کچھ لوگ نہ ہوں جو اندر آنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن اور کسی طرف سے کوشش نہیں ہوئی تھی۔

''یہ کہاں لے جائے گئے ہیں؟''

''نیچے تہہ خانے میں۔'' بابا نے کہا۔ ''تم یہیں رکو میں ان کو دیکھ کر آتا ہوں۔''

''میں بھی چلوں۔'' میں نے ان کے واضح حکم کے باوجود پوچھا۔

''نہیں تمہارا ان لوگوں کے سامنے آنا مناسب نہیں ہے۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ میرا کن لوگوں کے سامنے آنا مناسب نہیں تھا حویلی کے گارڈز یا پکڑے جانے والے لوگوں کے سامنے آنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں چینل بدل بدل کر دیکھنے لگا حویلی کے اندر اور باہر کوئی ایک درجن کیمرے لگے تھے جن کے ساتھ مائیک بھی تھے اور ان کی مدد سے پوری حویلی کی ایک جگہ بیٹھے بیٹھے نگرانی کی جا سکتی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بابا کی کمرے میں رہنے کی یہی وجہ تو نہیں تھی لیکن مجھ سے گریز کی کیا وجہ تھی کیونکہ ابھی بھی وہ مجھے اس کمرے میں لائے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا جلد سامنے آجاتا۔ کیونکہ بابا ایک بار میرے سامنے آچکے تھے اور میں ان سے بات کر سکتا تھا۔

بابا نصف گھنٹے بعد آئے تھے۔ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ان چاروں کو تہہ خانے میں باندھ دیا گیا ہے۔''

''اب ان کا کیا کرنا ہے؟''

''پہلے ان سے پوچھنا ہے کہ یہ حویلی میں کیوں داخل ہوئے اور پھر ان کو پولیس کے حوالے کر دینا ہے۔''

''میں ان کے سامنے تو جا سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ان کے سامنے جا سکتے ہو۔'' بابا نے سر ہلایا۔ ''میں نے گارڈز کو واپس ان کی ڈیوٹی پر بھیج دیا ہے۔''

اب مجھے پتا چلا کہ بابا اور شجاع بھائی حویلی کی حفاظت کے سلسلے میں اتنے مطمئن کیوں تھے۔ انہوں نے جدید ترین کیمرہ سسٹم لگوایا تھا اور گارڈز بھی تربیت یافتہ تھے۔ میں دروازے کی طرف بڑھا اور پھر رک گیا۔ ''کیا مجھے آپ کے کمرے میں آنے اور آپ سے بات کرنے کی اجازت ہے؟''

''ہاں اب تم آسکتے ہو۔'' وہ بنا کسی تاثر کے بولے۔ میں گہری سانس لے کر کمرے سے نکل گیا۔ پہلے میں سویرا کے کمرے کی طرف گیا وہ جاگ رہی تھی کیونکہ پہلی دستک کے جواب میں اس نے پوچھ لیا۔

"کون ہے؟"

"سویرا میں ہوں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ وہ بے تاب تھی۔

"سب خیریت ہے نا بابا نے آپ کو کچھ کہا تو نہیں؟"

"نہیں بابا نے مجھے کچھ نہیں کہا۔ حویلی میں کچھ لوگوں نے گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن اب حالات قابو میں ہیں پھر بھی تم دروازہ اندر سے بند کر کے سونا۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا پھر چونک کر مشکوک لہجے میں کہا۔ "کہیں آپ مجھے بہلا تو نہیں رہے ہیں۔"

میں نے اس کی شفاف آنکھوں میں دیکھا۔ "میں تم سے جھوٹ کہہ سکتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر مسکرا کر کہا۔ "نہیں۔"

"بس اب سو جاؤ میں یہی بتانے آیا تھا۔" میں نے کہا اور واپس مڑ۔ حویلی تک جانے کے لیے بائیں طرف سے راستہ تھا اور اس کے لیے مجھے باہر صحن میں نکلنا پڑتا لیکن جب میں باہر جانے والے دروازے کے پاس پہنچا تو مجھے وہاں ایک نیا دروازہ دکھائی دیا تھا اور یہ دروازہ جس طرف تھا اس طرف تہہ خانے کی دیوار ہونی چاہیے تھی۔ دروازہ کا مضبوط فولادی کنڈہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اسے کھولا تو میرا اندازہ درست نکلا یہ تہہ خانے میں جانے کے لیے حویلی کے اندر سے ایک نیا راستہ بنایا گیا تھا۔ اس کی سیڑھیاں کچھ الگ سے تھیں جو ذرا نیچے جا کر پرانی سیڑھیوں سے مل جاتی تھیں۔ میں ان سے نیچے اترا اور تہہ خانے میں آیا۔ جہاں تیز روشنی میں وہ چاروں کھڑے ہوئے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس طرح کے ان کے ہاتھ اور پاؤں چاروں الگ الگ زنجیروں سے بندھے تھے۔ ان کے لیے ان زنجیروں کو کھولنا ناممکن تھا۔ اتنی دیر میں وہ کسی قدر ہوش میں آ گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ باہوش شخص گورا چٹا اور چیچک کے داغ والا تھا اس کی عمر تیس بتیس تھی اور ان میں سب سے زیادہ دم خم والا وہی لگ رہا تھا میں سیدھا اس کی طرف گیا۔ اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑے تو وہ کراہا تھا اس نے گالی دی۔ "چھوڑ مجھے......"

میں نے زیادہ زور سے جھٹکا دیا تو وہ چلا اٹھا تھا۔ "اب گالی مت دینا۔" میں نے اسے خبردار کیا اور اس کے بال چھوڑ دیئے پھر اسی طرح باقی تین افراد کو بھی ان کے بال جھنجھوڑ کر ہوش میں لے آیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ پوری طرح ہوش میں آ گئے ہیں تو میں ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "ہاں تو بولو تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

چیچک کے داغ والا ڈھٹائی سے بولا۔ "کسی نے نہیں ہم ڈاکو ہیں ڈاکا مارنے آئے تھے تم لوگوں نے پکڑ لیا اب پولیس کے حوالے کر دو۔"

"کیوں پولیس تمہاری ماے کی پتر ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "بہت جلدی ہے پولیس میں جانے کی؟"

"ہاں تم ہمیں قید نہیں رکھ سکتے۔"

"کیوں نہیں رکھ سکتے اور چاہیں تو تمہیں مار کر اسی تہہ خانے میں دفن بھی کر سکتے ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ پہلے ہی یہاں کتنے بندے دفن ہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ چیچک کے داغ والا تو نہیں لیکن باقی تین اس بات سے خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔

''زیادہ بڑھک نہ مار۔'' چیچک زدہ نے خود بڑھک ماری۔ ''ہمیں کوئی مائی کا لال قید نہیں رکھ سکتا۔''

''اچھا تو کیا یہاں تم اپنی بہن کا ولیمہ کھانے آئے ہو؟'' میں نے طنز کیا۔ ''یہ زنجیریں تمہاری خاطر کے لیے لٹکائی ہیں؟''

''تم ہمیں روک نہیں سکتے ہمارے ساتھی جلد آ کر ہمیں چھڑا لیں گے۔'' اس کا حوصلہ ابھی تک برقرار تھا۔

''کون مرشد علی یا اس کے کتے؟''

وہ فوراً انجان بن گیا۔ ''کون مرشد......؟''

''تمہاری ماں کا خصم اور تمہاری بہن کا یار۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا اور اس کا حسبِ خواہ نتیجہ نکلا اس نے طیش میں آ کر کہا۔

''بکواس بند کر اگر مرشد بادشاہ کے بارے میں ایک لفظ کہا تو......''

''تو کیا کر لو گے تم؟'' میں نے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے کتنی جلدی تم نے اپنے مجازی باپ کو پہچان لیا۔''

وہ اب خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جھنجھلا رہا تھا۔ غصے میں آ کر اس نے اپنا راز خود فاش کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تم ہم سے کچھ نہیں معلوم کر سکتے، چاہے قتل کر دو یا پولیس کے حوالے کر دو۔''

''بس اتنی سی سزا۔'' میں نے طنز کیا۔ ''میرے پاس اس سے کہیں بہتر تجاویز ہیں تم لوگوں کے لیے۔ نمبر ایک تم سب کا ایک ایک ہاتھ اور ایک ایک پاؤں کاٹ کر کہیں پھینک دیا جائے۔''

اس بار ایک نوجوان بولا۔ وہ سیاہ رو اور دبلا سا تھا لیکن تھا وہ بھی پورا تربیت یافتہ۔ میں ان لوگوں کی پھرتی اور مہارت دیکھ چکا تھا مجھے یقین تھا کہ یہ مرشد کے کمانڈو دستے کے خاص اراکین تھے جو اس سے پہلے بھی اس کے لیے متعدد قسم کی خدمات انجام دے چکے ہوں گے اسی بنا پر اس خاص مہم کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا تھا۔ سیاہ رو نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ ''میں اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہوں تم نے ابھی میری دوسری تجویز سنی نہیں ہے یہ زیادہ آسان ہے۔ تمہاری آنکھوں اور کان میں ایلفی ڈال دوں گا۔ ایلفی کے بارے میں جانتے ہو نا تم اندھے ہو جاؤ گے تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے آپس میں چپک جائیں گی اور دنیا کا کوئی ڈاکٹر ان کو ٹھیک نہیں کر سکے گا۔ تمہارے کانوں میں ڈالی گئی ایلفی تمہیں ساری عمر کے لیے بہرہ کر دے گی۔ ذرا سوچو صرف دس روپے کی چیز تمہیں ہمیشہ کے لیے ان نعمتوں سے محروم کر دے گی۔ باقی عمر تاریکی اور سناٹے میں رہو گے۔''

''اس کی بکواس مت سنو۔'' چیچک زدہ نے انہیں للکارا۔ ''یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہمارے سر پر مرشد کا سایہ ہے۔''

''وہ مرشد جو اپنے بھائی کو نہیں بچا سکا۔'' میں نے حقارت سے کہا۔ ''وہ تمہیں کیا بچائے گا۔''

''تم کچھ بھی کہو ہم میں سے کوئی زبان نہیں کھولے گا۔'' چیچک زدہ بولا۔ ''تمہارا جو چاہے دل کرتے

رہو۔"

میں نے باقی تینوں کی طرف دیکھا۔"تم نے سن لیا تمہارے ساتھی نے اجازت دے دی ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کروں اب تم مجھ سے کوئی شکایت مت کرنا۔"

"تم ہمارے ساتھ کچھ نہیں کر سکتے۔" سیاہ رو بولا۔

میں واپس اوپر آیا۔ مجھے یاد تھا کہ گھر میں اوزار اور مرمت میں کام آنے والی اشیا کہاں رکھی جاتی تھیں مجھے حسبِ توقع وہاں سے ایلفی تو نہیں لیکن ایک اسی طرح کا سلوشن مل گیا اس کے ساتھ ایک مضبوط ٹیپ کا رول بھی مل گیا۔ میں دونوں چیزیں لے کر نیچے آیا۔ میرے ہاتھ میں سلوشن کی ٹیوب دیکھ کر ان کے چہروں کے رنگ اُڑ گئے تھے میں سیدھا چیچک زدہ کے پاس گیا وہ مرشد کی چمچہ گیری کر رہا تھا اور میں نے پہلے اسے سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مرشد نے ان کو کس مقاصد کے تحت بھیجا تھا اگر میں پوچھ گچھ کے روایتی طریقے اختیار کرتا تو اس میں دیر بھی لگتی اور چیخ و پکار بھی زیادہ ہوتی۔ میں نے ٹیپ کا ایک سرا اس کے منہ پر رکھا اور اس کی مزاحمت کے باوجود اسے لپیٹ دیا۔ دو تین بار لپیٹنے پر اس کا منہ مکمل طور پر بند ہو گیا تھا۔ اب وہ صرف ناک سے آواز نکال سکتا تھا۔ باقی تین دہشت زدہ انداز میں یہ کارروائی دیکھ رہے تھے میں ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"اس نے اجازت تم لوگوں کے بارے میں دی تھی لیکن میں نے سوچا پہلے اس کی قوت برداشت آزما لوں اگر یہاں ناکام رہا تو تم تین ہونا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سلوشن کی ٹیوب سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا سر جکڑ کر ٹیوب کا سرا اس کے بائیں کان میں گھسیڑ دیا۔ اس نے مزاحمت کی لیکن ناکام رہا اور جیسے ہی میں ٹیوب دبائی اس میں سلوشن نکل کر اس کے کان میں جانے لگا۔ وہ ناک سے آوازیں نکالتے ہوئے سر جھٹک کر سلوشن نکالنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے ٹیوب رکھی اور اس کا سر پکڑ کو دائیں طرف جھکا دیا تاکہ سلوشن پوری طرح اس کے کان میں چلا جائے۔ یہ بہت تیزی سے خشک ہوتا تھا اور ایک منٹ کے اندر اس کا بونڈ فولاد کی طرح مضبوط ہو جاتا تھا کم سے کم ٹیوب پر یہی لکھا تھا۔ میں نے اسے چھوڑا تو اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"آدمی ایک کان سے بھی اتنا ہی سن لیتا ہے جتنا کہ دو کانوں سے سنتا ہے۔ اس لیے تمہارے دوسرے کان میں بھی سلوشن ڈالنا ہوگا۔"

اس پر وہ پاگلوں کی طرح سر ہلانے لگا میں سمجھا شاید وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہے اور میں ٹیپ اتارا تو وہ چیخ چیخ کر مجھے گالیاں دینے لگا۔ میں نے ٹیپ دوبارہ لگا دیا۔ اس بار بلا تکلف اس کے دوسرے کان میں بھی سلوشن ڈال دیا۔ اس کا سر کچھ دیر دبا کر رکھا جیسے چپل یا جوتے کے تلے میں سلوشن لگا کر کچھ دیر اسے دبا کر رکھتے ہیں۔ وہ سر ہلانے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جب میں نے اسے چھوڑا تب بھی وہ سر گھما گھما کر گویا کانوں میں ڈالا جانے والا سلوشن نکالنے کی کوشش کر رہا تھا ظاہر ہے وہ اندر جم چکا تھا اس کا نکلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ باقی تین خاصی دہشت کے عالم میں یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔

"اب باری ہے تمہاری آنکھوں کی۔" میں نے چیچک زدہ سے کہا لیکن اس نے سنا نہیں وہ سر گھما رہا تھا۔

"افسوس کہ یہ تو گیا۔" میں نے سیاہ رو کی طرف دیکھا۔ اب تم کیا کہتے ہو؟"

''میں...... میں کیا کہوں؟'' اس نے ہکلا کر کہا۔

''یہی کہ اپنے کان اور آنکھوں میں سلوشن ڈلوانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''نہیں۔'' وہ لرز اٹھا۔

''تب مجھے بتاؤ مرشد نے تم چاروں کو یہاں کیوں بھیجا؟''

''انہوں نے......''

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ''اتنی عزت سے اس شیطان کا نام مت لو۔ اس نے کہو۔''

اس نے خون کے گھونٹ پی کر کہا۔ ''اس نے ہمیں تمہیں اٹھانے کے لیے بھیجا ہے۔''

اگر چہ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس نے جھوٹ بولا۔ چیچک زدہ اب جس طرح پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا صاف لگ رہا تھا وہ سننے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ میں نے اسے آواز دی لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے سیاہ رو سے کہا۔ ''تم سچ نہیں بول رہے ہو کیا تم دونوں میں سے کوئی سچ بولنا چاہے گا؟''

لیکن وہ خاموش رہے تھے۔ میں نے چیچک زدہ کو پوری طرح قربانی کا بکرا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس بار میں نے بے رحمی سے اس کی آنکھوں میں سلوشن ڈال دیا۔ اگر چہ اس کے لیے مجھے خاصی جدوجہد کرنا پڑی وہ آنکھیں کھولنے کے لیے آمادہ نہیں تھا مگر میں نے کسی نہ کسی طرح یہ کام کر لیا وہ مرشد کے خاص گرگوں میں سے تھا اور میرے نزدیک کسی رعایت کا مستحق نہیں رہا تھا۔ کانوں میں ڈالے جانے کی صورت میں اسے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی لیکن جب یہی سلوشن میں نے اس کی آنکھوں میں ڈالا تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ اس نے منہ بند ہونے کے باوجود ناک سے ایسا واویلا مچایا تھا کہ باقی تین کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔

''بولو اب کیا کہتے ہو۔ سچ بولنا ہے یا میں تم لوگوں کے ساتھ بھی یہی کام کروں۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' ان میں سے سب سے عمر رسیدہ کی ہمت جواب دے گئی وہ تقریباً چالیس سال کا صحت مند آدمی تھا اس نے اپنے کھچڑی ہو جانے والے بالوں کو مہندی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں گندی سی تھیں جیسے ان میں کیچڑ بھرا ہو۔

''تم لوگ کس لیے آئے تھے یہاں؟''

''ہم تمہاری حویلی سے......''

''بلا خاموش رہ۔'' سیاہ رو نے اسے للکارا۔ وہ ابتدائی خوف سے سنبھل گیا تھا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے اس شخص کو خاموش رہنے کو کہا اور سیاہ رو کے پاس آیا۔ اس کے منہ پر بھی ٹیپ لپیٹا اور پھر دوبارہ عمر رسیدہ کے پاس آ گیا۔ ''ہاں اب بولو۔''

''مجھے یہاں سے ہٹا لو میں ان کے سامنے نہیں بتا سکتا۔''

''ان کی فکر مت کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ کسی کو بتانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہاں سے صرف وہی زندہ سلامت جائے گا جو سچ بولے گا۔''

''ہمیں فاضلی نے حکم دیا تھا کہ تمہاری حویلی سے سویرا نامی ایک عورت کو اٹھانا ہے وہ......'' اس کا باقی جملہ منہ میں رہ گیا تھا بلکہ کچھ دانتوں کے ساتھ حلق میں اتر گیا تھا۔ میرا گھونسہ اس کے منہ پر پڑا تھا اس نے بلبلا کر کہا۔ ''میرا قصور کیا ہے میں تو بیچ بتا رہا ہوں۔''

''بکواس مت کرو میرے گھر سے عورت اٹھانے آئے ہو اور اپنا قصور پوچھ رہے ہو۔'' میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''مجھے افسوس ہو رہا ہے میں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت نرم سلوک کیا ہے۔ تم کسی نرمی کے مستحق نہیں تھے۔''

''پھر بھی جناب ہم نے کچھ کیا تو نہیں ہے۔'' اس نے خون تھوک کر کہا۔ میں خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ فاضلی کون ہے؟''

''مرشد کا قریبی آدمی ہے۔''

''تو یوں کہو نا یہ کام مرشد نے دیا تھا۔''

''ہم تو جی اتنی اوپر پہنچ نہیں رکھتے ہیں ہمیں فاضلی ہی حکم دیتا ہے۔''

میں نے کوئی ایک گھنٹے تک ان لوگوں سے سوالات کیے۔ باقی دو فر فر جواب دے رہے تھے۔ فاضلی نامی شخص نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ حویلی میں گھس کر سویرا اور ممکن ہو تو شمی کو بھی اٹھا لے جائیں۔ وہ ایک بڑی بند کیبن والی جیپ میں یہاں آئے تھے۔ جیپ بھی عقبی میدان سے پرے درختوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ جس راستے سے آئے تھے اپنا مشن مکمل کر کے اسی راستے سے واپس چلے جاتے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان ہی زنجیروں کو ان کے گلوں میں لپیٹ کر اس وقت تک بل دیتا رہوں جب تک ان کا دم نہ نکل جائے۔ ممکن ہے میں ایسا ہی کرتا لیکن گزرے وقت نے مجھے ٹھنڈے دماغ سے کام لینا سکھا دیا ہے۔ میں نے باقی دو کے منہ بھی ٹیپ لگا کر بند کیے اور اوپر آیا۔ بابا اپنے کمرے میں جاگ رہے تھے اس لیے ہلکی سی دستک کے جواب میں ان کی آواز آئی۔

''آ جاؤ۔''

میں اندر داخل ہوا اور ان کو تہہ خانے کی ساری رُوداد سنا دی۔ سلوشن والی کارروائی کا سن کر انہوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا البتہ سویرا اور شمی کے بارے میں مرشد کے عزائم سن کر ان کی آنکھوں میں سرخی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے ساری بات بتا کر پوچھا۔ ''ان کا کیا کرنا ہے؟''

''ان حالات میں ان کو حویلی میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔''

''میں کہیں جا کر ان کو ٹھکانے لگا آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ بابا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہیں پھینک آتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''ان کی جیپ بھی عقبی میدان میں کھڑی ہے۔''

''تمہارا حویلی سے نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔'' وہ تشویش سے بولے۔

''کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میں ایک گھنٹے میں ان کو کہیں پھینک آؤں گا۔''

''نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد انکار کر دیا۔ ''میں شجاع سے بات کرتا ہوں وہی ان کا کچھ کرے گا۔''

بابا نے کمرے میں موجود فون سے بات کرنا چاہی لیکن میں نے ان کو روک دیا۔ ''بہتر ہے موبائل سے بات کریں فون لائن بہت لمبی ہے اسے کہیں سے بھی ٹریپ کیا جا سکتا ہے۔''

بات بابا کی سمجھ میں آ گئی تھی انہوں نے موبائل پر شجاع بھائی سے رابطہ کی اور ان کو ساری صورت حال بتائی۔ شجاع بھائی بھی تشویش زدہ ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے جب بات گھر کی عزت پر آئے تو آدمی کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ شجاع بھائی نے بابا کو تسلی دی اور کہا کہ وہ چند گھنٹے میں ان لوگوں کا کچھ بندوبست کرتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھے ان کو کہیں لے جانے کا موقع ملا تو میں مرشد کے لیے ان کو ایک پیغام عبرت بنا دوں گا لیکن بابا مجھے حویلی سے باہر جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھے۔ اس لیے میں نے یہیں کارروائی کا فیصلہ کیا۔ صبح قریب تھی میں پھر تہہ خانے میں آیا۔ عمر رسیدہ سمیت باقی تین افراد کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو میں چیچک زدہ کے ساتھ کر چکا تھا۔ تہہ خانہ ان کی ناک سے کی جانے والی آہ و بکا سے گونج اٹھا تھا میں نے کام کرنے سے پہلے ان سے کہا۔

''شکر کرو کہ یہاں سے زندہ جا رہے ہو اور اپنے باپ مرشد کو بھی بتا دینا اب بات دور تک جائے گی اس کے خاندان تک۔''

پھر میں اوپر آ گیا۔ بابا مجھے راستے میں مل گئے۔ ''تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

''تہہ خانے سے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ چونکے۔ ''تم نے کچھ اور تو نہیں کیا؟''

''باقی تین بھی بہرے اور اندھے ہو چکے ہیں۔'' میں نے بتایا تو بابا کچھ دیر مجھے گھورتے رہے پھر بولے۔

''تم معاملات کو پھیلا رہے ہو۔''

''معاملے کو مرشد پھیلا رہا ہے میں صرف اسے جواب دے رہا ہوں۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''شجاع کی کال آئی تھی اس نے معاملہ گارڈز کے سپرد کر دیا ہے۔ میں ان کو ان کے سپرد کرنے جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا آیا۔ ساری رات جاگنے کے بعد بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مرشد کے اس نئے حرامی پن نے مجھے پریشان کر دیا تھا اب اس کی نظر حویلی کی عورتوں پر آ گئی تھی۔ یہ اس کا نیا پینترا تھا۔ اس طرح وہ مجھے اپنے سامنے جھکانا چاہتا تھا۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا اور پھر لیٹا تو نیند آ گئی لیکن یہ پریشان سی نیند تھی میں ایک بار چونک کر اٹھا تو عقبی صحن سے سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ مجھے کسی نے جگایا نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ کسی نے منع کیا تھا ورنہ شمی مجھے اتنی آسانی سے کہاں سونے دیتی۔ سر بھاری ہو رہا تھا میں باہر آیا تو شمی اور سویرا کچن میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

''ماں جی کہاں ہیں؟''

''کمرے میں رات طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' شمی نے بتایا۔ ''جوڑوں میں درد ہو رہا تھا۔''

''اچھا میں دیکھ کر آتا ہوں۔''

''ابھی سو رہی ہیں۔'' شمی بولی۔ ''میں دو منٹ پہلے آئی ہوں۔''

سویرا بولی۔ ''آپ کے لیے ناشتہ نکالوں۔''

''نہیں موڈ نہیں ہے ایسا کرو ایک کپ چائے دے دو، ویری ہاٹ اینڈ اسٹرانگ۔''

لیکن سویرا نے میری فرمائش اَن سنی کر کے میرے سامنے ایک گلاس گرم دودھ کا رکھ دیا میں نے احتجاج کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ابھی یہی ملے گا۔'' سویرا نے کہا۔ ''چائے میں کچھ دیر میں بناتی ہوں۔''

اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ مجھے یہ دودھ پینا ہی تھا۔ میں نے مجبوراً گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ ابھی دودھ ختم کیا تھا کہ اس نے ہاٹ پاٹ سے گرم روٹی اور مکھن کا پیالہ سامنے رکھ دیا۔ ''یہ میں نہیں کھا سکتا۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔

سویرا کھڑی ہو گئی اور اس نے شمی سے کہا۔ ''ان کو چائے بنا دو۔''

شمی ہم دونوں کی اس نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہی تھی اس نے انجان بن کر کہا۔ ''کن کو چائے بنا دوں۔''

''ان کو۔'' سویرا نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

''ان سے کہو چائے یہی بنائیں گی۔'' میں نے بھی اِن ڈائریکٹ کہا۔

''ان سے کہو اگر یہ روٹی اور مکھن کھائیں گے تو میں چائے بنا دوں گی۔''

''یہ آپ دونوں براہِ راست بات کیوں نہیں کر رہے۔ مجھے کیوں درمیان میں ڈالا ہوا ہے۔''

''بھئی سمجھا کرو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ابھی میرے لیے نامحرم ہے۔''

''تو کب تک محرم بن جائیں گے۔'' شمی نے شوخی سے کہا لیکن جب سویرا نے اسے گھورا تو اس کی سٹی گم ہو گئی اسے اپنے جملے کا احساس کچھ دیر سے ہوا تھا اور پھر وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ میں روٹی اور مکھن کھانے لگا۔

''پاگل ہے۔'' سویرا نے جھینپ کر کہا۔

''ہاں لیکن سوال پتے کا کر گئی ہے۔'' میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''نامحرم کب محرم بنے گا۔''

''میرا خیال ہے اب مجھے بھی جانا چاہیے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے خیال آیا۔ ''رات کیا ہوا تھا؟''

''یہ میں چائے پیتے ہوئے بتاؤں گا۔'' میں نے دوسرے لفظوں میں اس سے رکنے کا مطالبہ کر دیا۔ وہ کسمسائی۔

''یہ مناسب نہیں ہے۔ کام کی بات اور ہے لیکن اس طرح بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ آپا یا ماں جی آ سکتی ہیں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ میں چائے کے لیے شمی سے کہہ دوں گا۔''

''نہیں چائے تو میں بناؤں گی۔'' اس نے چولہے پر پانی رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بتایا نہیں کہ رات کیا ہوا تھا؟''

''کچھ لوگوں نے حویلی میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ گارڈز نے ان کو للکارا تو وہ بھاگ نکلے۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟''

''ہاں کیوں تمہیں کوئی شک ہے؟''

''پھر آپ رات بھر کیوں جاگتے رہے؟''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں وہ نیند نہیں آئی تھی اس واقعے کے بعد۔'' میں نے بہانہ کیا۔

''بابا نے آپ سے کیا کہا؟''

''کس بارے میں؟''

''یہی کہ وہ آپ سے کیوں نہیں مل رہے ہیں؟''

''انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اگر باہر سے گھسنے والوں کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ رات بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''بابا اتنے سخت نہیں ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''سویرا وہ میرے باپ ہیں اور میں ان کی سختی اور نرمی کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔''

سویرا مجھے چائے دے کر چلی گئی تھی میں چائے لے کر عقبی صحن میں آیا جہاں دھوپ پوری طرح پھیل گئی تھی اور میں نے دیوار کا معائنہ کیا جہاں رات کو جال لگایا گیا تھا یہاں دیوار میں ایک مضبوط فولادی حلقہ تھا۔ دن کے اوقات میں گارڈز اس طرف نہیں آتے تھے اس لیے میں بلا خوف و خطر کھلے میں چلا آیا تھا۔ یہاں دیوار صرف نو فٹ اونچی تھی اور اس پر خاردار تار بھی نہیں تھی تب ہی وہ چاروں آسانی سے اندر آنے میں کامیاب رہے میں نے بابا سے اس طرف بھی دیوار اونچی کر کے باڑھ لگانے کو کہنے کا سوچا۔ ٹھیک ہے وہ کیمروں کی مدد سے نگرانی کر سکتے تھے لیکن اگر دشمن بڑی تعداد میں اندر آنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر اس کی چلے گی۔ اس لیے دشمن کو اندر آنے سے روکنا ہی اہم تھا۔ میں معائنہ کر رہا تھا کہ شمی باہر آئی اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کو بابا اندر بلا رہے ہیں یہاں مزدور کام کرنے کے لیے آنے والے ہیں۔''

میں اس کے ساتھ اندر چلا آیا۔ ''مزدوروں نے کیا کرنا ہے؟''

''پتا نہیں یہ تو آپ بابا سے پوچھیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ہم راہداری میں تھے اور اس نے کسی کو نہ پا کر پوچھا۔ ''کیا آپ کی اور سویرا امی کی کل کوئی ملاقات ہوئی ہے؟''

''تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''کیونکہ آج آپ دونوں کے بات کرنے کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ کل تک آپ دونوں بہت تکلف سے بات کرتے تھے اور آج بے تکلفی تھی۔''

''ہاں سویرا سے بات ہوئی ہے لیکن تم یہ بات کسی کو بتاؤ گی نہیں۔''

''ارے آپ کیا سمجھتے ہیں میرے دل میں نہ جانے کتنے راز دفن ہیں۔'' اس نے فخر سے کہا۔ ''بائی دی وے یہ ملاقات جس نے برف پگھلائی کب ہوئی تھی؟''

''زیادہ جاسوس بننے کی کوشش مت کرو۔'' میں نے اسے کپ تھمایا اور بابا کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر بیٹھے مانیٹرز دیکھ رہے تھے۔ میرے سلام کا جواب دے کر انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے سوچا کہ حویلی کی دیوار اونچی کرادوں اور اس طرف بھی باڑھ لگوادوں۔'' انہوں نے عقبی صحن کا منظر دکھانے والے مانیٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''اتفاق سے جب آپ نے مجھے بلایا تو میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ سکیورٹی سسٹم اچھا ہے لیکن اصل میں کسی کو اندر آنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے۔''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ان چاروں کو یہاں سے کوئی سوکلومیٹرز دور ایک سڑک پر ان کی جیپ سمیت چھوڑ دیا گیا ہے اور میرا خیال ہے اب تک وہ مرشد تک پہنچ چکے ہوں گے۔ تم نے ان کے ساتھ جو کیا اس کے بعد ان کو پولیس کے حوالے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ورنہ یہ مرشد کے خلاف اچھا کیس بن سکتا تھا۔''

''ان کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے ان میں سے ایک کے ساتھ یہ سلوک کرنا پڑا تھا۔'' میں نے کہا۔

''پھر ان کا منصوبہ جان کر میں نے سب کے ساتھ یہی کیا۔ وہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔''

''تم نے ٹھیک کیا لیکن یہ شخص اچانک معاہدے کی خلاف ورزی پر کیوں اتر آیا ہے۔'' بابا کے لہجے میں تشویش آ گئی۔

''کیونکہ اس کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔ یہ بدترین قسم کا وعدہ خلاف اور خود کو فرعون سمجھنے والا شخص ہے۔ میں سانپ یا بچھو پر بھروسہ کرنا پسند کروں گا بہ نسبت مرشد کے۔''

''میں بھی اسے ایسا ہی شخص سمجھتا ہوں لیکن وہ طاقتور اور بدمعاش ہے ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔''

''کر سکتے ہیں بابا میں یہ بات گزشتہ چھ مہینے میں بے شمار بار ثابت کر چکا ہوں۔ مرشد اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی کرم نوازیوں کی وجہ سے میں کیا بن چکا ہوں اس لیے اس نے ڈر کر مجھے آپ کی مدد سے حویلی میں محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''اگر وہ تم سے ڈرتا ہے تو اسے حویلی بھجوانے کی کیا ضرورت تھی وہ تمہیں......'' بابا نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن میں سمجھ گیا۔

''اگر وہ مجھے مروا دیتا تو اس کے لیے بھی زندگی آسان نہیں رہتی۔ بابا میں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ بہت سارے جان نثار ہیں۔ جہاں تک لڑنے مرنے کا معاملہ ہے وہ میرے سامنے نہیں آ سکتا ہے لیکن وہ بزدل آدمی اپنے اثر و رسوخ کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ مجھے پولیس کیس میں الجھا رہا ہے۔''

''بزدل شخص کینہ ہوتا ہے۔'' بابا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔''اس سے ڈرنا چاہیے۔''

''جی بابا میں بھی اسی بات کا قائل ہوں لیکن اس سے ڈر کر اس کے آگے سر جھکانے کا قائل نہیں ہوں۔''

''یہ سر جھکانا نہیں ہے۔'' بابا نے پاؤں پٹخ کر کہا۔'' یہ مصلحت ہے۔''

''بابا وہ صرف مہلت حاصل کر رہا ہے کیونکہ الیکشن سر پر ہیں۔ بلکہ آپ نے دیکھ لیا اس نے کیا حرکت کی ہے ایسے شخص سے کسی قسم کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینا ہے۔''

شاید بابا بھی اسی نہج پر سوچ رہے تھے۔''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''آپ مجھے یہاں سے جانے دیں۔'' میں نے کہا۔''میں مرشد کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں صلح پسند ہوں لیکن صلح اس کی شرائط پر نہیں ہوگی۔''

بابا سوچ میں پڑ گئے پھر انہوں نے گہری سانس لی۔''تمہیں معلوم ہے کہ جب وہ کچھ عرصے پہلے حویلی میں آیا تھا تو اس نے ہمیں کیا دھمکی دی تھی؟''

''نہیں مجھے اس بارے میں شجاع بھائی نے نہیں بتایا۔''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں نے تمہیں نہیں روکا تو عنقریب میں اپنے ایک بیٹے سے محروم ہو جاؤں گا۔ اس وقت میں سمجھا کہ وہ تمہارے حوالے سے دھمکی دے رہا ہے۔''

''اس لیے آپ نے اس کی پروا نہیں کی۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''بکواس مت کرو۔'' بابا برہم ہو گئے۔''تم بھی میری اولاد ہو اور مجھے تمہاری بھی فکر ہے لیکن تم اس وقت کہاں تھے اور کیا کرتے پھر رہے تھے مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں تمہیں نہیں روک سکتا ہوں اور وہ شاہد سے الجھتا ہوا چلا گیا تھا۔''

''پھر شاہد بھائی کو قتل کر دیا گیا۔ یہ اسی کا کام ہے۔'' میں جذباتی ہو گیا۔''ابھی مجھے اس سے شاہد بھائی کا حساب بھی لینا ہے۔''

''نہیں ہم بدمعاش نہیں ہیں۔ میں نے قانونی راستہ اختیار کیا ہے۔ مرشد کے خلاف ایف آئی آر درج کرا دی ہے۔''

میں چونکا۔''یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔''

''یہ کام تمہارے آنے سے ایک دن پہلے کیا گیا تھا۔''

اب میں سمجھا کہ مرشد نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا۔''اس کے خلاف قانونی حربے بے کار ہیں وہ سیاست دان ہے اس ایف آئی آر کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لے گا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔''اب ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ آپ حویلی میں محافظ بڑھا دیں اور حویلی کے لوگ خاص طور سے عورتیں باہر جانے سے گریز کریں۔''

''صغراں کے شوہر کی برسی ہے وہ جانے پر ضد کر رہی ہے۔''

''انہیں سمجھائیں۔'' میں نے کہا۔''اس وقت عورتوں کا حویلی سے نکلنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے اگر آنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو ہم خود سے بھی سامنا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔''

''میں نے صغراں کو سمجھایا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کے دیور خود اسے لے جائیں گے وہ اپنے ساتھ مسلح بندے بھی لائیں گے۔''

''کب جانا ہے؟''

''دو دن بعد۔'' بابا نے کہا۔

''تب میں بھی جاؤں گا۔''

''نہیں تمہاری یہاں موجودگی کا کسی کو علم نہیں ہے۔'' انہوں نے انکار کر دیا۔ ''ویسے بھی میں حویلی میں تمہاری موجودگی ضروری سمجھتا ہوں۔''

میں نے سوچا اور بابا کی بات مان لی۔ ''ٹھیک ہے ویسے آپا کے سسرال والے اچھے قابلِ اعتماد لوگ ہیں۔ کون کون جائے گا؟''

''تمہاری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سویرا عدت میں ہے۔ شمی اور صغراں ہی جائیں گے۔'' بابا نے کہا۔ ''ویسے تم بات کر کے دیکھو میرا دل بھی نہیں مان رہا ہے۔''

میں نے آپا سے بات کی تو انہوں نے کہا۔ ''شہباز سال میں ایک ہی تو موقع آتا ہے جب میں سسرال جاتی ہوں وہ لوگ کتنا بلاتے ہیں۔ شمی سے اتنا پیار کرتے ہیں اور پھر مجھے لگتا ہے جیسے شفیق کی روح وہاں ہوتی میرا اور اپنی بیٹی کا انتظار کرتی ہے میں کیسے نہ جاؤں۔'' آپا کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں ہے آپا آپ جانتی ہیں میرے دشمن آج کل حویلی کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں کو معمولی سا نقصان ہو خاص طور سے شمی کو۔''

''میں نے رفیق بھائی سے کہا ہے وہ عتیق اور معین کے ساتھ مسلح بندے بھیجیں گے۔''

شفیق بھائی کے ایک ہی بڑے بھائی ہیں رفیق اور عتیق و معین ان کے بیٹے ہیں۔''

''تب ٹھیک ہے اگر یہ نہ آتے تو میں آپ دونوں کے ساتھ چلتا۔'' میں نے کہا۔

''بابا نے تجھے سب سے چھپا رکھا ہے۔'' آپا بولیں۔ ''تیرا سامنے آنا ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''وہ کب آئیں گے؟''

''کل شام آئیں گے اور رات یہیں رکیں گے پرسوں صبح ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے دن میں اور صبح نکلنا بہتر رہے گا۔'' میں مطمئن ہو گیا۔

اس شام تک حویلی کی عقبی دیوار دس فٹ تک اونچی ہو گئی تھی اور اس پر خاردار باڑھ بھی لگ گئی تھی۔ اب اسے پھلانگنا آسان کام نہیں تھا۔ شام تک مستری کام کر کے اور اپنا سامان سمیٹ کر رخصت ہو گئے تھے۔ یہاں میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا میں نے بابا سے کہا تو انہوں نے مجھے ایک شاٹ گن دے دی۔ ان کو اس کا لائسنس ملا ہوا تھا یہ جدید ساخت کی چھوٹی رشین ری پیٹر تھی۔ اس کا شاٹ بیس فٹ کے فاصلے سے آدمی کے سینے میں دس انچ قطر کا سوراخ کر سکتا تھا۔ اور بیس گز کے فاصلے سے آدمی کی کھوپڑی اُڑا سکتا تھا۔ تینوں محافظ جدید ترین اسلحے سے لیس تھے ان کے پاس غیر روایتی اسلحہ بھی تھا اور اس کا ایک مظاہرہ میں گزشتہ رات دیکھ چکا تھا۔ اس لیے مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی اتنی آسانی سے حویلی میں نہیں گھس سکتا تھا۔

میں نے شام اور رات کو موبائل کی مدد سے پہلے دبئی اور پھر ندیم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس روز سگنل کا مسئلہ آ رہا تھا۔ مجھے بیتو کی فکر بھی تھی کہ وہ کہیں سے ملا یا نہیں۔ حویلی میں آنے کے بعد بہ ظاہر میں اپنی زندگی میں مگن ہو گیا تھا لیکن مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال تھا۔ خاص طور سے بیتو کا اور ساتھ ہی مجھے اندر سے اطمینان تھا کہ فتح خان اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا اور وہ پھر مجھ سے ملے گا۔ ماں جی کی طبیعت خراب تھی لیکن شام تک خاصی بہتر ہو گئی تھی اس لیے میں ان کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ مجھے بچپن کے وہ قصے سناتی رہیں جو میری یادداشت میں تازہ تھے لیکن ان کے منہ سے ان باتوں کو سننے کا الگ ہی مزہ تھا۔ خاص طور سے شمی کا جوش و خروش دیکھتے ہوئے۔ وہ ماں جی سے کرید کرید کر میرے بچپن کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے تنگ آ کر اس کے بال کھینچے۔

''چڑیل تجھے میرے بچپن سے کیوں اتنی دلچسپی ہو رہی ہے؟''

''تو پھر کس کے بچپن سے ہونی چاہیے؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''کسی اور کے آخر تجھے کسی کے سر مونڈھنا ہے۔''

''آپ تو نا بس۔'' اس نے کھسیا کر کہا اور وہاں سے اٹھ کر بھاگی تو میرے قہقہے نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ آپا مسکرانے لگیں۔ میں نے آپا سے کہا۔ ''اس کے بارے میں کچھ سوچا ماشاللہ خاصی بڑی ہو گئی ہے۔''

''اس سال بی اے کا امتحان دے گی۔ اس کے بعد اس کے رفیق بھائی سے بات کرتی ہوں۔''

''ان سے کیوں؟'' میں نے تعجب سے کہا۔

''پاگل اس کے وارث وہ ہیں ادھر تو یہ امانت ہے۔ اس کے بارے میں فیصلہ ان کا حق ہے۔''

''لیکن آپ ماں ہیں۔'' میں نے اعتراض کیا۔ ''اور ہم بھی غیر نہیں ہیں۔''

''صغراں ٹھیک ہے کہہ رہی ہے پتر...... بچہ تو دادکے کا ہوتا ہے چاہے نانکے کے ہاں پلے بڑھے۔'' ماں جی نے بھی کہا۔

''پھر رفیق بھائی شمی کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتے ہیں۔'' آپا بولیں

''چلیں ٹھیک ہے آپ لوگوں نے سوچا ہے تو ٹھیک ہی سوچا ہو گا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

رات کو سب جلدی سونے کے لیے اٹھ گئے تھے کیونکہ اس رات سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سردی کی تازہ لہر آئی ہو اور ماں نے میرے کمرے میں بھاری کمبل رکھوا دیا تھا۔ شمی مجھے کافی دینے آئی تو کمبل بھی لے آئی تھی۔ تازہ دھل کر اور دھوپ کھا کر اس سے نرمی گرمی اور خوشبو کی لپیٹ سی آ رہی تھی۔ یہ بھیڑ کے بچے کے اون سے بنا نفیس کمبل تھا جو دس سال پہلے آیا تھا اور آج بھی ویسا ہی نیا تھا۔

''پتا ہے میرا اس کمبل پر دل آ گیا تھا لیکن نانی نے دینے سے انکار کر دیا کہ یہ آپ کا ہے۔'' شمی نے بتایا۔

''آپا بتا رہی تھیں کہ تم بی اے کا امتحان دینے والی ہو۔''

''پارٹ ون کا۔'' اس نے بتایا۔ ''شاید ابھی جاؤں تو دادا جان کے پاس رہ جاؤں کیونکہ مجھے کالج لانے لے جانے کا ذمہ......عتیق کا ہے۔''

عتیق کا ذکر کرتے ہوئے اس کی زبان میں جو ایک جھجک سی آئی تھی اس نے مجھے چونکا تھا۔ کیا یہ جھجک

اتفاق تھی یا کوئی خاص بات تھی۔ عتیق کو میں نے آخری بار چھ سال پہلے اس وقت دیکھا تھا جب آپا کو ان کے سسرال چھوڑنے گیا تھا۔ عتیق اس وقت سولہ سال کا نوجوان تھا اور شاید فرسٹ ایئر میں آ گیا تھا۔ اب تو وہ کوئی بیس سال کا ہوتا۔ اس وقت کا مجھے دبلا اور لمبا ہو جانے والا لڑکا یاد تھا جس کے براؤن بال اس کی سفید پیشانی پر بکھرے رہا کرتے تھے۔ وہ خوش شکل تھا اور اب مزید وجیہہ ہو گیا ہو گا۔

''کالج کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سرگودھا میں۔'' اس نے بتایا۔ ''صبح جاؤں گی اور پیپر دے کر دوپہر تک واپس آ جاؤں گی۔''

آپا کے سسرالی گاؤں سے سرگودھا کا فاصلہ دو گھنٹے کا تھا اور گاڑی اچھی ہو تو پونے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ مجھے فکر ہونے لگی کہ شمی روز آئے جائے گی اور موجودہ حالات میں یہ بالکل مناسب نہیں تھا لیکن ابھی پیپرز میں وقت تھا اور دوسرے اس موضوع پر میں بابا یا آپا سے ہی بات کر سکتا تھا شمی سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اگلی صبح میری آنکھ فجر کے وقت کھل گئی تھی اور میں نے اٹھ کر وضو کر کے نماز پڑھی اور پھر سو گیا۔ پھر شمی نے اٹھایا۔

''اٹھ جائیں شیبی۔ آج مجھے بہت سارے کام ہیں ناشتہ کر لیں۔''

''کیوں کیا کام ہیں؟'' میں نے انگڑائی لے کر پوچھا۔

''شام کو آنے والوں کے لیے ابھی سے تیاری کرنی ہے۔ میں آپ کو ناشتہ کرا دوں پھر شام کے کھانے کی تیاری شروع کروں گی۔''

میں بستر سے نیچے اتر آیا۔ ''بس آدھے گھنٹے میں آیا۔''

میں غسل اور شیو وغیرہ سے فارغ ہو کر کچن میں آیا تو شمی میرا ناشتہ بنانے میں لگ گئی۔ سویرا اور آپا دوپہر اور رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ دوپہر میں ساگ بن رہا تھا جب کہ شام کے لیے اہتمام تھا۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔ اب مجھے ایک ہی جیسے معمولات سے بوریت ہونے لگی تھی۔ چند دن پہلے تک جیسی ہنگامہ خیز زندگی تھی اس کے بعد یہ پُرسکون زندگی بہت سُست لگ رہی تھی۔ آپا نے بھانپ لیا۔

''کیا بات ہے شہباز چپ چپ سے ہو۔''

''ہو سکتا ہے کوئی یاد آ رہا ہو۔'' سویرا نے کہا۔

''اسے کون یاد آ سکتا ہے۔'' آپا معنی خیز انداز میں بولی۔ ''سامنے موجود لوگوں کو کون یاد کرتا ہے۔''

سویرا نے جھینپ کر رخ پھیر لیا۔ میں مسکرایا۔ ''یہ تو ہے لیکن بہت سارے لوگ ہوتے ہیں جو دور رہ کر یاد آتے ہیں۔''

اس بار سویرا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں نے ایک لمحے میں سوال کیا کہ مجھے کون یاد آ رہا ہے۔ یہی سوال آپا نے زبان سے کیا۔ میں اس بار سنجیدگی سے بولا۔ ''کچھ لوگ ہوتے ہیں جو دور رہ کر یاد آتے ہیں۔''

اس بار سویرا خفا ہو گئی۔ ناراضگی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اس کے ذہن میں یقیناً ایمن کا خیال آیا تھا جب کہ میں بیتو اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد میں اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ بابا نے کئی طرح کے اخبارات اور رسائل لگوا رکھے تھے لیکن اخبار آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ گاؤں میں اخبار کوئی دس بجے آتا تھا۔ راولپنڈی سے شائع ہونے والے ایک اخبار نے اطلاع دی کہ مرشد اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں میانوالی کے بعض نزدیکی علاقوں کا دورہ کرنے والا تھا جو اس کے حلقہ انتخاب میں آتے تھے۔ اصل میں وہ بیک وقت دو سیٹوں پر الیکشن لڑ رہا تھا۔ ایک راولپنڈی میں اس کا آبائی حلقہ تھا اور دوسرا یہ حلقہ تھا جہاں اس کے مرید خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ میں نے خبر غور سے پڑھی۔ وہ دو دن بعد اس طرف آ رہا تھا۔ اخبارات میں سیاسی تجزیہ نگاروں کا کہنا تھا کہ مرشد کی دونوں نشستوں سے فتح یقینی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی ان نشستوں سے صرف اس کے حمایت یافتہ امیدوار ہی کامیاب ہوتے تھے اور اس بار وہ خود ان سے کھڑا ہو رہا تھا۔

ایک رپورٹ نے میری توجہ کھینچ لی تھی جس میں مرشد کے کسی وظیفہ خوار نے دروغ گوئی کے نئے ریکارڈ قائم کرتے ہوئے کہا کہ بعض سیاسی مخالفین اور اسٹیبلشمنٹ کی طاقتیں مرشد کے سیاسی کیریئر میں مزاحم ہو رہی تھیں اور جب سے اس نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے یکے بعد دیگرے مختلف معاملات میں الجھایا جا رہا ہے۔ خبر میں ایک سکہ بند دہشت گرد (خاکسار) کی طرف بھی اشارہ تھا جس نے مرشد اور اس کے خاندان کے لوگوں پر قاتلانہ حملے کیے تھے اور ایسے ہی ایک حملے میں مرشد کا چھوٹا اور نیک نفس بھائی گولیوں کا نشانہ بن کر عمر بھر کے لیے معذور ہو چکا تھا۔ یہ شب بیدار نوجوان اپنے خاندانی مریدوں اور علاقے میں بے حد مقبول تھا۔ (ظاہر ہے اس کے کرتوت شب بیداری سے تعلق رکھتے تھے اور اس کا نشانہ آس پاس والے ہی بنتے تھے تو وہ ان میں 'مقبول' کیوں نہیں ہوگا) دیگر اخبارات کے سیاسی تجزیوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ مرشد نے میڈیا میں خاصی سرمایہ کاری کی تھی لیکن سوائے چند بکاؤ لوگوں کو چھوڑ کر اکثر صحافیوں کا قلم اس کے خلاف تھا۔ انہوں نے اسے کرپٹ اور ظالم فطرت کا آدمی قرار دیا تھا جو آبائی گدی پر قابض ہو کر لوگوں کی جہالت اور توہم پرستی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں اس کے جرائم پر سے پردہ اٹھایا تھا اور ساتھ ہی حالیہ کچھ عرصے میں شہر میں ہونے والی بعض وارداتوں کا تعلق بھی مرشد اینڈ پارٹی سے جوڑا تھا۔ ایک تیز طرار صحافی نے تو ڈیوڈ شا کو بھی کھوج نکالا تھا اور اس نے لکھا تھا کہ حکومت نوٹس لے کہ ایک بدنام زمانہ شخص جو دوسرے ملکوں میں حکومتوں کے تختے الٹنے میں ملوث رہا ہے وہ مرشد سے کس لیے ملتا ہے۔ یہ معاملہ اس صورت میں مزید اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ مرشد نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سرد آہ بھر کر اخبار رکھ دیا۔ جہاں حکومت کے لوگ ایسے افراد کو وی آئی پی مہمان کا پروٹوکول دے رہے ہوں جو حکومتوں کے تختے الٹنے میں معروف ہوں وہاں مرشد سے کون پوچھے گا کہ اس نے ڈیوڈ شا سے کس خوشی میں ملاقات کی۔

مجھے بیتو کی فکر زیادہ محسوس ہونے لگی تھی اس لیے میں نے ندیم کو کال کرنے کا فیصلہ کیا اور کمرے میں آیا۔ میں نے موبائل نکال کر آن کیا تو خوش قسمتی سے اس میں سگنل آ رہے تھے میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''میں بات کر رہا ہوں۔'' میں نے نام لینے سے گریز کیا۔

''ہاں بول کیا حال ہیں۔'' ندیم بھی یوں بولا جیسے اس کے آس پاس کوئی ہو۔

''بیتو کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں لیکن کل میں گھر پر نہیں تھا تو ایک لڑکا آیا تھا اس نے مجھ سے ملنے کو کہا تھا۔ میں نے چوکیدار رکھ لیا ہوا ہے۔ اس نے اسے مشکوک سمجھ کر بھگا دیا بعد میں اس نے مجھے بتایا تو اس کا حلیہ وہی ہے جو تُو نے بیتو کا بتایا ہے۔''

میں مضطرب ہو گیا۔ ''وہ پھر نہیں آیا؟''

''نہیں لیکن میں نے چوکیدار سے کہہ دیا ہے وہ آئے تو اسے روک کر مجھے اطلاع دے۔''

''جیسے ہی وہ تجھ سے رابطہ کرے مجھے ضرور بتانا۔'' میں نے کہا پھر اسے حویلی میں گھسنے والوں کا احوال بتایا۔ ''ان کے بارے میں اخبار میں کچھ نہیں آیا ہے۔''

''وہ بہت حرامی آدمی ہے سب صاف کر گیا ہوگا کیونکہ پولیس میں جانے کی صورت میں بات کھل جاتی اور ابھی وہ اس چکر میں ہے کہیں کوئی معاملہ اوپر نہ آنے پائے۔''

''بابا نے شاہد بھائی کے قتل کی ایف آئی آر میں مرشد کا نام دے دیا ہے۔''

ندیم چونکا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''میرے یہاں آنے سے ایک دن پہلے کی۔''

''یہ برا ہوا میرا خیال ہے بھیجے جانے والے بندے اسی ایف آئی آر کا نتیجہ ہے۔''

''لیکن مرشد اوچھے پن پر اتر آیا میں اسے اس کے سکوں میں ادائیگی کرنے کا سوچ رہا ہوں۔''

''وہ ہمیشہ سے اوچھا آدمی ہے تُو کوئی فیصلہ جذبات میں آ کر مت کر جو کر خوب سوچ سمجھ کے کر۔'' ندیم شاید کہیں باہر اٹھ آیا تھا کیونکہ اب وہ کھل کر بات کر رہا تھا اور کسی سڑک کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔



''میں جو کروں گا سوچ سمجھ کے ہی کروں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں موبائل رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے اچانک راجا عمر دراز کا خیال آیا اور مجھے پھر اس کے ایک خاص آدمی عبداللہ کا خیال آیا جو اس کی لاہور والی کوٹھی میں ہوتا ہے۔ اتفاق سے اس کا نمبر مجھے یاد آ گیا تھا کیونکہ وہ ایزی نمبر تھا۔ مجھے یقین سے یاد نہیں تھا لیکن میں نے ملانے میں حرج نہیں سمجھا کہ زیادہ سے زیادہ رانگ نمبر مل جائے گا۔ میں نے نمبر ملایا اور چند لمحے بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو کون بات کر رہا ہے۔''

''عبداللہ؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میں بات کر رہا ہوں۔'' اس نے میری آواز پہچاننے کی کوشش کی۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں شہباز بات کر رہا ہوں۔''

''شہباز صاحب۔'' اس کے لہجے میں خوشی آ گئی تھی۔ ''آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں نے آپ کے بارے میں آخری بار سنا تھا کہ آپ کہیں نیپال میں ہیں۔''

''میں واپس آ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''راجا صاحب کے بارے میں کوئی خبر ہے؟''

''آپ کو نہیں معلوم؟'' اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

''کیا نہیں معلوم؟'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''راجا صاحب خیریت سے ہیں؟''

"جی وہ ٹھیک ہیں اور واپس اپنے آبائی محل میں آ چکے ہیں لیکن ان دنوں وہ کسی سے نہیں مل رہے ہیں۔"
راجا عمر دراز کی واپسی کی خبر میرے لیے خوش کن تھی۔ یعنی وہ بھی انڈیا سے زندہ سلامت آ گیا تھا۔ "کیا راجا صاحب یہاں آئے تھے؟"
"نہیں ان کے بارے میں صرف خبر آئی ہے کہ وہ اپنے محل میں موجود ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔ "بیگ صاحب یہیں تھے جب ان کو اطلاع ملی تو وہ محل کی طرف روانہ ہو گئے۔"
"راجا صاحب کے ساتھ حکیم بھی ہے؟"
"نہیں مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔" عبداللہ نے جواب دیا۔ "میرے لائق کوئی خدمت؟"
"مجھے محل کا فون نمبر مل سکتا ہے؟"
"جی بالکل مل سکتا ہے۔ بیگ صاحب جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ جیسے ہی آپ کے بارے میں کوئی خبر آئے ان کو مطلع کیا جائے۔" عبداللہ نے کہا اور مجھے محل کے فون نمبرز لکھوائے۔ پھر اس نے وسیم اور سفیر کے بارے میں پوچھا۔
"یہ پوری پارٹی آج کل دبئی میں ہے۔"
"شہباز صاحب میرے لائق کوئی خدمت؟" اس نے پھر پوچھا۔
مجھے خیال آیا کہ وہ اس صورتِ حال میں میری مدد کر سکتا تھا وہ تجربے کار اور بہادر آدمی تھا۔ "یہ بتاؤ کہ کیا تم راولپنڈی آ سکتے ہو؟"
"آ سکتا ہوں لیکن بیگ صاحب سے اجازت لینا پڑے گی۔" اس نے کہا۔ "خیر یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ راجا صاحب کے نزدیک آپ کی جو اہمیت ہے مجھے یقین ہے اجازت مل جائے گی۔"
"میرا ایک ساتھی راولپنڈی میں غائب ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی فتح خان کے قبضے میں چلا گیا تھا اور میں چھوٹ گیا۔ شاید وہ بھی اس کی قید سے فرار ہو گیا ہے اسے تلاش کرانا ہے۔"
"میں آپ کو ایک گھنٹے بعد بتاتا ہوں۔" اس نے کہا۔
"تم کال مت کرنا میں خود ایک گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔ یہ خبر خوش آئند تھی کہ راجا عمر دراز واپس گیا تھا۔ اب میں جاننے کی فکر میں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے محل کا ایک نمبر ملایا جو حسبِ توقع سیکرٹری بیگ نے اٹھایا تھا۔
"بیگ صاحب میں بات کر رہا ہوں۔" میں نے نام بتانے سے گریز کیا لیکن وہ آواز سے پہچان گیا۔
"اوہ آپ۔" اس نے محتاط انداز میں کہا۔ "کہیے کیسے مزاج ہیں؟"
"ٹھیک ...... راجا صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟"
"راجا صاحب کی طبیعت علیل ہے۔" اس نے اسی انداز میں کہا۔
"دوسرے لفظوں میں ان سے بات نہیں ہو سکتی ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "اسی طرح اس پر بھی بات نہیں ہو سکتی ہے کہ راجا صاحب کی واپسی کن حالات میں ہوئی ہے؟"

''آپ سمجھدار ہیں فون پر اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں ہوتی ہے۔'' بیگ نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے راجا صاحب تک میری مزاج پرسی اور نیک تمنائیں پہنچا دیجئے گا۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مجھے غصہ آ رہا تھا سیکرٹری بیگ ہمیشہ سرکاری اسٹائل میں رہتا تھا اور اس کے نزدیک کوئی چیز ٹاپ سیکرٹ سے کم نہیں ہوتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ میرا غصہ سرد ہونے لگا۔ وہ بے چارہ بھی ملازم ہی تھا اور وہی کرتا تھا جو راجا کی مرضی ہوتی تھی۔ راجا کی اپنی ذہنیت ایسی تھی وہ حکمران کلاس کا آدمی تھا جو عام آدمی سے فاصلہ رکھنا پسند کرتا ہے اور میں اس کے کتنا ہی نزدیک سہی تھا تو عام آدمی۔ ایک گھنٹے بعد میں نے عبداللہ کو کال کی۔ مجھے امید تھی کہ بیگ کی جانب سے اسے اس کی حد میں رہنے کا حکم ملا ہوگا لیکن اس نے گرم جوشی سے کہا۔
''میری بیگ صاحب سے بات ہوگئی ہے اور ان کا حکم ہے کہ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں۔''
''میں ان کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے ظاہر کرنے سے گریز کیا کہ میری بیگ سے بات ہو چکی ہے۔''یہ بتاؤ کہ راولپنڈی میں تمہارے پاس کتنے کام کے آدمی ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''
''کیوں نہیں جناب۔'' اس نے چہک کر کہا۔''وہاں راجا صاحب کا خاص آدمی منظور ہے۔ وہ میرا گرائیں ہے۔ سابق ایس ایس جی ہے اور میں نے ہی اسے وہاں رکھوایا ہے بہت جی دار اور یاروں کا یار ہے۔ اس کے ساتھ دو تین آدمی ہوں گے۔ اگر زیادہ افراد کی ضرورت ہے تو میں لاہور سے لے آتا ہے۔ میں نے راجا صاحب کے حکم پر کام کے کوئی نصف درجن بندے رکھے ہیں۔ خود ان کو تربیت دی ہے۔''
''فی الحال ان کی ضرورت نہیں ہے بس تم آ جاؤ۔ اسلام آباد والی کوٹھی میں قیام ہے نا؟''
''جی شہباز صاحب۔'' اس نے تصدیق کی۔''سامان بھی ہر قسم کا مل جائے گا۔ ایک مہینے پہلے میں نے خود خریداری کی ہے۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا دیکھ کر۔''
میں سمجھ گیا سامان سے اس کی کیا مراد تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ راجا عمر دراز نے شہروں کے حوالے سے اپنی کوئی خاص پلاننگ کی تھی اور وسیم جیسے آزاد لوگوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی فورس تیار کر رہا تھا۔ عبداللہ اسی کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے پاس کم سے کم دس لڑاکے تھے اور یہ معقول تعداد تھی اگر مجھے ضرورت پڑتی تو میں بالکل بے یار و مددگار نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد کے لیے روانہ ہو جائے اور وہاں پہنچ کر مجھے اس نمبر پر ایس ایم ایس کر دے۔ میں موبائل رکھ کر باہر جا رہا تھا کہ مجھے کھڑکی سے عقبی صحن میں بابا کی جھلک دکھائی دی وہ تعمیر ہونے والی دیوار کا معائنہ کر رہے تھے۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔
''میں نے ان تینوں میں سے ایک کو ساتھ بھیجنے کا سوچا ہے یہ صغراں اور شمی کو پہنچا کر واپس آ جائے گا۔''
''یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔''
''ہوں...... تمہارے پاس موبائل کہاں سے آیا؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔ میں ایک لمحے کو چپ ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ انہوں کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔
''ندیم نے لا کر دیا تھا۔'' میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔
''یعنی تمہارے اپنے ساتھیوں سے رابطے ہیں؟''
''جی لیکن آپ فکر مت کریں میں کوئی قدم آپ کے علم میں لائے بغیر نہیں اٹھاؤں گا۔''

''مہربانی پتر۔'' وہ تلخ انداز میں بولے۔ ''شاید تمہیں اب بوڑھے باپ پر رحم آنے لگا ہے۔''

''پلیز بابا آپ میرے لیے محترم ترین ہیں۔'' میں نے التجا کی۔

''تبھی تم میرا فیصلہ میرے منہ پر مار کر چلے گئے تھے۔''

میں نے بے بسی سے ان کو دیکھا اتنے سالوں بعد بھی ان کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ ''بابا میں فوج میں نہیں جانا چاہتا تھا۔''

''اس لیے تم گھر سے چلے گئے۔''

''میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔''

''اس وقت تمہارے پاس یہ دلیل تھی ایسی کسی دلیل کے سہارے تم کسی دن یہاں سے چلے جاؤ گے۔ شہباز میں تمہارا باپ ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں تم وہی کرتے ہو جو تمہارے دل میں آتا ہے۔''

''شاید اس معاملے میں آپ پر گیا ہوں۔'' میں نے بے ساختہ کہا تو بابا نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور پاؤں پٹختے ہوئے اندر چلے گئے۔ مجھے لگا ایک بار پھر مجھ پر ان کے سامنے آنے پر پابندی لگ جائے گی لیکن دوپہر کے کھانے پر وہ پہلی بار دسترخوان پر موجود تھے اور ماں جی ان کو دیکھ کر کھلی جا رہی تھیں۔ ان کے لیے خود پلیٹ میں ساگ اور روٹی نکالی تھی۔ اصرار کر کے کھلا رہی تھیں۔

''لیں نا ملک صاحب اتنے دن سے برائے نام ہی کھا رہے تھے میں نے خود بنایا ہے۔''

ماں جی نے جوڑوں کی تکلیف کے باوجود بابا کے لیے خود ساگ بنایا تھا۔ کیونکہ وہ ان کے ہاتھ کا بنا ساگ پسند کرتے تھے۔ بابا کے طفیل میں نے بھی اتنے عرصے بعد ماں جی کے ہاتھ کا ساگ کھایا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ ماں جی نے اتنے عرصے بعد آنے والے بیٹے کے لیے کچھ نہیں بنایا تھا لیکن شوہر چند دن دسترخوان سے دور رہا تو وہ بے قرار ہو کر خود میدانِ عمل میں اتر آئیں۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ میاں بیوی کا رشتہ کس قدر رانوکھا اور عجیب ہوتا ہے۔ اگر اس میں محبت ہے تو اس کے آگے کسی رشتے کی اہمیت نہیں رہتی ہے اور اگر محبت نہیں ہے تو میاں اور بیوی کی آپس میں کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔ دوسرے مجھے ماں جی کی بابا سے محبت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا تھا۔ کھانے کے بعد جب بابا چلے گئے تو میں نے ماں جی کو چھیڑا۔

''بابا کی اتنی ناز برداری اور بیٹا اتنے دن بعد آیا ہے اور اسے پوچھا ہی نہیں۔''

ماں جی مسکرائیں۔ ''ہاں نا وہ میرے سر کا سائیں ہے۔ اس کے آگے کسی کی اہمیت نہیں ہے۔''

''ہم بھی تو اولاد ہیں۔''

''ہاں لیکن کس سے ملی ہے مجھے یہ اولاد۔'' ماں جی نے کہا۔ ''یہ مان، یہ مرتبہ، یہ عزت سب تیرے بابا کے دم سے ہے خدا مجھے ان کے سامنے اٹھا لے کیونکہ ان کے بغیر میری زندگی کچھ نہیں ہے۔''

''اللہ آپ دونوں کا سایا ہمارے سروں پر رکھے۔'' میں نے دل سے کہا۔ میں کمرے میں آیا تو شمی میرے کپڑے رکھ رہی تھی۔ یہ سارے نئے کپڑے تھے۔ میں نے تعجب سے کہا۔ ''یہ کہاں سے آئے؟''

''امی نے شبیر سے منگوائے ہیں۔ فضل کا بیٹا ہے۔ شہر میں منڈی میں کام کرتا ہے کبھی کبھی سلام کرنے آجاتا ہے اور اگر کچھ منگوانا ہو تو وہ لا دیتا ہے۔ امی نے اس سے منگوائے ہیں۔ سائز بالکل آپ کا ہے میں دیکھ

چکی ہوں۔"

یہ دو شلوار سوٹ تھے اور دو پینٹ شرٹس تھیں ایک فل سویٹر، ایک ہاف سویٹر، ایک گرم جیکٹ اور ایک گرم چادر تھی۔

"آپا آپ نے تو بہت کچھ منگوا لیا۔"

"کہاں چند سوٹس تو ہیں۔" اس نے کہا۔

"پاگل تم لڑکیوں کو سوٹ ہمیشہ کم لگتے ہیں ہم تو ملنگ لوگ ہیں۔"

"میں آپ کے لیے یہ والا نکال رہی ہوں۔" اس نے آسمانی شلوار سوٹ سامنے کیا۔" آپ شام کو پہنئے گا۔"

"ٹھیک ہے استری کر کے لے آنا۔" میں نے کہا۔ میں منتظر تھا کہ وہ کمرے سے نکلے تو میں موبائل نکالوں لیکن وہ جانے کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ تین چار دن کے لیے جا رہی تھی اور میرے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں مجبوراً اس سے بات کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نکلی تو میں نے کمرہ اندر سے بند کر کے اور کھڑکی پر پردہ کر کے موبائل نکالا اور اس پر دیکھا تو عبداللہ کا ایس ایم ایس موجود تھا۔ مجھے حیرت ہوئی ابھی تین گھنٹے پہلے اس سے بات ہوئی تھی اور وہ اسلام آباد والی کوٹھی میں پہنچ گیا تھا۔ ایس ایم ایس میں اس نے یہی اطلاع دی تھی۔ میں نے اسے کال کی۔

"تم اتنی جلدی پہنچ گئے۔"

"جناب ہم ایمرجنسی میں کام آنے والے بندے ہیں اس لیے ہر کام ایمرجنسی میں کرتے ہیں میں آپ سے بات کرتے ہی نکل گیا تھا۔ موٹروے کے راستے آنے میں ڈھائی گھنٹے لگے۔ ابھی پہنچا ہوں اور آپ کو ایس ایم ایس کیا تھا کہ آپ کی کال آ گئی۔"

"گڈ یہاں کی کیا پوزیشن ہے؟"

"بندے مجھ سمیت پانچ ہیں۔ یعنی کام کے بندے اور سامان تو ہر طرح کا ہے۔"

"عبداللہ اسلام آباد میں ایک عورت ہے شہلا رضوی۔" میں نے اسے شہلا رضوی کی کوٹھی کا پتا بتایا۔" اس کی نگرانی کرنی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے اور دوسرے وہاں میرے ایک ساتھی کو تلاش کرنا ہے اس کا نام بیتو ہے۔" میں نے اسے بیتو کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔" یہ سمجھ لو کہ یہ میرے لیے وسیم اور سفیر کی طرح ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس نے مستعدی سے کہا۔" میں ابھی سے نکل جاتا ہوں۔ منظور کے پولیس والوں سے بھی کچھ رابطے ہیں ہم تھانوں میں بھی چیک کرا لیتے ہیں۔"

"یہ اچھا ہوگا کیونکہ راولپنڈی ڈویژن میں کوئی سو سے اوپر تھانے ہوں گے ان سب میں پتا کرانا ہوگا۔"

"میں منظور سے کہتا ہوں وہ ابھی سے اس کام میں لگ جاتا ہے میں شہلا رضوی کو دیکھتا ہوں۔ یہ کیسی عورت ہے؟"

"بہ ظاہر دشمن نہیں ہے لیکن میرے کچھ مرحوم دشمنوں سے اس کے روابط رہے ہیں اور مرنے والوں کا تعلق مرشد سے تھا۔ اس لیے تم اس کو بھی میرا دشمن سمجھ سکتے ہو۔ اس کے پاس ایک بریف کیس ہے بلکہ وہ ایک

بینک لاکر میں ہے جو مرنے والے کا ہے اور یہ اس لاکر کی چیزیں ہتھیانا چاہ رہی ہے اس لیے یہ بینک کے چکر لگا رہی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں تم اس کی چھپ کر نگرانی کراؤ اور جب یہ بینک لاکر سے چیزیں نکال لے تو اس میں موجود سلور دھات کا بنا بریف کیس تم حاصل کرلو۔''

''میں سمجھ گیا بریف کیس میں کیا ہے؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا یہ میرے پاس کسی کی امانت ہے اور خیال رکھنا اسے کھولنے کی کوشش مت کرنا ممکن ہے اس میں دھماکہ خیز مادہ یا زہریلی گیس ہو۔''

''میں خیال رکھوں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے ہی میرے پاس کوئی کام کی خبر آئے گی میں آپ کو ایس ایم ایس کر دیا کروں گا۔''

''نہیں اب تم مجھے کال بھی کر سکتے ہو لیکن صرف ضرورت کے وقت۔'' میں نے کہا۔

کال کاٹ کر میں نے دبئی میں سفیر کے گھر کا نمبر ملایا لیکن اس پر بیل جا رہی تھی اور کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر پر کوئی نہ ہو۔ شاید وہ سب کہیں گھومنے پھرنے گئے تھے۔ دبئی گھومنے پھرنے کے لحاظ سے ایک بین الاقوامی مرکز بن گیا ہے۔ یہاں گھومنے پھرنے اور تفریح کی اتنی جگہیں بن گئی ہیں کہ آدمی روز ایک تفریح گاہ میں جائے تو سال بعد بھی اسے کسی جگہ دوبارہ جانے کا اتفاق نہ ہو۔ صحرا میں رہنے والوں نے صرف امن و امان اور انصاف مہیا کر کے ساری دنیا کا پیسہ اپنا کھینچ لیا ہے۔ دبئی میں تیل نہیں نکلتا ہے لیکن اپنی تجارتی پالیسیوں کی وجہ سے یہ متحدہ عرب امارات کی خوش حال ترین ریاست بن گئی ہے اور اس نے تیل رکھنے والی ریاستوں ابوظہبی اور شارجہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

صبح تک مجھ پر جو بوریت طاری ہو رہی تھی اب کسی حد تک اس کا ازالہ ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے اب میں بے کاری والی کیفیت سے نکل آیا تھا عبداللہ سے رابطہ کر کے میں ایک بار پھر متحرک ہو گیا تھا۔ بے شک میں آرام سے بیٹھا تھا لیکن میں نے ذہن میں جو جو کام سوچ رکھے تھے ان پر کام شروع ہو گیا تھا۔ خاص طور سے مجھے بیتو کی فکر تھی۔ ندیم نے بتایا تھا کہ وہ آزاد ہے اور اس نے ندیم سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن کسی وجہ سے دوبارہ اس کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں اول وہ پھر سے دشمن کے ہاتھ لگ گیا ہے یا دشمن ندیم کے گھر کے آس پاس اس کی تاک میں ہے اور وہ اس طرف آنے سے گریز کر رہا ہے۔ عبداللہ کے اسلام آباد پہنچنے سے میری تشویش میں خاصی کمی واقع ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں شمی نے کمرے میں جھانکا اور مجھے اطلاع دی۔ ''وہ لوگ آ گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

''وہی...... عتیق بھائی اور معین بھائی۔'' اس نے جھجک کر کہا۔

میں تیار ہو کر نشست گاہ میں آیا تو وہاں دونوں بابا کے ساتھ موجود تھے۔ عتیق نے حیرت اور خوشی سے کہا۔ ''سرپرائز...... شہباز بھائی۔'' وہ میرے سینے سے لگ گیا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں اور تم سناؤ۔'' میں نے گرم جوشی سے کہا۔ پھر معین سے ملا۔ وہ بڑا تھا لیکن خاموش طبع تھا اس کے ملنے میں اتنی گرم جوشی نہیں تھی لیکن عتیق میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ بابا کچھ دیر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر حال

احوال لیتے رہے پھر اٹھ کر اندر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی عتیق نے بے تکلفی سے کہا۔ ''شیبی بھائی آپ کہاں تھے۔ سچ آپ سے ملنے کا بہت شوق رہا ہے۔''

''یار میں خود سے نہیں مل پا رہا ہوں ان دنوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''میں انجینئرنگ پڑھ رہا ہوں۔ ٹیکسلا یونیورسٹی سے۔''

''کون سا ڈیپارٹمنٹ ہے؟''

''پیٹرولیم میں۔''

''اچھا شعبہ ہے کون سے سمسٹر میں ہو؟''

''بس آخری شروع ہونے والا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آج کل کچھ دن کے لیے گھر آیا ہوں۔''

عتیق پہلے کے مقابلے میں کسی قدر صحت مند ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے کی تازگی اور چمک اسے نوجوان بنا رہی تھی۔ وہ مجھے اسی لمحے پسند آ گیا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ شمی کے لیے وہ مناسب رہے گا۔ اگر آپا نے کہوں تو وہ اپنے جیٹھ سے بات کر سکتی تھیں۔ معین باہر موجود آنے والے افراد کو دیکھنے گیا تھا تو عتیق کو موقع مل گیا وہ میرے مزید نزدیک آ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''شہباز بھائی آپ کی کچھ لوگوں سے دشمنی ہو گئی ہے؟''

''ہاں یار۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کچھ ہیں نسلی اصلی کمینے جو بلا وجہ ہی پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''اور میں نے سنا ہے آپ انڈیا بھی ہو آئے ہیں؟''

''بہت ساری جگہوں پر گھوما ہوں کبھی تم فرصت سے آؤ تو تم کو تفصیل سے بتاؤں گا۔''

''آج رات یہیں رکیں گے تو فرصت ہی فرصت ہے۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''پلیز شہباز بھائی مجھے آپ کے بارے میں جاننے کا شوق ہے۔''

''ٹھیک ہے برخوردار میں تمہیں بتاؤں گا لیکن ابھی تم صغراں آپا اور شمی سے مل لو۔ فریش ہو جاؤ۔''

اسی اثنا میں شمی آئی اور اس نے عتیق سے کہا۔ ''آپ کو امی بلا رہی ہیں۔''

اس وقت میں نے شدت سے محسوس کیا کہ شمی نے اسے عتیق بھائی نہیں کہا تھا۔ دوسرے اس کا لہجہ مختلف تھا اور تیسرے میرے سامنے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ سگے چچا زاد تھے۔ عتیق اٹھ کر شمی کے ساتھ اندر چلا گیا اور میں مسکرایا۔ شاید وہ پہلے ہی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ کیونکہ پردے والی بات نہیں تھی اس لیے وہ بے تکلف زنانے میں چلا گیا تھا۔ اس دوران میں معین آ گیا اور میں اس کے ساتھ بیٹھا رہا تھا کوئی ایک گھنٹے بعد عتیق بھی اندر سے آ گیا۔ معین نے گریجویشن کر کے تعلیم چھوڑ دی تھی اور اب زمینوں پر رفیق بھائی کا ہاتھ بٹا رہا تھا لیکن عتیق کا ارادہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا اور وہ انجینئرنگ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔

رات کے پُر تکلف کھانے کے بعد محفل جمی تھی لیکن پھر معین تھکن کا کہہ کر سونے چلا گیا۔ آپا اور دوسرے بھی اٹھ گئے تھے۔ آپا نے کل سفر کے لحاظ سے تیاری کرنی تھی۔ عتیق میرے ساتھ میرے کمرے تک چلا آیا وہ میرے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ جان چھڑانے کے لیے اسے اپنی مختصر سی آٹو بایوگرافی سنا دوں لیکن اس مختصر آٹو بایوگرافی کو اس نے سوالات کر کر کے خاصا طویل کر لیا تھا۔ جب تک

میں اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا شمی وقفے وقفے سے کمرے میں جھانکتی رہی تھی اور چائے پانی کا پوچھتی رہی۔ وہ جب کمرے میں آتی تو عتیق کے چہرے پر ایک چمک اور رونق آجاتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے اس کا پورا وجود شمی کی طرف متوجہ ہے۔ بڑی مشکل سے رات ایک بجے تک میری داستان ختم ہوئی تو وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

''کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔''

''نہیں تم یہیں ٹھیک ہو۔ تمہاری ایک نارمل لائف ہے اور آدمی کے پاس نارمل لائف ہونا بھی بہت بڑی نعمت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی قدر مجھ سے پوچھو۔''

''لیکن کس قدر ایڈونچرس لائف بھی ہے۔'' اس نے رشک سے کہا اور پھر منہ بنا کر بولا۔ ''ایک ہم ہیں یونیورسٹی اور پھر حویلی اور پھر یونیورسٹی، اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔''

''ہوگا برخوردار......ضرور ہوگا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بس ذرا شادی ہو جانے دو پھر دیکھنا لائف کتنی ایڈونچرس ہو جائے گی۔ شاید اس وقت سکون کو ترسو گے۔''

شمی اس وقت چائے کے کپ لینے آئی تھی۔ یہ بات سن کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی اور عتیق کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ پھر وہ بمشکل سونے گیا مجھے بھی شدت سے نیند آرہی تھی اس لیے میں بھی لیٹ کر سو گیا۔ صبح جلدی اٹھنا تھا کیونکہ نو بجے تک آپا اور دوسرے ناشتہ کر کے روانہ ہو جاتے۔ عتیق اور معین بڑی پجیرو جیپ لائے تھے اور ساتھ میں دو مسلح محافظ تھے۔ خود ان کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ ہمارے علاقے میں اسلحہ ایک لازمی چیز ہے ہر شخص استعمال کرنا جانتا ہے۔ صبح شمی نے مجھے اٹھایا۔

''اٹھ جائیں شیبی ناشتہ لگنے والا ہے۔''

ناشتہ اندر ہی تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آگیا۔ آپا اور شمی تیار ہو گئے تھے۔ ناشتہ کرتے کرتے ساڑھے آٹھ بج گئے اور پھر سامان جیپ میں رکھا جانے لگا۔ میں باہر نہیں جا سکتا تھا اس لیے عتیق اور معین سے نشست گاہ میں الوداعی ملاقات کر لی۔ شمی میرے گلے لگ گئی۔ ''آپ فکر مت کرنا میں جلدی آجاؤں گی۔''

''اسی بات کی تو فکر ہے۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔

وہ منہ بنا کر بولی۔ ''اتنا تنگ ہیں مجھ سے تو ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہوں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں تجھے ہمیشہ کے لیے بھیج دوں۔''

آپا آرہی تھیں انہوں نے سن لیا۔ ''کہاں بھیج رہا ہے ہمیشہ کے لیے میری بیٹی کو؟''

''جہاں ایک دن ہر بیٹی کو جانا ہوتا ہے۔''

''شیبی آج کل آپ کے ذہن میں بس یہی سوار ہے۔'' شمی بولی۔

''تیرا ماما ہے اسے فکر نہیں ہوگی۔'' آپا نے اس کے تیز لہجے پر اسے ڈانٹا۔ باہر سامان رکھا جا چکا تھا۔ آپا اور شمی مجھ سے مل کر رخصت ہوگئے۔ نو بجے جیپ حویلی سے نکل چکی تھی۔ میں نے عتیق اور معین سے ان کے موبائل نمبر لے لیے تھے۔ میں نے عتیق سے کہا۔ ''گھر پہنچتے ہی مجھے کال کر کے اطلاع کرنا اور راستے میں محتاط رہنا۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' اس نے کہا۔ ان کے ساتھ ایک گارڈ بائیک پر جا رہا تھا۔ ان کو حویلی تک بحفاظت پہنچا کر وہ واپس آ جاتا۔ ان کے جانے کے بعد میں ماں جی کے پاس آ بیٹھا جو بیٹی کے جانے سے اداس تھیں حالانکہ آپا چند دن کے لیے گئی تھیں۔ آج ان کی تکلیف کم تھی۔ سویرا بھی آ گئی تھی۔ وہ ماں جی سے باتیں کرنے لگی تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا میں نے ایک بار پھر سفیر کو دبئی میں کال کرنے کی کوشش کی۔ اس بار بھی بیل جاتی رہی اور کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کوئی روز تو باہر نہیں جاتا اور فون خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سفیر کے موبائل نمبر پر کوشش کی لیکن وہ گزشتہ روز کی طرح بند جا رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ بے سبب نہیں تھا کوئی چکر ضرور تھا۔ مجھے خیال آیا کہ سفیر کے گھر فون کر کے معلوم کروں لیکن اس کے آبائی گھر کا نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ پھر میں نے عبداللہ کو کال کی۔

''کیا حال احوال ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم نے شہلا رضوی کا گھر تلاش کر لیا ہے اور دو آدمی مستقل وہاں نگرانی پر ہیں۔''

''گڈ......شہلا کیا گھر میں ہے؟''

''جی شہباز صاحب اور وہ کل رات سے گھر سے نہیں نکلی ہے۔''

''اس کی نگرانی جاری رکھو اور بیتو کا پتا چلا؟''

''نہیں۔'' اس کا جواب حسبِ توقع تھا۔ ''منظور کی مدد سے میں نے راولپنڈی ڈویژن کے تمام تھانوں میں معلوم کرا لیا ہے اس حلیے اور نام کا کوئی نوجوان کسی تھانے میں نہیں ہے۔''

''پولیس والے ٹہلانے کے ماہر ہوتے ہیں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''اگر کسی خاص مقصد سے پکڑا ہے تو وہ اسے ظاہر نہیں کریں گے۔''

''منظور کا سالا اسپیشل برانچ میں ڈی ایس پی ہے اور اس کی پہنچ اوپر تک ہے اس کے توسط سے معلوم کرایا ہے۔''

''تب ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''امکان یہی ہے کہ بیتو آزاد ہے اور مجھ سے رابطے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسا کرو تم ایک آدمی ندیم کے گھر کی نگرانی پر لگا دو اور ہاں یہ دیکھو ندیم کے گھر کی نگرانی کوئی اور تو نہیں کر رہا ہے؟''

''میں دیکھ لوں گا ویسے یہ ندیم صاحب کہاں ہوتے ہیں؟''

میں نے اسے آب پارہ میں ندیم کے گھر کا پتا بتایا اور فون بند کر دیا۔ پھر میں نے آج کے اخبارات دیکھے جو کچھ دیر پہلے ہی آئے تھے۔ مجھے مرشد سے متعلق خبروں کی تلاش تھی۔ آج بھی اس کے جلسے کی خبریں تھیں۔ تجزیوں میں اس کے حق اور مخالفت میں کالموں کا بازار گرم تھا۔ اہم خبر یہ تھی کہ آج مرشد کی ایک مقامی سیاست دان ملک قادر بخش سے ملاقات طے تھی۔ ملک قادر اس سیٹ پر مرشد کا پرانا حریف تھا اور اب دونوں حریف آپس میں دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ ملک قادر بخش میانوالی کا ایک بڑا زمیندار تھا اور اس کا خاندان غداروں کے اس ٹولے سے تعلق رکھتا تھا جس نے انگریزوں کی جی حضوری کر کے زمینیں حاصل کی تھیں۔ ایک کالم میں ملک قادر کے بارے میں انکشاف تھا کہ کچھ عرصے پہلے یہ اسلام آباد کے ایک نائٹ کلب سے چھاپے کے دوران گرفتار

ہوا تھا لیکن پھر اوپر کے دباؤ کی بنا پر اسے چھوڑ دیا گیا البتہ اس واقعے کی خبر معہ ویڈیو کے ٹی وی پر آ چکی تھی۔

حکمران پارٹی میں ہونے کی وجہ سے ملک قادر کوئی سیٹ نہ رکھتے ہوئے بھی وفاقی حکومت میں مشیر بنا ہوا تھا اور وزیروں کے برابر مزے کر رہا تھا۔ مرشد بھی حکمران پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اس لیے شاید دونوں میں مفاہمت ہو رہی تھی۔ مرشد کو اس علاقے سے کامیابی کے لیے ملک قادر کا تعاون درکار تھا۔ کیونکہ وہ اس کی مخالفت پر اتر آتا تو اپوزیشن کو اس کا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مرشد بہر صورت قومی اسمبلی کی یہ دونوں نشستیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ حکومت سے مذاکرات کر کے اپنی مرضی کی وزارت حاصل کر سکتا تھا۔



بارہ بجے تک اخبارات پڑھ کر میں نے پھر سفیر کے دونوں نمبر ملائے اس بار بھی وہی جواب تھا ایک پر بیل جا رہی تھی اور دوسرا بند پڑا تھا۔ مجھے آپا اور شمی کا خیال آیا اب تک انہیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن عتیق یا معین کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ میں نے عتیق کا نمبر ملایا لیکن وہ آؤٹ آف سگنل تھا یہی جواب معین کے موبائل سے بھی آ رہا تھا۔ میں بابا کے پاس آیا۔

''آپا اور شمی کے پہنچ جانے کی کوئی خبر آئی ہے؟''

''نہیں۔'' بابا بولے۔ ''میں خود بھی اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ تم نے فون کیا؟''

''عتیق اور معین کو کال کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے موبائل آؤٹ آف سگنل ہیں ان کے گھر کا نمبر مجھے نہیں معلوم ہے۔''

بابا کو گھر کا نمبر معلوم تھا انہوں نے وہاں کال کی اور رفیق بھائی سے بات کی لیکن آپا اور شمی ابھی وہاں نہیں پہنچے تھے۔ سفر مشکل سے ڈھائی گھنٹے کا تھا اور اب تک ان کو پہنچ جانا چاہیے تھا اگر حالات ٹھیک رہتے۔ اتنی دیر کا مطلب تھا کہ راستے میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ بابا نے فون بند کر کے میری طرف دیکھا۔ ''ممکن ہے ٹائروں یا گاڑی کا مسئلہ ہوا ہو۔''

''ممکن ہے۔'' میں نے جواب دیا لیکن میری چھٹی حس رہ رہ کر اشارہ دے رہی تھی کہ کوئی چکر تھا۔ میں صحن میں آیا اور پھر معین اور عتیق کے نمبروں پر کال ملانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نمبر آؤٹ آف رینج تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں بابا کے پاس آیا۔

''بابا جو گارڈ گیا ہے اس کے پاس بھی موبائل ہوگا اس سے بات کریں۔''

بابا کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا لیکن وہ انہوں نے گیٹ پر اس کے ساتھیوں سے بات کر کے لے لیا۔ ں نے نمبر نوٹ کر کے اسے کال کی اور بیل جاتے سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن بیل جاتی رہی اور اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ ایک دفعہ کٹ گیا تو میں نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار بھی بہت دیر تک بیل جاتی رہی۔ ا دل ڈوبنے لگا کوئی گڑبڑ تھی ورنہ کسی سے تو رابطہ ہوتا۔ میں مایوس ہو کر کال کاٹنے والا تھا کہ دوسری طرف سے ال ریسیو کر لی گئی۔ عقب میں شور ہو رہا تھا۔

''ہیلو کیا ہوا میں حویلی سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ ابھی تک پہنچے نہیں۔''

''جناب کہاں سے پہنچیں یہاں ہم گھر گئے ہیں۔''

''یہاں کہاں...... کس جگہ ہوتم؟''

''سرگودھا روڈ پر جناب......شہر سے بارھویں میل پر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''عتیق صاحب کو گولی لگی ہے دشمن بہت ہیں۔''

''کیا؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ساتھ جانے والی عورتیں کہاں ہیں؟''

''وہ گاڑی میں ہیں لیکن دشمن نے گھیر لیا......'' اس نے اتنا کہا تھا کہ اچانک کال کٹ گئی۔ میں نے دوبارہ نمبر ملایا لیکن اس بار جواب نہیں آرہا تھا مطلوبہ نمبر بند ہونے کی خبر سنائی جارہی تھی میں نے زیرلب گالی دی اور بابا سے کہا۔ ''گڑبڑ ہے ان لوگوں کو سرگودھا روڈ پر کہیں دشمنوں نے گھیر لیا ہے عتیق کو گولی لگی ہے۔''

بابا کھڑے ہوگئے۔ ''صغراں......شمی۔''

''وہ گاڑی میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''گارڈ اُن سے مقابلہ کررہا ہے لیکن وہ کہہ رہا ہے حملہ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔''

''یا اللہ......میرے بچے۔'' بابا نے کہا اور میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے عبداللہ سے رابطہ کیا۔

''عبداللہ تم کہاں ہو؟''

''اسلام آباد۔'' اس نے میرے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ خیریت نہیں ہے۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''ہاں تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سرگردھا کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ جلد از جلد وہاں پہنچ کر مجھے کال کرنا میں پھر تمہیں بتاؤں گا۔ مکمل سامان کے ساتھ ہونا۔''

''میں نکل رہا ہوں۔'' عبداللہ نے کہا۔

بابا باہر آگئے تھے۔ ''شہباز کس سے بات کررہے ہو؟''

''بابا مجھے جانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''کہاں؟''

''جہاں ان لوگوں پر حملہ ہوا ہے۔'' میں نے وحشت زدہ ہوکر کہا۔ میرا دل یہ سوچ کر بیٹھا جارہا تھا کہ دشمن اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب رہا تھا۔ اس نے بالآخر میرے گھر کی عزت کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ ''مجھے گاڑی کی چابی دیں۔''

''لیکن شہباز......'' بابا نے کہنا چاہا۔

''بابا۔'' میں چیخ اٹھا۔ ''آپ چابی دے رہے ہیں یا میں ایسے ہی چلا جاؤں۔''

بابا کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے پھر انہوں نے مجھے اپنی پرانی ملٹری ماڈل کی جیپ کی چابی لادی۔ یہ جیپ بابا کی لاڈلی تھی اور وہ جدید ترین گاڑی کو بھی اس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ میں نے شاٹ گن لی اور بابا سے ان کا پستول بھی لے لیا اور باہر کی طرف لپکا۔ بابا میرے ساتھ باہر آئے تھے۔ گارڈز مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔

''تم دونوں چوکس رہو یوں سمجھو کسی بھی وقت یہاں حملہ ہوسکتا ہے۔''

''ہم چوکس ہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''یہاں سے جانے والوں پر حملہ ہوا ہے تمہارا ساتھی ان سے مقابلہ کر رہا تھا پھر میرا فون پر اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔''

''ہم بھی اسے ٹرائی کر رہے ہیں۔''

میں نے جیپ باہر نکالی اور طوفانی رفتار سے روانہ ہو گیا۔ سڑک تک میں پھر ذرا قابو میں رہا تھا لیکن پکی سڑک آنے کے بعد میں نے جیپ یوں چلائی کہ دیکھنے والوں نے مجھے شرابی اور دیوانہ نہ جانے کیا کیا سمجھا ہو گا۔ میں ان کو کیا بتاتا کہ میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ مجھے صرف آپا اور شمی کا خیال تھا اور تیسرا نام میرے ذہن میں مرشد کا آ رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا اگر آپا یا شمی کو ذرا بھی نقصان ہوا تو کل کے اخبارات میں میرے یا مرشد دونوں میں سے کسی ایک کے مارے جانے کی اطلاع ہو گی۔ میرے جبڑے بھنچے ہوئے تھے دونوں ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ میرا ذہن کہیں اور تھا اور میں قطعی لاشعوری طور پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ کتنی بار جیپ دوسری گاڑیوں سے ٹکراتے ہوئے بچی تھی۔ کئی ایک سے چھوتی ہوئی گزر گئی تھی لیکن مجھے نہ تو احساس ہوا اور نہ میں نے رفتار کم کی تھی۔ سڑک پر آنے کے بعد اس کی رفتار کہیں بھی سو سے کم نہیں ہوئی تھی۔

گارڈ نے مجھے جو جگہ بتائی تھی وہ حویلی سے دو گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ موبائل بج رہا تھا لیکن میں نے نہیں سنا بعد میں پتا چلا کہ عبداللہ مجھے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اسلام آباد سے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ سرگودھا میں کہاں میرا انتظار کرے۔ اچانک میری نظر پاس سے گزرتی ایک جانی پہچانی عمارت پر پڑی تو میرے ذہن کو جھٹکا لگا تھا میں منزل سے قریب تھا اور تب میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے حویلی سے نکلے سوا گھنٹے ہونے کو آیا تھا۔ میں حیران ہوا مجھے لگا میں ابھی چند منٹ پہلے روانہ ہوا تھا اور اتنا وقت بھی گزر گیا۔ یہ قدرت کا احسان تھا کہ اس نے میرا مشکل ترین وقت یوں کاٹ دیا کہ مجھے اس کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

اچانک مجھے کچھ دور ایک ہجوم نظر آیا اس میں پولیس والے نمایاں تھے۔ میرا پاؤں بے اختیار بریک پر گیا۔ میرے دل نے کہا یہی جگہ تھی جہاں گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ میں نے جیپ ذرا دور روک دی اور اتر کر ہجوم کی طرف بڑھا۔ لوگ زیادہ نہیں تھے کیونکہ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی یہ یہاں سے گزرنے والے تھے جو تماشہ دیکھنے رک گئے تھے۔ میں لوگوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا تو مجھے سب سے پہلے ایک بائیک اور اس کے آس پاس خاصی مقدار میں خون نظر آیا۔ عتیق اور معین کی جیپ ذرا آگے تھی اور اس کی باڈی میں کئی سوراخ نظر آ رہے تھے لیکن جیپ خالی نظر آ رہی تھی۔ وہاں موجود لوگوں میں نہ تو زندہ اور نہ کوئی مردہ تھا جو میرے لیے شناسا ہوتا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ایک شخص کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟''

اس نے مجھے دیکھا اور یوں بھڑک کر پیچھے ہوا جیسے اس نے کسی درندے کو دیکھ لیا۔ شاید میرے تاثرات کچھ ایسے ہو رہے تھے۔ ''آپ کون ہو جی؟''

''مجھے بتاؤ'' میں نے کہا تو میرے لہجے میں غراہٹ آ گئی تھی۔

''وہ جی یہاں پر اس جیپ کو کچھ لوگوں نے روک لیا پھر بہت فائرنگ ہوئی۔''

''جیپ میں موجود لوگ کہاں گئے؟''

''پتا نہیں جی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو پولیس کو پتا ہوگا۔ انہوں نے آ کر سب کو پیچھے کر دیا تھا۔''

''کوئی ہلاک یا زخمی ہوا تھا؟''

''ہوا ہوگا۔'' اس نے اس بار جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ''مجھے کیا معلوم۔''

مجھے لگا کہ وہ شخص اس واقعے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا لیکن کسی خوف سے بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ سب ہی حادثے کے منظر کی طرف متوجہ تھے۔ وہاں پولیس کی خاصی نفری تھی تین چار گاڑیاں بھی موجود تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ واقعے کے کچھ دیر بعد ہی پولیس یہاں آ گئی تھی اور اس نے زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کو اسپتال روانہ کر دیا تھا۔ آپا اور شمی کہاں تھیں یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں کسی پولیس والے سے نہیں پوچھ سکتا تھا میں پولیس کو مطلوب تھا اور میری تصویر ان کے ذہنوں میں محفوظ ہو سکتی تھی۔ میں یہ خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا اس لیے میں نے اس شخص سے معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنا پستول قمیص کی جیب سے اس کی پسلیوں سے لگا دیا۔

''یہ پستول ہے اگر آواز نکالی تو کسی کی مدد آنے سے پہلے مر جاؤ گے۔''

اس کا رنگ اُڑ گیا تھا لیکن اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کک...... کیا چاہتے ہو؟''

''یہاں سے چلو مجھے تم سے صرف کچھ پوچھنا ہے لیکن تم نے مزاحمت کی تو اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہو گے۔''

وہ قربانی کے جانور کی طرح میرے ساتھ کھنچا چلا آیا تھا۔ میں اسے جیپ تک لایا اور اندر دھکیل دیا۔

''بیٹھو۔''

''آپ نے کہا تھا مجھ سے پوچھیں گے جی۔'' اس نے منمنا کر کہا۔ ''آپ تو مجھے لیے جا رہے ہیں۔''

''پوچھوں گا یہاں سے تو چلیں۔'' میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے واپس گھما لی اور کچھ دور آنے کے بعد درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف موڑ دی۔ یہاں جیپ روکی تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا وہ لرزتے قدموں سے نیچے اترا۔

''مجھے نہ مارنا میرے چھوٹے بچے ہیں۔''

''ان کی ماں ہے۔'' میں نے لہجے کو بے رحمانہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہے۔''

''جوان ہے تو پال لے گی۔ تمہاری کمی اتنی محسوس نہیں ہوگی لیکن تم زندہ رہ سکتے ہو مجھے تم سے صرف چند سوال کرنے ہیں۔''

''پوچھیں جی۔'' اسے آخری بات سے حوصلہ ہوا تھا۔

''تم کہاں رہتے ہو؟''

''پاس ہی گاؤں ہے میرا ناصر آباد۔''

''وقوعے والی جگہ کیا کر رہے تھے؟''

''کچھ نہیں جی کچھ دور رہٹ پر بیٹھا تھا جب یہ سب ہوا۔'' اُس نے کام کی بات بتا دی میں یہی جاننا چاہ رہا تھا کہ اس نے کتنا کچھ دیکھا ہے۔

''خوب اگر تم یہیں تھے تو تم نے سب اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا۔''

اس کا رنگ اُڑ گیا اس نے جلدی سے کہنا چاہا۔ ''سب تو نہیں......''

میں نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''لگتا ہے تم کو اپنے بچوں کی پروا نہیں ہے تم ان کو جلدی یتیم کرنا چاہ رہے ہو۔''

وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ ''مینوں اللہ دی قسم......''

''قسمیں مت کھاؤ۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم یہاں ہو اور تم نے سب کچھ اپنی آنکھ سے نہ دیکھا ہو۔''

''میں نے دیکھا ہے۔'' اس نے بادلِ ناخواستہ اقرار کیا۔ ''لیکن انہیں معلوم ہو گیا تو وہ میرے بیوی بچوں کو بھی مار دیں گے۔''

''کون؟''

''شریف بدمعاش جی۔ وہ بہت ظالم ہے۔''

مجھے بالکل ہنسی نہیں آئی تھی شریف بدمعاش کا نام سن کر۔ ''میں بھی کم ظالم نہیں ہوں۔ یہ کام شریف بدمعاش کا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ خود نہیں تھا لیکن اس کے بندے تھے سارے۔''

''ہوا کیا تھا؟''

''پتا نہیں میں تو فائرنگ سن کر چونکا تھا۔ اُدھر رہٹ کے پاس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُدھر دیکھا تو وہ بڑی سی گاڑی کو گھیر کر اس پر فائر کر رہے تھے۔ گاڑی سے بھی فائر ہو رہے تھے۔ پھر اُدھر سے ایک موٹر سائیکل والا آیا اور اس نے شریف کے دو بندے مار گرائے۔ انہوں نے اس پر بھی فائرنگ کی۔ وہ گر گیا اور اپنی موٹر سیکل کی آڑ سے ان لوگوں پر فائر کرنے لگا۔ پھر اسے گولی لگ گئی اور وہ وہیں لیٹ گیا۔''

میرا دوران خون تیز ہونے لگا تھا وہ چپ ہوا تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ''آگے بولو رکو مت۔''

''پھر گاڑی سے فائرنگ بند ہو گئی۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''شریف کے آدمی آگے آئے تو اچانک ایک آدمی نے گاڑی سے نکل کر ان پر فائرنگ کی اور شریف کے دو آدمی مارے گئے لیکن انہوں نے اسے بھی مار دیا۔''

''وہ آدمی کیسا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''حلیہ کیسا تھا؟''

''جی کالے رنگ کے شلوار قمیص میں تھا موٹا سا اور پکے رنگ والا۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا وہ عتیق یا معین نہیں تھے بلکہ ان کا کوئی محافظ تھا۔ ''بولتے رہو۔''

''دو بندے مرے تو وہ واپس بھاگے تھے اور پھر پولیس کی ایک گاڑی آ گئی اور وہ سب بھاگ نکلے۔''

''اور گاڑی والے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا

''ان کا پتا نہیں وہ شاید گاڑی میں ہی تھے۔ میں تو پولیس کو دیکھتے ہی بھاگ گیا تھا۔ شریف کے آدمی تو ان کے ہاتھ آتے نہیں وہ آس پاس موجود لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے۔''

''بکومت تم وہاں موجود تھے۔''

''وہ تو جی میں بعد میں آیا تھا۔'' اس نے چالاکی سے کہا۔ ''جب اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔''

''یعنی تم نے نہیں دیکھا کہ گاڑی والوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے ان کو پولیس والے لے گئے ہوں گے۔'' اس نے کہا اور اس کی بات درست ہی تھی۔ میں نے موبائل نکالا اور رفیق بھائی کے گھر کا نمبر ملایا۔ وہاں ایک ملازم نے کال ریسیو کی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

''ان کو جی اسپتال سے کال آئی تھی وہ چلے گئے ہیں۔''

''میری کسی سے بات کراؤ میں صغراں آپا کا بھائی بول رہا ہوں۔''

صغراں آپا کے نام نے کام کیا اور کچھ دیر اشفاق بھائی لائن پر تھے وہ رفیق بھائی کے چچا زاد تھے۔

''اشفاق بھائی میں شہباز بات کر رہا ہوں رفیق بھائی کون سے اسپتال گئے ہیں؟''

''سرگودھا ڈسٹرکٹ اسپتال۔'' انہوں نے کہا۔

''صغراں آپا اور شمسہ بھی وہیں ہیں؟''

''پتا نہیں تم ایسا کرو رفیق بھائی کے نمبر پر کال کر لو۔'' انہوں نے کہا اور نمبر بتایا۔ میں نے یہ نمبر ملایا لیکن ...ج جا رہا تھا۔ مجھے کسی قدر اطمینان ہوا تھا کہ حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

''شریف بدمعاش۔'' میرے دانت بھنچ گئے تھے۔ ''یہ کہاں ہوتا ہے؟''

''اسی سڑک پر ذرا آگے اس کا ڈیرہ ہے۔''

''ذرا اس کا جغرافیہ بتانا اور ڈرو مت اول میں کسی کو بتاؤں گا نہیں اور دوسرے آج شریف اور اس کا ٹولہ اس دنیا میں نہیں رہے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ جی بڑا ذلیل شخص ہے کسی کی عزت اور مال اس سے محفوظ نہیں ہے۔'' وہ شخص پھٹ پڑا تھا۔ ''ہر برا ...م کرتا ہے، شراب کی بھٹی چلاتا ہے چرس ہیروئن بیچتا ہے، لوگوں کے جانور اٹھاتا ہے، ان کی عورتیں اٹھا لیتا ہے ...ل کے کوئی درجن مقدمات ہیں لیکن آج تک پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا ہے۔''

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''تم بھی اس سے زخم کھائے ہوئے لگتے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''دس سال پہلے میری بہن غائب کر دی تھی اس نے، آج تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا ...۔''

''تم نے اس کے خلاف رپورٹ نہیں کی تھی؟''

''میرے باپ نے کی تھی۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''وہ آج اپنی قبر میں پڑا ہے۔''

میں نے ملائمت سے کہا۔ ''تم سے غیرت مند تو تمہارا باپ نکلا اپنی عزت پر جان قربان کر دی اور تم اب ... بے غیرتی کے ساتھ زندہ ہو۔''

''تو کیا کرتا باپ کی طرح مر جاتا۔ باقی بہنوں اور ماں کا کیا ہوتا ان کا ایک ہی سہارا ہوں۔''

''سہارا اللہ ہوتا ہے۔ تم اس کی آڑ میں اپنی بزدلی نہیں چھپا سکتے۔ تمہاری بہن کی عزت اور باپ کا قاتل اب بھی زندہ ہے اور تمہارے سامنے ہے۔ تم نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا۔''

''میں...... میں کیا کر سکتا ہوں میں ایک کمزور آدمی ہوں۔'' اس کا سر جھک گیا تھا۔

میں نے اس مزید شرمندہ کرنے سے گریز کیا اور رفیق بھائی کا نمبر ملایا اس بار بیل جانے لگی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ ''میں شہباز بات کر رہا ہوں۔ سب ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے ان کی آواز سنتے ہی بے تابی سے کہا۔

''شکر ہے خدا کا صغراں اور شمی محفوظ ہیں۔''

''شکر اللہ کا۔'' میں نے اطمینان کا سانس لیا پھر مجھے عتیق کا خیال آیا۔ ''رفیق بھائی عتیق کیسا ہے؟''

''آپریشن تھیٹر میں ہے اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔'' وہ نارمل لہجے میں بولے۔ ''ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''رفیق بھائی مجھے بہت افسوس ہے۔'' میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

''نہیں تم مت آؤ یہاں پولیس ہے۔'' ان کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔ ''ایسا کرو تم میرے گھر چلے جاؤ شمی اور صغراں کو میں نے وہیں بھیج دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں وہیں آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اور کال کاٹ کر عبداللہ کا نمبر ملایا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں سرگودھا پہنچ گیا ہوں۔''

''واپس آؤ میں تیرھویں میل پر ہوں بائیں طرف دیکھتے رہنا ایک مزار ہے اس کے اوپر سرخ رنگ کا بڑا سا جھنڈا ہے۔ اس سے آگے درختوں کا ایک جھنڈ ہے میں وہاں منتظر ہوں۔''

''میں دس منٹ میں آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''محمود جی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ شریف بدمعاش کے دشمن ہو جی؟''

''میں ہر شریف بدمعاش کا دشمن ہوں ویسے اس کا نام عجیب سا ہے شریف بھی اور بدمعاش بھی۔''

''نام کا شریف ہے اور ذات کا بدمعاش ہے۔'' اس نے تشریح کی۔

''تم نے کہا اس کا ڈیرہ یہاں سے کچھ دور ہے؟'' میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں جی بس کوئی دو میل ہو گا۔'' اس نے شہر کی طرف جانے والے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''تم ہمیں اس کے ڈیرے تک لے جاؤ گے۔'' میں نے کہا تو وہ بدک گیا۔

''میں جی وہ کیوں؟''

''کیوں کیا نہیں بس تمہیں لے کر جانا ہے۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے جہاں چاہے جا سکتے ہو۔''

''نہیں جی اسے پتا چلا تو وہ مجھے مار دے گا۔''

''مرنا تم نے ایک نہ ایک دن ہے تو بہادری سے کیوں نہیں مرتے کب تک بزدلوں کی طرح زندہ رہو گے؟'' میں نے ملامت سے کہا۔ ''تم نے صرف شریف کا اڈہ دکھانا ہے سامنے نہیں آنا ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ مجھے لے جاؤ گے اور اس کا کوئی نہ کوئی آدمی دیکھ لے گا۔ پھر وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔''

''وہ چھوڑنے کے لیے بچے گا تو چھوڑے گا نا۔'' میں نے اس لہجے میں کہا کہ وہ تھرا اُٹھا تھا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر مزید کچھ نہیں کہا۔ چند منٹ بعد ایک لینڈ کروزر آ کر سڑک کے کنارے رکی اور اس سے عبداللہ اترا تھا میں نے اسے شناخت کر لیا تو درختوں سے آگے آ کر اسے اشارہ کیا اور وہ گاڑی سمیت میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے لینڈ کروزر درختوں کے عقب میں روکی اور نیچے کود کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

''کہاں تھے شہباز صاحب، آپ کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔''

''اب دیکھ لیا تم نے ابھی مزید دیکھو گے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ بتاؤ اسلحہ کتنا ہے؟''

''چار خودکار رائفلیں ہیں۔ دو شاٹ گن ہیں۔ ماؤزر پستول ہیں۔ ایک درجن گرینیڈ ہیں اس کے علاوہ اسموک گرینیڈ ہیں۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہے۔''

''نہیں کافی ہے...... یہ بتاؤ مرنے مارنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس نے میرے لہجے میں خون کی پیاس محسوس کر لی تھی۔ ''خیریت شہباز صاحب آپ نے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی؟''

''اس سے پہلے دشمن نے میرے گھر والوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کی اسے بتانا ہے کہ میں اس حد تک آ سکتا ہوں اور دوسرے ایک بدنہاد اور ناسور کو اس دنیا سے رخصت کرنا ہے۔''

''میں اور میرے ساتھ تین ساتھی بالکل تیار ہیں۔'' عبداللہ نے لینڈ کروزر کی طرف دیکھا۔ میں نے محمود کو پاس بلایا۔ وہ عبداللہ اینڈ پارٹی کو دیکھ کر مزید سہم گیا تھا۔

''تم نے شریف کا ڈیرہ اندر سے دیکھا ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ کھیتوں کے درمیان ہے۔ اس تک جانے کا صرف ایک راستہ ہے باقی ہر طرف پانی والی زمین ہے جس میں گاڑی دھنس جاتی ہے۔ اندر سامنے بڑا احاطہ ہے اس کے درمیان میں ایک صحن ہے اور اس کے دونوں طرف عمارتیں ہیں۔'' دائیں والی عمارت شریف کی ہے اس میں اس کے آدمی بھی بلا اجازت نہیں جا سکتے ہیں۔ وہ سب بائیں طرف والی عمارت میں رہتے ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''میں دو دن وہاں رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''شریف کے آدمی مجھے شبہ میں پکڑ کر لے گئے تھے۔''

''کیسے شبہ میں؟''

''ان کا کہنا تھا کہ میں نے چوہدری عارف کو بتایا کہ اس کی قیمتی بھینسیں شریف کے ڈیرے پر ہیں۔''

''ان لوگوں کا شبہ اتنی آسانی سے رفع نہیں ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنا کرتا کمر سے اوپر کر دیا اس کی پشت مارنے، جلانے اور کاٹنے کے زخموں سے بھری ہوئی تھی۔

''ہفتے تک میں سیدھا نہیں لیٹ سکا تھا مرنے والا ہو گیا تھا تب انہوں نے مجھے چھوڑا۔'' وہ تلخ انداز میں بولا۔

عبداللہ نے میرے اشارے پر اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کیا اور خود میرے ساتھ ذرا دور آ گیا۔
''اس نے جو بتایا ہے اس کے مطابق شریف کا ڈیرہ بڑا محفوظ ہے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔
''آپ مجھے پوری بات بتا سکتے ہیں؟''
عبداللہ کے کہنے پر میں نے اسے پوری کہانی شروع سے اب تک سنائی۔ مرشد کا سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
''یہ حرامزادہ ابھی تک آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟''
''یہی حرامزادہ میرے پیچھے پڑا ہے اس کے علاوہ کوئی بھی میرا ایسا دشمن نہیں ہے حد یہ کہ فتح خان نے بھی دشمنی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے۔''
''جہاں تک میں فتح خان کے بارے میں جانتا ہوں وہ کسی کو معاف کرنے والا شخص نہیں ہے۔''
''ہاں اس کی دستبرداری کا یقین تو مجھے بھی نہیں ہے کیونکہ میں اس کی تحویل میں تھا اور یقیناً اسی نے مجھے حویلی بھجوایا ہے۔''
''آپ نے بتایا ہے کہ حملے میں شریف کے آدمی بھی مارے گئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں اس کا مطلب ہے اس کے اڈے پر سخت ٹینشن ہوگی اور وہ لوگ بہت چوکنا ہوں گے۔''
''امکان تو یہی ہے۔'' میں نے کہا۔
''اس صورت میں وہاں کھلا حملہ ممکن نہیں ہے۔'' اس نے سوچ کر کہا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔
''یعنی کام نہیں ہو سکتا ہے؟''
''آپ کا حکم ہے تو کام ضرور ہوگا۔ بس ذرا خطرہ مول لینا پڑے گا اور کچھ چکر چلانا ہوگا۔''
''کیسا چکر اور خطرے کی نوعیت کیا ہوگی۔''
''میرے پاس پولیس وردیاں رکھی ہیں ایک جگہ سے مل رہی تھیں میں نے لے لیں۔ اس میں ایس ایس پی کے عہدے کی وردی بھی ہے۔ اگر ہم پولیس کے بھیس میں جائیں تو ہمیں اندر جانے کا راستہ تو مل جائے گا۔''
اس کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ میں نے اس سے وردیاں نکالنے کو کہا۔ یہ اصلی وردیاں تھیں اور ان پر نشانات بھی موجود تھے۔ ایس ایس پی کی وردی میرے ناپ کی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرے بال پولیس اسٹائل میں نہیں تھے۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے کسی بھی دکان سے مشین سے دس منٹ میں بال بن جائیں گے۔'' عبداللہ نے کہا۔
ذرا سی بحث کے بعد منصوبہ تیار ہو گیا۔ میری جیپ پر جعلی پولیس نمبر پلیٹ لگا دی جائے گی اور کسی زمانے میں ایسی جیپیں پولیس کے زیر استعمال ہوتی تھیں۔ فلیش لائٹ سامنے لگانے سے یہ مکمل پولیس جیپ نظر آنے لگی۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ''لگتا ہے تم مکمل تیاری کے ساتھ نکلے تھے۔''
''ہمارے کام میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' وہ مسکرایا۔
باقی افراد کو وہیں چھوڑ کر ہم سرگودھا کے ایک بازار تک گئے۔ عبداللہ مجھے ایک باربر شاپ پر چھوڑ کر کچھ چیزیں لینے چلا گیا اور اس کی واپسی تک میں نے بال بنوا کر شیو اور شیمپو بھی کروا لیے۔ اب میں ایس ایس پی کا

کردار ادا کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ عبداللہ نے وردی پریس کروالی تھی اور کہیں سے وہ مخصوص چھڑی بھی لے آیا تھا جو ایس ایس پی اور اس سے اوپر کے عہدے کے لوگ اپنے اختیارات کی نمائش کے لیے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ ہم واپس پہنچے تو شام قریب تھی میں نے ایک بار پھر رفیق بھائی کو کال کر کے عتیق کے بارے میں پوچھا۔ آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی تھی اور اسے خون دیا جارہا تھا لیکن ڈاکٹر اس کی حالت کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے۔ میں نے بابا کو کال کی اور گھر میں خیریت کا پوچھا۔ بابا نے بتایا کہ وہاں سب ٹھیک تھا۔ شجاع بھائی نے اس واقعے کا سن کر اسی ایجنسی کی طرف سے مزید گارڈز بھیج دیئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ مرشد دوطرف کارروائی نہ کرے۔ اس کے پاس مرنے مارنے والوں کی کمی نہیں تھی۔

''میرا خیال ہے ہم سورج ڈوبنے کے بعد وہاں پہنچتے ہیں۔'' عبداللہ نے مشورہ دیا۔ اس کا مشورہ ٹھیک تھا اس لیے میں نے مان لیا۔ ویسے بھی اب اس میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ رفیق بھائی کے گھر فون کر کے آپا سے بات کرلوں لیکن میری ہمت نہیں ہوئی۔ مجھے شمی کا خیال بھی آرہا تھا۔ ہم نے تیاری مکمل کرلی تھی۔ باقی سب نے بھی پولیس کی وردیاں پہن لی تھیں۔ اسلحہ ہمارے پاس غیر سرکاری تھا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی آج کل پولیس والوں کے پاس سب سے زیادہ غیر قانونی اسلحہ نظر آتا ہے۔ میں ایک انسپکٹر کو جانتا ہوں جس کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کے پاس مشہور زمانہ اصلی اسمتھ اینڈ ولسن پسٹل ہے جس کی مالیت پاکستانی کرنسی میں کوئی پانچ لاکھ روپے بنتی ہے۔ اس لیے ہمارے پاس اس اسلحے کی موجودگی کا جواز تھا۔ ویسے بھی ایس ایس پی اپنے علاقے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

محمود ابھی تک ہمارے پاس تھا اور میں نے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ آخر میں نے اسے یہیں باندھ کر ڈال جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ اس جیسے شخص کا کوئی بھروسہ نہیں تھا وہ شریف کو اطلاع بھی دے سکتا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا تو وہ بولا ''میرے پاس زیادہ بہتر حل ہے ایک انجکشن دیتا ہوں یہ دو گھنٹے کے لیے سو جائے گا۔ اسے سڑک کے کنارے ڈال دیں گے کوئی نہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔''

''یہ مناسب رہے گا۔'' میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا اسے یہاں ڈالا تو کہیں کوئی سانپ یا بچھو نہ کاٹ لے۔ سڑک کے کنارے اسے مدد مل جائے گی لیکن جب اسے دبوچ کر انجکشن لگایا جارہا تھا تو وہ یوں مچل رہا تھا جیسے ہم اسے زہر کا انجکشن دے رہے ہیں۔ انجکشن لگتے ہی وہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اسے لینڈ کروزر میں ڈال دیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ جیپ میں ہم چار افراد جائیں گے۔ عبداللہ کا ایک ساتھی لینڈ کروزر سمیت پیچھے رہے گا اور اس سے ریڈیو کے ذریعے رابطہ رہے گا اور ضرورت پڑنے پر اسے طلب کیا جاسکتا تھا۔ عبداللہ کے تینوں ساتھ سابق کمانڈوز تھے اور اپنے کام میں ماہر تھے۔ ہر قسم کا اسلحہ استعمال کر سکتے تھے اور ہر قسم کے حالات سے نمٹ سکتے تھے۔

سورج ڈوبتے ہی ہمارا قافلہ روانہ ہوگیا۔ سڑک پر آنے کے بعد ہم نے شہر کا رخ کیا کیونکہ شریف کا ڈیرہ اسی سمت میں تھا کوئی دو میل جانے کے بعد مطلوبہ عمارت نظر آگئی۔ یہ ایک بڑا بلند احاطہ تھا جس پر خاردار تار بھی لگی تھی اور اندر باہر کی طرف طاقتور سرچ لائٹس لگی تھیں جن کو سورج ڈوبتے ہی جلادیا گیا تھا۔ احاطے تک ایک ہی راستہ جارہا تھا۔ یہ باقی زمین سے کوئی پانچ چھ فٹ اونچا تھا اور اس کے آس پاس ساری زمین نیچی تھی۔ اصل میں

راستہ اور احاطے کی زمین اوپر اٹھائی ہوئی تھی۔ پاس کی زمین پر شاید باقاعدگی سے پانی چھوڑا جاتا تھا کیونکہ اس نے دلدل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس میں نہ صرف گاڑیاں نہیں چل سکتی تھیں پیدل نقل وحرکت بھی مشکل تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شریف چالاک آدمی تھا اس نے اپنے ڈیرے کی حفاظت کے انتظامات کر رکھے تھے لیکن جب موت آتی ہے تو ساری چالاکی دھری رہ جاتی ہے۔



میری جیپ جب ڈیرے کی طرف جانے والے راستے پر مڑی تب ہی اسے دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ جیپ کے پاس پہنچنے سے پہلے اندر سے ایک مسلح شخص نکل آیا۔ جیپ قریب آنے پر اسے احساس ہوا کہ یہ پولیس کی ہے تو وہ محتاط ہو گیا۔ ڈرائیو عبداللہ کر رہا تھا۔ میں اس کے برابر والی نشست پر ایس ایس پی کے کروفر سے اکڑا بیٹھا ہوا تھا۔ جب مسلح شخص عبداللہ کے پاس آیا تب بھی میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''جی صاحب؟'' اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

''صاحب کو شریف سے ملنا ہے۔'' عبداللہ نے بھاری لہجے میں کہا اس نے اے ایس آئی کی وردی پہن رکھی تھی جب کہ پیچھے بیٹھے دونوں نے کانسٹیبل والی وردیاں پہن رکھی تھیں۔

''شریف اندر نہیں ہے۔'' اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔

''اس سے کہو اگر میں واپس چلا گیا تو شریف بہت بڑی مشکل میں پھنس جائے گا میں ڈی آئی جی آفس سے آیا ہوں۔''

مسلح شخص نے غور سے میری وردی کے نشانات دیکھے اور بولا۔ ''میں اندر بولتا ہوں۔''

''صرف پانچ منٹ انتظار کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا۔'' میں نے اسی لہجے میں اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ اندر چلا گیا اس کے جاتے ہی گیٹ اندر سے بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر گیٹ کھلا اور اس بار دو افراد باہر آئے ایک تو وہی تھا۔ دوسرا ایک لمبا اور دبلا لیکن گورا چٹا نوجوان تھا۔ اس نے اپنے بال شانوں تک بڑھا رکھے تھے۔ اس نے میری طرف آ کر کہا۔ ''حکم سرکار۔''

''مجھے صرف شریف سے بات کرنی ہے۔'' میں نے سرد لہجہ اپنایا۔ ''اگر وہ نہیں ملنا چاہتا تو میں واپس جا رہا ہوں۔ واپس چلو۔'' میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے سرکار یہاں تک آئے ہیں تو اندر چلیں کچھ خاطر تواضع ہو جائے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن ممکن ہے صبح تک تم سب کی خاطر تواضع کہیں اور ہو رہی ہو۔''

نوجوان چونکا تھا۔ اسی لمحے کسی نے اسے گیٹ سے پکارا۔ عبداللہ نے جیپ اسٹارٹ کی تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ایک منٹ سرکار...... بس ایک منٹ۔'' وہ گیٹ کی طرف گیا اور فوراً واپس آ گیا۔ ''آپ اندر آ جائیں ایس ایس پی صاحب شریف صاحب اندر موجود ہے۔''

''ابھی تک تو وہ نہیں تھا۔'' میں نے طنز کیا۔ ''گیٹ کھلواؤ۔''

''جیپ یہیں چھوڑ دیں سرکار۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''لگتا ہے تمہارا شریف صاحب سنجیدہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جیپ اندر جائے گی یا میں واپس جاؤں

گا۔"

میرے فیصلہ کن لہجے کی اداکاری نے اسے قائل کر لیا کہ یہ کوئی سرپھرا ایس ایس پی ہے اور سچ مچ واپس چلا جائے۔ وہ ایک بار پھر ہدایات لینے گیٹ تک گیا۔ شاید وہاں سے اندر تک کوئی مواصلاتی رابطہ تھا۔ اس بار وہ ذرا دیر سے آیا اور گیٹ کھلنے لگا۔ اس نے پاس آ کر معذرت سے کہا۔ "اِدھر حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابھی چند گھنٹے پہلے سڑک پر مارا ماری ہوئی ہے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور عبداللہ کو جیپ آگے بڑھانے کا اشارہ کیا اس کے ساتھ ہی ہم سب کے اعصاب تن گئے تھے۔ ہم دشمن کی کھچار میں داخل ہو رہے تھے اور ہم وہاں مذاکرات کرنے نہیں جا رہے تھے۔ وہاں موت کا کھیل ہونا تھا اور موت کسی کو بھی ساتھ لے جا سکتی تھی۔ اس لیے ہم ذہنی طور پر تیار ہو گئے تھے میں نے چلنے سے پہلے عبداللہ سے کہا تھا۔ "دیکھو یہ میری ذاتی لڑائی ہے اور تمہارا اس میں شامل ہونا لازمی نہیں ہے۔"

"شہباز صاحب۔" عبداللہ کا لہجہ شکایتی ہو گیا۔ "کیا میں بھول سکتا ہوں جو وقت میں نے لاہور میں آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ آپ کے ساتھ میں آگ میں بھی کود سکتا ہوں۔"

"تمہارا جذبہ قابلِ ستائش ہے لیکن تم راجا عمر دراز کے ملازم ہو اور ممکن ہے وہ تمہارے کسی ایسے تعاون کو پسند نہ کریں۔"

"مجھے پروا نہیں ہے زیادہ سے زیادہ مجھے ملازمت سے نکال دیا جائے گا تو مجھے اس کی پروا بھی نہیں رہی ہے۔"

"پھر بھی تم ایک بار سوچ لو۔" میں نے اصرار کیا۔

"سوری شہباز صاحب میں نہیں سوچ سکتا۔" وہ مسکرایا۔ "کیونکہ اپنا دماغ میں لاہور میں چھوڑ آیا ہوں۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایسے جان نثار دوستوں کے ہوتے ہوئے اگر میں خدا سے مرشد جیسے دشمن کا شکوہ کروں تو یہ میری طرف سے کفرانِ نعمت ہوتا۔ اب ہم شریف کے ڈیرے میں تھے۔ جیسے ہی جیپ اندر آئی عقب میں گیٹ بند کر دیا گیا تھا۔ عبداللہ نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ پارکنگ کے اس گوشے میں روکی جہاں نیم کے درخت تلے روشنی سب سے کم تھی اور یہ جگہ گیٹ کے بھی پاس تھی۔ عبداللہ نے آہستہ سے کہا۔

"اگر فرار کا موقع ہو تو گیٹ کو گرینیڈ سے اُڑا دینا۔"

"یس سر۔" عقب سے جواب آیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ میرے پاس دو عدد پستول اور عبداللہ کے پاس خودکار رائفل کے علاوہ پستول بھی تھا۔ وردیوں کے نیچے ہم نے چھوٹے اور کم فاصلے پر کام کرنے والے ریڈیو چھپا رکھے تھے۔ ایک سیکنڈ میں ہم ان کو کان سے لگا سکتے تھے اور مخصوص فریکوینسی پر پہلے سے سیٹ تھے ہم پانچوں آپس میں بیک وقت رابطہ کر سکتے تھے۔ دبلا اور گورا نوجوان ہمارے پاس آیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

"ایس ایس پی صاحب صرف آپ اندر جا سکتے ہیں۔"

"نہیں یہ بھی ساتھ جائے گا۔" میں نے انکار کیا۔

''دیکھئے شریف صاحب نہیں مانیں گے۔'' اس نے التجا کی۔

اس سے پہلے میں کچھ کہتا عبداللہ نے کہا۔ ''میں باہر ہی رک جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے لیکن تم ملاقات کی جگہ تک ساتھ چلو۔'' میں نے کہا۔ دبلا نوجوان ہمیں لے کر دائیں طرف والی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔ ''شریف صاحب اندر ہیں یہاں سے آگے آپ اکیلے ہی جائیں گے۔''

عبداللہ وہیں رک گیا۔ میں اندر بڑھا تو دبلا نوجوان میرے ساتھ تھا یہ اچھا ہوا کہ ان میں سے کسی نے اب تک ہم سے کوئی شناختی کاغذ یا کارڈ نہیں مانگا تھا کیونکہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ باہر سے عام سی نظر آنے والی عمارت اندر سے خاصی پوش ثابت ہوئی تھی اور ایک نشست گاہ نما کمرے میں ایک بنی سنوری قیامت میری منتظر تھی۔ قیامت میں نے اسے یوں کہا کہ وہ بے پناہ متناسب جسم رکھتی تھی اور اس نے اسے نمایاں کرنے کا مناسب بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ البتہ اس کے چہرے میں سوائے گورے رنگ کے اور کوئی بات نہیں تھی۔ کھڑے اور کھردرے نقوش تھے مگر یہاں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہی کون ہوگا۔

''آؤ سرکار بسم اللہ۔'' اس نے لہک کر کہا۔

''شریف کہاں ہے؟''

''صاحب جی اندر ہیں۔'' اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں نشست گاہ میں تین دروازے کھل رہے تھے۔ اس نے درمیان والے دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا اور میرے سرد رویے کو دیکھتے ہوئے وہ محتاط ہو گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اندر ایک چھوٹا کمرہ نشست گاہ کی طرح سجا ہوا تھا اس میں ایک بیش قیمت صوفہ سیٹ اور شیشے کی میز تھی۔ ایک صوفے سے ایک ادھیڑ عمر شخص اٹھا اور اس نے نہایت تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ آگے نہیں کیا اور سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''شریف؟''

اس کی بھنویں سکڑ گئیں وہ گول پھولے ہوئے چہرے کا مالک تھا اس کی چھوٹی آنکھیں گالوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور رنگت سیاہی مائل تھی۔ اس کی آنکھوں میں شک آ گیا تھا۔ ''جناب ایس ایس پی صاحب مجھے نہیں پہچانتے۔''

''اس کی دو وجوہات ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک تو یہ کہ میں یہاں نیا ہوں اور دوسرے آدمی اپنی موت کو پہلی بار اس وقت دیکھتا ہے جب وہ اس کے سامنے آتی ہے۔''

اس کے چہرے پر خوف نمودار ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ زبان کھولتا میں پستول نکال چکا تھا اور نہایت سُرعت سے اس کے عقب میں پہنچ گیا مجھے خدشہ تھا کہ اس کا کوئی محافظ ہماری باتیں نہ سن رہا ہو اور وہ دخل درمعقولات کرے۔ اس سے پہلے وہ سنبھلتا میں پستول اس کی پشت سے لگا چکا تھا۔ ''شریف کسی کو بلانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تم پر انا للہ ہی پڑھ سکے گا۔''

اس نے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے تھے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ ''تم ایس ایس پی نہیں ہو تو پھر کون ہو؟''

''جلد تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اسے شانے سے پکڑ کر ایک چھوٹے صوفے میں بٹھا دیا۔ ''یہ بتاؤ یہاں اور کتنے آدمی ہیں؟''

''بہت ہیں۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری یہ شاید اس کی عادت تھی۔ ''تم بچ کر نہیں نکل سکتے۔''

میں جتنی آسانی سے شریف تک پہنچ گیا تھا اور اسے قابو کر لیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل لیا۔ اندھی قتل و غارت گری مجھے کبھی پسند نہیں رہی اور نہ ہی میں کوئی منتقم مزاج شخص تھا۔ شمی اور صغراں آپا کی گاڑی پر حملے کا جان کر میرے اندر جو انتقامی جذبات پیدا ہوئے وہ ان کے محفوظ ہونے کا سن کر خاصی حد تک کم ہو چکے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

''شریف میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی میرا تم کو مارنے کا ارادہ ہے بشرطیکہ تم خود نہ مرنا چاہو۔''

اس کی چھوٹی سؤر جیسی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر تم نے یا تمہارے آدمیوں نے مزاحمت کی تو مجبوراً مجھے یہاں تمہاری لاش چھوڑ کر جانا ہوگا۔''

''مجھے کیوں لے کر جانا چاہتے ہو اپنے ایس ایس پی صاحب۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''ابھی تک وہ ہتھکڑی نہیں بنی جو شریف کے ہاتھوں میں ڈالی جائے۔''

''بکواس مت کرو، ہمارے پاس ہتھکڑیاں بھی بہت ہیں اور تمہاری گردن میں ڈالنے کے لیے رسیاں بھی کافی ہیں۔ اس لیے شرافت سے کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے جان بوجھ کر پولیس والے انداز میں کہا۔

''پر میرا قصور ایس ایس پی صاحب؟'' وہ فکرمند نظر آنے لگا۔

''میرے ساتھ چلو سب معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ وہ خاصا تنومند آدمی تھا لیکن اس وقت بالکل ڈھیلا ہو رہا تھا۔ وہ مجھے سچ مچ ایس ایس پی سمجھ رہا تھا۔ اگرچہ میرا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا اگر مجھے مک مکا کرنا تھا تو اس کے لیے یہی جگہ بہتر تھی اور اگر اسے گرفتار کرنا تھا تو صرف تین آدمیوں کے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر اسے شک نہیں ہوا تھا کہ میں جعلی ایس ایس پی ہوں۔ میں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا تو دروازہ کھلا اور وہی دبلا نوجوان اندر آیا۔ یہ صورتِ حال شاید اس کے لیے غیر متوقع تھی ایک لمحے کے لیے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا۔

''یہ کیا ایس ایس پی صاحب؟''

''میں شریف کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ یہ کل صبح تک آجائے گا لیکن کسی نے راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔''

''اگر میں مر گیا تو کیا یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے؟'' اپنے آدمی کو سامنے دیکھ کر شریف نے بہادر بننے کی کوشش کی تھی۔

''کیوں نہیں...... تمہیں کیا معلوم اس وقت کتنی پولیس فورس تمہارے اڈے کے چاروں طرف موجود ہے اور ان کو صرف ایک سگنل کی ضرورت ہے۔'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا اور شریف کو پستول کی نال سے آگے

دھکیلا۔ ''باہر چلو۔''

دبلا اور گورا نوجوان پیچھے ہٹنے لگا تھا اس کا فکر مند ہونا لازمی تھا کیونکہ وہی ہمیں اندر لایا تھا۔ بڑی نشست گاہ میں وہی خادمہ تھی۔ میرے حساب سے وہ خادمہ ہی تھی لیکن شریف کو ہینڈز اَپ دیکھ کر اس نے ہلکی سی چیخ ماری۔ ''یہ کیا ہے شریف؟''

''نازاں تم اندر جاؤ۔'' شریف نے سخت لہجے میں کہا۔

''کوئی اندر نہیں جائے گا۔'' میں نے نازاں کو روک دیا۔ ''تم بھی باہر چلو۔''

''اسے جانے دیں ایس ایس پی صاحب...... یہ میری گھر والی ہے اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق تو نہیں ہے لیکن اندر جا کر اس نے بلا وجہ اِدھر اُدھر فون کرنے شروع کر دیئے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

''اپنے ایس ایس پی صاحب اگر کوئی گل بات کرنی ہے تو اِدھر بھی ہو سکتی ہے۔'' شریف بولا غالباً اپنے آدمیوں کے سامنے یوں مجبور بن کر جاتے ہوئے اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ ''مجھے میرے آدمیوں کے سامنے یوں ذلیل کرنا ضروری تو نہیں ہے۔''

''بالکل ضروری نہیں ہے۔ اگر تم شرافت سے میرے ساتھ چلو۔'' میں نے اسے دھکیلنا جاری رکھا۔ ''اگر تم نے کوئی اَڑی دکھائی تو شرمندگی بہت زیادہ ہوگی تم اپنے آدمیوں کے سامنے مار بھی کھاؤ گے۔''

وہ بھڑ کا تھا لیکن پستول کے سامنے بالکل مجبور تھا۔ اسی حالت میں ہم صحن میں آئے تو عبداللہ چونکا۔ اس نے جلدی سے رائفل سنبھال لی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میرے اندر جانے کے کچھ دیر بعد ہی قتل و غارت گری شروع ہو جائے گی لیکن اس کے بجائے میں شریف کو ہینڈز اَپ کرا کے لے آیا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''یہ ہمارے ساتھ جائے گا اور کسی نے روکنے کی کوشش کی تو اس کی لاش یہاں چھوڑ کر جانی ہے۔''

اس احاطے میں شریف کے کوئی سات آٹھ مسلح ساتھی موجود تھے اور وہ صورتِ حال دیکھتے ہی اپنے ہتھیار سنبھال چکے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اور عبداللہ نے بیک وقت شریف پر اسلحہ تان لیا تھا۔ عبداللہ نے چیخ کر کہا۔ ''خبردار اگر کسی نے گولی چلائی ورنہ سب سے پہلے یہ مرے گا۔''

''شریف اپنے آدمیوں کو حکم دو اسلحہ پھینک دیں اور ایک طرف ہو جائیں۔'' میں نے حکم دیا لیکن شریف خاموش رہا تھا۔ اس بار میں نے زبان کے بجائے ہاتھ سے کام لیا اور اس کی کمر پر عین گردے کے مقام پر پستول کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ کراہا تھا میں پھنکار کر بولا۔ ''شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اپنے آدمیوں سے بولو اسلحہ ڈال کر ایک طرف ہو جائیں جلدی۔''

شریف اپنے آدمیوں کو غلیظ گالیوں سے نوازتے ہوئے ایک طرف ہونے کو کہہ رہا تھا۔ مجبوراً وہ اپنا اسلحہ صحن کے وسط میں پھینک پھینک کر ایک طرف ہونے لگے۔ عبداللہ کے دونوں ساتھی بھی آ گئے تھے اور چار مسلح افراد کے سامنے وہ سب بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے دونوں عمارتوں کی تلاشی لے کر اندر موجود افراد کو بھی باہر جمع کیا۔ یہ کل دس افراد تھے اور ان میں دو زخمی بھی تھے۔ یہ یقیناً دوپہر میں ہونے والی کارروائی میں

شامل تھے۔ان سب کو ایک الگ کمرے میں ڈال کر اس کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔اب وہ کسی کی مدد کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ان میں نازاں بھی تھی۔یعنی مسز شریف اور میں دیکھ رہا تھا کہ اسے شریف کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ اس کے چہرے پر فکر کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔ان سب کو کمرے میں بند کرنے کے بعد عبداللہ کے آدمیوں نے احاطے میں موجود تمام گاڑیوں کے ٹائرز پنکچر کر دیئے یوں ہمارے پیچھے بھی کسی کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔

شریف اب سچ مچ پریشان اور خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا جب اسے جیپ میں بٹھایا تو اس نے پوچھ لیا۔''تم اصلی پولیس والے ہو؟''

میں ہنسا۔''بہت دیر میں خیال آیا تمہیں۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ عبداللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رسید کیا۔''خاموش ہو کر بیٹھ۔''

ہاتھ کھا کر وہ دبک گیا تھا۔گیٹ کے نگران بھی بند کیے جا چکے تھے اس لیے گیٹ بھی خود کھولنا اور بند کرنا پڑا تھا۔عبداللہ کا تیسرا ساتھی لینڈ کروزر سمیت سڑک پر ہمارا منتظر تھا۔اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور یہ معرکہ آسانی سے سر ہو گیا تھا۔کچھ آگے نکلنے کے بعد میں نے عبداللہ سے کہا۔''اگر تمہارے پاس بے ہوشی والا انجکشن ہے تو اسے دے دو۔''

عبداللہ نے ایک جگہ گاڑیاں رکوائیں اور پھرتی سے شریف کو وہی انجکشن دے دیا جو اس نے محمود کو دیا تھا۔پھر اسے لینڈ کروزر میں منتقل کر دیا۔فی الحال یہاں ٹریفک نہیں تھا اس لیے ہم نے پولیس کی وردیاں اتار دیں اور اپنے عام کپڑوں میں آ گئے۔میں نے بابا کی جیپ سے پولیس سائرن ہٹا دیا اور عبداللہ کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔''اسے اپنے آدمیوں کے ساتھ اسلام آباد بھیج دو اور تم میرے ساتھ چلو۔''

''ٹھیک ہے جان شیر اسے واپس لے جائے گا۔'' عبداللہ نے ایک ساتھی کی طرف دیکھا۔''اسے کوٹھی کے تہہ خانے میں ڈلوا دینا اور کسی کو اس کے قریب آنے مت دینا۔''

''میں سمجھ گیا صاحب۔'' جان شیر نے کہا۔

''اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پیچھے ترپال تلے ڈال دو۔'' عبداللہ نے اسے حکم دیا جس کی تعمیل کی گئی اور اس کے فوراً بعد جان شیر اسے لے کر روانہ ہو گیا۔عبداللہ اور اس کے دونوں ساتھی میرے ساتھ جیپ میں آ گئے اور میں رفیق بھائی کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ان کا گاؤں سرگودھا سے کوئی دس میل آگے اسی سڑک پر تھا۔اس لیے دونوں گاڑیاں مخالف سمتوں میں گئی تھیں۔رات کا وقت ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ پریشانی ہوئی تھی لیکن پھر میں نے راستہ تلاش کر لیا اور ہم ایک گھنٹے بعد حویلی پر تھے۔صغراں آپا کا سسرال بڑی زمیندار فیملی تھا۔ان کی کوئی ہزار ایکڑ زمین تھی اس لحاظ سے وہ بڑے زمیندار تھے اور اسی لحاظ سے ان کی حویلی بھی بڑی اور شاندار تھی۔

جیسے ہی میں نے حویلی کے سامنے جیپ روکی۔ایک نوجوان لپک کر آیا۔اس نے آہستہ سے کہا۔''شہباز بھائی؟''

''ہاں۔'' میں نے بھی اسی کی طرف آہستہ سے کہا۔

''میرے ساتھ اندر آیئے۔''

''یہ میرے ساتھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ بالکل فکر مت کریں۔'' نوجوان نے کہا۔''میں آپ کو اندر پہنچا کر ان کو بھی دیکھتا ہوں ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

میں اس کے ساتھ اندر آیا۔ وہ مجھے ایک چھوٹے دروازے سے اندر لے گیا تھا جہاں کسی اور سے سامنا نہیں ہوا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے ایسا کر رہا تھا راستے میں نوجوان نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ اشفاق بھائی کا بیٹا منہاس تھا۔''عتیق کی حالت کیسی ہے؟''

''ابھی تک ویسی ہی ہے۔'' وہ افسردہ ہوگیا۔''ڈاکٹر کہہ رہے ہیں اگر کل صبح تک ہوش آ گیا تو......'' وہ بولتے ہوئے چپ ہوگیا۔ بات واضح تھی اگر عتیق کو کل صبح تک ہوش نہیں آتا تو اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ میرا دل کٹنے لگا۔ اتنا خوب صورت نوجوان میری وجہ سے بستر مرگ پر آ گیا تھا۔ منہاس مجھے ایک کمرے میں لایا۔''آپ یہاں بیٹھیں میں چاچی کو بتاتا ہوں۔''

چاچی سے مراد صغراں آپا تھیں۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد صغراں آپا اور ان کے ساتھ شمی اندر آئی۔ شمی کا ستا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کرب کی کن منزلوں سے گزر رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپکی اور میرے بازو سے سر رکھ کر رونے لگی۔ میں نے اس کا سر تھپکا۔''شمی میری جان مت رو...... اللہ سے دعا کرو وہ سب ٹھیک کرے گا۔''

صغراں آپا بھی روتی رہی تھیں ان کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔''یہ کیا ہوا؟''

''چوٹ آئی ہے لیکن معمولی سی ہے۔''

میں شمی اور آپا کو لے کر بیٹھ گیا۔''آپا راستے میں کیا ہوا تھا؟''

''پتا نہیں...... جب ہم سرگودھا کے پاس پہنچے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا بہت دیر اسے ٹھیک کرنے میں لگی۔ کچھ آگے گئے تو ٹائر پھر پنکچر ہوگیا اور جیسے ہی ہم رکے ان لوگوں نے گھیر لیا۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ عتیق اور معین نے ہمیں نیچے سیٹوں پر گرا دیا اور خود حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرنے لگے۔''

''آپ کے ساتھ دو گارڈز بھی تھے۔''

''ان میں سے ایک تو فوراً گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔'' آپا نے افسردگی سے کہا۔''دوسرا عتیق اور معین کے ساتھ مل کر مقابلہ کر رہا تھا پھر بابا کا بھیجا گارڈ بھی آ گیا لیکن حملہ آور بہت زیادہ تھے۔ دوسرا گارڈ بھی باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ بابا کا گارڈ زخمی ہوا تھا۔''

''عتیق کیسے زخمی ہوا؟''

''دو حملہ آور گاڑی کے پاس آ گئے تھے عتیق نے ان کو روکا تو اس دوران میں اسے گولی لگ گئی لیکن اس نے کسی کو بتایا نہیں وہ تو شمی نے دیکھ لیا اس کا کرتا سرخ ہو رہا تھا۔''

شمی پھر سسکنے لگی۔ میں نے اس کا سر تھپکا۔''چپ کر میری گڑیا جس شخص کی یہ کارستانی ہے وہ اس وقت میرے قبضے میں ہے میں اس سے عتیق کی تکلیف کا مکمل حساب لوں گا۔''

آپا چونک گئیں۔ ''مرشد؟''

''نہیں آپا اس کا گرگا ہے میں اسی وجہ سے دیر سے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''حملہ آور کیسے بھاگے؟''

''عتیق کی فائرنگ سے ان کے دو آدمی زخمی ہوئے تھے پھر وہاں ایک پولیس کی گاڑی آگئی۔ اسے دیکھ کر وہ بھاگ نکلے۔'' آپا نے وہی بتایا جو محمود مجھے پہلے بتا چکا تھا۔

''پولیس نے ان کا پیچھا نہیں کیا؟''

''نہیں وہ جاتے جاتے بھی فائرنگ کر رہے تھے اس لیے پولیس وین نے ان کے پیچھے جانے کی کوشش نہیں کی۔'' آپا نے کہا۔ ''شکر ہے وہ نہیں گئے ورنہ ہماری مدد کون کرتا۔ جیسے ہی معین نے ان کو بتایا کہ گاڑی میں رفیق بھائی کی فیملی ہے انہوں نے ہماری مدد کی اور پولیس موبائل میں ہمیں اسپتال کے لیے روانہ کر دیا ہماری گاڑی تو خراب ہو گئی تھی۔''

''بابا نے جو گارڈ ساتھ کیا تھا اس کی حالت کیسی ہے؟''

''اسے بھی دو گولیاں لگی تھیں جب میں اسپتال سے آ رہی تھی تو اسے آپریشن کے لیے لے جا رہے تھے۔''

آپا کو زخم کی وجہ سے چین کلر دی ہوئی تھی اور ان سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا اس لیے وہ اٹھ کر اندر چلیں۔ ان کے جاتے ہی شمی نے روتے ہوئے سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔ ''شیبی...... عتیق۔'' اس کے لہجے میں فریاد آ گئی۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا گڑیا۔'' میں نے اس کا سر تھپکا۔ ''اللہ سے اس کی صحت کے لیے دعا کرو۔''

''اگر...... اسے کچھ ہوا تو میں......'' شمی کہتے کہتے رک گئی۔ ''تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''اس میں تیرا قصور نہیں ہے۔''

''میرا ہی قصور ہے۔'' شمی پھر رونے لگی۔ ''وہ مجھے لے جانے آئے تھے۔ ایک آدمی نے کہا کہ اگر وہ مجھے باہر بھیج دیں وہ کسی کو کچھ نہیں کہیں گے اور صرف مجھے لے کر چلے جائیں گے۔''

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ ''گڑیا تم بس اللہ سے عتیق کی صحت مانگو۔ ان لوگوں کو میں دیکھ لوں گا۔ ان سے ایسا حساب لوں گا کہ یہ قبر میں بھی بلبلاتے رہیں گے۔''

شمی روتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا۔ میں رشتے میں اس کا ماموں تھا لیکن ہمارے درمیان دوستی بھی تھی۔ اس لیے وہ میرے سامنے کھل کر رو لی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ''اب مت رو اور جا کر آپا کو دیکھو۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں کسی کو بھیجتی ہوں۔''

''اگر رفیق بھائی مصروف نہ ہوں تو ان کو بھیج دینا اور کسی کو مت بھیجنا۔''

رفیق بھائی کچھ دیر میں آ گئے تھے۔ جوان بیٹا زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا اس کے باوجود وہ حوصلے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں ان سے گلے ملا۔ ''شہباز تمہیں بہت یاد کیا۔''

''اور ملاقات بھی ہوئی تو کس موقع پر۔'' میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کاش ہم کسی خوشی کے موقع پر ملے ہوتے۔''

''خوشی کا موقع بھی آئے گا یار۔''

میں خود کو خطا کار محسوس کر رہا تھا یہ میری دشمنی کی آگ تھی جو ان کے خاندان تک چلی آئی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''رفیق بھائی مجھے افسوس ہے یہ سب میری وجہ سے......''

''اوئے نہیں یار۔'' انہوں نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''تیرا کیا قصور ہے اور مجھے تو اپنے بیٹے پر فخر ہے اس نے گھر کی عزت بچاتے ہوئے گولی کھائی ہے۔ میرا پتر شیر ہے۔''

''بے شک۔'' میں نے دل سے کہا۔ ''اللہ اسے لمبی عمر دے۔''

رفیق بھائی نے بتایا کہ ڈاکٹر نے کل دوپہر تک کا وقت دیا تھا اگر اس دوران میں عتیق کو ہوش آ جاتا تو اس کی حالت خطرے سے باہر آ جاتی۔

''ورنہ؟'' میں نے فکر سے پوچھا۔

رفیق بھائی نے گہری سانس لی۔ ''اس سے آگے ڈاکٹر کچھ نہیں کہتے ہیں۔''

''آپ نے پولیس رپورٹ کرائی؟''

''ہاں کرائی لیکن نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف۔''

''یہی درست ہے لیکن جس نے یہ کام کیا ہے اس وقت وہ میرے قبضے میں ہے۔''

رفیق بھائی چونکے۔ ''تمہارے قبضے میں؟''

میں نے ان کو مختصراً شریف بدمعاش کے بارے میں بتایا۔ گاڑی پر حملہ اس کے آدمیوں نے کیا تھا اور وہ عورتوں کو لے جانے آئے تھے۔ رفیق بھائی کو تعجب ہوا تھا کہ میں نے اتنی جلدی ذمے دار کو تلاش کر کے اسے اٹھوا بھی لیا تھا۔ ''میرے کچھ ساتھی اور ہمدرد ہیں بس ان کی مدد سے یہ کام کیا ہے وہ فی الحال اسلام آباد میں ہے اور وہاں اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی تاکہ اسے مرشد کے خلاف گواہ کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔''

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس حملے کے پیچھے ملک عارف کا ہاتھ ہے۔'' رفیق بھائی بولے تو میں چونک گیا۔

''ملک عارف سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟''

''سیاسی معاملہ ہے ہم دونوں الگ الگ پارٹیوں کے حامی ہیں اور یہ تسلسل بہت عرصے سے جاری ہے لیکن ان دنوں وہ ذلالت پر اتر آیا ہے اور اس نے سرگودھا میں میرے ایک قیمتی پلاٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر جھگڑا چل رہا ہے۔''

''ملک عارف نے میرے دشمن مرشد علی سے اتحاد کر لیا ہے۔ آج مرشد اس کے گھر آیا ہے اور کل وہ میانوالی میں جلسہ کرے گا۔'' میں نے انہیں بتایا۔

''تب میرا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے۔'' رفیق بھائی نے سر ہلایا۔ ''ملک عارف یہاں کے اکثر بدمعاشوں اور رسہ گیروں کا سرپرست ہے اور ممکن ہے اس معاملے میں اس نے مرشد کی مدد کی ہو۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ ملک عارف کے لیے بھی کام کرتا ہو لیکن میرا اندازہ ہے کہ شریف کے مرشد سے ذاتی تعلقات ہیں تب ہی وہ اتنی تیزی سے حرکت میں آ گیا تھا۔''

''ممکن ہے۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔ رفیق بھائی کچھ دیر میرے پاس بیٹھے تھے پھر باہر چلے گئے کیونکہ حملے کا سن کر بہت لوگ ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ میں نے بابا کو کال کی اور ان کو بتایا کہ میں رفیق بھائی

کے گھر ہوں۔ بابا نے کہا۔

''شجاع کے بھیجے ہوئے دو گارڈ اور آ گئے ہیں۔ جو زخمی ہوا تھا اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔''

''شکر ہے۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔

''مرشد کا فون آیا تھا۔'' بابا نے کہا تو میں چونک گیا۔

''کیا کہہ رہا تھا حرام......'' میں بولتے بولتے رک گیا کیونکہ آج تک بابا کے سامنے منہ سے گالی نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

''چالا کی دکھا رہا تھا۔ حملے کے بارے میں انجان بن گیا اور جب میں نے بتایا تو افسوس کرنے لگا۔''

''آپ نے کیا کہا؟''

''یہی کہ وہ افسوس نہ کرے اس کے لیے افسوس کرنے کے ابھی بہت سارے مواقع آئیں گے۔''

''آپ نے اسے بالکل ٹھیک جواب دیا۔ فون کس وقت آیا تھا؟''

''ابھی شام سات بجے۔'' بابا نے بتایا تو میں چونک گیا۔ شریف کو اٹھائے جانے کے فوراً مرشد نے بابا کو کال کی تھی۔

''کیا میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟''

''ہاں میں نے کہا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تم سو رہے ہو۔''

''اس نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس سے پتا چلے کہ اسے حویلی سے باہر میری موجودگی کا علم ہے؟''

''نہیں لیکن مجھے شبہ ہے اسے پتا چل گیا ہے۔''

بابا سے بات کر کے میری تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ وہ رفیق بھائی کے مہمان خانے میں ساتھیوں سمیت رکا ہوا تھا اور ان کو کھانا وغیرہ دے دیا گیا تھا۔ میں نے اس سے شریف کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا۔ ''وہ منزل پر پہنچ گیا ہے اور وہاں محفوظ ہے۔''

''اس کی کڑی نگرانی کرنی ہے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ مرشد کے لیے اہم آدمی ہے۔'' میں نے عبداللہ کو مرشد کی کال کے بارے میں بتایا۔

''شہباز صاحب یہ یہیں ہے کیا خیال ہے اسے کوئی چیرا نہ لگایا جائے۔''

''کیا یہ مناسب ہوگا۔'' میں اس کی بات سمجھ گیا۔ ''ہمارے پاس مل ملا کر چار بندے ہیں اور اس کے ساتھ محافظوں کی فوج ہوتی ہے۔''

''اس کے محافظ بھی اسی کی طرح ہوں گے دو غلے اور بزدل۔ وقت پر پیٹھ دکھانے والے۔''

''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''کل یہ جلسہ کرنے جا رہا ہے وہاں کچھ نہ کچھ......''

''نہیں وہاں لوگ ہوں گے۔''

''اچھا جلسہ گاہ کی طرف جاتے ہوئے کچھ کیا جائے۔''

''اس میں بھی خطرہ ہے پولیس مستعد ہوگی۔''

''ابھی تو وہ کہیں محفوظ ہوگا۔'' عبداللہ کو مایوسی ہوئی تھی۔ ''راستے میں ہی کوئی کارروائی کی جا سکتی ہے۔''

''میں سوچتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اس دوران میں منہاس مجھے بلانے آیا اندر کھانا لگ گیا تھا۔ کیونکہ ہم ایک ہی خاندان کی طرح تھے اس لیے پردے کا مسئلہ نہیں تھا۔ رفیق بھائی کے والد اور والدہ محبت سے ملیں۔ وہ آج بھی صغراں آپا کو اپنی بہو سمجھتے تھے اور ان کا ہر موقع پر خیال رکھتے تھے۔ اتفاق سے پورے خاندان میں شمی ہی واحد لڑکی تھی باقی سب کے لڑکے تھے۔ اس لیے شمی سب کی لاڈلی تھی۔ کھانا سوگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد رفیق بھائی نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔

''سونا مت مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''مجھے ویسے بھی نیند نہیں آئے گی۔'' میں نے کہا۔

شمی میرے لیے اس کمرے میں چائے لے آئی جہاں مجھے رات گزارنی تھی۔ وہ افسردہ تھی لیکن اس نے خود کو خاصی حد تک سنبھال لیا تھا چائے دے کر وہ چلی گئی کیونکہ عتیق کی صحت یابی کے لیے گھر میں آیت کریمہ پڑھا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رفیق بھائی آ گئے۔

''شہباز وہ بندہ کہاں ہے جسے تم نے پکڑا ہے؟''

''وہ یہاں نہیں ہے میں نے اسے اسلام آباد بھیج دیا ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ وہ مجھے درکار ہے؟''

میں کچھ دیر ان کی بات پر غور کرتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''رفیق بھائی آپ میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں اور آپ کا کہا سر آنکھوں پر...... لیکن کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہے۔''

ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اندر سے بہت ضبط کر رہے ہوں۔ وہ بولے تو ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''شہباز اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا تو میں اسے اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔''

''رفیق بھائی آپ ایک اچھے انسان ہیں اور ان جیسوں سے نمٹنے کا کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ دوسرے مجھے اس سے معلوم کرنا ہے کہ اس نے کس کے اشارے پر یہ کام کیا ہے۔''

''یہ تو واضح ہے۔''

''ہاں لیکن اس سے اگلوانا ہی اہم نہیں ہے اسے مرشد کے خلاف استعمال بھی کرنا ہے اور اس کام میں خاصی محنت کرنا ہوگی۔ میں نے اپنے ان چار ساتھیوں کی مدد سے اسے اس کے اڈے سے اٹھایا ہے جہاں اس کے ایک درجن مسلح اور چھٹے ہوئے بدمعاش موجود تھے۔''

''پھر بھی اگر اسے مارنے کا موقع آیا تو میں اسے اپنے ہاتھ سے مارنا چاہوں گا۔''

''اللہ کرے ایسا موقع نہ آئے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن خدانخواستہ ایسی کوئی بات ہوئی تو وہ آپ کے ہاتھ سے ہی مرے گا۔''

رفیق بھائی نے گہری سانس لی۔ ''بس میں تم سے یہی وعدہ لینا چاہتا تھا۔ اب تم سو جاؤ تھک گئے ہو گے۔'' رفیق بھائی چلے گئے تھے۔ میں نے سونے کا ارادہ کیا اور پھر ترک کر دیا۔

O......❖......O

اس وقت ہم میانوالی کی ایک ویران سڑک پر موجود تھے۔ میرے ساتھ عبداللہ اور اس کے دونوں ساتھی تھے۔ عبداللہ نے کہیں سے ایک نئی ٹویوٹا وین اٹھائی تھی۔ یہ بہترین حالت میں تھی کیونکہ ہم جو کرنے آئے تھے اس میں اپنی گاڑی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ گاڑی اٹھانے کا آئیڈیا عبداللہ نے دیا تھا اور عمل بھی اس نے کیا۔ وہ ایک کوٹھی کے سامنے موجود یہ نئی کار لے آیا تھا۔ بابا کی جیپ سے سارا اسلحہ اور دوسری چیزیں اس میں منتقل کیں اور ہم سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہو گئے۔ رات سرد تھی لیکن ہمیں بند کار میں اس کا اتنا احساس نہیں تھا۔ ہمیں ملک عارف کے گھر کا علم نہیں تھا لیکن اخبارات سے جلسہ گاہ کا علم ہوا تھا اور یہ معلوم تھا کہ مرشد کا قافلہ اسی راستے سے گزر کر جلسہ گاہ کی طرف جائے گا۔ سورج نکلنے تک ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے۔

''جگہ ایسی ہو جہاں سے کام کے بعد ہمیں نکلنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔'' میں نے عبداللہ سے کہا۔

''آپ فکر نہ یہ خالد خان اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔'' اس نے اپنے ایک ساتھی کی طرف اشارہ کیا اور یہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے۔ اس نے ایک جگہ کا بتایا ہے۔''

ہم سات بجے اس جگہ پہنچے۔ یہ ایک چھوٹی سی سڑک تھی جو نہر کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''میں بھی یہاں سے واقف ہوں یہ میانوالی کی سڑک نہیں ہے۔''

''آپ دیکھتے جائیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے وہ جگہ دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔''

سردی کی وجہ سے نہر کے نسبتاً گرم پانی سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور بعض جگہ تو لوگ اشنان بھی کر رہے تھے۔ پھر نہر اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ ان ٹیلوں کی وجہ سے سڑک کبھی نہر کے بالکل پاس آ جاتی تھی اور کبھی دور چلی جاتی تھی۔ پھر خالد خان نے کار ایک جگہ روکنے کو کہا۔ وہ کار سے اتر کر سڑک کے ساتھ ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ یہ کوئی چالیس پچاس فٹ بلند ٹیلا تھا اور اس پر چڑھنا آسان نہیں لگ رہا تھا خالد اوپر گیا تو میں بھی نیچے اتر آیا دو گھنٹے سے بیٹھے بیٹھے جسم بند سا ہو گیا تھا میں اس کے جوڑ کھولنے لگا۔

میں نے ٹیلے کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ خالد اوپر سے سامنے کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹیلے کی بالکل جڑ سے نہر لگ کر بہہ رہی تھی اور حیرت انگیز بات تھی کہ نہر کے اس پار بھی سڑک تھی۔ یہاں سے سڑک ذرا گہرا موڑ کاٹ رہی تھی۔ خالد نے کہا۔ ''یہ سڑک ہے میانوالی کی اور مرشد یہاں سے گزر کر جلسہ گاہ تک جائے گا۔''

میں حیران رہ گیا تھا میں شاید سینکڑوں مرتبہ یہاں سے گزرا تھا لیکن میں نے نہر پار ٹیلوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ ان کے اس طرف بھی کوئی سڑک ہوگی۔ ٹیلے اور نہر کے پار سڑک کوئی سو فٹ کی دوری پر تھی اور درخت نہ ہونے کی وجہ سے بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے خالد خان کا شانہ تھپکا۔ ''تم نے کمال کر دیا کتنی کام کی جگہ ہے۔ اپنا کام کرو اور مزے سے ٹہلتے ہوئے چلے جاؤ۔''

''نہر کی وجہ سے کوئی اس طرف نہیں آ سکے گا اور نہ ہی جوابی حملہ کر سکے گا۔'' خالد خوش ہو کر بولا۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی لیکن صبح کی دھند کی وجہ سے دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ میں نیچے آیا اور عبداللہ سے کہا۔

''تمہارے آدمی نے بہترین جگہ تلاش کی ہے۔ اگر ہم کامیاب رہے تو مرشد کو کبھی نہ بھولنے والا سبق

ملے گا۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''ہمیں یہ کار کسی ایسی جگہ چھپانی ہوگی جہاں سے فرار کے وقت ہمیں آسانی سے مل جائے اور سڑک سے کسی کی نظر بھی اس پر نہ پڑے۔''

''یہ کام تم کرو اور اسلحے والا بیگ نکال دو۔'' میں نے کہا اور اوپر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اسلحے کا بیگ خالد اور اس کا ساتھی عباس لے آئے تھے۔ میں نے ٹیلے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ایک موزوں جگہ چنی اور یہاں بیٹھ گیا۔ رات نیند نہ لینے کی وجہ سے سر ہلکا سا بھاری ہو رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہ بھاری پن اس وقت ختم ہو جائے گا جب میں دو کپ سیاہ گرم کافی کے پیوں گا۔ کافی عبداللہ کہیں سے بنوا کر اور تھرماس میں بھروا کر لایا تھا ساتھ میں وہ کھانے کے لیے بسکٹ اور چپس بھی لے آیا تھا۔ خالد اسلحے کے بعد کھانے پینے کا سامان بھی اوپر لے آیا تھا۔ عبداللہ کچھ دیر میں آیا اور اس نے ذرا دور ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''میں نے کار اس کے پیچھے چھپا دی ہے۔''

''کہیں کوئی اور نہ اس کا معائنہ کر لے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں کر سکتا میں نے اسے جھاڑیوں میں اس طرح چھپایا ہے کہ شاید ہی کسی کو نظر آئے۔''

ہم نے کافی بسکٹ اور چپس سے ناشتہ کیا۔ اس کے بعد بیگ سے خودکار رائفلیں نکالیں۔ یہ سنگل موڈ پر دو سو گز تک آسانی سے مار کر سکتی تھیں اور روسی ساختہ ان رائفلوں کی ایکوریسی بھی اچھی تھی۔ امکان تھا کہ مرشد کے قافلے میں کوئی نصف درجن گاڑیاں ہوں گی۔ اور ہمیں ان میں سے سب سے اہم نظر آنے والی گاڑی کو نشانہ بنانا تھا۔ ہمیں ڈرائیور کو نہیں بلکہ گاڑیوں کے ٹائروں کو نشانہ بنانا تھا۔ طے ہوا کہ ہم سب ہی کوشش کریں گے۔ کیونکہ ماہر نشانے باز کوئی بھی نہیں تھا۔ البتہ ہم اناڑی بھی نہیں تھے۔ درست نشانہ لگانے کے تمام اصول جانتے تھے۔

''عبداللہ تم اور خالد آگے والی گاڑی کو نشانہ بناؤ گے جب وہ موڑ مڑ رہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''آگے پیچھے کے ٹائر آپس میں خود بانٹ لو تاکہ ایک پر ہی نشانہ نہ لگے۔ میں اور عباس اس کے پیچھے آنے والے گاڑی کو نشانہ بنائیں گے۔ یہ بات یقینی ہے وی آئی پی گاڑیوں میں مرشد خود ہوگا یا اس کے محافظ ہوں گے۔ اگر کسی انسان کا نشانہ لو تو نچلے جسم کا لینا سمجھ گئے۔''

سب نے سر ہلایا تھا۔ پھر ہم نے اپنی اپنی جگہیں چن لیں میں اور عباس ذرا نچلی پوزیشن پر چلے گئے جب کہ عبداللہ اور خالد ذرا اوپر تھے یوں ہم پھیل کر مؤثر فائر کر سکتے تھے۔ عبداللہ کے سامان میں دو عدد دوربینیں بھی تھیں۔ ان میں ایک میرے پاس اور دوسری عبداللہ کے پاس تھی۔ خالد نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ اس کا کیسے پتا چلے گا کہ جو قافلہ آ رہا ہے اس میں مرشد ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا۔

''اول تو قافلے پر اس جماعت کے پرچم ہوں گے جس کی طرف سے مرشد الیکشن لڑ رہا ہے دوسرے یہاں سے اور کوئی وی آئی پی قافلہ گزرنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود کسی غلطی کی صورت میں بھی زیادہ نقصان نہیں ہوگا کیونکہ ہمارا کسی کو جان سے مارنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔ جب بھی سڑک پر بیک وقت ایک سے زیادہ گاڑیاں نمودار ہوتی تھیں تو ہم

دوربین آنکھوں سے لگا لیتے تھے۔ سورج رفتہ رفتہ اوپر آ رہا تھا اور اسی تناسب سے دھند اور سردی میں بھی کمی واقع ہو رہی تھی۔ کیونکہ ہم سب نے عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس لیے اچھا محسوس کرنے لگے۔ جلسے کا وقت دوپہر کا تھا اس لیے امکان یہی تھا کہ مرشد وہاں بارہ بجے تک پہنچ جائے گا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ دو گھنٹے پہلے روانہ ہوگا۔ دس بجے ہم سب مستعد ہو گئے۔ سڑک کے موڑ میں کام کا ٹکڑا صرف کوئی ایک سو گز کا تھا اس سے پہلے اور اس کے بعد ہماری رائفلیں غیر مؤثر ہو جاتیں۔ ہمیں جو کرنا تھا اسی ٹکڑے میں کرنا تھا اور میں نے اپنے موبائل کی اسٹاپ واچ چلا کر دیکھا۔ کوئی بھی درمیانی اور طاقتور انجن والی گاڑی اس ٹکڑے سے صرف تیس سیکنڈ میں گزر جاتی تھی گویا ہمارے پاس کارروائی کے لیے اتنا ہی وقت تھا۔

دس بج کر دس منٹ پر سڑک پر ایک بڑا قافلہ نمودار ہوا دوربین سے اس میں کم سے کم دس گاڑیاں نظر آئی تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ تمام گاڑیوں پر اس سیاسی پارٹی کے جھنڈے لہرا رہے تھے جس کی طرف سے مرشد الیکشن لڑ رہا تھا۔ سب سے آگے ایک شہ زور کھلی پک اَپ تھی جس میں مرشد کے مسلح محافظ سوار تھے اور وہ اسلحے کی نمائش کرتے آ رہے تھے۔ اس کے بعد دو اور چھوٹی پک اَپس تھیں جن میں مرشد کے جاہل مرید بھرے ہوئے تھے۔ پھر ایک ڈبل کیبن پک اَپ تھی اس میں بھی عقبی کھلی جگہ میں مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے اور پھر لگا تار تین سیاہ رنگ کی وی آئی پی گاڑیاں تھیں ان میں سے کسی ایک میں مرشد ہو سکتا تھا۔

''تینوں وی آئی پی گاڑیوں کو نشانہ بنانا ہے۔'' میں نے فوراً فیصلہ کیا۔ ''پہلے آگے پیچھے والی گاڑیوں کو نشانہ بنانا ہے اور پھر درمیان والی کو، سب سمجھ گئے۔''

''یس سر۔'' سب نے بیک وقت کہا۔

ہم لوگوں نے فائر کرنے کے لیے بہترین پوزیشن لی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ مرشد علی تم بھی کیا یاد کرو گے آج تک میں دفاعی جنگ لڑتا آیا جس میں سب سے اہم اپنی جان بچانا تھا لیکن آج تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے اب میں تمہارے راستے پر بھی چل کر دیکھوں۔ آگے والی گاڑیاں موڑ کے پاس آ گئی تھیں اور پھر وہ موڑ سے گزر گئیں وی آئی پی گاڑیاں نزدیک آ گئی تھیں جیسے ہی وہ مخصوص ٹکڑے میں پہنچیں میں نے پیچھے والی گاڑی کے اگلے ٹائر کا نشانہ لیا۔ پہلے عبداللہ نے فائر کیا اور کے فوراً بعد خالد نے فائر کیا۔ میں نے اور عباس نے بیک وقت فائرز کیے تھے۔ فضا دھماکوں سے گونج اٹھی اور مجھے خوشی ہوئی جب میں نے دونوں گاڑیوں کو لڑکھڑاتے دیکھا۔ میرا نشانہ خطا گیا تھا اس لیے میں نے دوبارہ نشانہ لیا اور لگا تار دو گولیاں چلائیں کوئی گولی کارآمد بیٹھی اور گاڑی کا اگلا ٹائر بھی برسٹ ہو گیا اور وہ لڑکھڑا کر رک گئی۔ اگلی والی پہلے ہی رک گئی تھی اور بیچ والی ان دونوں کے درمیان میں پھنس گئی تھی پھر اس کے ڈرائیور نے اسے نکالنے کی کوشش کی اس نے آگے والی گاڑی کو ٹکر ماری اور راستہ بنا لیا۔

''مرشد درمیان والی میں ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی باقی سب کی رائفلوں کا رخ بھی اسی طرف ہو گیا تھا اس لیے اس کے ٹائرز تباہ ہونے میں ایک منٹ بھی نہیں لگے تھے وہ بھی لڑکھڑا کر رک گئی۔ اس دوران میں آگے اور پیچھے محافظوں سے بھری گاڑیاں بھی رک گئی تھیں اور پہلے تو ان کو سمجھ نہیں آیا کہ فائر کہاں سے ہو رہے تھے پھر کسی تجربے کار نے بھانپ لیا کہ فائرنگ ٹیلے سے کی جا رہی تھی اس نے

چیخ کر دوسروں کو بتایا تو شاید ایک درجن سے بھی زیادہ خود کار ہتھیاروں کے دہانے ٹیلے کی طرف کھل گئے تھے لیکن یہاں ہم بالکل محفوظ تھے۔ میں نے ایک لمبے چوڑے پہلوان نظر آنے والے آدمی کے پیروں کا نشانہ لیا۔ اس نے بہت بڑی گن اٹھا رکھی تھی۔ گولی اس کے پاؤں میں کہیں لگی اور وہ تیورا کر گرا۔ اس دوران میں میرے ساتھیوں نے دو شکار اور کر لیے تھے یہ بھی زخمی ہوئے تھے۔

آگے والی گاڑیاں آگے نکل گئی تھیں اور موڑ سے پیچھے رہ جانے والی گاڑیاں ریورس ہو رہی تھیں۔ البتہ وی آئی پی گاڑیاں پھنس کر رہ گئی تھیں کیونکہ اس جگہ سڑک کی چوڑائی کم تھی اور دوسرے سب کے دائیں طرف کے تمام ٹائرز برسٹ ہو چکے تھے اور یہ بہت بھاری گاڑیاں تھیں اس طرح نہیں چل سکتی تھیں۔ ان گاڑیوں سے بھی محافظ اتر آئے تھے اور مرشد کے لیے اپنی جان پر کھیل رہے تھے۔ پھر میں نے درمیان والی گاڑی سے ایک سنہری لہراتے لبادے کی جھلک دیکھی۔ میرے دل نے کہا وہ مرشد تھا اور گاڑی سے اتر آیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ قاتلانہ حملہ تھا اور اس کی گاڑی سے نکل جانے میں ہی عافیت تھی۔ میں نے رائفل سنہری لبادے پر مرکوز کر لی لیکن اسے کئی افراد نے چاروں طرف سے اس طرح گھیرا ہوا تھا کہ وہ مشکل سے نظر آ رہا تھا۔

''بزدل۔'' میں نے زیر لب کہا اور ان چار پانچ افراد کے پیروں کا نشانہ لے کر لگا تار گولیاں چلائیں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا دو افراد تو گرے اور باقی مرشد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ اپنے جبہ اور دستار سمیت اکیلا رہ گیا تھا۔ کوئی سو گز کے فاصلے سے مجھے اس کے چہرے پر خوف و ہراس صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے پیروں کے پاس فائر کیا۔ مٹی اڑی تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹا اور بدحواسی میں نیچے گر گیا۔ اس کی دستار اتر گئی تھی اور جبہ بھی مٹی سے خراب ہو گیا تھا لیکن وہ ان سب چیزوں کی پروا کیے بغیر اتنی تیزی سے بھاگا کہ میں اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا تھا۔ وہ آگے ایک گاڑی کی اوٹ میں چلا گیا اور ہمارا کام ختم ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''ساتھیوں چلو واپس۔''

عبداللہ خاموش تھا اور اس کے ساتھی ناخوش تھے کیونکہ میں نے سامنے آئے دشمن کو چھوڑ دیا تھا اور دشمن کے ساتھیوں کو موقع ملتا تو وہ ہمیں ہرگز نہ چھوڑتے لیکن انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہم سارا اسلحہ اور سامان سمیٹ کر نیچے آئے اور اس ٹیلے کی طرف دوڑ لگا دی جہاں عبداللہ نے گاڑی چھپائی تھی۔ گاڑی پر سے جھاڑیاں صاف کرنے میں ایک منٹ لگا اور اس دوران میں عبداللہ نے سامان ڈکی میں ڈال دیا اور دوسرے منٹ میں ہم وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ ابتدائی بیس منٹ عبداللہ نے بہت تیز ڈرائیونگ کی تھی پھر اس نے رفتار کم کر لی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

''شہباز صاحب یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''نہیں بہت کچھ ہوا ہے۔''

''دشمن کا کوئی آدمی نہیں مرا۔'' خالد نے عقب سے شکوہ کیا۔

''ہمارا مقصد مارنا نہیں تھا صرف دہشت زدہ کرنا اور مرشد کو یہ بتانا تھا کہ وہ ہمیں تر نوالہ مت سمجھے۔''

''جناب اس واقعہ کے بعد وہ اور بھی محتاط ہو جائے گا۔''

''وہ ہمیشہ سے بہت محتاط رہنے والا آدمی ہے۔'' اس بار میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں اسے اچھی

طرح جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔"

میرے لہجے اور بات پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ میرے ملازم نہیں تھے بلکہ رضا کارانہ طور پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر میرا ساتھ دے رہے تھے اور مجھے ان کے ساتھ اس طرح سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے کچھ دیر بعد نرم لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے غور نہیں کیا وہ ایک سیاسی جلسے سے خطاب کرنے جا رہا تھا اور اب وہ اس واقعے کو کس طرح استعمال کرے گا۔ وہ اسے سیاسی چپقلش قرار دے گا۔ اگر ان میں سے کوئی مر جاتا تو معاملہ مزید سنگین ہو جاتا۔ مرشد کی تو خواہش ہوگی کہ اس کے ساتھیوں میں سے چند ایک کی لاشیں گریں اسے ان پر سیاست چمکانے کا موقع ملے۔ دوسرے ہم کوئی پیشہ ور قاتل نہیں ہیں اور نہ ہی مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگ ہیں ہم کسی کو صرف اپنے دفاع میں مار سکتے ہیں اس طرح پلان بنا کر کسی کو قتل کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا ہے۔

"آپ کو ہمارے سامنے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" عبداللہ بولا۔ "آپ ہمارے باس ہیں۔"

"میں نے کبھی اپنے ساتھیوں میں خود کو باس نہیں سمجھا۔ یہ میرے ساتھیوں کی نوازش ہے کہ وہ مجھے بڑا رکھتے ہیں لیکن تم میرے ساتھی ہو۔"

"نہیں آپ نے ٹھیک کہا۔" اس بار عبداللہ کا لہجہ نارمل ہو گیا تھا۔ "ہم جذباتی ہو گئے تھے۔ واقعی نہ ہم جرائم پیشہ ہیں اور نہ ہی پیشہ ور قاتل۔"

"شکر ہے تم میری بات سمجھ گئے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں مرشد کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ وہ دشمنی میں حد رکھے ورنہ حد میں بھی پھلانگ سکتا ہوں۔ شریف کی گمشدگی کے بعد یہ اس کے لیے دوسرا دھچکا ہے۔"

"یہ اتنی آسانی سے سمجھنے والی چیز نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن پہلے کسی نے اسے اس انداز میں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی۔" میں مسکرایا۔

"اب کہاں چلنا ہے جناب؟" عبداللہ نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس کار سے چھٹکارا پالینا چاہیے۔ ایسا کرو تم مجھے اسپتال کے پاس اتار دو اور اس کار کو صاف کر کے کہیں چھوڑ دینا۔ خود ٹیکسی کر کے رفیق بھائی کی حویلی چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" عبداللہ نے سر ہلایا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم سرگودھا کے اس اسپتال کے سامنے رکے جہاں عتیق داخل تھا۔ مجھے یاد تھا کہ ڈاکٹروں نے آج اس کے بارے میں حتمی طور پر بتانا تھا۔ میں نے کار سے اترتے ہوئے دعا کی کہ عتیق کو ہوش آ گیا ہو۔ عبداللہ مجھے چھوڑ کر آگے چلا گیا تھا۔ میں نے اس سے ایک پستول لے لیا تھا۔ گھر سے لایا اسلحہ میں نے رفیق بھائی کے گھر میں آپا کے پاس رکھوا دیا تھا تاکہ ہم کہیں پکڑ میں آئیں تو اس اسلحے کی وجہ سے بابا کو مشکل نہ ہو کیونکہ اس کا لائسنس ان کے نام پر تھا۔

میرے ذہن میں رات کو یہ خیال آیا اصل میں تو عبداللہ نے اس طرف توجہ دلائی تھی لیکن میں نے ذرا دیر سے سوچا۔ پھر میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ مجھے ہر بار تو نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ مرشد کہاں ہے اور کیا کرنے جا رہا ہے۔ میں نے رات ہی کو عبداللہ کو حویلی کے باہر بلوا لیا اور پھر ہم نے سارا منصوبہ طے کیا

اور عبداللہ اسی وقت گاڑی کا بندوبست کرنے روانہ ہو گیا تھا وہ ایک گھنٹے میں کار سمیت آ گیا اور ہم صبح پانچ بجے روانہ ہو گئے۔ اور چند گھنٹوں میں اپنا منصوبہ کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عبداللہ میری امن پسندی سے خوش نہیں تھا لیکن مجھے اس کی خوشنودی سے زیادہ اپنے حالات کو دیکھنا تھا میں بے دریغ قتل و غارت گری کر کے قانون کا مجرم نہیں بن سکتا تھا۔



عبداللہ کے جانے کے بعد میں اسپتال کے اندر آیا۔ میں نے ریسیپشن سے ایمرجنسی کے بارے میں پوچھا۔ مجھے بتایا کہ اس کے لیے مجھے باہر سے جانا ہو گا۔ مجبوراً میں باہر آیا اور گھوم کر ایمرجنسی والے دروازے سے اندر گیا۔ استقبالیہ پر موجود شخص نے مجھے عتیق کے بارے میں بتایا۔

''وہ بیڈ نمبر بارہ پر ہے۔''

میں اندر آیا تو مجھے راہداری میں ہی رفیق بھائی، معین اور شمی نظر آ گئے ان کے ساتھ ایک ڈاکٹر کھڑا ہوا تھا اور اس نے کچھ کہا تو شمی نے اپنا سر تھام لیا اور پھر چکرا کر گرنے لگی تھی۔ رفیق بھائی نے اسے سنبھالا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر نے عتیق کے بارے میں کوئی بری خبر سنا دی تھی۔

میں تیزی سے رفیق بھائی کے پاس آیا وہ نیم بے ہوش شمی کو وہیں پڑی بنچ پر لٹا رہے تھے۔ ان کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز تم......''

''رفیق بھائی عتیق کیسا ہے؟''

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اب تک ہوش نہیں آیا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولے۔

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

''ڈاکٹر مایوس ہو رہے ہیں۔''

معین شمی کو پانی پلا رہا تھا اور کچھ پانی اس کے چہرے پر بھی چھڑکا تھا۔ وہ ہوش میں آنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ ''شیمی...... عتیق۔''

میں نے اس کا سر تھپکا۔ ''شمی اللہ نے چاہا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ جلد ہوش میں آ جائے گا۔''

''لیکن اگر......'' شمی بولتے بولتے رک گئی تھی۔ یہ سوال تو سب کے ذہن میں تھا کہ اگر عتیق کو ہوش نہیں آیا تو کیا ہو گا لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ رفیق بھائی کسی اور ڈاکٹر سے بات کرنے چلے گئے تھے۔ میں شمی کے پاس بیٹھا اسے تسلی دیتا رہا تھا اور اس دوران میں کچھ سوچ بھی رہا تھا۔ شمی حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی یا معین اور میرے سامنے بکھرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے رویے نے عتیق کے لیے اس کی چاہت کے جذبوں کو عیاں کر دیا تھا میں نے اس سے پوچھا۔

''تم اسپتال کیسے آئیں؟''

''تایا جی نہیں لا رہے تھے لیکن میں ضد کر کے آ گئی۔'' وہ بولی۔ ''میں عتیق کو دیکھنا چاہتی تھی۔''

''آپا کہاں ہیں؟''

''گھر میں......ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو دوائی لے کر سو گئیں۔''

دس پندرہ منٹ بعد رفیق بھائی واپس آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''یہاں کے ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کر دی ہے۔ اسے اسلام آباد لے جانے کو کہا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انسان کی کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی ہے۔ ممکن ہے اسلام آباد میں عتیق کی بہتر ٹریٹ منٹ ہو سکے۔''

رفیق بھائی نے سر ہلایا۔ ''میں نے ایمبولینس کا کہہ دیا ہے۔ ایک ڈاکٹر بھی ساتھ جائے گا۔''

''تایا جی میں بھی جاؤں گی۔'' شمی بولی۔

''نہیں تیرا زیادہ باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے تُو جانتی ہے یہ اسی وجہ سے......'' رفیق بھائی بولتے رک گئے۔ شاید وہ کہنا چاہ رہے تھے کہ شمی کی وجہ سے عتیق اس حال کو پہنچا تھا لیکن ان کا انداز یقیناً الزام دینے والا نہیں تھا۔ ان کا کہنا درست تھا۔ احتیاط بہتر تھی۔ میں نے ان کی تائید کی۔

''رفیق بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرے دشمن انسان نہیں ہیں وہ ایک ناکام کوشش کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔''

''بس اب تم گھر جاؤ۔'' رفیق بھائی نے کہا اور معین سے کہا۔ ''تم اور شمی گھر جاؤ اور صغیر کو بھیج دینا۔ وہ میرے ساتھ جائے گا۔''

صغیر ایک طرح سے رفیق بھائی کا پی اے تھا۔ وہ اسے ہمہ وقت ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ معین شمی کو لے کر چلا گیا اور میں وہیں رکا رہا تھا۔ رفیق بھائی نے پہلی بار غور سے مجھے دیکھا۔ ''تم کچھ بدلے ہوئے ہو؟''

''ہاں میں نے بالوں کا اسٹائل بدل لیا ہے۔'' میں جواب دیا۔ ''کیا میں آپ کے ساتھ چلوں؟''

''نہیں تم یہیں رکو اور ہاں مجھے اپنے اسلام آباد والے بندوں کا پتا اور نمبرز دے دو ہوسکتا ہے ان سے کام پڑ جائے۔''

''وہ یہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے گھر ہیں آپ ان کے ساتھ چلے جائیں وہ بہت تربیت یافتہ محافظ بھی ہیں آپ کو فالتو بندے نہیں لے جانا پڑیں گے اسلام آباد کے بہت سارے معاملات یہی دیکھ لیں گے۔''

انہوں نے میرا مشورہ مان لیا اور میں نے عبداللہ کو کال کر کے اسے ساتھیوں سمیت صغیر کے ساتھ اسپتال آنے کو کہا۔ رفیق بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز تمہارے آنے سے مجھے سہارا ملا ہے۔''

''ایسا نہ کہیں اور آپ اکیلے تو نہیں ہیں اشفاق بھائی اور ان کے بیٹے بھی تو ہیں۔''

''اشفاق۔'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''آج کل تو اپنے بھی اپنے نہیں ہیں۔''

''رفیق بھائی کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے بھی اشفاق بھائی کا انداز کچھ روکھا لگا ہے۔''

''انہوں نے سر ہلایا۔ ''یہ زمین جائیداد کا چکر برا ہوتا ہے۔ اشفاق نے اپنی زمین الگ کر لی ہے اور اب شمی کے حصے پر بھی اس کی نظر ہے۔''

مجھے تعجب ہوا۔ ''شمی کے حصے پر نظر......وہ کیسے؟''

''وہ چاہتا ہے کہ شمی کی شادی اس کے کسی بیٹے سے کر دی جائے تاکہ اس کا حصہ بھی اس کے پاس

آ جائے۔“

”رفیق بھائی میں نے کبھی زمین جائیداد اور دولت کو اہمیت نہیں دی اس لیے میں آپ کو اس سلسلے میں کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکتا لیکن جہاں تک شمی کا تعلق ہے اس کی خوشی عتیق ہے اور میرے خیال میں ان کی خوشی کے سامنے ایسی ہزاروں زمینوں کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”یہی تو میں نے بھی اس سے کہا ہے لیکن وہ اس بات کو سمجھتا نہیں ہے شمی کے معاملے میں وہ ضد پر آ گیا ہے۔“

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے شمی کے بڑے آپ لوگ بھی ہیں اور اس کے لیے فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔“

”اباجی معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک دو دن میں خاندان والے مل کر بیٹھنے والے تھے لیکن یہ سانحہ پیش آ گیا۔“

”رفیق بھائی میرا دل کہتا ہے کہ عتیق ٹھیک ہو جائے گا اور شمی اس کی دلہن ہی بنے گی۔“

”ان شاءاللہ...... میرے بچوں کی خوشی میری اصل خوشی ہے۔“

کچھ دیر میں عبداللہ اور اس کے ساتھی آ گئے تھے۔ وہ اپنی گاڑی میں آئے تھے۔ جس میں وہ اسلام آباد سے یہاں آئے تھے۔ میں نے اسے رفیق بھائی کے ساتھ جانے کو کہا۔ ”وہاں بھی رفیق بھائی تم سے رابطہ رکھیں گے اور تم نے ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنی ہے۔“

”آپ بے فکر رہیں شہباز صاحب۔“ عبداللہ نے کہا اور میرے سینے سے لگ گیا۔ ”ایک بار پھر معذرت۔“

”کس بات پر؟“ میں انجان بنا۔

”آپ جانتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”بندہ بشر ہوں غلطی ہو جاتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں یار...... غلطیاں تو مجھ سے بھی ہوتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ اس دوران میں عتیق کو ایمبولینس میں شفٹ کیا جا رہا تھا میں نے اسے دیکھا۔ اس کا خوب صورت چہرہ زرد ہو رہا تھا اور یہ زردی میرے دل کو کاٹنے لگی۔ میں نے دل میں کہا۔ ”مرشد اگر اسے کچھ ہوا تو تمہارے اوپر میرا قرض بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔“

وہ سب چلے گئے تو میں نے بابا کی جیپ لی اور سرگودھا شہر کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے ایک پی سی او کال کر کے پہلے راولپنڈی میں مرشد ہاؤس کے فون نمبر لیے اور پھر ان کو ٹرائی کرنے لگا۔ ایک فون کسی نے ریسیو کیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ”کون ہے کس سے بات کرنی ہے؟“

”تمہارے باپ مرشد سے۔“ میں نے کہا۔

”اوئے کون ہے تُو......“ اس نے چیخ کر کہا۔

”میں خود کو تمہاری ولدیت میں شامل نہیں کرنا چاہتا اس لیے مجھے مرشد کا نمبر دو اس سے ضروری بات کرنی ہے۔“

''ادب سے نام لے مرشد بادشاہ کا۔''

''اچھا۔'' میں ہنسا اور نہایت ادب سے مرشد کو چند ناقابلِ بیان خطابات دیئے۔ اس پر اس کا چیلا آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے کال کاٹ کر پی سی والے لڑکے سے دوبارہ ملانے کو کہا اور رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''اپنی بکواس بند کرو اور مجھے مرشد کا نمبر دو اگر اسے بعد میں معلوم ہوا کہ میری کال آئی تھی اور تم نے نمبر نہیں دیا تو تم اس کے سالے بھی بن جاؤ گے۔ کوئی نہ کوئی بہن تو ہو گی نا تمہاری۔''

''اوئے تیری تو......'' اس نے میری بات کا اثر لیے بغیر اپنی بکواس جاری رکھی۔

''لگتا ہے تم مرشد کے سالے بن چکے ہو اور اسی وجہ سے اتنا بھونک رہے ہو۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ کر لڑکے سے دوسرا نمبر ملانے کو کہا۔ اتفاق سے وہ فارغ ہو گیا تھا اور اس بار کسی شائستہ سے آدمی نے فون اٹھایا۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے پہلے تصدیق کی۔

''تم مرشد ہاؤس سے ہی بات کر رہے ہو؟''

''جی جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''مرشد کا دشمن نمبر ون۔'' میں نے جواب دیا۔ ''حیرت ہے اس نے اتنے مہذب ملازم بھی رکھے ہیں ابھی دوسرے نمبر پر تو کوئی کتا بھونک رہا تھا۔''

''دشمن۔'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''مرشد صاحب کے؟''

''کیوں تمہارا آقا کیا شرافت کا پتلا ہے اس کے دشمن نہیں ہو سکتے؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں جناب ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ سنبھل کر بولا۔ ''آپ ان سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''بہت ضروری بات ہے یوں سمجھ لو کہ اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ دس منٹ بعد کال کر لیں میں ان سے پوچھ کر رکھتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''شہباز ملک۔'' میں نے کہا اور فون رکھ کر پی سی او والے لڑکے کو ادائیگی کر کے باہر آ گیا۔ دس منٹ بعد میں شہر سے باہر جا چکا تھا اور ایک جھگی ہوٹل کے ساتھ بنے پی سی او سے مرشد ہاؤس کال کی۔ میں نے پی سی او کے مالک کو سو کا نوٹ دے کر وہاں سے جانے کا حکم دیا تو اس نے بلا تامل تعمیل کی تھی۔ نمبر اسی نستعلیق شخص نے اٹھایا تھا اور میری آواز سن کر بولا۔

''میں لائن ملا رہا ہوں آپ مرشد صاحب سے بات کر لیں۔''

''اس کا مطلب ہے مرشد واپس آ گیا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ فوراً ہی مرشد لائن پر آ گیا اور اس نے میری بات سن لی تھی۔

''شہباز ملک۔'' اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''مرشد۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم معاملے کو بڑھا رہے ہو۔ مجھ پر تمہارا قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ آج جو ہوا وہ ادائیگی کے طریقہ کار کی وضاحت تھی۔ امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں ادائیگی کیسے کروں گا۔''

''تم نے جو کیا اس کا نتیجہ تمہارے سارے خاندان کو بھگتنا پڑے گا۔''

''مرشد بات خاندان تک آئی ہے تو میں اس حد تک گیا ہوں ورنہ تم جانتے ہو میں اب تک دفاعی پوزیشن

میں رہا ہوں اور میں نے کبھی تمہارے خلاف کوئی قدم از خود نہیں اٹھایا۔ مگر اب تم نے مجبور کر دیا ہے۔''

''تم تسلیم کرتے ہو کہ مجھ پر حملہ تم نے کیا ہے؟''

''میں ایسی کوئی بات کیسے تسلیم کر سکتا ہوں۔'' میں اس کی چالاکی سمجھ گیا وہ یقیناً اس گفتگو کو ریکارڈ کر رہا تھا۔''البتہ میں نے سنا ہے کہ آج کسی سیاسی جلسے کے لیے جاتے ہوئے تم پر حملہ ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ تمہارا اپنا سیاسی اسٹنٹ ہو اور تم اپنے مخالفوں پر الزام لگا رہے ہو۔''

''یہ کام تمہارا ہے......''

''میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم کار سے اتر کر بھاگے تو تمہاری دستار عزت زمین پر پڑی رہ گئی تھی؟''

''شہباز۔'' وہ کٹ کھنے انداز میں بولا۔''میں تمہارے ساتھ اس سے بھی برا کروں گا جو تم نے میرے آدمیوں کے ساتھ کیا ہے؟''

''کیا کیا ہے؟''

''ان کی آنکھیں اور کان بے کار ہو گئے ہیں۔'' وہ بولا۔

''کوئی بات نہیں تمہارے مرید ویسے بھی اندھے اور بہرے ہیں۔ اگر سچ مچ ہو گئے تب بھی کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا ہے۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔''میرا خیال ہے جس نے بھی یہ کام کیا ہے بالکل ٹھیک کیا ہے اور آئندہ بھی تمہارا جو آدمی اس کے ہاتھ آئے گا شاید وہ بھی اسی طرح اندھا اور بہرہ ہو کر واپس ملے۔ تمہیں پتا ہے اس شخص نے ان کو گونگا کیوں نہیں کیا ان کے منہ میں زبان کیوں چھوڑ دی؟''

''کیوں؟'' اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''تاکہ وہ تمہیں گالیاں دے سکیں۔ کیونکہ ان کی اس حالت کے اصل ذمے دار تم ہی ہو۔''

شہباز۔'' اس نے اچانک لہجہ بدل لیا۔''دیکھو اس طرح لڑائی جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ہمیں مل کر بات کرنی چاہیے۔''

''میں تم جیسے آدمی کے ساتھ مل بیٹھنے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ کسی غلیظ سؤر کے ساتھ بیٹھ جاؤں اور دعا کرو کہ میرا اور تمہارا سامنا نہ ہو ورنہ شاید وہ تمہارا آخری لمحہ ہو۔''

''اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی تمہیں عقل نہیں آئی۔'' وہ فوراً اپنی اصلیت پر واپس آ گیا تھا۔''ابھی تمہارا ایک بھائی اور خاندان کے کچھ لوگ باقی ہیں۔''

''مرشد تمہارے خاندان کے کچھ لوگ بھی ہوں گے۔ ان کا حساب بھی کر لینا۔'' میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ بے شک یہ پی سی او ایک سڑک پر تھا لیکن اتنی لمبی بات کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میرا مقصد مرشد کو یہ جتانا تھا کہ مجھے کمزور نہ سمجھے اور آج اس کا آخری دن بھی ہو سکتا تھا۔ میرا فائر اس کے پیروں کے پاس لگنے کے بجائے اس کے سینے میں بھی اتر سکتا تھا۔ میں جیپ میں بیٹھا اور فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ پی سی او کے مالک نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی اس کا مطلب تھا کہ میں نے سو روپے سے کم کی بات کی تھی۔ میرا ارادہ اب حویلی جانے کا تھا۔ میں نے موبائل سے بابا کا نمبر ملایا۔

''بابا میں گھر آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔''کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''نہیں شمی اور صغراں کہاں ہیں؟''

''فی الحال وہ وہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کچھ عرصے ان کو وہیں رہنے دیا جائے۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' بابا نے میری تائید کی۔ ''لیکن تم حویلی آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے میں کچھ دیر میں آرہا ہوں۔''

''ایک منٹ شہباز۔'' بابا بولے تو میں رک گیا انہوں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔ ''شہباز میں چاہتا ہوں تم سویرا سے اکیلے میں مت ملا کرو۔''

میں ایک لمحے کو سن ہو گیا تھا۔ پھر میرا خون سر کی طرف جانے لگا اور میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بابا کیا آپ کے نزدیک میں اب بھی اچھے کردار کا آدمی نہیں ہوں۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''لیکن ہماری ایک تہذیب اور اخلاقیات ہے۔ سویرا عدت میں ہے اور کسی نامحرم سے اس کا ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم گھر کے فرد ہو اس لیے تم سے پردہ تو نہیں کر سکتی ہے لیکن تمہارا اس سے اکیلے میں ملنا اور خاص طور سے اس کے کمرے میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔''

میرا اشتعال کم ہونے لگا تھا اور بابا کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بابا میں خود بھی اس معاملے میں بہت خیال رکھتا ہوں اور میں نے کبھی جان بوجھ کر سویرا سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اس رات بھی اتفاق سے میں اس کے کمرے کی طرف جا نکلا تھا۔''

''شہباز مجھے تم پر اعتماد ہے۔''

''مہربانی ہے آپ کی۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ پھر میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ان کو نکلے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔

''تم لوگ کہاں ہو؟''

''ہم پہنچنے والے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''رفیق صاحب کو اسپتال پہنچا کر میں کوٹھی چلا جاؤں گا۔''

''تم نے اس آدمی سے رپورٹ لی جو شہلا رضوی کی نگرانی کر رہا ہے؟''

''نہیں اس چکر میں مہلت نہیں ملی۔ جاتے ہی یہ کام کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کال ختم کر کے ندیم کا نمبر ملایا اور اس سے حال احوال لیا اس کے پاس کوئی نئی تازی نہیں تھی میں نے اسے بتایا کہ مرشد کے ساتھ میں نے اور اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ ندیم فکر مند ہو گیا۔

''شہباز یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مرشد پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور ہو گیا ہے۔ جب سے اس نے حکومت میں شمولیت اختیار کی ہے۔ وہ انتظامیہ کی مدد بھی حاصل کر سکتا ہے۔''

''وہ بے شک ساری دنیا کی مدد حاصل کر لے لیکن اس نے مرنا ایک گولی سے ہے اور یہ بات میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دی ہے۔''

''تیری مرضی بھائی۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن بھائی مروا مت دینا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور مزید ایک کا اضافہ ہونے والا ہے۔''

''تم وکیل کیس سے گھبراتے نہیں ہو چاہے عدالت کا ہو یا گھر کا۔'' میں نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر مجھے دبئی والی پارٹی کا خیال آیا اور میں نے سفیر کے گھر کا نمبر ملانا چاہا تو موبائل سے سگنل ہی غائب ہو گئے میں شہر سے دور نکل آیا تھا۔ بھاگ دوڑ میں مجھے کھانے کا خیال نہیں رہا تھا اور اب بھوک لگ رہی تھی۔ شام کے سائے دراز ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت ہوٹلوں میں کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں ملتی اور دوسرے گھر اب کچھ ہی دور تھا میں آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتا تو سویرا کے ہاتھ کا بنا ہوا کھا سکتا تھا۔ سویرا کا خیال آیا تو میں اس کے بارے میں سوچنے لگا اور آس پاس سے ایسا بے خبر ہوا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ایک سیاہ کار میری جیپ کے پاس آ گئی۔ وہ بہت تیزی سے اوورٹیک کرتی ہوئی میرے پاس سے گزری تو میں چونکا تھا۔ اس کے باوجود شاید میں توجہ نہ دیتا لیکن میں نے دیکھا کہ کار کی نمبر پلیٹ غائب تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہاں میرے دشمنوں کی کمی نہیں تھی اور میں نے شریف بدمعاش کے گروپ کو بھی دشمن بنا لیا تھا۔ وہ یقیناً میری تلاش میں ہوں گے اور مجھے تلاش کر لینا کوئی ناممکن نہیں تھا کیونکہ میں کھلے عام گھوم ہی رہا تھا۔ سیاہ کار بہت تیز رفتاری سے آگے نکل گئی۔ میں نے بھی رفتار بڑھائی لیکن اس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں اسے نظر میں رکھ رہا تھا۔ میری چھٹی حس اس کے بارے میں خبردار کرنے لگی تھی۔ کچھ آگے ایک چھوٹی سے نہر تھی اور سڑک پل سے گزر رہی تھی۔

پل کے پاس پہنچتے ہی سیاہ کار نے پرشور بریک لگائے لگا اور ذرا گھوم کر اس طرح رکی کہ سڑک کسی حد تک ہلاک ہو گئی تھی۔ فوراً ہی اس سے تین افراد نکلے اور انہوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ وہ خودکار رائفلوں سے مسلح تھے میں نے خطرہ بھانپتے ہوئے جیپ کو پوری بریک لگا دی اور اسے ذرا موڑتے ہوئے روک لیا لیکن اتنی دیر میں وہ میری طرف اپنے ہتھیاروں کے دہانے کھول چکے تھے۔ میں جیپ رکتے ہی نیچے کود گیا اس کے باوجود ایک گولی میرے شانے کو چھوتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی انگارہ چھو گیا ہو۔ میرے پاس پستول تھا اور شاٹ گن سیٹ کے نیچے رکھی تھی۔ میں نے پستول نکال لیا اور جیپ کے دوسری طرف زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنے شانے کا زخم دیکھا۔ سویٹر اور قمیص ادھڑ گئی تھی اور اس سے سرخی جھلک رہی تھی میں نے ٹٹولا تو میری انگلیاں بھی خون سے بھر گئیں لیکن زخم معمولی سا تھا۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے بعد میں ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اس دوران میں کئی گولیاں آ کر جیپ کی باڈی سے ٹکرائی تھیں اور بابا جان کی چہیتی جیپ مزید مجروح ہو گئی تھی۔ میں نے پستول چیک کیا اور بونٹ والے حصے سے ذرا ہاتھ نکال کر ان کی طرف چار پانچ گولیاں چلائیں۔ میں نے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی تھی تین خودکار رائفلوں کا سامنا کرنا ایسی حماقت ہوتی جس کا صلہ فوری طور پر گولیوں کی صورت میں مل سکتا تھا۔ میری جوابی کارروائی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ افراتفری میں کار کے پیچھے بھاگے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ فلمی انداز میں سامنے کھڑے تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ذرا سر نکالا اور ان کی طرف مزید کئی گولیاں چلائیں۔ ظاہر ہے اس اندھا فائرنگ میں نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ پستول کا میگزین ختم ہو گیا تھا اسے تبدیل کرنے کے ساتھ میں نے سیٹ کے نیچے سے شاٹ گن نکال لی۔ اب میں اطمینان بخش طور پر مسلح تھا۔

جیسے ہی وہ دوسری طرف گئے انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ جیپ کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیئے اور اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ان کے میگزین ختم نہیں ہو گئے۔ جیپ پر گولیاں یوں برس رہی تھیں جیسے

برسات میں اولے گرتے ہیں۔ دوسری طرف کے دونوں ٹائرز برسٹ ہو گئے اور یقیناً باڈی بھی چھلنی ہو گئی ہو گی لیکن دوسری طرف میں محفوظ تھا۔ پہلے ایک کی رائفل خالی ہوئی اور ایک سیکنڈ بعد دوسرے کی بھی خالی ہو گئی اور تیسرے سیکنڈ میں تیسرا بھی خالی رائفل لیے بیٹھا تھا۔ میں اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

پہلے مجھے ان لوگوں کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ ایک مصروف شاہراہ ہے۔ بے شک اس وقت یہاں کوئی اور گاڑی نہیں تھی لیکن کوئی گاڑی کسی وقت بھی اور کسی طرف سے آ سکتی تھی۔ مگر ان کا اطمینان بتا رہا تھا کہ ان کو کسی کی پروا نہیں ہے اور اگر کسی نے دخل در معقولات یا نامعقولات کیا تو وہ اس سے نمٹ سکتے تھے۔ ان میں پولیس بھی شامل ہے لیکن اس قسم کے معاملات میں ہماری پولیس سے زیادہ ذہین اور کوئی نہیں ہے۔ جہاں دو گروہ جدید اسلحے کے ساتھ آپس میں گولیوں کا تبادلہ خیال کر رہے ہوں وہاں سے ہماری پولیس کم سے کم دو تین کلومیٹرز کے فاصلے پر چلی جاتی ہے تاکہ اسے فائرنگ کی آواز بھی نہ سنائی دے اور وہ حلفیہ بیان دے سکے کہ اس نے فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔ باقی عوام کی ان کو پروا نہیں تھی۔ وہ ان کی بلا سے بھاڑ میں جائے۔

لیکن جب انہوں نے ایک ساتھ ہی اپنی رائفلوں کے میگزین ختم کر لیے تو وہ مجھے لاپرواہی نہیں احمق بھی لگے تھے۔ تجربے کار لوگ کبھی ایسی حماقت نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے جس طرح بدحواس ہو کر فائرنگ کی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ میری مزاحمت ان کے لیے غیر متوقع تھی اور وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ میں ان کی طرف سے حملہ ہوتے ہی رضاکارانہ طور پر ہتھیار ڈال دوں گا یا فوت ہو جاؤں گا۔ جب میں نے ان کی توقع کے خلاف اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تو وہ بوکھلا گئے تھے۔ اسی بوکھلاہٹ میں انہوں نے دھڑ دھڑا کر فائرنگ کی تھی۔

جیسے ہی فائرنگ تھمی میں جیپ کی آڑ سے نکل آیا اور میں نے پہلا شاٹ اس کو مارا جو سامنے کھڑا میگزین تبدیل کر رہا تھا۔ گولی اس کے شانے پر لگی اور اس نے بازو کو تقریباً الگ کر دیا تھا۔ دوسرے کو بھی میں نے بازو پر گولی مارنا چاہی تھی لیکن اس نے حرکت کر کے خود کو زندگی سے محروم کر لیا وہ دائیں طرف جھکا اور اس کا سر شاٹ گن کی مہلک گولی کی زد میں آ گیا۔ اس کا سر نصف سے زیادہ اُڑ گیا تھا۔ تیسرے نے اس دوران میں کسی نہ کسی طرح اپنی رائفل کا میگزین بدل لیا تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی حسرت لیے وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ گولی اس کے شانے اور گردن کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی تھی اور وہ زمین پر گر کر اپنی گردن سے نکلنے والے خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا بچنا محال نظر آ رہا تھا۔ جس کا بازو اُڑ گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لات مار کر اس کی رائفل دور پھینک دی۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔

''مجھے مت مارنا۔''

''کیوں؟'' میں نے شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ ''تم لوگ کیا مجھے پھول پیش کرنے آئے تھے؟''

''نہیں۔'' وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔ اس کی تکلیف یقیناً بڑھ گئی تھی۔

''کس کے آدمی ہو تم سب؟''

''شریف کے...... ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ بدستور خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا پھر وہ تیورا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں واپس جیپ کی طرف آیا۔ اس کی باڈی میں مختلف جگہوں پر کم

سے کم دو درجن سوراخ ہو گئے تھے۔ دونوں ٹائرز برسٹ ہو گئے تھے اور اب ان کو بدلنا لازمی تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر جیک نکال کر اس طرح لگایا کہ جیب اس طرف سے اٹھ گئی۔ خوش قسمتی سے جیپ میں دو عدد اسٹیپنی تھیں اور میں نے باری باری دونوں کو بدل دیا۔ اس کام میں مشکل سے دس منٹ لگے تھے۔ جیک ہٹا کر میں نے اس امید میں اگنیشن کی چابی گھمائی کہ انجن کو کوئی نقصان نہ ہوا ہو اور جب انجن جھرجھری لے کر اسٹارٹ ہو گیا تو مجھے ناقابلِ بیان سی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا سی جگہ سے جیپ نکالی اور روانہ ہو گیا۔ اس دوران میں دونوں جانب سے کئی گاڑیاں آئیں مگر جنگ وجدل اور خون وکشت کے آثار دیکھ کر درمیان سے واپس چلی گئیں۔ میں نے بھی کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا اس لیے امید تھی کہ پولیس حویلی کا رخ نہیں کرے گی۔ شریف کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور میرے پیچھے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے پل پر روک لیا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہوا ورنہ وہ میرا تعاقب کرتے حویلی تک بھی جا سکتے تھے۔ مرشد کے لیے یہ ایک اور جھٹکا ہوگا۔

میں آدھے گھنٹے بعد حویلی پہنچ گیا تھا۔ جیپ اور اس کی حالت دیکھ کر گارڈ نے گیٹ کھولنے کے بجائے پہلے انکوائری اور جب تک اسے میری صورت واضح نہیں دکھائی دی اس نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ میں اندر آیا تو گارڈ نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہوا سر؟''

''حملہ۔'' میں نے ایک لفظ میں جواب دیا اور جیپ کو اس کے شیڈ کی طرف لے گیا۔ شاید بابا کو اطلاع مل گئی تھی اس لیے وہ میرے اترنے سے پہلے آ گئے اور انہوں نے جیپ کا حشر دیکھ لیا تھا۔

''شہباز یہ کیا ہوا ہے؟''

''راستے میں ان لوگوں نے حملہ کیا جنہوں نے کل آپا کی گاڑی پر حملہ کیا تھا۔''

''یہ کیا؟'' اب انہوں نے میرا زخمی شانہ بھی دیکھ لیا۔

''کچھ نہیں معمولی سا زخم ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ بولے اور مجھے اندر لے گئے۔ اپنے کمرے میں آتش دان کے سامنے انہوں نے میری قمیص اتروائی اور شانے کے زخم کا معائنہ کیا اور پھر اسے روئی اور ڈیٹول سے صاف کیا۔ زخم کسی قدر لمبا تھا اور کچھ گہرا بھی تھا اس لیے اس پر چپکانے والی پٹی نہیں لگ سکتی تھی۔ بابا نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر اوپر سے ایک چکنی پٹی رکھ کر ٹیپ لگا دیا۔ انہوں نے یہ اچھا کیا کہ ماں جی یا سویرا کو نہیں بتایا تھا ورنہ انہوں نے رونا دھونا شروع کر دینا تھا۔ قمیص پر خون کے دھبے لگے ہوئے تھے اس لیے اسے پہننے کے بجائے میں نے بابا کی دی ہوئی گرم چادر لے لی۔

''ہاں اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے ان کو تفصیل سے بتایا کہ راستے میں مجھ پر کس طرح قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو ابھی ان کی جگہ میری لاش وہاں سڑک پر پڑی ہوتی۔ بابا تشویش زدہ ہو گئے تھے۔ میں سمجھا کہ اس حملے کی وجہ سے ہوئے لیکن انہوں نے کہا۔ ''شہباز مجھے لگتا ہے تم کو پھنسانے کی سازش کی گئی ہے۔''

''کیا مطلب بابا؟''

''تم نے شاٹ گن استعمال کی ہے اور اس کا لائسنس میرے نام پر ہے۔''

میں چونکا اور بابا کی بات سمجھ گیا۔ ''لیکن ہمارے ہاں گولیوں سے ہتھیار کا سراغ لگانے کا نظام کہاں ہے؟''

''وہ تو ہے لیکن ایسا عام معاملات میں نہیں کیا جاتا ہے تم جانتے ہو جب اوپر سے دباؤ آتا ہے تو ہماری پولیس سب کر گزرتی ہے۔ وہ لاشوں سے گولیاں حاصل کر کے ان کا موازنہ میری شاٹ گن سے کروا سکتے ہیں۔''

ہر ہتھیار کی گولی الگ سے شناخت کی جا سکتی ہے کیونکہ جب گولی نال سے گھومتی ہوئی نکلتی ہے تو اس پر کچھ مخصوص نشانات پڑ جاتے ہیں۔ ایسا ہر بار ہوتا ہے اس لیے یہ پتا چلانا آسان ہے کہ مطلوبہ ہتھیار کون سا ہے جس سے گولی چلائی گئی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں قانونی ہتھیاروں کا ریکارڈ اس لحاظ سے بھی رکھا جاتا ہے اور کسی واردات میں قانونی ہتھیار استعمال ہو تو اس کا پتا چل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو فنگر پرنٹ جیسا عام سا کام بھی صحیح سے نہیں ہوتا ہے لیکن اگر شاٹ گن کی گولیوں کا موازنہ بابا کی شاٹ گن سے کر لیا جاتا تو پتا چل جائے گا کہ فائر اسی سے ہوئے ہیں۔

''بابا شاٹ گن غائب کرنا ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''بلکہ ممکن ہو تو اس کی چوری کی رپورٹ لکھوا دیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں نہ صرف شاٹ گن بلکہ جیپ کی بھی۔'' انہوں نے کہا اور کھڑے ہو گئے۔ ''میں خود جا رہا ہوں۔''

میں ان کے ساتھ باہر تک آیا۔ ''شجاع بھائی کے بھیجے اضافی گارڈ کہاں ہیں؟''

''یہیں ہیں وہ رات کو ڈیوٹی پر آ جائیں گے۔'' بابا نے کہا۔ انہوں نے جیپ شیڈ سے نکالی اور اکیلے جانے لگے تھے لیکن میں نے اصرار کر کے ایک گارڈ ان کے ساتھ کر دیا۔ میں اندر آیا تو ماں جی اور سویرا کو پتا چل گیا تھا کہ میں آ گیا ہوں وہ اندر بے تابی سے میری منتظر تھیں اور انہوں نے اندر آتے ہی مجھے گھیر لیا۔

''پتر شہباز...... اب عتیق کیسا ہے؟'' ماں جی نے پوچھا۔ ''صغراں ٹھیک ہے نا؟''

''جی ماں جی۔'' میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ سویرا ان کے پیچھے بیٹھی تھی۔ ''عتیق کی حالت ٹھیک نہیں ہے رفیق بھائی اسے اسلام آباد لے گئے ہیں وہاں کسی اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔''

''خدا خیر کرے۔'' ماں جی نے کہا۔ ''تو نے دوپہر میں کھانا کھایا؟''

''نہیں...... لیکن بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور یہ سچ تھا۔ راستے میں پیش آنے والے واقعے نے میری بھوک اُڑا دی تھی۔

''نہیں تو کھانا کھا لے۔'' ماں جی نے کہا۔ ''سویرا کھانا نکال دے۔''

''جی ماں جی۔'' وہ کھڑی ہو گئی۔

''ماں جی میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں۔'' میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ میں کمرے کی طرف آیا تو پیچھے سے سویرا بھی آ گئی۔

''آپ کی شرٹ کہاں ہے؟''

میں حیران ہوا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نے شرٹ نہیں پہنی ہے؟''

''بس ہو گیا۔'' وہ جھینپ کر بولی۔ ''لیکن آپ نے بتایا نہیں۔''

''وہ راستے میں ایک حادثہ ہو گیا تھا اس میں شرٹ خراب ہو گئی تو وہ میں نے اتار دی تھی کہ ماں جی پریشان نہ ہو۔''

''کیا آپ زخمی ہیں؟'' اس نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''معمولی سا زخم ہے۔'' میں نے اسے ٹالا۔ ''ایسا کرو کھانا یہیں لے آؤ۔''

وہ جھجکی پھر اس نے کہا۔ ''آپ مجھے دکھا سکتے ہیں؟''

''سویرا خاص نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''اب تم جاؤ تاکہ میں چینج کر سکوں۔''

وہ کمرے سے چلی گئی میں نے محسوس کیا کہ میرے انکار سے اسے دکھ ہوا تھا لیکن مجھے بابا کی بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے صحیح کہا تھا ہمارا تنہائی میں ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ کم سے کم جب تک وہ عدت میں ہے۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر دوسرے کپڑے نکال کر پہنے اس دوران میں سویرا کھانا لے آئی تھی۔ اس نے کھانا گرم کیا تھا۔ روٹیاں ذرا باسی لیکن مزے کی لگیں۔ سویرا میرے پاس رکنا چاہتی تھی لیکن میں اس کی خواہش سے انجان بن گیا تو وہ چلی گئی۔ کھانے کے بعد میں نے رفیق بھائی کو کال کی۔ عتیق کو اسلام آباد کے ایک بہترین نجی اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا اور وہاں اس کے کچھ ٹیسٹ کیے جا رہے تھے۔ پھر صغراں آپا اور شمی سے بات کی۔

جب میں حویلی میں آیا تو سورج ڈوبنے کو تھا اور اب تاریکی چھا چکی تھی۔ گارڈز کو میرے وجود کا علم ہو گیا تھا اس لیے میں نے حویلی کا چکر لگایا اور نئے آنے والے گارڈز سے ملا۔ وہ بھی اسی فرم کے تھے اور یہ سب تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان کی مستعدی میں دیکھ چکا تھا۔ اگر آپا لوگوں کے ساتھ جانے والا گارڈ اپنی جان پر کھیل کر مزاحمت نہ کرتا تو شاید حملہ آور کامیاب ہو جاتے۔ زخمی ہونے والے گارڈ کو بھی اسلام آباد منتقل کر دیا گیا تھا اور اس کی حالت بہتر تھی۔

بابا دو گھنٹے بعد آئے تھے اور انہوں نے جیپ اور شاٹ گن کی چوری کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ یہ کام انہوں نے کل کی تاریخ میں کرایا تھا اور ظاہر ہے اس کے لیے سکہ رائج الوقت استعمال کیا تھا۔ وہ تھکے ہوئے تھے اس لیے رات کا کھانا جلد کھا کر سو گئے تھے۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ شمی اور آپا کے جانے کے بعد حویلی میں سناٹا سا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور بور ہو رہا تھا۔ میں نے سفیر کا دبئی والا نمبر بھی ملا کر دیکھا کہ شاید اب اس سے بات ہو جائے لیکن بات نہیں ہو سکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں حویلی میں بے دست و پا بیٹھا ہوں میرے تمام دوست مجھ سے دور تھے اور کوئی مسئلہ ہوتا تو مجھے کہیں جانے میں گھنٹوں لگ جاتے تھے۔ مجھے اصل میں اسلام آباد میں ہونا چاہیے کیونکہ سارے معاملات وہیں چل رہے تھے اور یہاں کچھ بھی نہیں تھا لیکن میں بابا کی اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ فی الحال وہ مجھے اجازت نہیں دے گے۔

دس بجے عبداللہ کا فون آ گیا۔ ''شہباز صاحب ایک اہم خبر ہے؟''

''بیتو کے بارے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں شہلا رضوی کے بارے میں وہ ایک نجی بینک کے چکر لگا رہی ہے اور اس نے وہاں اکاؤنٹ بھی کھول لیا ہے۔''

''وہاں اس نے کوئی لاکر بھی لیا ہے؟''

''اس کا علم نہیں ہے میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنا ایک آدمی مستقل رفیق صاحب کے ساتھ لگا دیا ہے۔''

''گڈ۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ اس بینک میں نفیس برنی نامی شخص کا کوئی لاکر اور اکاؤنٹ ہے یا نہیں۔''

''میں معلوم کرتا ہوں۔''

''مرشد یا فتح خان کی کوئی خبر ہے؟''

''نہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوا ہے۔''

''مرشد کے آدمیوں میں فاضلی نامی ایک شخص ہے اس کے بارے میں معلوم کرانے کی کوشش کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب کا آپ کے لیے پیغام ہے کہ آپ محل کے نمبروں پر راجا صاحب سے بات کر سکتے ہیں۔''

گویا راجا صاحب یا بیگ کے خیال میں مجھ سے رابطہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے تلخی سے سوچا۔ پہلے میں نے سوچا کہ میں کال نہیں کروں گا راجا عمر دراز کے پاس میرا موبائل نمبر پہنچ گیا ہو گا اور وہ چاہیں تو خود کال کر لیں لیکن پھر میں نے کال کرنے کا فیصلہ کیا۔ راجا عمر دراز کا رویہ کیسا ہی سہی وہ بہر حال میرا محسن بھی تھا۔ اب بھی اس کے آدمی بے لوث میرے کام آ رہے تھے۔ میں نے محل کا نمبر ملایا۔ کسی ملازم نے اٹھایا۔ میں نے اپنا نام بتاتے ہوئے بیگ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتنا تو مجھے پتا چل گیا تھا کہ محل کے پروٹوکول کے مطابق راجا سے صرف بیگ ہی رابطہ کر سکتا تھا۔

''شہباز صاحب۔'' بیگ نے حسبِ معمول محتاط اور مشکوک لہجے میں کہا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے عبداللہ کا پیغام ملا ہے۔''

''جی راجا صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے لیکن ابھی تو وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں اور ان سے صبح ہی بات ہو سکے گی۔''

''ٹھیک ہے میں صبح بات کر لوں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کرنے والا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ ''بیگ صاحب ایک بات بتا سکتے ہیں کہ راجا صاحب جب باہر سے واپس آئے تو اکیلے تھے یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا اور آپ مجھے ٹالنے کے بجائے بلا تکلف جواب دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔''

میری اس بات پر وہ شاید کھسیا گیا تھا۔ ''میں آپ کو کبھی ٹالنے کی کوشش نہیں کرتا ہوں اور آپ کے سوال کا جواب ہے ہاں راجا صاحب کے ساتھ ایک آدمی تھا۔''

''کون؟''

''حکیم قادس۔'' اس نے جواب دیا۔

''شکریہ بیگ صاحب۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے خیال آیا کہ کوئی نہ کوئی اہم بات ہوئی ہے۔ حکیم قادس ڈیوڈ شا کے قبضے میں تھا اور وہ اب آزاد ہے۔ راجا عمر دراز انڈیا میں پُراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اور

اب وہ بھی واپس آ گیا ہے۔ اس دوران میں وہ کہاں رہا اور حکیم قادس اس کے ہاتھ کیسے لگا؟ میں جاننے کے لیے بے چین ہو گیا تھا اور راجا عمر دراز بھی شاید اسی سلسلے میں مجھ سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا۔



میں سوچوں میں گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں دروازہ کھولے بغیر جان گیا کہ وہ سویرا تھی لیکن اس وقت کیوں آئی تھی جب ساری حویلی سو چکی تھی۔ اس نے دستک بہت آہستہ سے دی تھی۔ اگر سناٹا نہ ہوتا تو مجھے سنائی بھی مشکل سے دیتی۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے دوبارہ دستک دی تو میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''آ جاؤ۔''

دروازہ کھلا اور وہ اندر آ گئی۔ اس نے چائے کا مگ تھام رکھا تھا۔ وہ جھجک کر بولی۔ ''مجھے پتا ہے..... آپ رات سونے سے پہلے..... چائے لیتے ہیں تو میں.....''

''شکریہ۔'' میں مسکرایا۔ ''آؤ اندر آ جاؤ۔''

''نہیں..... یہ مناسب نہیں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''میرا اتنے رات گئے آپ کے کمرے میں آنا مناسب نہیں ہے۔''

میں اٹھ کر دروازے تک چلا آیا اور اس سے مگ لے لیا۔ ''تم نے ٹھیک کہا۔ اخلاق اور تہذیب کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ سویرا اب مجھے احساس ہوتا ہے تم میری محبت ہی نہیں میرا فخر بھی ہو۔''

وہ شرمیلے انداز میں مسکرا دی۔ ''مجھے بھی آپ پر فخر ہے۔ اب میں جاؤں؟''

''خدا حافظ۔'' میں نے جواب دیا تو وہ چلی گئی۔ شمی کے نہ ہونے کی وجہ سے اس نے شمی کی ذمے داریاں بھی سنبھال لی تھیں لیکن بہت مناسب اور باوقار انداز میں۔ میں نے درست کہا تھا مجھے اس سے محبت ہی نہیں اس پر فخر بھی تھا لیکن اس کی ایک لمحے کی جھلک اور ان چند باتوں نے میری ساری بوریت دور کر دی تھی میں نے چائے پی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو فجر کا وقت ہو رہا تھا مسجد سے اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ جب میں حویلی میں تھا تو پانچ وقت خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتا تھا لیکن بعد میں یہ فرض بھولتا چلا گیا۔ اب بھی حویلی میں آنے کے بعد مجھے یہ بھولا سبق یاد آیا تھا لیکن فرض میں پھر بھی کوتاہی ہو جاتی تھی۔ اس وقت اذان کی آواز سنی تو بے ساختہ گرم بستر سے اٹھ گیا اور وضو کر کے باہر آ گیا۔ ماں جی ہمیشہ اپنے کمرے سے باہر نماز پڑھتی تھیں۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اپنے کمرے میں ان کو سُستی آ جاتی تھی اور نماز کے بعد وہ وظائف اتنی دل جمعی سے نہیں کر پاتی تھیں۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی نماز پڑھ رہی تھی۔ سلام پھیر کر انہوں نے پیار سے مجھے دیکھا۔

''پتر اٹھ گیا ہے؟''

''جی ماں جی۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں نماز پڑھوں گا۔''

ماں جی نے جائے نماز میرے سپرد کر دی اور میں نماز پڑھنے لگا۔ ماں جی وظائف کرنے میں لگ گئیں۔ میں نماز سے فارغ ہوا تو انہوں نے مجھ پر پھونکیں ماریں۔ ''اللہ ہمیشہ کامیاب کرے، اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''ماں جی مجھے یقین ہے یہ آپ کی دعائیں ہیں جو ہر مشکل وقت میں میرے کام آتی ہیں۔''

''ماں ہوتی کس لیے ہے پتر۔'' وہ بولیں۔ ''اب مجھے صغراں اور شمی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں وہ وہاں بالکل محفوظ ہیں میں خود دیکھ کر آیا ہوں رفیق بھائی نے حفاظت کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔''

''پر شہباز ایسا کب تک چلے گا۔ آخر یہ دشمنی کب ختم ہوگی۔''

''میں نہیں جانتا ماں جی۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''میں نے اسے شروع نہیں کیا اس لیے اسے ختم کرنے کا اختیار بھی نہیں رکھتا ہوں۔''

''یہ موا مرشد کیا چاہتا ہے؟''

''ماں جی وہ میرا سر اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''وہ خود کو خدا سمجھتا ہے۔''

''نعوذ باللہ۔'' ماں جی بولیں۔ ''ایسا کمینہ آدمی ہے۔''

''آپ کی سوچ سے بھی زیادہ...... اب وہ میرے خاندان کے پیچھے ہے۔ پہلے جان کے درپے تھا اور اب عزت کے پیچھے بھی پڑ گیا ہے۔''

''ایسے کمینوں سے آدمی کو دور رہنا چاہیے۔''

''ہاں ماں جی لیکن آدمی کیا کرے جب کمینے خود ہی پیچھے پڑ جائیں اور اپنی طاقت کے زعم میں فرعون بن جائیں۔''

ماں جی کچھ دیر سوچتی رہیں پھر انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پتر ایسے لوگوں کا پوری استقامت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی جہاد ہے۔''

''میں یہی کر رہا تھا ماں جی اور جب میرے دشمن نے دیکھا کہ وہ مجھ پر قابو نہیں پا سکتا ہے تو اس نے حویلی پر وار کیا اور پھر بابا کو مجبور کر دیا کہ وہ مجھے یہاں نظر بند کر دیں۔''

ماں جی نے حیرت سے کہا۔ ''تجھ سے کس نے کہا کہ تو حویلی میں قید ہے؟''

''خود بابا نے...... مرشد نے ان کو دھمکی دی ہے کہ اگر میں حویلی سے باہر نکلا تو اس خاندان کے دوسرے افراد کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔''

''نعوذ باللہ یہ تو سچ مچ خدا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔'' ماں جی کو غصہ آ گیا تھا۔ ''اور یہ ملک صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ بیٹوں کو فوج میں اس لیے بھیجنا چاہتے ہیں کہ وہ کمینوں کے سامنے سر جھکا دیں۔ اس سے تو بہتر تھا وہ تم لوگوں کو چوڑیاں پہنا کر گھر بٹھا دیتے۔''

ماں جی کا ردِعمل میرے لیے حیران کن تھا۔ جو بات بابا کو کرنی چاہیے تھی وہ ماں جی کر رہی تھیں۔ جب کہ مجھے ان سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ ماں تھیں اور اولاد کی تکلیف کے خیال سے ماں تڑپ اٹھتی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں آج ہی ملک صاحب سے بات کرتی ہوں۔''

''ماں جی میں نے بابا کو یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دشمن کے مقابلے میں گھر بیٹھ جانے سے دشمنی ختم

نہیں ہو جاتی ہے۔ اگر دشمنی مال و دولت کی وجہ سے ہو تو انسان اس سے دستبردار ہو سکتا ہے لیکن دشمن آپ کی جان یا عزت مانگ رہا ہو تو اس کے سامنے ہتھیار کیسے ڈالے جا سکتے ہیں اور مرشد نے اپنے معاہدے کا پاس نہیں کیا۔ پہلے اس کے آدمی حویلی میں گھستے ہوئے پکڑے گئے۔ وہ شمی اور سویرا کو اٹھانے آئے تھے پھر انہوں نے آپا اور شمی کو لے جانے والی گاڑی پر حملہ کیا لیکن بابا اب بھی مجھے حویلی سے نکلنے اور کچھ کرنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

میری بات نے ماں جی کا غصہ مزید بڑھا دیا تھا وہ بولیں۔ "میں ابھی ملک صاحب سے بات کرتی ہوں۔"

ماں جی بابا کے کمرے کی طرف گئی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ بابا اس وقت نماز پڑھ کر چہل قدمی کر رہے ہوں گے۔ گرمیوں میں وہ باہر صحن میں یہ کام کرتے تھے لیکن جب موسم سرد ہو جاتا تو وہ اپنے کمرے میں چہل قدمی کر لیا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد سویرا وہاں آ گئی۔

"آپ کو بابا نے طلب کیا ہے۔" وہ کچھ پریشان لہجے میں بولی۔ "کیا آپ کی بابا سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"بابا سے ماں جی کی بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا اور اسے مختصراً ماں جی سے ہونے والی بات بتائی۔ وہ مزید پریشان ہو گئی۔

"اب کیا ہو گا اگر بابا اور ماں جی میں لڑائی ہو گئی۔"

"نہیں ہو گی۔" میں مسکرایا۔ "کیونکہ ماں جی جس موڈ میں گئی ہیں بابا ہتھیار ڈال دیں گے۔"

سویرا کی پریشانی کسی قدر کم ہوئی تھی۔ "ہاں وہ ماں جی سے محبت بہت زیادہ کرتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی لڑائی نہیں ہو گی۔"

بابا کے کمرے میں بابا اپنے بستر پر سر جھکائے بیٹھے تھے اور ماں جی ان کے سامنے کھڑی تھیں۔ میں کمرے میں آیا تو بابا نے میری طرف دیکھا۔ "اوئے شہباز اپنی ماں سے کیا کہہ دیا ہے یہ اتنا غصہ کر رہی ہے۔" الفاظ کے برعکس بابا کا لہجہ غصے والا نہیں تھا میں نے سکون کا سانس لیا۔

"بابا جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور آپ نہیں مان رہے وہی میں نے ماں جی سے کہی ہے۔"

"آپ خود انصاف سے کام لیں ملک صاحب۔" ماں جی بولیں۔ "آپ نے میرے بچوں کو بچپن میں مجھ سے دور فوج میں کیوں بھیجا تھا۔ اس لیے نا کہ یہ ملک کی حفاظت کریں اور اس پر کوئی خدانخواستہ برا وقت آئے تو اپنی جانیں قربان کر دیں تو آج اس گھر پر برا وقت آیا ہے تو آپ ان بیٹوں کو بزدلی کا سبق دے رہے ہیں۔ بیٹے ہوتے کس لیے ہیں۔ گھر پر قربان ہونے کے لیے نا؟"

"او بھلئی لوکے یہ دوسرا معاملہ ہے۔" بابا دبے لہجے میں بولے۔

"کیسے دوسرا معاملہ ہے۔" ماں جی بپھر کر بولیں۔ "کیا فائدہ ہوا آپ کو اسے گھر میں بند کرنے کا دشمن نے دو بار وار بھی کر دیا۔ وہ تو اللہ کا کرم رہا کہ اس نے دونوں بار منہ کی کھائی لیکن اگر وہ ایک بار بھی کامیاب ہو جاتا تو ہم تو جیتے جی مر جاتے۔"

بابا زچ ہو رہے تھے۔ ''تو تم کیا چاہتی ہو اسے لڑنے مرنے اور دشمنی بڑھانے کے لیے آزاد چھوڑ دوں۔''

''بابا میں نے کبھی دشمنی بڑھانے والا کوئی کام نہیں کیا بلکہ مرشد اور اس کے ساتھیوں کو بہت رعایت دیتا رہا ہوں بہت بار میرے اختیار میں تھا کہ ان کو مار دوں لیکن میں نے ان کو چھوڑ دیا۔''

''یہ میرا پتر ہے ملک صاحب۔'' ماں جی نے فخر سے کہا۔ ''کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور نہ کبھی کسی کے ساتھ غلط کرتا ہے۔ اس کا دشمن ایک کمینہ اور کم ظرف آدمی ہے اُس سے مقابلے میں اِس کا ساتھ دیں اِس کے ہاتھ پاؤں نہ باندھ کر بٹھائیں۔''

''بابا آپ مجھ پر اعتماد تو کریں۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔ ''میں نے مرشد کے آگے سر نہیں جھکانا ہے لیکن اس حویلی میں قید کر کے آپ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ وہ میرے خوف سے آزاد ہو گیا ہے۔''

بابا سوچنے لگے ان کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ وہ شاہد بھائی کو گنوا چکے تھے۔ ماں جی ان کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس چلی گئیں۔ ''ملک صاحب میں ماں ہوں اور آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ اولاد کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں۔ خدا نہ کرے ان کو کچھ ہو لیکن ایسی ذلت سے جینے سے بہتر عزت سے مر جانا ہے۔''

بابا نے گہری سانس لی۔ ''جیسی تیری مرضی شہباز کی ماں۔''

''نہیں جی......'' چند لمحے پہلے شیرنی کی طرح بپھری ماں جی فوراً نرم پڑ گئیں۔ ''فیصلہ تو آپ نے کرنا ہوتا ہے لیکن میرا آپ پر اتنا حق تو ہے کہ میں آپ کے کسی فیصلے کو غلط محسوس کروں تو احتجاج کر سکوں۔''

اس بار بابا مسکرائے تھے۔ ''کیوں نہیں تجھے تو اس سے زیادہ حق ہے اور اولاد پر تو ماں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے شہباز کو میری طرف سے اجازت ہے۔''

''شکریہ بابا۔'' میں کھل اٹھا تھا۔ ''اللہ نے چاہا تو آپ کو کبھی میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

''اگر ہوئی بھی تو ماں باپ کس لیے ہوتے ہیں۔'' بابا نے کہا۔ ''تمہیں میری جس مدد کی ضرورت ہو تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔''

بابا میں ایک عادت تھی کہ وہ اگر کسی فیصلے کو تبدیل کرتے تھے تو اس تبدیلی کو پوری طرح نبھاتے تھے۔ میں نے کہا۔ ''نہیں بابا مجھے بس آپ کی تائید اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

''لیکن تمہیں رقم کی ضرورت تو ہو گی۔'' ماں جی بولیں۔ ''تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''نہیں ماں جی اللہ کے فضل سے میرا بزنس بہت اچھا چل رہا تھا۔ بزنس تو ختم ہو گیا ہے لیکن اب بھی بینک میں میرے لاکھوں روپے پڑے ہیں۔ پھر بیرون ملک میری بڑی رقم ہے۔''

بابا چونکے۔ ''بیرون ملک کہاں ...... میرے علم کے مطابق تمہارا سارا کاروبار ملک میں ہے۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا بابا؟'' میں نے کہا تو وہ گڑبڑا سے گئے تھے۔

''بس پتا ہے۔''

مجھے لگا جیسے بابا چھپا رہے ہوں وہ میرے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ میں نے کہا۔

''بابا انڈیا میں مجھے ایک جگہ سے بڑی تعداد میں قیمتی ہیرے ملے تھے۔ وہیں ایک شخص نے مجھ سے یہ خرید لیے اور مجھے ایک بین الاقوامی بینک اکاؤنٹ کھلوا کر رقم اس میں ڈال دی۔ ایک کروڑ ڈالرز میں اس نے یہ ہیرے لیے تھے۔''

''ایک کروڑ ڈالرز کے ہیرے۔'' بابا فکرمند ہو گئے اور ماں جی نے غور سے مجھے دیکھا۔

''پتر یہ ہیرے کہاں سے آئے؟''

''ماں جی میں نے کسی کا حق نہیں مارا۔ وہاں بھی کچھ مرشد جیسے لوگ ہیں یہ ہیرے ان کے تھے اور پھر وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے تو ہیرے مجھے مل گئے۔'' میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''تب ٹھیک ہے۔'' ماں جی مطمئن ہو گئی تھیں۔ میں نے فخر محسوس کیا تھا۔ یہ میرے ماں باپ تھے ان کی تربیت نے مجھے اچھے برے کی تمیز سکھائی تھی اور آج جب کہ میں ایک ہنگامی دور سے گزر رہا تھا تب بھی ان کو سب سے زیادہ فکر یہی تھی کہ میں کوئی غلط کام نہ کروں۔ ماں جی نے مجھ سے کہا۔

''پتر وہ پیسے تو بینک میں ہیں اور تو پولیس کی وجہ سے بینک نہیں جا سکتا ہے پھر رقم کیسے لیتا ہے؟''

''میں نے ندیم کو کچھ سادہ چیک دے رکھے ہیں مجھے جتنی ضرورت ہوتی ہے اس سے لے لیتا ہوں اور وہ چیک سے نکلوا لیتا ہے۔ ویسے ماں جی اللہ کا بڑا احسان ہے۔ اس جنگ میں، مَیں اکیلا نہیں ہوں میرے بہت سارے ہمدرد اور مددگار ہیں۔ سب سے بڑھ کر میں راستی پر ہوں اس لیے مجھے یقین ہے اللہ میرے ساتھ ہے۔''

بابا اور ماں جی مجھے درمیان میں لے کر بیٹھ گئے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک میں نے ماں باپ کے ساتھ اتنا اچھا وقت نہیں گزارا جتنا کہ اس وقت گزارا تھا۔ ماں جی تو خیر میرے لیے سراپا محبت تھیں لیکن بابا کی محبت کا اس دن صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔ شاید اولاد ماں باپ کی محبت کے بارے میں کبھی صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتی ہے جوان کے دل میں اولاد کے لیے ہوتی ہے۔ میں بھی شاید کبھی اس محبت کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ پھر ماں جی نے اچانک کہا۔ ''ملک صاحب آپ نے شہباز کو بتایا کہ ہم نے اس کے اور سویرا کے بارے میں کیا سوچا ہے۔''

میرا دل دھڑکا تھا اور گلا یک دم خشک ہو گیا تھا میں نے بے ساختہ بابا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''نہیں میں نے ابھی نہیں بتایا ہے۔ ذرا سکون مل جائے تو بتاتا ہوں۔''

''ملک صاحب بے سکونی میں تو ایسی خبر زیادہ سکون دیتی ہے۔'' ماں جی نے اصرار کیا۔ ''آپ بتا دیں۔''

''چل یہ بات بھی تیری۔'' بابا ہنس کر بولے۔ ''شہباز ہم نے سوچا ہے کہ جب سویرا کی عدت ہو جائے گی تو تیرا اور اس کا رشتہ کر دیں گے لیکن اس کے لیے پہلے تم دونوں کی رضامندی ضروری ہے۔''

''شہباز اور سویرا کبھی انکار نہیں کریں گے۔'' ماں جی نے یقین سے کہا۔ ''بے شک آپ پوچھ کر دیکھ لیں؟''

''بابا میں آپ سے اور ماں جی سے چھپاؤں گا نہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں سویرا کو شروع سے پسند کرتا تھا لیکن جب وہ میرے بھائی کی بیوی بن گئی تو میرے لیے قابلِ احترام ہستی بن گئی اور خدا گواہ ہے پھر میں نے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں لیکن اب وہ میرے بھائی کی بیوہ ہے اور میں نے اس سے بات کی ہے

وہ بھی اس حویلی سے نہیں جانا چاہتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بابا بولے۔"اسی وجہ سے میں نے یہ فیصلہ کرنے کا سوچا ہے۔ایک بار مجھ سے غلطی ہوگئی تھی اور اب میں اسے دوہرانا نہیں چاہتا۔"

"لیکن بابا ابھی اس کام میں وقت ہے خدا کرے یہ معاملہ نمٹ جائے تو میں......"

"نہیں میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ یہ معاملہ نمٹے یا نہیں، سویرا کی عدت ختم ہوتے ہی میں تم دونوں کا نکاح کروادوں گا اور ہوسکے تو تمہیں کہیں باہر بھی بھیج دوں گا۔" بابا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"بابا میں آپ سب کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔"بس آپ مجھ سے یہی بات مت کیجیے گا۔"

"پتر ضد نہ کر۔" ماں جی نے کہا۔"اگر سانپ سے مقابلہ ہوتو اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہیے۔"

"ماں جی مجھے بھی بارہا یہ خیال آیا لیکن مجھے لگا ایک تو میں اس کے سامنے سے ہٹ کر اپنی شکست تسلیم کر لوں گا۔دوسرے میں کہیں باہر چلا جاؤں اور وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے تب بھی میرے پیارے تو یہاں ہیں وہ ان کے خلاف کچھ بھی کرسکتا ہے۔شاہد بھائی والے واقعے سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا۔"

"خیر یہ ایک تجویز ہے۔" بابا نے کہا۔"تم اس پر بعد میں غور کرسکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے میں غور کروں گا اور اپنے دوستوں سے بھی مشورہ لوں گا۔" میں نے سر ہلایا۔

جیپ میں نے ایک اعتماد کے آدمی کو بننے کے لیے دے دی ہے اگر تم جانا چاہو تو میں کوئی گاڑی منگوادیتا ہوں۔"

"بہتر ہو کہ کسی جاننے والے سے گاڑی لینے کے بجائے کوئی ٹیکسی یا پرائیویٹ کار منگوالیں وہ ڈرائیور سمیت چوبیس گھنٹے میرے پاس رہ سکتی ہے اور جب ضرورت نہیں ہوگی تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"میں یہی کرتا ہوں یہاں ایک دو لوگ ہیں جو رینٹ پر کار دینے کا کام کرتے ہیں۔"

"کار کے بجائے کوئی جیپ منگوالیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی بات کرلیتا ہوں۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور سویرا نے اندر جھانکا۔"ناشتہ تیار ہے آپ لوگ آجائیں۔"

"بیٹا جی ناشتہ ہوتا رہے گا لیکن تم ادھر آؤ تم سے ایک بات کرنی ہے۔" بابا نے کہا۔ میں جلدی سے کھڑا ہوگیا۔

"میں نہانے جارہا ہوں۔"

جب میں کمرے سے نکل رہا تھا تو سویرا بابا کی پاس جا بیٹھی تھی۔"جی بابا حکم کریں۔"

اس سے آگے میں سن نہیں سکا تھا اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ مجھے بابا کا سوال بھی معلوم تھا اور سویرا اس کا کیا جواب دے گی میں یہ بھی جانتا تھا۔اس کی تصدیق ناشتے کے دسترخوان پر سویرا کے کھلے ہوئے چہرے سے ہوگئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھرتی سے اٹھی اور وہاں سے چلی گئی میں نے انجان بن کر پوچھا۔"اسے کیا ہوا ماں جی جو مجھے دیکھ کر یوں بھاگی ہے۔"

ماں جی مسکرائیں۔ ''پاگل تیرے بابا نے اس سے بات کر لی ہے اور اس نے ہاں کہہ دی ہے تو وہ تیرے سامنے کس طرح رہ سکتی ہے۔''

میں نے اس بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ایک بار اس کی اور میری بات طے ہوگئی تو وہ میرے لیے شجر ممنوعہ بن جائے گی۔ اس سے بات کرنا تو ایک طرف رہا وہ اس جگہ بھی نہیں بیٹھ سکے گی جہاں میں ہوں گا۔

ماں جی مسکرا رہی تھیں۔ شاہد بھائی کے صدمے کے بعد ان کے لیے شاید یہ پہلی خوشی کی بات تھی۔ میں نے سر کھجایا۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''شہباز جب سویرا اور شاہد کی بات طے ہوئی تو اس وقت مجھے علم نہیں تھا۔ صغراں جانتی تھی لیکن وہ باپ کے ڈر سے چپ رہی۔''

''بابا بھی جانتے تھے۔''

''ہاں انہوں نے بعد میں مجھے بتایا تھا لیکن اس وقت وہ تمہاری پسند کو عام سی بات سمجھے تھے۔ نوجوان اس عمر میں ایسی پسند رکھتے ہیں۔''

''لیکن میں نے کبھی سویرا کے لیے ایسی پسند نہیں رکھی۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس کا اندازہ مجھے اور تیرے بابا کو بعد میں ہوا تھا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔''

''شاید اس معاملے میں میرا مقدر ہی خراب تھا۔'' میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''نہیں پتر وہ تیرے نصیب میں ہے لیکن ذرا دوسرے انداز میں۔'' ماں جی نے سمجھایا۔ ''اب اس بات کو دل سے نکال دے اور آنے والے وقت کا سوچ۔''

مجھے ایک خیال آیا۔ ''بابا شادی کیوں کرنا چاہ رہے ہیں جب کہ وہ جانتے ہیں میرے حالات کیا ہیں۔''

''شاید اس لیے کہ شادی کے بعد تُو باہر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ تیرے بابا نے ندیم سے بھی بات کی اس کا بھی یہیں کہنا ہے کہ یہاں تیرے مسائل سمیٹنے کے لیے سالوں چاہئیں۔''

''لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا ماں جی۔ یہ ملک میرا بھی تو ہے ایک ذلیل شخص کی وجہ سے میں کیوں اسے چھوڑ کر جاؤں۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''آخر جنگل میں تو جانور رہتے ہیں۔ کوئی اس وجہ سے نہیں جاتا کہ اسے درندوں کا خوف ہوتا ہے۔''

''پتر جنگل کا بھی قانون ہے جو اللہ نے بنایا ہے۔ اس وجہ سے کوئی جانور جنگل چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اللہ نے انسانوں کے لیے بھی قانون بنایا ہے لیکن انسانوں نے اسے چھوڑ کر اپنے قانون بنا لیے ہیں۔ یہ جنگل کے قانون سے بدتر ہیں۔ وہاں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی ہے اور ہمارے ہاں انصاف نہیں رہا ہے۔''

گھر میں رہنے والی ماں جی بھی یہ بات محسوس کرتی تھیں کہ اس ملک میں انصاف نہیں رہا ہے اور اسی وجہ سے جسے موقع ملتا ہے وہ ملک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جو ایک بار چلا جاتا ہے وہ چاہنے کے باوجود واپس نہیں آ سکتا ہے۔ جو رہنے کے ارادے سے واپس آتا ہے وہ چند دن میں گھبرا کر واپس جانے کی سوچتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ سہولیات کی عدم دستیابی نہیں بلکہ انصاف کی عدم فراہمی ہے۔ یہاں اگر ایک طاقتور شخص کسی کمزور انسان کے

پیچھے پڑ جائے تو اس کے لیے کہیں جائے اماں نہیں رہتی ہے۔ اس جنگ میں نقصان ہمیشہ کمزور کو اٹھانا پڑتا ہے اور اسے انصاف نہیں ملتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ میرا اور مرشد علی کا بھی تھا۔ اس کے بھائی نادر کی وجہ سے ایک بے مقصد لڑائی کا آغاز ہوا جس کے پیچھے ہٹ دھرمی اور اُنا کے کچھ نہیں تھا۔ نادر کو اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا جب کہ مجھے اپنے کاروبار اور پھر اپنے بھائی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس جنگ میں نہ جانے کتنے متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگ مارے جا چکے تھے جن کی گنتی بھی مجھے یاد نہیں تھی۔

مرشد ایک طاقتور گدی نشین تھا جو سیاست میں بھی اتر آیا تھا۔ اسے پولیس اور انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی اور اس نے ان کو پوری طرح میرے خلاف استعمال کیا تھا۔ میرے ساتھ میرا خدا تھا اور اس کے کچھ بندوں کا سہارا تھا جو میں مرشد کے خلاف ڈٹا ہوا تھا۔ حالات نے مجھے سخت جان بنا دیا ہے لیکن دیکھا جائے تو اب بھی میرا اور مرشد کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اس کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ اس سے مصالحت کا مطلب تھا کہ میں خود کو بے دست و پا کر کے اس کے آگے پیش کر دوں اور وہ جو چاہے سلوک کرے۔ معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اگر میں اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ مجھے بدترین انداز میں موت کے سپرد کرتا۔ وہ نہایت عیار اور سفاک شخص ہے جو بس موقع کا منتظر ہے۔ قارئین نے ڈسکوری یا نیشنل جیوگرافک ٹی وی چینلو پر جانوروں کی فلموں میں ایک گیدڑ کے سائز کا دھبے دار جانور دیکھا ہو جسے انگریزی میں ہائنا اور اردو میں لکڑ بھگا کہتے ہیں۔ یہ نہایت ڈھیٹ، سفاک اور چالاک جانور ہے۔ یہ ہمہ وقت اس تاک میں رہتا ہے کہ اسے کہیں سے آسان کھانا مل جائے۔ اس کے لیے یہ شیروں اور چیتے کے قبیل کے درندوں سے ان کا شکار چھیننے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ کوئی کمزور جانور اس کے ہاتھ لگ جائے تو یہ اسے چیڑ پھاڑ کر کھا جاتا ہے۔ اگر کوئی بڑا جانور اس کے نرغے میں آ جائے تو یہ اسے بھی مارنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ اگر کوئی جانور کہیں دلدل میں پھنس جائے تو یہ اس کے مرنے کا انتظار کیے بغیر اسے کھانا شروع کر دیتا ہے لیکن خود کسی طاقتور جانور کے ہاتھ آ جائے تو ایسی چیخ و پکار مچاتا ہے جیسے دنیا میں اس سے زیادہ مظلوم اور کوئی نہیں ہے۔ جانوروں میں یہ سب سے گھٹیا فطرت رکھتا ہے۔ جب بھی میں مرشد کے بارے میں سوچتا تو میرے ذہن میں لکڑ بھگا آ جاتا ہے۔ وہ بالکل اس جانور کی سی فطرت رکھتا تھا۔

ماں جی کی طرف سے حوصلہ افزائی اور بابا کی اجازت نے میرا دل بڑا کر دیا تھا اور اب میں مرشد سے بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا۔ ماں جی نے ماں ہونے کے باوجود حیرت انگیز حوصلے کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے مرشد کے سامنے ڈٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ جب کہ وہ شاہد بھائی کی جدائی کا صدمہ ابھی سہہ رہی تھیں۔ یہ ماں جی کی عظمت تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کا کہہ رہی تھیں جب کہ مائیں ایسی صورت میں معافی تلافی کرنے کی بات کرتی ہیں۔ جن لوگوں کی ایسی مائیں ہوتی ہیں وہی تاریخ میں اپنا کوئی مقام بناتے ہیں۔

دوپہر کو ایک درمیانے سائز کی پرانی ہڈ والی جیپ حویلی میں آ گئی تھی۔ بابا نے اسے میانوالی سے بلوایا تھا کیونکہ یہاں سے کسی کو بلاتے تو وہ لازمی مجھ سے واقف ہوتا۔ اس کا ڈرائیور اور مالک ایک دبلا اور کسی قدر طویل قد کا لمبے بالوں والا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر خشخشی سی داڑھی تھی اور اس کا نام ایاز حمید تھا۔ میں اس سے ملا اور اسے بتایا کہ اسے مستقل بنیادوں پر رہنا ہوگا۔ اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''مسئلہ نہیں ہے جی۔ دن کے ہزار

ہوں گے اور کہیں آنا جانا ہوتو تیل آپ ڈلواؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہیں رکو گے۔ رات کو گارڈز کے کمرے میں سو جانا اور کھانا تم کو حویلی سے ملا کرے گا۔"

گارڈز کے لیے بابا نے یہ کیا تھا کہ قریب زمین پر کام کرنے والے ایک مزدور کو ٹھیکہ دے دیا تھا اور وہ تین ٹائم ان کے لیے گھر سے پکوا کر لے آتا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ملازمہ اور دوسرے افراد کو میری وجہ سے حویلی میں آنے سے روک دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب مجھے ضرورت ہوگی تب ہی حویلی سے نکلوں گا۔ ابھی میں مرشد کو ایک سبق دے چکا تھا اور محاذ پر فی الحال امن لگ رہا تھا لیکن شام کے وقت بابا نے عجلت میں مجھے بلایا۔

"شہباز جانے کی تیاری کرلو۔ تم نے آدھے گھنٹے کے اندر یہاں سے نکل جانا ہے۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ "خیریت بابا......؟"

"ابھی اطلاع آئی ہے کہ پولیس حویلی آ رہی ہے۔" بابا نے کہا۔ "شاید تمہیں گرفتار کرنے اور شاٹ گن کی تفتیش کرنے آ رہے ہیں۔"

میں نے بابا سے نہیں پوچھا کہ ان کو کس طرح پتا چلا کہ پولیس آ رہی ہے۔ میں اندر کی طرف لپکا اور پہلے ماں جی کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں۔ وہ حوصلے سے بولیں۔ "جاؤ پتر اللہ اپنی امان میں رکھے۔"

میں کمرے میں آیا۔ اپنا سامان اور چند ضروری چیزیں بیگ میں رکھیں اور اس دوران میں گارڈ کو پیغام بھیج دیا کہ وہ ایاز کو تیاری کا کہہ دیں۔ ابھی میں سامان رکھ رہا تھا کہ سویرا کمرے میں آئی۔ "آپ جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے تھے۔ "اتنی جلدی...... پھر نہ جانے کب آئیں گے۔"

"جب تقدیر لائے گی۔" میں نے کہا۔ "سویرا بابا نے تم سے بات کر لی ہے اور مجھے معلوم ہے تم نے ہاں کی ہے لیکن تم جانتی ہونا میں کس راستے پر چل رہا ہوں کسی وقت بھی کاتب تقدیر میری زندگی کا آخری سانس لکھ سکتا ہے اور تم......"

اس نے تڑپ کر اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ "منہ سے اچھی بات نکالیں۔ اور کچھ بھی ہو جائے یہ زندگی اب آپ کے نام پر ہے۔"

میں نے دل پر جبر کر کے اس کا ہاتھ چومنے سے گریز کیا اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ "تب مجھے رو کر نہیں مسکرا کر جانے کی اجازت دو۔"

وہ یوں مسکرائی کہ آنسو مسلسل گر رہے تھے۔ ایسا لگا جیسے بارش بھی ہو رہی ہو اور دھوپ نکل آئے۔ "آپ آئیں گے۔" اس نے یقین سے کہا۔ "میں آپ کے لیے دعا کروں گی۔"

"مجھے سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہے۔" میں نے یقین سے کہا۔ اسی لمحے کمرے کے باہر سے بابا کی آواز آئی۔

''شہباز۔''

اور میں بیگ اٹھا کر باہر کی طرف لپکا۔ شاید بابا جان گئے تھے کہ سویرا میرے کمرے میں ہے اس لیے انہوں نے انجان بن کر ہمیں شرمندہ ہونے سے بچالیا تھا۔''جی بابا؟''

''وقت نہیں ہے پولیس کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والی ہے۔''وہ بولے۔''میرے ساتھ آؤ۔''

ہم باہر صحن میں آئے۔ بابا نے ایک پستول اور اس کے چند میگزین میرے حوالے کیے۔''یہ غیر قانونی ہے اور یہ.....''انہوں نے ایک پاؤچ مجھے تھمادیا۔''اس میں کچھ رقم ہے۔''

میں نے کہا۔''اس کی ضرورت نہیں ہے بابا۔''

''رکھ لو۔''وہ حکیمانہ انداز میں بولے۔

ایاز نے جیپ اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ میں نے دونوں چیزیں جیب میں رکھیں۔ بابا کے گلے لگا اور بیگ جیپ کے پیچھے رکھ کر خود ایاز کی برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی جیپ چلا دی تھی اور وہ تیز رفتاری سے گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔ عقبی آئینے میں بابا کھڑے دکھائی دیئے لیکن جیسے ہی جیپ نے کچے پر ٹرن لیا حویلی کا منظر غائب ہو گیا۔ میں نے سرد آہ بھری۔ کتنے سالوں بعد میں اس گوشہ عافیت میں آیا تھا اور اب جا رہا تھا تو مجھے لگا جیسے میں یہاں بس کچھ دیر ہی رکا ہوں۔ ایاز نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''صاحب کہاں جانا ہے۔''

میں نے ابھی سوچا نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے ایاز نے کہا تو مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔''جانا ہمیں مین روڈ کی طرف ہے لیکن کوئی اور راستہ نہیں ہے اس طرف جانے کا؟''

''ہے جناب۔''اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور جیپ کو ذرا آگے ایک اور کچے راستے پر گھما دیا۔ مجھے یاد آیا کہ یہ راستہ ایک اور گاؤں سے گزر کر مین روڈ تک جاتا تھا۔ اگرچہ کچھ طویل تھا لیکن یہ اس راستے سے خاصا الگ تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس پر مجھے پولیس یا دشمن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس کی اطلاع دشمن نے مجھے حویلی سے نکالنے کے لیے خود پہنچائی ہو۔ اس لیے متبادل راستہ اختیار کرنا ہی بہتر تھا۔

''تم کہاں رہتے ہو؟''میں نے ایاز سے پوچھا۔ مقصد وقت گزاری تھی۔ ابھی تاریکی میں کچھ وقت تھا اور جب تک ہم مین روڈ تک پہنچتے تاریکی چھا جاتی۔

''سرگودھا میں جناب۔''

''اگر میں تم کو اسلام آباد لے جاؤں تو تمہیں انکار تو نہیں ہوگا۔''

''بھلے پورا پاکستان گھمائیں۔''اس نے اسٹیئرنگ کاٹتے ہوئے کہا۔''اپنی تو روزی یہی ہے۔ کام ملتا کس کو برا لگتا ہے۔''

''گڈ تو اب تم میرے ساتھ ہو۔''میں نے کہا۔''یہ بتاؤ جیپ کس کنڈیشن میں ہے؟''

''ظاہری حالت آپ دیکھ رہے ہیں باقی انجن کی حالت دیکھ لیں گے ویسے میں خود مکینک ہوں۔''اس نے بتایا۔

''پڑھے لکھے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''گریجویٹ ہوں فرسٹ ڈویژن میں کیا تھا۔''

میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تو پھر یہ کام کیوں کر رہے ہو؟''

''آپ کا مطلب ہے کہیں کلرکی کیوں نہیں کر رہا؟'' اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''نہیں جناب میں یہ کام اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے نوکری نہیں ملی بلکہ اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے یہ کام پسند ہے۔ میں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد صرف اس لیے مکینک کورس بھی کیا ہے۔''

''شکر ہے مجھے ایک آدمی تو ایسا ملا جس نے تعلیم نوکری کے لیے حاصل نہیں کی ہے خود میری سوچ بھی یہی ہے۔''

''آپ نے تو یونیورسٹی میں بھی پڑھا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ماسٹر کیا ہے لیکن کچھ عرصے پہلے تک ایک ٹورسٹ ایجنسی چلا رہا تھا۔ شمالی علاقوں میں سیاحوں کے لیے ٹور بناتا تھا۔''

''کچھ عرصے پہلے تک۔'' اس نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ''اب نہیں کرتے؟''

''نہیں۔''

''اگر برا نہ مانیں تو پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کام کیوں چھوڑ دیا۔''

''چھوڑا نہیں دشمنوں نے چھڑوا دیا۔ اب ان سے جنگ چل رہی ہے۔ جب جنگ چل رہی ہو تو کاروبار کہاں چلتا ہے۔''

''اوہ۔'' اس نے افسوس کیا اور گیئر بدل کر بولا۔ ''یہ دشمنی بڑی نامراد چیز ہے بندے کا سب کھا جاتی ہے۔''

''وہ اور دشمنی ہوتی ہے۔ زر، زن اور زمین والی...... لیکن یہ ایک الگ دشمنی ہے۔ یہ زبردست اور ایک عام آدمی کے درمیان دشمنی ہے۔''

اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ ''اس میں عام آدمی کون ہے؟''

''جو اس وقت تمہارے ساتھ بیٹھا ہے۔''

''زبردست کون ہے؟''

''ہے ایک فرعون صفت شخص۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں بتا دوں کہ میرے ساتھ ہونے کی صورت میں تمہاری زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ابھی کل ہی میں ایک حملے میں مرتے مرتے بچا ہوں۔''

''موت سے آدمی کی کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں آپ پہلے آدمی نہیں ہیں جس نے میری خدمات حاصل کی ہیں اور اس کی کسی سے دشمنی بھی ہو۔''

''پھر بھی تم سوچ لینا اور منزل مقصود پر پہنچا کر تم چاہو تو اپنا راستہ پکڑ لینا۔''

''کام پکڑنے کے بعد میں نے کبھی سوچا نہیں ہے ہاں آپ کا جب دل چاہے مجھے فارغ کر دینا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

ہم آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے بعد مین روڈ پر پہنچے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اندر کی لائٹ بند

کردو...... یہاں کچھ گدھ میری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔''
اس نے لائٹ بند کردی۔ ''اگر ان کو آپ کی اتنی ہی تلاش ہے تو وہ گاڑی روک بھی سکتے ہیں۔''
''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا ورنہ میرے ساتھ تم مفت میں مارے جاؤ گے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''کسی قسم کے ناکے کی صورت میں تم فرار کی کوشش کرو گے۔''
''ٹھیک ہے جی۔'' اس نے مین روڈ پر پہنچ کر جیپ روک لی۔ ''اب بتائیں کس طرف جانا ہے؟''
اسلام آباد کی طرف۔'' میں نے کہا اور اس نے جیپ اس طرف موڑ دی۔
''ڈھائی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آج کل سڑک بن رہی ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔'' میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بجنے والے تھے یعنی ہم ساڑھے آٹھ بجے تک اسلام آباد پہنچ سکتے تھے۔ ''ویسے تم اسلام آباد سے واقف ہو۔''
''مکمل طور پر جناب آپ صرف پتا بتا دیں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔'' اس نے یقین سے کہا
''تب تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''مجھے ایک ایسے بندے کی اشد ضرورت ہے۔''
''آپ چاہیں تو سو جائیں میں اسلام آباد پہنچ کر آپ کو جگا دوں گا۔'' اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟''
''نہیں تم آرام سے چل سکتے ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا آرام کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ راستے میں کھانے کے لیے کہیں رکنا ہوگا۔ کوئی اچھی جگہ ذہن میں ہے؟''
''ہاں ادھر سڑک پر کئی اچھے ریستوران مل جاتے ہیں۔''
''بس تو ساڑھے سات بجے کے بعد کہیں روک لینا۔'' میں نے کہا اور جیپ کے باہر دیکھنے لگا۔ ایاز زیادہ بولنے والا آدمی نہیں تھا۔ مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسے لوگ کھلتے بھی ہیں خاص طور سے جب آپ بات کرنا چاہ رہے ہوں اور وہ نپے تلے جواب دے رہے ہوں۔ میں حویلی سے نکل کر خوش نہیں تھا مجھے کچھ فرسٹریشن تھی۔ میری نظر میں رہ رہ کر سویرا کا روتا ہوا چہرہ آ رہا تھا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے بات کرے اور ایاز زیادہ بات کرنے والا آدمی نہیں تھا۔
میانوالی سے گزرتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ ابھی موبائل پر سگنل تھے اور میں بات کر سکتا تھا۔ میں نے بابا کا نمبر ملایا۔
''شہباز کہاں ہو تم؟'' بابا نے بے قراری سے پوچھا۔
''بابا میں ایک دوسرے راستے سے مین روڈ پر پہنچ چکا ہوں اور اب اسلام آباد جا رہا ہوں۔''
''شکر ہے۔'' وہ بولے۔ ''پولیس والے ابھی گئے ہیں۔ انہوں نے رائفل اور جیپ کا پوچھا تو میں نے ایف آئی آر کی فوٹو کاپی دکھا دی۔ وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔''
''آپ نے پوچھا نہیں کہ ان کو اطلاع کیسے ملی؟''
''نہیں بے کار کی بات ہوتی۔ یہ نچلی سطح کے لوگ ہوتے ہیں جن کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔''

''یہ یقیناً مرشد یا اس کے مقامی ساتھی ملک عارف کا کام ہے۔''

''ملک عارف۔'' بابا نے تلخی سے کہا۔ ''یہ شخص ویسے ہی ہم سے خار کھاتا ہے کیونکہ پچھلے الیکشن میں ساری برادری نے اس کے مخالف کو ووٹ دیئے تھے۔''

''آپ فکر مت کریں بابا موقع ملا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔''

الوداعی کلمات کہہ کر میں نے کال کاٹ دی اور عبداللہ کا نمبر ملایا۔

''شہباز صاحب کہاں ہیں آپ؟''

''میں اسلام آباد آرہا ہوں۔''

''رئیلی۔'' وہ خوش ہو گیا۔ ''پھر یہیں آیئے گا۔''

''ہاں پتا بتاؤ۔''

''میں آپ کو ایس ایم ایس کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پوچھا۔ ''ابھی کہاں ہیں؟''

''میانوالی میں ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''کوئی نئی خبر آئی ہے؟''

''خبر بھی ہے اور ساتھ میں کچھ تصویریں بھی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ آتے ہیں تو آپ کو دکھاتا ہوں۔''

''ممکن ہے مجھے آنے میں کچھ دیر ہو جائے میں پہلے اسپتال جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر مجھے سفیر اور مونا کا خیال آیا۔ ان کی طرف سے اتنی طویل خاموشی مجھے پریشان کر رہی تھی۔ کئی دن سے ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی پیغام ملا تھا۔ میں نے پھر کوشش کی اور اس بار بھی بیل جاتی رہی تھی۔ مجھے خدشات ستانے لگے تھے۔ اگرچہ دبئی کا شمار امن و امان کے لحاظ سے دنیا کے محفوظ ترین شہروں میں ہوتا ہے اور یہاں جرائم کا تناسب بہت کم ہے لیکن انسان کے ساتھ کہیں بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مرشد کے ہاتھ ان دنوں بہت لمبے ہو رہے تھے اور وہ دبئی میں بھی کارروائی کر سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ کام ناممکن نہیں تھا اور پھر وہاں مونا بھی تھی۔ جس کے پیچھے یہ دونوں بھائی ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ آخر اتنے دن سے رابطہ نہ ہونے کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ اگر ان کا فون خراب تھا تو دبئی کے سارے فون تو خراب نہیں ہو گئے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی جو انہوں نے مجھے کال نہیں کی تھی۔ بہرحال وقت آنے پر اس کا پتا چل ہی جاتا۔

''جناب کچھ آگے ایک بہت اچھا ریستوران آنے والا ہے۔'' ایاز نے آگاہ کیا۔ میں چونک گیا۔ ابھی سات بجے تھے اور سوچوں میں خاصا وقت گزر گیا تھا۔ ''اس کے بعد اگلا اچھا ریستوران خاصی دیر بعد آئے گا۔ اس لیے میں نے سوچا آپ کو بتا دوں۔''

''ٹھیک ہے گاڑی یہاں روک لینا۔'' میں نے سر ہلایا۔

چند منٹ بعد جیپ سڑک کے کنارے ایک ریستوران کی طرف مڑ گئی۔ یہ چمکتے نیون سائن اور باہر سے اچھی ڈیکوریشن کے ساتھ مناسب قسم کا ریستوران لگ رہا تھا۔ باہر کوئی ایک درجن گاڑیاں پارک تھیں۔ ایاز نے جیپ پارکنگ میں روک دی۔ میں اترا تو وہ بیٹھا رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''تم بھی آؤ۔''

''میں ٹھیک ہوں جناب اسلام آباد پہنچ کر کھالوں گا۔''

''میں اکیلا نہیں کھاتا اگر کوئی میرے ساتھ ہو۔''

''میں ڈرائیور ہوں جناب۔'' اس نے دبی آواز میں کہا۔

''تو کیا ہوا میں بھی کوئی صاحب نہیں ہوں آجاؤ۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ جیپ سے اتر آیا تھا۔

''آپ کا بیگ لے لوں کیونکہ یہ کھلی جیپ ہے۔''

''لے لو چند جوڑے ہیں لیکن یار لوگ یہ بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔'' میں نے سر ہلایا۔ اس نے بیگ نکال لیا اور میرے پیچھے آنے لگا۔ ریستوران اندر سے بھی پالش اور چمکتا دمکتا تھا۔ ہیڈ ویٹر نے مجھ سے مہذب انداز میں پوچھا۔ ''آپ کتنے آدمی ہیں سر؟''

''دو۔'' میں نے جواب دیا تو اس نے ایک طرف میری رہنمائی کی۔

''آپ اس طرف آجائیں سر۔'' اس نے ہماری اس حصے کی طرف رہنمائی کی جہاں دو تین اور چار افراد کے لیے مخصوص میزیں تھیں۔ میں اور ایاز ایک میز پر آگئے تھے۔ ایک ویٹر نے فوراً مینو لاکر رکھ دیا اور پھر منرل واٹر کی بوتل لے آیا۔ میں نے مینو دیکھا اور دو آدمیوں کے لیے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ ریستوران میں کوئی بیس پچیس افراد بیٹھے تھے اور یہ سب ذی حیثیت اور معزز نظر آنے والے لوگ تھے۔ اس سے پتا چل رہا تھا کہ اس ریستوران کی شہرت اچھی ہے اور اچھے لوگ یہاں آنا پسند کرتے ہیں۔ ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے ایاز کی جیپ صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے کھانا سے پہلے سوپ کا آرڈر دیا تھا وہ فوری سرو ہو گیا اور ہم سوپ پینے میں لگ گئے۔ موسم کے لحاظ سے یہ اچھا لگا تھا۔

سوپ پیتے ہوئے میری نظر باہر کی طرف گئی۔ ایک بڑی سیاہ کار پارکنگ میں آئی اور تیز رفتاری کی وجہ سے رکتے رکتے وہ ایاز کی جیپ سے ٹکرا گئی تھی۔ تصادم شدید نہیں تھا لیکن دونوں گاڑیوں کو کچھ نہ کچھ نقصان ہوا تھا۔ آواز اندر تک آئی تھی۔ ایاز نے سر گھما کر دیکھا اور بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔

''لعنت ہو۔'' اس نے غرا کر کہا اور باہر کی طرف لپکا۔ میں بھی سوپ چھوڑ کر اس کے پیچھے آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکلا تھا اٹھتے ہوئے میں نے احتیاطاً اپنا بیگ اٹھا لیا تھا اور یہ احتیاط کام آئی۔ اس وقت تک سیاہ کار جو مرسیڈیز تھی اس سے ایک موٹا سا اور چھوٹے قد کا آدمی نکلا۔ اس نے شاندار قسم کے کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اوپر واسکٹ تھی۔ بس سر پر نہرو کیپ کی کمی تھی ورنہ وہ بالکل کوئی بھارتی نیتا لگ رہا تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی دھاڑنا شروع کر دیا۔

''کس......کی ہے یہ جیپ......میری گاڑی کا بیڑا غرق کر دیا۔''

اتنے میں ایاز وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے جیپ کا معائنہ کیا۔ ٹکر عقب سے لگی تھی اس لیے ایک بیک لائٹ ٹوٹی تھی اور باڈی پر ہلکا سا ڈینٹ آگیا تھا۔ اس نے موٹے آدمی کی طرف دیکھا۔ ''بیڑا غرق میری جیپ کا کیا اور شور کر رہے ہو۔''

موٹے آدمی کے ساتھ دو مسلح محافظ بھی اترے تھے۔ ایاز کی بات سن کر ان میں سے ایک کتے کی طرح

غراتا اس کی طرف لپکا۔ ''زبان چلاتا ہے ملک صاحب کے سامنے...... تیری تو......'' اس نے گھما کر اپنی رائفل کا بٹ ایاز کو مارنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ دوسروں کے ساتھ میرے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔ ایاز نے آرام سے اس کا وار خالی کیا اور اس کا ایک بازو پکڑ کر اسے یوں گھمایا کہ اس کا سارا زور اپنے بازو پر آیا اور جب ایاز نے اسے اچانک روکا تو زور کی وجہ سے اس کی کہنی کی ہڈی ایک چٹخارے دار آواز کے ساتھ ٹوٹی اور محافظ بلبلا کر اپنی ساری گل فشانی بھول گیا تھا۔ ابھی وہ اپنی کہنی کا ماتم کر رہا تھا کہ ایاز نے اس کی کمر پر ٹانگ مار کر اسے دوسرے محافظ پر پھینک دیا جو اپنی رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں الجھ کر گر پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتے ایاز نے موٹے کو گردن سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور سر کی بھرپور ٹکر اس کی ناک پر رسید کی۔ اس تصادم نے اس کی ناک کو متاثر کیا تھا کیونکہ اس نے بلبلانے کی آواز نکالی تھی۔

''یہ میری گاڑی کے ڈینٹ کا جواب ہے۔'' ایاز نے کہا اور موٹے کو گھما کر اس کی گردن جکڑ لی۔ اس دوران میں اس کے دونوں پالتو سنبھل چکے تھے اور انہوں نے رائفلیں تان لیں۔ ایاز مسکرایا۔ ''ملک صاحب اپنے کتوں کے ہاتھ مرنے کا پہلے بھی کبھی تجربہ ہوا ہے؟''

ظاہر ہے اسے ایسا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا اور اس وقت اس کی جان پر بنی تھی۔ اس کی سانس رک رہی تھی۔ ایاز نے گرفت ذرا ڈھیلی کی اور اس سے کہا۔ ''ان پلوں کو بول...... ہتھیار پھینک دیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑیاں اچھی لگیں گی۔''

ملک نے ان دونوں کے خاندان سے اپنی ناجائز رشتے داری قائم کرتے ہوئے ان کو ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا اور انہوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی تھی۔ ایاز نے ان کی خالی ہاتھ سے جو مرمت لگائی تھی وہی ان کے لیے کافی تھی۔ ملک نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا حالانکہ اس کے ارنا بھینسے جیسے جسم میں خاصی جان لگتی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایاز کے ہلکے جسم میں اتنی جان اور چستی ہوگی۔

''جیپ کا نقصان کون پورا کرے گا۔'' ایاز نے پوچھا۔

''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔'' موٹا کسمسایا۔

''اگر میں تمہاری گردن توڑ دوں تو کل کے اخبار میں یقیناً تمہارا نام آئے گا۔'' ایاز نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی توپ چیز تھا۔ یہ تو خیر اس کے حلیے اور کار سے بھی ظاہر تھا۔ ایاز ایک غریب ڈرائیور تھا اور وہ کسی مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''بس چھوڑ دو یار۔''

ایاز نے ایک جھٹکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ ''آپ کے کہنے پر چھوڑ رہا ہوں ورنہ اس سے اپنا نقصان نکلوا کر چھوڑتا۔''

موٹا گردن مسلنے لگا پھر اس نے خون خوار نظروں سے ایاز کی طرف دیکھا۔ ''اوئے تو نے ملک عارف سے پنگا لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔''

میں چونکا تھا۔ ''تم ملک عارف ہو...... اس علاقے کے ایم پی اے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... ابھی تم دونوں کو پتا چل جائے گا۔ میرے محافظ پیچھے رہ گئے تھے وہ آنے

والے ہوں گے۔"

وہ درست کہہ رہا تھا کیونکہ اسی لمحے سڑک سے ایک لینڈ کروزر ریستوران کی طرف مڑتی دکھائی دی۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ ہم مشکل میں پڑنے والے تھے اور میں نے تیزی سے پستول نکال کر ملک عارف کی کمر پر رکھ دیا لیکن اس طرح کہ کسی اور کو نظر نہ آئے اور آہستہ سے کہا۔" ملک جیسا کہہ رہا ہوں ویسا کرو ورنہ تمہارے مرنے کا بھی کسی کو پتا نہیں چلے گا یہ پستول بے آواز ہے۔"

اس کا رنگ اُڑ گیا تھا اور اس نے بھی آہستگی سے کہا۔" تم نہیں جانتے کہ تم کس سے ٹکر لے رہے ہو؟"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اب شرافت سے جیپ کی طرف چلو اور اپنے آدمیوں سے کہو اسی جگہ رک کر تمہارا انتظار کریں تم ضروری کام سے ہمارے ساتھ جا رہے ہو۔"

وہ خاموش رہا تو میں پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔ مجبوراً اس نے کہا۔" میں ان لوگوں کے ساتھ جا رہا ہوں تم یہیں رک کر میرا انتظار کرو۔"

اگر ملک عارف کا لہجہ چیخ چیخ کر نہ کہہ رہا ہوتا کہ اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہے تب بھی اس کے آدمی احمق نہیں تھے جو صورت حال کو نہ سمجھتے۔ وہ جان گئے تھے کہ دال میں کالا ہی کالا ہے۔ ان کا شیر کی طرح دھاڑنے والا آقا اچانک بلاوجہ بکری کی طرح منمنانے نہیں لگا ہے۔ میں نے ایاز سے کہا۔" جیپ نکالو ہم ملک صاحب کو ذرا گھما پھرا کر لاتے ہیں۔"

ایاز نے جیپ نکالی اور اس سے پہلے کہ ملک کی محافظ فورس پارکنگ میں داخل ہوتی میں نے ملک کو بھی جیپ میں دھکیل دیا تھا لیکن جب ایاز نے جیپ باہر نکالنا چاہی تو لینڈ کروزر راستے میں آ گئی تھی۔ میں نے ملک عارف سے کہا۔" اپنے آدمیوں سے کہو راستہ چھوڑ دیں اور پیچھے آنے کی کوشش نہ کریں اس صورت میں تم ایک آدھ گھنٹے میں صحیح سلامت واپس آ جاؤ گے دوسری صورت میں ہمیں تمہاری لاش یہیں چھوڑ کر جانی پڑے گی۔ اب بولو کیا کہتے ہو۔"

"تم کیا سمجھتے ہو اس صورت میں تم بچ جاؤ گے؟"

"شاید نہیں اور شاید بچ جائیں۔" میں نے کہا۔" لیکن ایک بات یقینی ہے تم اس دنیائے رنگ و خوشبو کو چھوڑ کر جہنم رسید ہو جاؤ گے۔" میں نے اس بار پستول نکال کر اس کی موٹی گردن میں دھنسا دیا۔" ملک عارف مجھے مجبور مت کرو۔"

میری لہجے میں موجود سفاکی محسوس کر کے اس کی تھرتھری چھوٹ گئی تھی اور اس نے جلدی سے سر ہلایا۔

"میں کہتا ہوں۔"

"اور ان کو یہ بھی سمجھا دینا کہ ہمارے پیچھے آنے کی حماقت مت کریں یہ تمہاری صحت کے لیے مُضر ہو گا۔"

ملک عارف نے اپنے انداز میں اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا کہ وہ دخل اندازی سے پرہیز کریں اور اس کی واپسی کا انتظار کریں۔ مجبوراً ہمارے راستے سے لینڈ کروزر ہٹا لی گئی تھی۔ ایاز نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔" یہ اتنی آسانی سے ماننے والی مخلوق نہیں ہے۔ وہ پیچھے آ سکتے ہیں۔"

''آئیں گے تو خود بھگتیں گے۔''میں نے لاپروائی سے کہا۔
عقب میں تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایاز سے کہا۔''جیپ کی تمام لائٹس بند کر دو۔''
''بریک لائٹ تو بند نہیں ہو سکتی۔''اس نے جواب دیا اور باقی لائٹس بند کر دیں۔ ملک عارف کسمسایا۔
''تم لوگ مجھے کیوں لے جا رہے ہو؟''
''تمہاری کار نے جیپ کو ٹکر ماری ہے ذرا اس کا حساب کتاب کرنا ہے۔''میں نے سنجیدہ لہجے میں مذاق کیا۔
''بس اتنی سی بات؟''وہ بے یقینی سے بولا۔''یہ بات تو تم وہاں بھی کر سکتے تھے؟''
''اور تمہارے آدمی ہمیں اتنی آسانی سے جانے دیتے۔''میں نے طنز کیا۔''نہیں ملک صاحب حساب ذرا لمبا ہے۔''
''دیکھو یار اگر تمہیں کچھ چاہیے تو لے لو اور مجھے جانے دو۔''اب وہ فکر مند ہو کر منت سماجت پر اتر آیا تھا۔
میں اس کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے عقب میں دیکھ رہا تھا اور جب مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تو میں نے ایاز سے کہا۔
''جیپ کہیں کچے پر اتار لو اور جگہ ایسی ہو کہ سڑک سے نظر نہ آئے۔''
اس نے چند لمحے بعد جیپ کچے میں اتار کر ایک دیوار جیسی جگہ کے پیچھے روک لی تھی۔ میں نیچے اتر آیا اور ملک عارف کو بھی کھینچ لیا۔ میرا موڈ دیکھ کر اس پر لرزہ سا طاری ہو رہا تھا۔ ایاز نے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال لی تھی اور پھر اس نے بھی کہیں سے ایک پستول برآمد کر کے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں نے ملک سے کہا۔''دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر نیچے بیٹھ جاؤ اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہتے ہو تو مانگ لو۔''
''تت...... تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟''اس کی آواز بھی لرزنے لگی۔''میرا قصور کیا ہے...... اگر جیپ کو نقصان ہوا ہے تو......''
''وہ مذاق تھا۔''میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔''اب بات ہوگی مرشد اور تمہارے تعلق کی۔''
وہ بری طرح چونکا تھا۔ پھر اس نے مجھے دیکھا۔''تم کون ہو؟''
''شہباز ملک...... تم مجھے یقیناً جانتے ہو گے۔''
اس نے سر ہلایا اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔''میں تم کو جانتا ہوں۔''
''تب یہ بھی جانتے ہو گے کہ مرشد میرا بدترین دشمن ہے۔''
''ہاں اس کے قافلے پر تم نے حملہ کیا تھا۔''
''درست ہے...... اور میرے گھر کی گاڑی پر شریف بدمعاش کے آدمیوں نے حملہ کیا تھا۔ شریف بدمعاش کو کس نے اس کام کا حکم دیا تھا۔''
''میں نے نہیں دیا۔''اس نے جلدی سے کہا۔''شریف اور مرشد کا آپس میں براہ راست رابطہ ہے۔''
''یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ شریف کا اصل میں کس سے رابطہ ہے کیونکہ شریف میرے پاس ہے اور جلد اس کی اسٹوری سامنے آجائے گی۔''

ملک عارف خوف زدہ ہو گیا تھا پھر اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''ایک بدمعاش کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔''

''ہاں عدالت میں شاید نہ ہو لیکن اگر یہی بیان میڈیا پر آجائے تو اس کی بہت زیادہ اہمیت ہو جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھ کو جواب دینا ہوگا۔ مرشد سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''پارٹی کا تعلق ہے۔ ہم دونوں ایک ہی پارٹی سے ہیں۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''لیکن مرشد یہاں تم سے ملنے آیا تھا کس لیے؟''

''سیاسی معاملہ ہے۔ وہ اس علاقے سے الیکشن لڑ رہا ہے۔ اسے میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''سیاسی معاملہ ہے یا کوئی اور چکر ہے۔'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ''مرشد بہت بڑا چکر باز ہے۔ وہ تمہیں بھی مروا سکتا ہے۔ وہ سیاسی آدمی نہیں ہے بس ضرورت کے تحت سیاست میں منہ مار رہا ہے لیکن تم خاندانی سیاست دان ہو۔ میرا مطلب ہے کہ انگریزوں کی چاکری کر کے تمہارے بزرگوں نے جاگیریں بنا لیں اور سیاست ان کا پیشہ بن گیا۔ تمہارے لیے بلاوجہ کی دشمنیاں خطرناک ہوں گی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''مطلب یہ کہ مرشد سے میری دشمنی ہے اور تمہیں اس نے یقیناً بتایا ہوگا اور تم نے اسے اپنے تعاون کا یقین دلایا ہوگا لیکن اس نے تمہیں میرے بارے میں پورا سچ نہیں بتایا ہوگا۔ تم سرکار کے آدمی ہو ذرا میرے بارے میں انٹیلی جنس رپورٹ لے لینا اس سے تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی کہ تم نے میرے راستے سے دور رہنا ہے۔ باقی تو تمہیں معلوم ہوگا ہی کہ مرشد جلسہ چھوڑ کر کیوں بھاگا ہے اور شریف غائب ہے۔ تمہیں بھی کتنی آسانی سے اٹھا لایا ہوں۔''

''میں...... میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میرا وعدہ......''

''ملک عارف۔'' میں نے لہجے کو خوفناک بنایا۔ ''وعدہ مجھ سے نہیں خود سے کرو کیونکہ اس کی خلاف ورزی کا خمیازہ بھی تم خود بھگتو گے اور چند دن میں تمہیں اس کا پتا بھی چل جائے گا۔'' میں نے کہتے ہوئے اچانک اس کی گدی پر پستول کا دستہ مارا وہ بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ میں نے اس کی قمیص تھام کر اسے آرام سے گرنے دیا ورنہ اس کا منہ ناک برابر ہو جاتا۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' ایاز نے پوچھا۔

''کچھ نہیں پڑا رہنے دو ہوش میں آکر خود ہی اپنے آدمیوں کو تلاش کر لے گا۔''

ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مجھے ایاز سے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ موقع کی نزاکت محسوس کر کے اس نے جیپ کو پوری رفتار سے دوڑایا تھا اور کوئی دو کلومیٹرز کے بعد اسے ایک ذیلی سڑک پر گھما دیا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کوئی متبادل راستہ ہے؟''

''نہیں متبادل تو نہیں ہے لیکن میں نے اسے بنا دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کچھ سفر ایک نالے میں کرنا پڑے گا۔''

مجھے بھی اندازہ تھا کہ ایک ایم پی اے کا اغوا معمولی بات نہیں تھی اور اب تک پولیس حرکت میں آچکی ہو

گی اور اگر ایاز اسی سڑک پر سفر جاری رکھتا تو پولیس کہیں نہ کہیں ہمیں روک لیتی۔ مجھے اس کی حاضر دماغی اور قوت فیصلہ نے متاثر کیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی بروقت فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سڑک خاصی خراب تھی لیکن جیپ کی وجہ سے سفر میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ البتہ رات کا کھانا رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اب کھانے کا موقع کہاں ملے گا؟''

''جہاں نصیب میں ہوگا لیکن اس سڑک پر مشکل ہے البتہ جب ہم اسلام آباد کے قریب پہنچ جائیں گے تب کچھ نہ کچھ ملنے کا امکان ہے۔''

''اور اس میں کتنا وقت لگے گا؟''

''شاید ایک گھنٹہ اور لگ جائے۔ یعنی ہم رات ساڑھے نو بجے اسلام آباد میں ہوں گے۔'' اس نے رفتار ذرا سست کی۔ ''ویسے جانا کہاں ہے؟''

میں نے اسے عبداللہ کا ایس ایم ایس دکھایا۔ ''یہاں جانا ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور توجہ سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ یہ پوٹھوہار رینج کا علاقہ تھا اور یہاں زمین بہت زیادہ اونچی نیچی تھی۔ سڑک بھی اسی حساب سے اوپر نیچے ہو رہی تھی لیکن اصل مرحلہ اس وقت آیا جب ایاز نے جیپ ایک برساتی نالے میں گھسا دی۔ یہ بہت مشکل جگہ تھی اور یہاں کوئی بہت مضبوط فور وہیل ڈرائیو ہی چل سکتی تھی۔ ایاز کی جیپ واقعی بہترین تھی اس کا اندازہ مجھے اس سفر میں ہو گیا۔ نالے کا راستہ کوئی دس منٹ جاری رہا لیکن اسے پار کر کے ہم اسلام آباد کی طرف جانے والی ایک بہترین سڑک پر آ گئے اور کوئی آدھے گھنٹے بعد شہر کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ ایاز نے آہستہ سے کہا۔

''لیں جی ہم پہنچ گئے۔''

''ویسے تو پولیس سے اتنی مستعدی کی امید نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے اسلام آباد پولیس کے پاس تمہاری جیپ کا نمبر آ گیا ہو۔ آخر معاملہ ایک ایم پی اے کا ہے۔''

''نہیں اس کا امکان نہیں ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ ''کل تک میں اس کا بندوبست کر لوں گا۔''

''کیسا بندوبست؟''

''بس کر لوں گا۔'' اس نے گول مول سے انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہا ہے۔

راجا عمر دراز کی یہ کوٹھی دوسری تھی۔ ایف سیکٹر میں یہ ایک چھوٹی لیکن خوبصورت کوٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ راجا عمر دراز کی خاص رہائش گاہ کو اب اس قسم کے کاموں کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ مین گیٹ پر عبداللہ خود میرا منتظر تھا۔ اس نے گیٹ کھلوایا اور ہم اندر پہنچ گئے۔ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے ایاز سے ہاتھ ملایا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ ایاز ہے میں نے جیپ سمیت ہائر کیا ہے اب یہ ساتھ رہے گا۔''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''میں انتظام کرتا ہوں۔''

''مجھے جیپ کا کچھ کام کرنا ہے۔'' ایاز بولا۔ ''کیا میں یہاں کام کر سکتا ہوں؟''

''یہاں نہیں اندر گیراج ہے وہاں کر سکتے ہو۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''تم رکو میں آتا ہوں۔''

ایاز اب جیپ کی فکر میں لگ گیا تھا اور عبداللہ مجھے اندر لے آیا۔ شاید آج بارش ہوئی تھی کیونکہ موسم نہایت سرد ہو گیا تھا اور یہاں مجھے زیادہ سردی لگ رہی تھی۔ کوٹھی اندر سے سینٹرلی ہیٹ لگ رہی تھی کیونکہ بہ ظاہر کوئی آتش دان یا ہیٹر نہیں لگا تھا لیکن اندر کا درجہ حرارت معقول تھا۔ عبداللہ مجھے ایک نشست گاہ میں لایا۔ ''آپ کیا لینا پسند کریں گے؟''

''چائے یا کافی میں سے جو مل جائے۔'' میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے انٹرکام پر کسی کو کافی کا کہا اور مجھ سے بولا۔ ''میں آپ کے ڈرائیور کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔''

وہ کوئی دس منٹ بعد واپس آیا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ پہلے اسپتال جائیں گے؟''

''ہاں ارادہ تو یہی تھا لیکن راستے میں ایک مسئلہ ہو گیا۔'' میں نے اسے ملک عارف سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔ ''دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے بھی یہیں لے آؤں لیکن وہ ایم پی اے ہے۔ اس کی تلاش میں ہنگامہ ہو جاتا۔''

''یہ واقعی تشویش والی بات ہے۔ اس کی جیپ کا نمبر لازمی پولیس کے پاس آ جائے گا۔''

''وہ کہہ تو رہا ہے کہ اس کے پاس کوئی حل ہے۔''

''خیر دیکھ لیں گے یہاں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''آپ فرمائیں کھانے میں کیا پسند کریں گے؟''

''کچھ بھی ہو یار...... بس صحیح سے بنا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے کسی خبر اور کچھ تصویروں کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں میرا جو آدمی شہلا رضوی کی نگرانی کر رہا ہے وہ کیمرے سے تصویریں بھی لیتا رہتا ہے۔ کل رات اس نے شہلا رضوی کے گھر کی بالکونی میں آنے والے چند افراد کی تصویریں لی تھیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ کسی نے اندر سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور بالکونی میں پکڑا گیا۔ دو افراد اسے بالکونی سے پکڑ کر اندر لے جا رہے ہیں۔''

عبداللہ ایک لیپ ٹاپ لے آیا اور آن کر کے اسے میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ اس دوران میں ایک نوجوان آکر خاموشی سے کافی اور اس کے لوازمات کی ٹرے رکھ گیا تھا۔ عبداللہ نے کافی بنا کر مجھے دی۔ کمپیوٹر آن ہو گیا تو اس نے ایک فولڈر کھولا جس میں چند تصویریں تھیں۔ ''یہ سب بہت تیزی سے ہوا اور اسے زیادہ وضاحت سے تصویریں لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔''

اس نے ایک تصویر کھولی۔ اس میں ایک شخص بالکونی کی ریلنگ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور دو افراد عقب سے اسے روک رہے تھے۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ رات کا وقت تھا اور تصویر بھی واضح نہیں تھی لیکن مجھے لگا جیسے بالکونی سے کودنے کی کوشش کرنے والا بیتو ہے۔ دوسری تصویر میں دونوں آدمی اسے کھینچنے میں کامیاب رہے تھے اور تیسری اور چوتھی تصویر میں وہ اسے اندر لے جا رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی تصویر اتنی واضح نہیں تھی کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتا لیکن اس میں بیتو کی جھلک آ رہی تھی۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔

''کیا کوٹھی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری ہے؟''

''زیادہ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس شخص کو بھی شاید کسی گاڑی میں بند کر کے وہاں لایا گیا ہے

کیونکہ میرے آدمی نے اسے وہاں لائے جاتے نہیں دیکھا۔''

''یہ ممکنہ طور پر میرا ساتھی بیتو ہے۔ یہ بتاؤ کہ بینک والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''میں نے ایک آدمی سے بات کی ہے۔ وہ اسی بینک میں کام کرتا ہے لیکن برانچ مختلف ہے اس لیے معلوم کرنے میں وقت لگ رہا ہے۔ کل پتا چل جائے گا کہ نفیس برنی نامی شخص کا اس برانچ میں اکاؤنٹ اور لاکر ہے یا نہیں ہے۔''

مجھے سفیر اور دوسروں کا خیال آیا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھی وسیم سمیت دبئی میں ہیں۔''

''جی آپ نے بتایا تھا۔''

''لیکن تین دن سے میرا ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے گھر کے نمبر پر کال ریسیو نہیں ہو رہی ہے۔''

''پتا کیا ہے؟'' عبداللہ نے کہا۔

''پتا نہیں صرف فون نمبر معلوم ہے۔''

نمبر دے دیں اس سے بھی کام چل جائے گا۔'' عبداللہ نے کہا میں نے اسے نمبر دیا تو اس نے اسی وقت کسی کا نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''عبداللہ بات کر رہا ہوں ایک فون نمبر لکھو۔'' عبداللہ نے اسے نمبر لکھوایا۔ ''ٹھیک ہے اب اس نمبر کے پتے پر جا کر کنفرم کرو کہ یہاں موجود لوگ وہیں مقیم ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں...... ہاں ایمرجنسی ہے مجھے ایک گھنٹے میں رپورٹ کرو۔'' اس نے موبائل رکھ کر مجھ سے کہا۔ ''یہ دبئی میں راجا صاحب کا آدمی ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میں بھول گیا تھا کہ سفیر اور مونا کو راجا صاحب نے دبئی بھیجا تھا۔''

''جی لیکن شاید انہوں نے اپنا کوئی سیٹ اَپ کر لیا تھا۔'' عبداللہ اٹھتے ہوئے بولا اس نے لیپ ٹاپ بند کیا۔ ''جب تک کھانا تیار ہو رہا ہے آپ فریش ہو جائیں۔''

وہ مجھے ایک چھوٹے لیکن سجے ہوئے بیڈ روم میں لایا۔ ''میرا بیگ جیپ میں ہے وہ منگوا دو۔''

عبداللہ بیگ لے کر آیا اور بولا۔ ''یہ کوئی جن ٹائپ کا آدمی ہے اپنی جیپ کھول کر بیٹھا ہے اور خود اس کی مرمت کر رہا ہے۔''

''کچھ ایسا ہی ہے شاید...... میں نے اسے ہائر کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے کھانا دینا اس نے بھی نہیں کھایا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں اب یہ میری ذمے داری ہے۔ ویسے اگر کام کا آدمی ہے تو ہم رکھ لیتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم دیکھ لو ابھی تو یہ یہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کام کا نہ نکلے تو فارغ کر دیں گے۔''

میں فریش ہو کر باہر آیا تو عبداللہ نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ میں اس کے ساتھ ڈائننگ روم میں آیا۔ اسی نوجوان نے کھانا لگایا تھا۔ شاید وہ باورچی تھا لیکن دیکھنے میں کوئی بے فکرا اور کھلنڈرا قسم کا نوجوان لگ رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ''یہ کک ہے؟''

''آل راؤنڈر ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''کھانا بنانے سے لے کر گاڑی چلانے تک سارے کام کرتا ہے۔ یوں

سمجھ لیں کہ اس کی وجہ سے یہاں دو ملازموں کی بچت ہوتی ہے۔ ایک گارڈ ہے جو باہر گیٹ پر ہوتا ہے رات کو وہ اپنے کوارٹر میں سونے چلا جاتا ہے اور رکھوالی کے لیے کتے کھول دیئے جاتے ہیں۔"

"تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟"

"یہیں...... لیکن وہ نیچے تہہ خانے میں ہوتے ہیں۔ شریف کو بھی وہیں رکھا ہے۔"

"اس نے کچھ بتایا ہے؟"

"نہیں...... کچھ ہلکا پھلکا کام کیا ہے لیکن ابھی اس پر صحیح سے محنت نہیں کی ہے۔" عبداللہ نے بتایا۔ اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ ایاز کا کھانا اسے گیراج میں ہی دے دیا تھا۔ یہ اس کی خواہش تھی۔ اس کے لیے اوپر ایک کمرہ کھول دیا تھا۔ باہر سے آنے والے غیر متعلقہ لوگ اوپر ٹھہرائے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد عبداللہ نے مجھے کوٹھی دکھائی اور پھر تہہ خانے میں لایا۔ یہ خفیہ قسم کا تہہ خانہ تھا اور اس تک رسائی کے لیے کچن سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہاں الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ایک پٹ سے گزرنے پر تہہ خانے کا راستہ آجاتا تھا۔ ہم نیچے آئے۔ شروع میں ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف دو کمرے تھے۔ پھر ایک مضبوط دروازہ آیا۔

شریف کو اسی دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے پنجرے نما کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ پنجرے میں ایک بستر اور ایک کموڈ معہ واش بیسن کے تھا۔ یعنی اسے باہر نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ "یہاں تو سارا انتظام کیا ہے تم نے۔"

"نہیں یہ کوٹھی اسی طرح ملی تھی بس تبدیلیاں کرائیں اور تہہ خانے کو خفیہ کر دیا۔"

شریف مجھے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے سلاخیں تھام کر کہا۔ "تم...... تم جعلی ایس ایس پی بنے تھے۔"

"ہاں تم نے ٹھیک پہچانا۔"

"تم مجھ سے مرشد یا کسی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔" اس کا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔

"ابھی تو تم سے پوچھا ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا اسی وقت عبداللہ کے موبائل نے بیل دی تو وہ معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

"شریف۔" میں پنجرے کے پاس گیا۔ "تمہارے آدمیوں نے اس گاڑی پر حملہ کیا جس میں میرے خاندان کی عورتیں سفر کر رہی تھیں اس حملے میں دو محافظ ہلاک اور ایک زخمی ہوا۔ میرا ایک رشتے دار شدید زخمی ہے۔ صرف اس حملے کی بنا پر تم واجب القتل ہو۔"

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ "تو مجھے قتل کیوں نہیں کر دیا؟"

"سچی بات ہے جب میں نے تمہارے اڈے کا رخ کیا تو میرے سر پر خون سوار تھا لیکن تمہاری خوش قسمتی کہ میرا اشتعال کم ہو گیا اور میں تمہیں صرف اٹھا لایا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اب تمہارے ساتھ جو ہو گا وہ بہت سکون اور آرام سے ہو گا۔"

وہ فکر مند ہوا تھا مگر اس کی ڈھٹائی برقرار رہی۔ "کیا کرو گے زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کر دو گے۔"

"اگر تم مرنا چاہو گے تو یہ بھی ممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو تو زندہ بھی رہ

سکتے ہو اور کوئی جلدی نہیں ہے تم آرام سے سوچ سکتے ہو۔'' میں کہہ کر باہر کی طرف آیا۔ عبداللہ بات مکمل کر کے اندر آ رہا تھا وہ مجھے راستے میں مل گیا۔ میں نے اس کے چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ خبر اچھی نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ سب تین دن سے گھر سے غائب ہیں۔ پڑوسیوں میں کسی نے ان کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کو ان کے بارے میں معلوم ہے۔''

''کوئی حادثہ؟''

''میں نے اس زاویے سے بھی معلوم کرنے کو کہا ہے۔ اس نے کچھ مہلت مانگی ہے کل صبح تک معلوم کر کے بتائے گا۔''

میری فکر بڑھ گئی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی تھی ورنہ اس طرح سے کون غائب ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے کہیں تھے تو کم سے کم مجھ سے رابطہ کر سکتے تھے۔ بہر حال صرف پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ جو میرے اور عبداللہ کے بس میں تھا وہ ہم کر رہے تھے۔ ہم اوپر نشست گاہ میں آئے۔ عبداللہ کے علم میں تھا کہ میں سرحد پار کر گیا تھا لیکن اسے اس بارے میں زیادہ نہیں پتا تھا کہ میں وہاں کیا کرتا رہا تھا۔ اس کا اشتیاق دیکھ کر میں نے اسے اپنا مختصر سفر نامہ سنایا۔ جب میں خاموش ہو کر کافی ختم کرنے لگا تو اس نے کہا۔

''حیرت انگیز جناب...... میں نے کسی ایک فرد کی ذات سے متعلق اتنے واقعات نہیں سنے ہیں۔''

''مجھے خود اب یہ خواب و خیال لگتا ہے۔ اس پورے سفر میں ایک دن بھی سکون سے گزارنے کو نہیں ملا۔''

''اب مجھے بیتو کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہے اور آپ بے فکر رہیں اسے تلاش کرنا اب میری ذمے داری ہے۔''

''تمہاری اب یہاں کیا حیثیت ہے؟'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''میرا مقصد یہ جاننا ہے کہ میرے چکر میں تم اپنے کاموں سے نہ رہ جاؤ۔''

''بیگ صاحب نے مجھے لاہور اور اسلام آباد میں راجا صاحب کی تمام جائیداد اور امور کا نگران بنا دیا ہے میں براہِ راست بیگ صاحب کو جواب دہ ہوں۔''

''مبارک ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ سب تم اپنی صوابدید پر کر رہے ہو یا اس کے لیے بیگ صاحب سے اجازت لی ہے۔''

''آپ کے معاملے میں بیگ صاحب کی ہدایت واضح ہے کہ آپ کے ہر معاملے کو راجا صاحب کا معاملہ سمجھا جائے۔''

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ بیگ نے یہ بات کی تھی کیونکہ مجھے بعض اوقات لگتا تھا کہ وہ میرے اور راجا عمر دراز کے تعلق کو پسند نہیں کر رہا ہے۔ یہ حیرت میں نے خود تک محدود رکھی تھی اور عبداللہ کے سامنے ظاہر نہیں کی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ''اب تم آرام کرو اور اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو مجھے فوراً اطلاع کرنا۔ بے شک سوتے سے اٹھا دینا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے کہا۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور فون کر کے پہلے بابا کو اپنی خیریت کی اطلاع دی اور پھر رفیق بھائی کو کال کی۔ ''عتیق کی حالت کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ویسی ہی ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''اب تک اسے نہ تو ہوش آیا ہے اور نہ اس کے وائٹل سائن میں کوئی بہتری آئی ہے۔''

''رفیق بھائی اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بس اسی آس پر اس کے ساتھ بیٹھا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ کہاں رکے ہیں؟''

''ایک دوست ہیں ان کے گھر رکا ہوں۔ تمہارے آدمی نے جو گارڈ دیا تھا اسے میں نے عتیق کے پاس چھوڑ دیا ہے۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا ہے۔ میری کسی خدمت کی ضرورت ہو تو ضرور کہیے گا۔''

''بس تم دعا کرو میرا بیٹا ہوش میں آ جائے۔''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے کہا۔ ''شمی اور آپا آپ کے ہاں ہیں۔ میں چاہتا ہوں فی الحال وہ وہیں رہیں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں میں نے حویلی کی سکیورٹی بڑھا دی ہے۔ وہ وہاں محفوظ ہیں۔''

رفیق بھائی سے بات کر کے میں نے ان کی حویلی کا نمبر ملایا اور شمی سے بات کرنے کو کہا وہ کچھ دیر بعد لائن پر آ گئی۔ ''شیبی کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں تم اور آپا کیسے ہیں؟''

''ہم بھی ٹھیک ہیں لیکن عتیق......'' اس کا لہجہ نم ناک ہو گیا۔

''اللہ اسے ٹھیک کرے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

''میری ابھی رفیق بھائی سے بات ہوئی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ حالت میں تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن اس کے علاج کی کوشش جاری ہے۔ یہاں زیادہ سہولتیں اور بہتر ڈاکٹرز ہیں۔''

''شیبی میں وہاں نہیں آ سکتی؟''

''نہیں گڑیا...... یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ابھی تمہارا اور آپا کا وہاں سے نکلنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔''

کچھ دیر شمی سے بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ آپا جلد سو جانے کی عادی تھیں اور وہ سو چکی تھیں۔ سنٹرلی ہیٹ ہونے کی وجہ سے اندر کا درجہ حرارت خوشگوار تھا لیکن پھر بھی بیڈ کے ساتھ ہلکا کمبل موجود تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لیکن میں پھر بھی لیٹ گیا اور اپنے دشمنوں اور اپنے پیاروں کے بارے میں سوچتے سوچتے مجھے نیند آ ہی گئی تھی۔ رات کچھ بے چین سی گزری لیکن جب صبح آنکھ کھلی تو ذہن اور جسم تازہ ہو رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ سورج نکلنے والا تھا اور صبح دھند آلود تھی۔ میں سویٹر پہن کر باہر آ گیا۔

سردی شدت کی تھی لیکن ہوا میں ایک تازگی محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں کوٹھی کے چھوٹے سے لان میں

واک کرنے لگا۔ گارڈ اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا اور اس نے کتے بند کر دیئے تھے۔ ایاز شاید ابھی تک سو رہا تھا۔ سورج نکلا تو دھند تیزی سے غائب ہو گئی تھی۔ روشنی ہونے پر میں اندر آیا۔ عبداللہ جاگ گیا تھا یا پہلے کا جاگا ہوا تھا۔ پھر آل راؤنڈر نوجوان منیر آیا اور اس نے ناشتے کے بارے میں پوچھا اور ناشتہ بنانے چلا گیا۔

''دبئی سے کوئی خبر آئی ہے؟'' میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں آئی ہے لیکن ناشتہ کر کے میں کال کرتا ہوں۔''

میں بیک وقت تین چار معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ ایک طرف بیتو کی گمشدگی اور تلاش کا معاملہ تھا تو دوسری طرف سفیر اینڈ وسیم پارٹی کی پُر اسرار گمشدگی تھی۔ مرشد کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ عتیق زندگی اور موت کی کش مکش میں تھا اور دشمن کا ایک اہم مہرہ شریف بدمعاش میرے قابو میں تھا۔ ان سارے معاملات میں یہ واحد بہتری تھی۔ شبیر نے ناشتہ بنایا اور میز پر لگانے لگا۔ اس دوران میں اخبار آ گئے تھے میں نے فوری طور پر پہلے علاقائی خبریں چیک کیں لیکن عارف ملک کے اغوا اور بازیابی کی خبر فرنٹ پیج پر تھی اور اس نے خاصا ہنگامہ کیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے میرا نام لینے کے بجائے اسے اپنے سیاسی مخالفین کی کارروائی قرار دیا تھا۔ مرشد کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی سوائے ایک خبر کے کہ اس کا منسوخ شدہ سیاسی جلسہ اب ایک ہفتے بعد اسی مقام پر ہونا طے پا گیا تھا۔ مرشد سے مجھے یاد آیا اور میں نے عبداللہ سے کہا۔

''میں نے تمہیں مرشد کے خاص آدمی فاضلی کے بارے میں بتایا تھا اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

''نہیں...... میں نے اپنے آدمیوں کے بجائے پولیس میں موجود اپنے گاؤں والے سے مدد مانگی ہے۔ اگر اس کا کوئی پولیس ریکارڈ موجود ہے تو اس کے بارے میں لازمی پتا چل جائے گا۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے...... ابھی مجھے اسپتال جانا ہے جہاں عتیق داخل ہے۔''

''آپ خود جائیں گے یا میں لے چلوں۔''

''میں خود جاؤں گا تم کسی گاڑی کا بندوبست کر دو۔''

''ایک وٹز یہاں موجود ہے۔''

''وہی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے کہا۔ ناشتہ کر کے میں گیراج میں آیا جہاں ایاز ناشتے سے پہلے اپنی جیپ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ اس نے پچھلا حصہ جہاں رگڑ لگی تھی اتار دیا تھا اور اب اس کا ڈینٹ ٹھیک کر رہا تھا۔

''یہ کام تو کسی ورکشاپ میں بھی ہو سکتا ہے۔''

اس نے کپڑے سے ہاتھ صاف کیا۔ ''نہیں میں اس کے سارے کام خود کرتا ہوں۔''

میں نے اسے پانچ ہزار دیئے۔ ''یہ رکھ لو اگر مزید ضرورت ہو تو کہہ دینا۔''

''شکریہ جناب۔'' اس نے نوٹ جیب میں ڈال لیے۔ ''کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں میں باہر جا رہا ہوں۔ ملک عارف نے ملبہ سیاسی مخالفین پر ڈال دیا ہے لیکن اندرون خانہ ہماری تلاش جاری ہو گی اس لیے کچھ دن باہر نکلنے سے گریز کرو۔''

''کچھ دن۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں آج شام کو باہر جاؤں گا اور کسی کا باپ مجھے نہیں پکڑ سکے گا۔''

میں نے اس سے بحث نہیں کی تھی۔ عبداللہ نے مجھے کار کی چابی لا دی۔ راستے میرے جانے پہچانے تھے اس لیے اسپتال تک بنا کسی سے پوچھے ہی پہنچ گیا تھا۔ راستے میں رفیق بھائی کو کال کی تو ان کا نمبر انگیج جا رہا تھا۔ راستہ زیادہ نہیں تھا میں بیس منٹ میں پہنچ گیا لیکن جب اسپتال کے ریسیپشن پر پہنچا اور وہاں موجود شخص سے کہا۔

''مجھے عتیق نامی ایک نوجوان کو دیکھنا ہے وہ یہاں آئی سی یو میں داخل ہے۔''

''سوری سر۔'' اس نے معذرت کی۔ ''رفیق صاحب کی غیر موجودگی میں کسی کو انہیں دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں مایوس ہوا تھا لیکن پھر مجھے عبداللہ کے آدمی کا خیال جو یہاں موجود تھا۔ ''یہاں ایک گارڈ ہے وہ مجھے پہچانتا ہے۔''

اس نے پھر انکار کر دیا۔ ''میں معافی چاہوں گا سر لیکن رفیق صاحب کی واضح ہدایات ہیں کہ ان کی غیر موجودگی میں کوئی عتیق نامی مریض کے کمرے میں نہیں جا سکتا ہے۔''



میں نے محسوس کیا کہ اسپتال والے اس معاملے میں سخت تھے اس لیے میں بحث کرنے کے بجائے باہر آ گیا۔ رفیق بھائی کو دوبارہ کال کی لیکن ان کا نمبر پھر انگیج جا رہا تھا نہ جانے کس سے اتنی لمبی بات کر رہے تھے۔ میں مایوس ہو کر وقت گزاری کے لیے باہر نکل آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ شہلا رضوی کا گھر یہاں سے کچھ ہی دور تھا اور میں وہاں کا ایک چکر لگا سکتا تھا۔ بہ ظاہر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن ہو سکتا تھا کہ کوئی فائدہ نکل ہی آئے۔ میں نے سوچا اور کار کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ راستے میں ایک جگہ کچھ ٹھیلے والے سامان بیچ رہے تھے۔ ان میں مجھے سن گلاسز اور اونی ٹوپیاں نظر آئیں۔ میں نے کار روک کر ایک ایسی ٹوپی لی جو ذرا لمبی تھی اور اسے سر پر فولڈ کر کے پہنا جاتا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک بڑے سائز کا سن گلاس اور پاس ہی ٹھیلے سے ایک چھوٹی سی قینچی لی۔

ذرا ایک آگے ایک سنسان جگہ کار روک کر میں نے ٹوپی کو کھول کر پہنا اور پھر اس پر آنکھوں کی جگہ والے حصے کاٹ دیئے۔ اب پہن کر دیکھا تو ٹوپی نقاب بن گئی تھی اور اسے فولڈ کر کے پہنا جاتا تو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اس کا کچھ حصہ کٹا ہوا ہے۔ سن گلاس عام حالات میں چہرہ چھپانے کے لیے بہترین تھے۔ میں نے سن گلاس پہن لیے۔ اسلام آباد ایک سنسان شہر ہے لیکن اس کے پوش علاقے تو ویران محسوس ہوتے ہیں۔ یہاں نہ لوگوں کی آمد و رفت ہوتی ہے اور نہ ہی گلیوں میں کوئی نظر آتا ہے۔ شہلا رضوی کا گھر ایسی ہی جگہ تھا۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ میں نے کار کوٹھی سے ذرا پہلے روک دی اور خود پیدل آگے بڑھا۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی جو عبداللہ کی طرف سے یہاں نگرانی پر مامور تھا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے جتنا کیمرے سے ریکارڈ کیا تھا اپنی آنکھوں سے یقیناً اس سے زیادہ ہی دیکھا ہوگا لیکن گلی کے دوسرے سرے تک جانے کے باوجود مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔

''تمہارا آدمی جو شہلا رضوی کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے اس وقت کہاں ہے؟''

''کیوں کیا ہوا جناب؟''

''میں یہیں موجود ہوں اور وہ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''ایک منٹ میں کال کر کے بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ایک منٹ بعد میرے موبائل پر کال آئی۔ عبداللہ ہی تھا۔ ''وہ یہیں ہے۔ آپ شہلا رضوی کی کوٹھی کے سامنے دیکھیں ایک بڑا سا درخت ہے۔ شاید پیپل کا ہے وہ اس پر موجود ہے۔ وہاں سے وہ بہتر طریقے سے اور کسی کی نظر میں آئے بغیر نگرانی کر سکتا ہے۔''

میں حیران ہوا تھا۔ ''اس سے کہو مجھے اس نمبر پر کال کرے۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ایک منٹ بعد اجنبی نمبر سے کال آئی میں نے ریسیو کی۔ ''کون بات کر رہا ہے؟''

''سر میں شبیر ہوں پیپل کے درخت سے، حکم فرمائیں۔''

''تم نے تصویریں کس وقت لی تھیں؟''

''رات کوئی دو بجے کے قریب۔''

''یعنی اس بات کو تقریباً تینتیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔ ''کیا تم نے اس کے بعد اس شخص کو دیکھا یا کوٹھی میں کوئی اور مشکوک سرگرمی دیکھی؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے بعد نہ تو وہ شخص نظر آیا اور نہ ہی کوٹھی میں کوئی سرگرمی نظر آئی ہے۔''

''شہلا رضوی کہاں ہے؟''

''وہ کوٹھی کے اندر ہے وہ کل شام کو کہیں گئی تھی اس کے بعد رات کو دیر سے واپس آئی ہے۔''

''تم نے اس کا پیچھا نہیں کیا؟''

''نہیں کیونکہ جب سے میں نے تصویریں لی ہیں عبداللہ صاحب نے مجھے مستقل کوٹھی کی نگرانی کرنے کا حکم دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے یہ میرا نمبر بھی نوٹ کر لو۔ اب تم کسی بھی معاملے میں عبداللہ کے ساتھ مجھے بھی رپورٹ دو گے یا مجھے بتاؤ گے کہ تم نے عبداللہ کو رپورٹ دے دی ہے۔''

''ٹھیک ہے سر۔''

میں نے فون بند کیا۔ شہلا رضوی میری توقع سے بڑھ کر تیز طرار عورت ثابت ہو رہی تھی۔ اگر بھاگنے کی کوشش کرنے والا بیتو نہیں تھا تب بھی اس نے کسی کو تو قید کر رکھا تھا۔ یہ کام اس نے دیدہ دلیری سے اپنی کوٹھی میں کیا ہوا تھا اور اسے اپنے شوہر کا خوف بھی نہیں تھا۔ ممکن رضوی کہیں دورے پر گیا ہوا ہو لیکن اسے کس کی مدد حاصل تھی وہ صرف اپنے بل بوتے پر تو کسی کو اس طرح قید نہیں رکھ سکتی تھی۔ فرار ہوتے آدمی کو دو افراد نے ناکام بنا کر قابو کیا تھا یعنی اسے کم سے کم دو افراد کی مدد حاصل تھی۔ میں اس بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ مجھے اندر گھس کر دیکھنا چاہیے۔ اگر بیتو ہوا تو معلوم ہو جائے گا۔ جیسے جیسے میں اس پر سوچتا رہا مجھے یہ خیال اچھا لگا۔ اندر جانے میں خطرہ تھا لیکن میں نے کس موقع پر خطرے کا سامنا نہیں کیا۔ میری تو زندگی ہی خطرات کا دوسرا نام بن گئی تھی۔ میں نے موبائل نکال کر شبیر کا نمبر ملایا۔

''جی سر؟'' اس نے پوچھا۔

''کوٹھی میں موجود کتا اس وقت کہاں ہوتا ہے؟''

''وہ دن میں کہیں بند کر دیا جاتا ہے میں نے اسے ہمیشہ رات میں آزاد دیکھا ہے اور اس وقت کوئی باہر نہیں آتا ہے۔ کتا صرف چوکیدار اور شہلا رضوی سے مانوس ہے۔''

''یعنی دن کے وقت وہ بند ہوتا ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے یہی دیکھا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''سنو مجھے اندر جانا ہے۔ تمہارے پاس موبائل کا ہینڈ فری ہے؟''

''سر میں اس درخت پر مستقل ہینڈ فری لگا کر ہی رکھتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''گڈ...... بیٹری کا مسئلہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں ابھی نصف ہے اور میرے پاس دو اضافی بیٹریاں ہوتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں اندر جانے سے پہلے تمہیں کال کروں گا اور تم مجھے گائیڈ کرو گے۔''

''میں سمجھ گیا سر۔''

میں نے کال کاٹ کر موبائل میں ہینڈ فری لگا اور اسے جیب میں رکھ لیا اب میں اسے ہاتھ میں لیے بغیر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں چوکیدار تھا۔ اس لیے میں نے عقبی راستہ اختیار کیا۔ پیچھے والی گلی چھوٹی تھی اور شاید استعمال بھی نہیں ہوتی تھی لیکن شہلا رضوی والی کوٹھی کے عقب میں مکمل خاردار تار تھی اور میں اس جگہ سے اندر جانے کی کوشش کرتا تو کپڑوں کے ساتھ خود بھی پھٹ جاتا۔ اس لیے میں نے آسان راستہ استعمال کیا اور برابر والی کوٹھی کی نیچی دیوار پھلانگ کر آرام سے اندر چلا گیا۔ پھر میں نے شبیر کو کال کی۔

''میں تمہارے دائیں طرف والی کوٹھی میں ہوں۔ یہاں سے شہلا کی کوٹھی میں جاؤں گا۔ ذرا اس کا معائنہ کرو سامنے کوئی ہے؟''

وہ دور بین سے دیکھ رہا تھا۔ ''نہیں سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

اس کوٹھی میں پیچھے کی طرف چھوٹی گلی تھی اور یہ گلی دونوں طرف سے گھوم کر سامنے والے حصے میں جا رہی تھی۔ میں شہلا والی کوٹھی کی طرف آیا۔ چلنے کے دوران میں آہستہ سے بات کر رہا تھا پتا نہیں اس کوٹھی میں کون کہاں ہو اور میری آواز سن لے۔

''چوکیدار کہاں ہے...... کوئی اور نظر آ رہا ہے؟''

''چوکیدار گیٹ پر ہے اور لان یا کوٹھی کے سامنے والے حصے میں کوئی نہیں ہے۔''

''میں دیوار پھلانگ رہا ہوں اگر کوئی اس طرف آئے تو مجھے خبردار کرنا۔'' میں نے کہا اور دیوار پر ہاتھ جما کر آرام سے اوپر چڑھ گیا اور پھر نیچے اتر گیا۔ اس جگہ سے کوٹھی کا کنارہ چند فٹ کے فاصلے پر تھا میں جلدی سے بغلی گلی میں آ گیا۔ شبیر نے کہا۔ ''آپ نظر آ رہے ہیں باقی سب کلیئر ہے۔''

''اوپر والی منزل؟''

''کوئی نہیں ہے۔''

میں بغلی گلی میں دبے قدموں آگے بڑھا یہاں تمام کھڑکیاں مکمل طور پر بند تھیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تب بھی میں اندر نہیں جا سکتا تھا۔ ان پر فولادی گرل تھی۔ ایک دروازہ آیا میں نے اسے آزمایا لیکن وہ اندر سے بند نکلا تھا۔ اس گلی میں یہی ایک دروازہ تھا۔ پھر میں پیچھے آ گیا۔ یہاں صرف کھڑکیاں تھیں اور دروازہ کوئی نہیں تھا۔ بنانے والے نے کچھ زیادہ ہی محفوظ کوٹھی بنائی تھی۔ بالآخر میں گھومتا ہوا بائیں طرف کی بغلی گلی میں آ گیا۔ یہاں بھی صرف ایک دروازہ تھا اور وہ بھی اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شہلا رضوی پوری طرح محتاط تھی۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ سامنے والے حصے سے اندر جاتا لیکن اس کے لیے میرا سامنے آنا ضروری تھا۔ یہ حصہ چوکیدار کی نظر میں تھا۔

''چوکیدار کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گیٹ کے اندر اس کے ساتھ ہی ٹہل رہا ہے۔''

''اسے کچھ دیر کے لیے باہر نہیں نکالا جا سکتا ہے؟''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' شبیر نے کہا میں گلی کے سرے تک آ گیا تھا اور یہاں سے مجھے چوکیدار نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ اس طرف دیکھتا تو میں بھی اسے نظر آ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ٹوپی کھینچ کر چہرے پر کر لی۔ اب دیکھنے والا کوئی شخص مجھے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ گیٹ اس جگہ سے کوئی سوفٹ دور تھا پھر بھی میں نے ٹن کی ہلکی سی آواز سن لی تھی۔ ایسا لگا جیسے کوئی پتھر گیٹ سے ٹکرایا ہو۔ چوکیدار نے اس پر فوری ردِعمل ظاہر کیا تھا اور وہ چھوٹا ذیلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''جلدی جناب...... وہ باہر ہے۔'' شبیر کی آواز آئی لیکن میں اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکا تھا۔ میں سامنے والے داخلی دروازے کی طرف دوڑا اور میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ کھلا ہو ورنہ میں اندر کیسے جاتا اور چوکیدار بھی ایک منٹ سے زیادہ باہر نہیں رکتا۔ میں دوڑ کر ٹیرس کے نیچے برآمدے میں آیا اور بڑے سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ اسے کھلا پا کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ مجھے شبیر کی آواز آئی۔

''وہ گیٹ کے اندر جا رہا ہے۔''

میں بلا تکلف اندر داخل ہو گیا اور اس دوران میں نے پستول بھی نکال لیا تھا۔ یہ سامنے والا حصہ تھا جہاں ایک بار میں مہمان خانے سے نکل کر داخل ہوا تھا مہمان خانہ اس کے برابر میں تھا۔ یہ ایک وسیع ہال میں کھلتا تھا جس میں ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھی۔ نیچے نشست گاہ، کھانے کا کمرہ اور دوسری جگہیں تھیں۔ بیڈ روم زاوپر ہی تھے۔ میں نے پہلے نیچے دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں ہال میں ایک طرف موجود دروازے تک آیا اور میں نے اسے کھول کر اندر دیکھا۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا اور اس کے برابر میں کچن تھا۔ ہال کے دوسری طرف کئی کمرے تھے جن میں اسٹڈی اور شاید ٹی وی لاؤنج بھی تھا۔ میں اس طرف آیا اور یہاں بھی دیکھ لیا لیکن یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سب اوپر تھے۔

اوپر جانے والا راستہ ذرا خطرناک تھا کیونکہ اگر کوئی اوپر سے اچانک آ جاتا تو میرے لیے چھپنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں نے اوپر جانے سے پہلے شبیر سے کہا۔ ''اگر یہاں ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہو گئی تو تم میری کیا مدد کر سکو گے؟''

''میں سامنے سے آ سکتا ہوں یا جیسا آپ حکم کریں؟''

''اگر یہاں مقابلے کی صورتِ حال ہوئی تو تم چوکیدار کو قابو کرو گے۔ اسے مارنا مت جب تک ناگزیر نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ اس وقت میں بہت محتاط تھا۔ میرے قدم بے آواز اٹھ رہے تھے اور میرے کان اوپر سے آنے والی آوازوں پر لگے تھے۔ مگر اوپر سناٹا تھا۔ میں نے لاؤنج میں قدم رکھا تو تمام دروازے بند تھے۔ اوپر میرے حساب سے تین بیڈروم تھے۔ ایک شہلا کا تھا اور باقی دو یقیناً دیگر استعمال کے لیے ہوں گے۔ لاؤنج بھی خالی تھا۔ میں نے پہلے شہلا کے بیڈروم کے علاوہ دوسرے بیڈروم دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ ایک کے دروازہ ہینڈل گھمایا وہ کھلا تھا۔ میں نے بہت آہستہ سے اسے کھولا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ اسی لمحے شہلا کے بیڈروم سے کسی کے کھنکارنے کی آواز آئی اور آواز مردانہ تھی۔ میں تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ آہستہ سے بند کر لیا۔ یہ شہلا کے بیڈروم کے برابر والا کمرہ تھا۔ اس کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی کھلتا تھا۔ میں اس دروازے تک آیا اور کان لگا دیئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا شوہر گھر میں ہی تھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے شہلا کی غنودہ سی آواز سنی۔

''چپ......'' مرد نے کہا۔ ''ادھر کوئی ہے۔''

مجھے اپنے کانوں پر شبہ ہوا تھا۔ یہ فتح خان کی آواز تھی لیکن نہیں فتح خان یہاں کہاں سے آ گیا۔ میں نے جھک کر کی ہول سے جھانکا۔ شہلا بولی۔ ''تمہیں وہم ہوا ہے۔''

''چپ کر...... کا بچی۔'' فتح خان نے اس بار اسے گندی گالی دی تھی۔ ''وہ تمارا باپ شہباز خان کو کم نہیں سمجھو۔ وہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے۔''

''تو دفع ہو کر دیکھو۔'' شہلا نے بھنا کر کہا۔ ''میری نیند کیوں حرام کر رہے ہو۔''

''کتیا بھونکتی جا رہی ہے۔'' فتح خان نے غالباً اسے تھپڑ رسید کیا تھا کیونکہ آواز کچھ ایسی ہی آئی تھی۔ فتح خان کی اس بیڈروم میں موجودگی اور شہلا سے اس کی گفتگو نیز تھپڑ سے مجھے بہ خوبی انداز ہو گیا تھا کہ ان میں تعلقات کہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شہلا رضوی ایک بہت بڑے سرکاری افسر کی بیوی اور خود بھی بے حد حسین و جمیل عورت تھی۔ فتح خان نہ صرف عمر میں اس سے بڑا اور رتبے میں اس سے چھوٹا تھا پھر شکل پر بھی پھٹکار برستی تھی۔ شہلا نے کیا دیکھ کر خود کو اس کے سپرد کیا تھا۔ میں ساکت ہو کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ فتح خان کو یہاں موجود پا کر مجھے حیرت ہوئی تھی لیکن اب میں اس بات کا عادی بھی ہو گیا تھا وہ ہمیشہ مجھے غیر متوقع طور پہ ٹکراتا تھا۔ شاید یہی خیال اس کا میرے بارے میں بھی ہو کہ میں اسے ہمیشہ سرپرائز دیتا ہوں اور ابھی بھی اسے یہی خدشہ تھا لیکن سوال یہ تھا کہ خدشہ کیوں تھا۔ میں یقیناً بلا وجہ اس کے پیچھے نہیں آ سکتا تھا۔

معاملہ صاف تھا۔ بیتو فتح خان کے قبضے میں تھا اور فتح خان شہلا رضوی کے پاس موجود تھا۔ اس لیے شبیر نے جس آدمی کی فرار کے وقت تصویر لی تھی وہ بیتو ہی تھا۔ البتہ ایک بات سوال طلب تھی کہ فتح خان شہلا رضوی تک کیسے پہنچا۔ جہاں تک اس کے بیڈروم تک رسائی کی بات ہے تو یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فتح خان یہ کام

اسلحے کے زور پر باآسانی کرسکتا تھا۔ اس کی فطرت کا یہ پہلو پوشیدہ نہیں تھا وہ عورتوں کا شائق تھا اور اس سے پہلا تعارف بھی اسی وجہ سے ہوا تھا۔ شینا اس کی منظور نظر تھی حالانکہ وہ کسی اور کی بیوی تھی۔ پھر اس نے ایک غریب اور معصوم لڑکی کو اغوا کر کے اس سے زبردستی نکاح پڑھوالیا اور وہ بمشکل اس کے چنگل سے نکلی تھی۔ اب وہ ایک اور شادی شدہ عورت شہلا کے بیڈروم میں موجود تھا۔ عورتوں کے محاذ پر اس کی فتوحات کا دائرہ یقیناً اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا کیونکہ میں یا کوئی اس کے تمام کرتوتوں سے واقف نہیں تھا۔

میں نے بیڈروم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ فتح خان یقیناً باہر آیا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ مسلح تھا اور یقیناً ان کمروں میں بھی آتا۔ میں دروازہ اندر سے بند نہیں کرسکتا تھا ورنہ پکڑا جاتا۔ یہاں چھپنے کے لیے سوائے باتھ روم کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے چھپنے کے بجائے سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اور دروازے کے پیچھے کھڑا ہوگیا لیکن فتح خان کمروں کی طرف آنے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ مجھے ایک خیال آیا اور میں نے شہلا کے بیڈروم میں کھلنے والا دروازہ چیک کیا۔ وہ کھلا ہوا تھا اور میں نے بہت آہستگی سے اسے کھولا۔ اگر شہلا جاگ رہی تھی اور اس کی نظر اس طرف ہوتی تو وہ یقیناً چوکنا ہوجاتی لیکن فتح خان کے مقابلے میں اسے قابو کرنا زیادہ آسان تھا۔ میں نے اندر کمرے میں جھانکا تو شہلا بیڈ پر کمبل میں روپوش نظر آئی تھی اور وہ اگر سو نہیں رہی تھی تب بھی غنودگی میں تھی۔ میں دبے قدموں اس کے پاس پہنچا اور کمبل ذرا سا سرکا کر اس کا جائزہ لیا اور پھر اس کی گدی پر نپا تلا ہاتھ مارا اور وہ وہیں ساکت ہوگئی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور نبض دیکھنے کے لیے مجھے کمبل ہٹانا پڑا تھا۔ میں نے بے ساختہ لاحول پڑھی۔ جو رہا سہا شک تھا وہ اسے دیکھ کر دور ہوگیا تھا۔ میں نے اسے کمبل سے کھینچ کر نیچے قالین پر ڈالا اور پھر رول کر کے اسے بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ موسم سرد تھا لیکن اندر کا درجہ حرارت معتدل تھا اس لیے میں نے اسے ڈھانپنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ بستر کی چادر ٹھیک کی اور خود اس کی جگہ لیٹ گیا۔ میں نے دل میں کہا۔

”فتح خان آج کے سرپرائز کو تم بھی یاد کرو گے۔“

وہ کوئی دس منٹ بعد آیا تھا۔ شبیر میرے ساتھ لائن پر تھا لیکن وہ عقل مند تھا اس نے ایک بار بھی مجھے خود سے مخاطب نہیں تھا۔ میں نے موبائل کے تمام فیچرز کو سائلنس پر لگا دیا تھا یعنی اب وہ بے آواز تھا۔ فتح خان نے اندر آ کر کسی کو ایک شاندار گالی دی۔ ”...... کا بچہ سوتا ہے نگرانی اس کا باپ کرے گا۔“

میرا دل دھڑک اٹھا نگرانی سے کیا مراد تھی۔ کیا بیتو یہیں تھا اور یہیں تھا تو مجھے کیوں نظر نہیں آیا اور پھر اس سوال کا جواب الہام کی طرح میرے ذہن میں آیا تھا کہ بیتو یقیناً مہمان خانے میں قید تھا اور فتح خان کے آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے اسے خطرہ تھا کہ کہیں بیتو فرار نہ ہوجائے یا کہیں میں اسے چھڑا کر نہ لے جاؤں۔ فتح خان میری طرف آیا اور اس نے اس بار گالی سے بھی زیادہ واہیات بات کی تھی۔ اگر شہلا ہوش میں ہوتی تو اس کی بات سن کر بھی بے ہوش ہوسکتی تھی لیکن بے ہوش فتح خان ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے کمبل سرکایا۔ میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور پستول کا دستہ اس کی کنپٹی پر لگا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں حیرت منجمد ہوگئی تھی پھر وہ میرے اوپر ہی لڑھک گیا تھا۔

میں نے اسے ایک طرف دھکیلا اور اٹھ بیٹھا۔ میں نے پہلے اس کی نبض دیکھی۔ وہ کم سے کم ایک گھنٹے کے لیے دنیا کے جھمیلوں سے آزاد ہو گیا تھا لیکن میں اس پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بارہا اسی طرح میرے قابو میں آیا تھا اور موقع ملتے ہی فرار ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے شہلا کی شال کے ٹکڑے کیے اور اس سے فتح خان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور باقی بچ جانے والی چادر اس کے منہ میں ٹھونس دی تھی۔

اس کے بعد میں باہر آیا اور نیچے کا رخ کیا۔ شبیر لائن پر تھا میں نے پوچھا۔ ''چوکیدار کہاں ہے؟''

''گیٹ پر۔'' اس نے کہا۔ ''ایک آدمی باہر آیا تھا اور مرکزی دروازے کے برابر ایک دروازے میں گیا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔''

''میں جانتا ہوں اب وہ میرے قابو میں ہے۔''

''اس کے بعد ایک اور شخص اندر گیا ہے۔'' شبیر نے بتایا اور میں سیڑھیاں اترتے اترتے رک گیا۔

''کتنی دیر ہوئی ہے؟'' میں نے آواز دھیمی کر لی۔

''پانچ منٹ ہوئے ہیں۔''

''تم کو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔'' میں نے برہمی سے کہا اور پستول سامنے کر لیا۔ اندر آنے والا یقیناً فتح خان کا آدمی تھا۔ میں دبے قدموں نیچے آنے لگا۔ شبیر نے ندامت سے کہا۔

''میں سمجھا کہ آپ کو پتا ہوگا۔''

''مجھے نہیں معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں چپ رہوں گا لیکن تمہیں کوئی بات کہنی ہو تو فوراً کہنا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''

میں ہال میں آیا تو کچن کی جانب سے کھڑ پڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ شخص کسی کام سے کچن میں آیا تھا۔ میں نے ڈائننگ روم میں جھانکا۔ وہ میری طرف پشت کیے چولہے پر کچھ بنا رہا تھا میری ناک نے چائے کی خوشبو محسوس کی اور میں دبے قدموں اندر آ گیا۔ کیتلی سے سیٹی کی سی آواز نکل رہی تھی اس لیے اسے میری آمد کا پتا نہیں چلا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور نیک لاک میں پھنسا لیا۔ اس نے تڑپ کر ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ باہر نکلتے ہی پستول چھین لیا۔ وہ اچھا صحت مند نوجوان تھا لیکن میری گرفت میں صرف پھڑ پھڑا سکتا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔

''اگر تم اسی طرح زور لگاتے رہے تو اپنی گردن ٹوٹنے کے ذمے دار خود ہو گے۔''

وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اس کا پستول چولہے کے پیچھے پھینک دیا اور اپنا پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ''میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں لیکن غیر ضروری حرکت اور بولنے سے پرہیز کرنا۔''

اس نے سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کی تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا ہو کر اپنی گردن مسلنے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''کون ہو تم اور اندر کیسے آئے؟''

''سوال مجھے کرنا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''تم لوگوں کا قیدی کہاں ہے؟''

''کون قیدی؟'' اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''وہ جسے تم لوگوں نے بھاگتے ہوئے بالکونی سے پکڑا تھا۔''

وہ بری طرح چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

میں نے پستول اس کی طرف سیدھا کیا۔ ''بکواس کرنے کے بجائے میرے سوال کا جواب دو اور اس امید میں مت رہنا کہ کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔ فتح خان اوپر بے ہوش پڑا ہے۔''

اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ اس بار اس نے شرافت سے جواب دیا۔ ''وہ گیسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں قید ہے۔''

''وہاں اور کتنے لوگ ہیں؟''

''ایک اور ہے۔'' اس بار بھی اس نے سچ بولا اور میں نے اس کے انعام میں اس کے سر پر ایک عدد ضرب لگائی اور وہ کراہ کر فرش پر لڑھک گیا۔ اس کی بے ہوشی کو طویل کرنے کے لیے مجھے دوسری ضرب لگانی پڑی تھی۔ کیونکہ اس نے اس نے ہڈ والا اپر پہن رکھا تھا اس لیے پہلی ضرب زیادہ زوردار نہیں تھی۔ میں نے اس کا اپر اتارا اور خود پہن لیا۔ اب اگر چوکیدار مجھے دیکھتا تو فتح خان کا آدمی ہی سمجھتا۔ میں نے چولہا بند کیا اور باہر آیا۔ اپنا چہرہ میں نے ہڈ میں ہی رکھا تھا۔ مہمان خانے میں داخل ہو کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یہاں کل چار کمرے تھے۔ بیتو ان میں سے کسی ایک میں قید تھا اور کسی ایک میں فتح خان کا دوسرا آدمی تھا۔ اس نے خود بتا دیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن لی تھی اور بلند آواز سے بولا۔

''کہاں مر گیا ہے چائے کب لائے گا۔''

میں اس کمرے کی طرف بڑھا اور رخ پھیر کر اندر داخل ہوا وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ فتح خان نے یقیناً ان کی کلاس لی تھی کیونکہ وہ بیتو کی نگرانی کرنے کے بجائے سو رہے تھے۔ اپر کی وجہ سے وہ مجھے اپنا ساتھی سمجھا تھا البتہ جب میں اس کے قریب آیا تو وہ میری پتلون اور جوتے دیکھ کر چونکا اور اس کا ہاتھ تیزی سے سرہانے رکھے ہتھیار کی طرف گیا تھا لیکن میں نے اس کے ہاتھ پر لات ماری اور اس کی پیش قدمی رک گئی۔ اس نے ایک اذیت بھری آواز کے ساتھ اپنی ٹوٹ جانے والی کلائی پکڑ لی تھی۔ میں نے بالوں سے کھینچ کر اسے نیچے گرایا اور پستول اس کے سر پر مار کر اسے بھی لمبا لٹا دیا۔ میں کسی کے ساتھ رعایت کے لیے تیار نہیں تھا۔ فتح خان جیسے شخص کے ساتھیوں کو لازمی خطرناک ہونا چاہیے تھا۔

میں باہر آیا اور کمروں کے دروازے چیک کیئے ان میں سے ایک لاک نکلا تھا۔ میں واپس بے ہوش ہونے والے کے پاس آیا اور اس کی جیب کی تلاشی لی۔ چابی اس کے پاس نہیں تھی وہ مجھے ایک طرف دیوار کے ساتھ کی ہولڈر پر لٹکی ملی۔ اسے لے کر واپس آیا اور بیتو کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بستر پر سکڑا سمٹا لیٹا ہوا تھا اس سردی میں اس کے پاس اوڑھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اس کی صحت بہت کمزور لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کھانے پینے کو ٹھیک سے نہیں ملا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ اس کے ساتھ قید میں برا سلوک ہوا تھا۔ میں نے اپر اوپر کیا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر اسے آواز دی۔ ''بیتو...... میری جان۔''

وہ نیند میں کسمسایا۔ ''شوبی......''

''میں ہوں بیتو...... اٹھ جاؤ۔'' اس بار میں نے اسے سہلایا۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ سچ مچ شوبی بھائی

ہے یا ہم پھر خواب دیکھ رہا ہے؟''

''بیتو تم جاگ رہے ہو میں تمہیں لینے آیا ہوں اٹھ جاؤ۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔'' آپ شوبی ہے۔'' اس نے بمشکل کہا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ مجھ سے لپٹا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کا جسم بہت کمزور ہو گیا ہے اس کی ہڈیاں محسوس کی جا سکتی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''بیتو یہ تمہیں کیا ہوا؟'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ان حرامزادوں نے کھانا پانی بند کر دیا ہے۔ دو دن سے نہ کھانے کو دیا ہے اور نہ پینے کو۔''

میرا خون ایک بار پھر کھولنے لگا تھا۔ فتح خان بالآخر اپنے مخصوص گھٹیا پن پر اُتر آیا تھا۔''دو دن سے کیوں؟''

اس نے وضاحت کی۔''ہم نے ادھر سے فرار کا کوشش کیا تھا۔ پکڑا گیا تو فتح خان نے ہمارا کھانا پینا بند کر دیا۔'' بیتو کا لہجہ دکھی ہو گیا تھا۔ کھانا اس کی کمزوری تھی اور وہ بھوکا نہیں رہ سکتا تھا۔

''بیتو فکر مت کرو فتح خان میرے قبضے میں ہے اور جلد وہ تمہاری جگہ بھوک پیاس برداشت کرے گا۔'' میں نے اسے بتایا۔

''وہ آپ کے قبضے میں ہے۔'' بیتو نے مسرت سے کہا۔''اب ہم اس سے بدلہ لے گا۔''

''بالکل لے گا لیکن ابھی یہاں سے نکلنے کا سوچو۔'' میں نے کہا۔''یہاں فتح خان کے علاوہ دو آدمی اور ملے ہیں میں نے ان کو بھی بے ہوش کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ اور تو کوئی نہیں ہے؟''

''ہم نے بس یہی دو دیکھا ہے، اس کے علاوہ بھی ہے تو ہم کو نہیں معلوم ہے۔''

''تم چل پھر سکتے ہو؟''

''ہم بالکل ٹھیک ہے۔'' وہ بستر سے اتر آیا۔ اس سرد موسم میں اس نے ایک ہلکی جرسی کی شرٹ اور سوتی ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ وہ نیچے اترا تو اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی لیکن وہ سنبھل گیا۔''دیکھا بالکل ٹھیک ہے۔''

''میرا خیال ہے یہاں سے نکلنے سے پہلے تمہاری پیٹ پوجا کا کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا اور شبیر سے بولا۔''باہر کی کیا پوزیشن ہے؟''

بیتو بھونچکا رہ گیا۔''کیا..... کیا بولتا شوبی بھائی۔''

''یار تم سے نہیں کہہ رہا۔'' میں نے اسے ایئر فون دکھایا۔''باہر ایک ساتھی ہے اس سے بات کر رہا ہوں۔''

''پوزیشن کلیئر ہے سر۔'' شبیر نے کہا۔

''میں نے اندر ٹیک اوور کر لیا ہے۔ یہاں سے کچھ لوگوں کو منتقل کرنا ہے جلد از جلد۔''

''میں سمجھ گیا سر۔'' اس نے کہا۔''میں باس سے بات کرتا ہوں۔''

''نہیں باس سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے میں چوکیدار کو قابو کرتا ہوں اور تم اندر آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے جناب۔''

میں نے اپر اوپر کیا بیتو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''شوبی بھائی بہت اچھے لگ رہے ہو صحت خوب بنا لی ہے۔''

''ہاں یار اب تک گھر میں تھا اس لیے خوب مزے کیے۔ سمجھ لو دو دن پہلے تک آرام ہی کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''بیتو اب تمہیں قیدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ میں تمہیں بہ ظاہر کوٹھی کے اندر لے جاؤں گا اور تم باہر نکل کر نیچے گر پڑو گے جیسے بے ہوش ہو گئے ہو اور میں مدد کے لیے چوکیدار کو بلا لوں گا۔''

''ہم سمجھ گیا...... اس طرح آپ اسے بھی قابو کر لے گا۔''

''بالکل کیونکہ اس کوٹھی میں بس وہی قابو میں نہیں ہے۔ اس کے بعد ہمیں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔''

''ہم تیار ہے۔'' اس نے کہا۔

میں پہلے دوسرے کمرے میں آیا اور یہاں موجود شخص کو باندھ دیا۔ میں اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا ان میں سے ایک بھی ہوش میں آجاتا تو ہم مشکل میں پڑ جاتے اور پھر اسے بیتو والے کمرے میں ڈال دیا۔ میں اور بیتو باہر آئے۔ بیتو آگے تھا اور میں اسے دھکیل رہا تھا۔ بیتو نے اداکاری شروع کر دی اور اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ مہمان خانے سے باہر نکلتے ہی وہ لان پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کا انداز بالکل فطری تھا اور ایک لمحے کو مجھے خدشہ ہوا کہ وہ سچ مچ نہ بے ہوش ہو گیا ہو۔ میں نے جھک کر آہستہ سے کہا۔

''بیتو ٹھیک ہو نا؟''

''جی شوبی بھائی آپ چوکیدار کو بلاؤ'' اس نے آنکھیں کھولے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے اسے ہلایا جلایا اور پھر گیٹ کی طرف دیکھا۔ چوکیدار اس طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے میں بیتو کے پاس بیٹھ گیا اور اسے ہلانا جاری رکھا۔ جب تک کہ چوکیدار نے ہماری طرف نہیں دیکھ لیا۔ وہ چونکا اور پھر بغیر بلائے ہی ہماری طرف آنے لگا۔ پاس آکر اس نے برہمی سے کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے ادھر کیا کر رہے ہو؟...... کوئی دیکھ لے تو مصیبت بن جائے گی۔''

''یہ'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''بے ہوش ہو گیا ہے۔''

چوکیدار تقریباً چالیس بیالیس برس کا تنومند شخص تھا اور وہ جیسے ہی بیتو کی طرف جھکا میں نے بلا تکلف اس کی گدی پر پستول کا دستہ رسید کیا اور وہ بیتو پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا۔ بیتو نے اسے ایک طرف دھکیلا۔ یہ اس روز میرا پانچواں شکار تھا۔ میں نے اسے گھسیٹا اور اسے بھی لے جا کر اس کمرے میں ڈال دیا جس میں بیتو کو قید کیا ہوا تھا۔ اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''جا کر گیٹ کھول دو تا کہ باہر والا ساتھی اندر آجائے اور اسے یہ چابی دے دینا۔'' میں نے کار کی چابی دی۔ پھر شبیر سے کہا۔ ''گلی کے سرے پر وٹز کار کھڑی ہے اسے کوٹھی کے اندر لے آؤ۔''

''یس سر۔'' اس نے جواب دیا اور میں نے اس بار کال کاٹ دی۔ میرے موبائل کی بیٹری بہت کم رہ گئی تھی اور کسی ہنگامی موقع پر یہ جواب بھی دے سکتی تھی۔ بیتو گیٹ کی طرف چلا گیا اور میں اندر آیا۔ سیڑھیوں سے اوپر آیا اور بیڈ روم میں دیکھا۔ فتح خان بے ہوش پڑا تھا لیکن جب میں نے بستر کے نیچے دیکھا تو شہلا غائب تھی۔ میرے اندر فوراً خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ وہ میری توقع کے برخلاف جلدی ہوش میں آگئی تھی اور یہاں سے

نکل چکی تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی تھی یا یہیں کہیں چھپی ہوئی تھی؟ مجھے علم نہیں تھا۔

میں نے پستول نکال لیا اور کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہ یہاں نہیں تھی۔ میں نے واش روم میں بھی دیکھا۔ اسی لمحے مکان کے باہر سے کسی گاڑی کا انجن غرایا اور میں ٹیرس کی طرف لپکا۔ جیسے ہی میں ٹیرس میں آیا مجھے ایک کار نکل کر گیٹ کی طرف جاتی دکھائی دی۔ بدقسمتی سے بیتو نے بڑا والا گیٹ کھول دیا تھا اور شہلا اسے ٹکر مار کر پورا کھولتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ بیتو چھلانگ لگا کر ایک طرف نہ ہوجاتا تو وہ بھی کار کی زد میں آجاتا۔ اب یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ شہلا باہر جا کر یقیناً کوئی کارروائی کرتی۔ فی الحال تو وہ میرے چنگل سے نکل کر بھاگی تھی۔ باہر جا کر وہ پولیس کو بھی کال کرسکتی تھی ان لوگوں کے بارے میں اس کے لیے کوئی کہانی بنانا مشکل نہیں تھا اور پولیس بھی اس کی بات مانتی کہ وہ ایک بڑے بیوروکریٹ کی بیوی تھی۔

میں تیزی سے واپس بیڈروم میں آیا اور فتح خان کو اٹھا کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ کم بخت کا وزن خاصا تھا حالانکہ دیکھنے میں وہ اتنا وزنی نہیں لگتا تھا۔ میں اسے نیچے لایا۔ اس کے چیلوں کو لے جانا بے کار تھا۔ جیسے ہی میں باہر آیا۔ گیٹ سے شبیر کار لے آیا تھا اس نے بالکل ٹیرس کے سامنے روکی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے فتح خان کو اندر ڈالا اور بیتو کو جلدی آنے کا اشارہ کیا وہ گیٹ کی طرف سے آرہا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی شبیر نے کار چلا دی اور بیتو کے پاس پہنچ کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ بیتو اندر آگیا۔ اس دوران میں میں نے فتح خان کو سیٹوں کے درمیانی خلا میں ٹھونس دیا تھا اور خود اس کے اوپر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔ اب جب تک کوئی بالکل پاس آکر نہیں دیکھتا اسے فتح خان نظر نہیں آتا۔

''ایسی سڑکوں سے گزرنا جہاں ٹریفک کم ہو۔'' میں نے شبیر سے کہا۔

''جی جناب۔'' وہ بولا۔

''تم نے شہلا کو کار میں جاتے دیکھا؟''

وہ چونکا۔ ''کیا وہ نکل گئی؟''

''ہاں وہ اپنی گاڑی میں نکل بھاگی ہے۔''

''نہیں میں نے اسے نہیں دیکھا شاید وہ دوسری طرف سے نکل گئی ہو۔'' شبیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا اس کا پیچھا کرنا ہے؟''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ کہیں نہیں جائے گی صرف عارضی طور پر بھاگی ہے۔ واپس یہیں آئے گی۔'' میں نے فتح خان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اصل آدمی یہ ہے سمجھ لو اس کا ہاتھ آنا ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔''

''شوبی بھائی آپ کا قسمت اچھا ہے۔'' بیتو نے مڑ کر کہا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا چند دن سے قسمت مجھ پر مہربان تھی پہلے شریف نامی اہم مہرہ ہاتھ آیا اور اب فتح خان ہاتھ آگیا تھا۔ میں نے بیتو سے پوچھا۔ ''فتح خان نے تمہیں اپنے قبضے میں رکھا تھا؟''

''ہاں ہم کو نہیں معلوم کہ وہ آپ کو کدھر لے گیا تھا جب آپ واپس نہیں آیا تو ہم نے بہت ہنگامہ کیا تھا۔ یہ حرامی ہم کو پٹواتا تھا۔''

''شہلا کی کوٹھی میں کیسے آئے؟''

''یہ تو ہم کونہیں معلوم لیکن آپ دو دنیا کو بھول رہا ہے وہ بھی فتح خان کے قبضے میں تھا اس نے شہلا کا بتایا ہو گا۔''

میں چونک گیا بیتو درست کہہ رہا تھا۔شہلا تک فتح خان کی رہنمائی دو دنیا نے کی ہو گی اور جب اسے پتا چلا ہو گا کہ شہلا بلیک میلنگ کا شکار ہو کر پروفیسر کے سامنے مجبور تھی تو اس نے بھی شہلا سے فائدہ اٹھانے کا سوچا ہو گا۔فتح خان جیسے لوگ موقع سے اور خاص طور سے دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے سے کبھی نہیں چوکتے ہیں۔وہ اس سے کس طرح فائدہ اٹھا رہا تھا یہ تو میں خود بھی دیکھ چکا تھا۔ مجھے فتح خان اور مرشد کے تعلقات کے بارے میں علم نہیں تھا۔فتح خان مجھے اس بارے میں جو بتا تا رہا ہے میں نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ فتح خان کی گمشدگی کا مرشد پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔اگر وہ اس کے لیے کام نہیں بھی کر رہا تھا تب بھی وہ مرشد کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

شبیر میری ہدایت کے مطابق سنسان سڑکوں پر کار گھما رہا تھا اور اسی وجہ سے ہم خاصے لمبے روٹ سے کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔''ایک بڑا شکار ہاتھ لگا ہے اسے ساتھ لا رہا ہوں۔ استقبال کی تیاری کرو۔''

عبداللہ نے پوچھا نہیں۔وہ سمجھ گیا تھا کہ میں ساتھ لانے والے کے لیے بھی ایسا انتظام چاہ رہا ہوں جیسا کہ شریف کے لیے کیا تھا۔ جب گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی تو عبداللہ منتظر تھا۔اس کے ساتھ منیر تھا۔عبداللہ نے بے ہوش فتح خان کو دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔وہ فتح خان کونہیں پہچانتا تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ فتح خان ہے۔''

''فتح خان۔''اس نے بے یقینی سے کہا۔''سچ میں۔''

''سوفی صد۔''میں نے مسکرا کر کہا۔اب اسے اندر لے جاؤ اور فوراً بند کر دو۔میری طرح یہ بھی فرار کا ماہر ہے اور جب تک میں نہ آؤں کوئی اس کے قریب نہ جائے۔''

عبداللہ چونکا۔''آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

میں نے سر ہلایا۔''عتیق کو دیکھنے جا رہا ہوں۔صبح اسے دیکھنے گیا تھا لیکن اسپتال والوں نے رفیق بھائی کی غیر موجودگی میں دیکھنے کا اجازت نہیں دی۔اب جا کر دیکھتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ دبئی سے کوئی خبر آئی؟''

''ہاں......راجا صاحب کے آدمی نے وہاں سے کنفرم کر لیا ہے کسی ایسے حادثے کی رپورٹ نہیں آئی ہے جس میں ان ناموں والے افراد شامل ہوں۔''

بیتو چونکا۔''دبئی......ادھر کیا ہوا ہے؟''

''وہ لوگ چار دن سے غائب ہیں گھر خالی ہے اور کچھ پتا نہیں کہ کہاں چلے گئے ہیں۔''میں نے بتایا۔ ''اب ان کی تلاش بھی کی جا رہی ہے۔''

بیتو کا چہرہ ستا گیا تھا اور اس پر چند لمحے پہلے جو خوشی تھی وہ معدوم ہو گئی۔''ہم تو سمجھا کہ صرف ہم مشکل میں ہے اور باقی آرام سے ہو گا۔''

''نہیں یار ہمارے مقدر میں آسانی کہاں ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''اب تم آرام سے کھا پی کر جان بناؤ اس کے بعد میدان عمل میں آجانا۔''

''کیا کس میدان میں آجانا؟'' بیتو سمجھا نہیں۔

''برخوردار کام پر واپس آجانا۔''

اس نے دانت نکالے۔ ''اچھا...... اچھا ہم سمجھا نہیں تھا۔''

شبیر منتظر تھا کہ اسے مزید ہدایات دی جائیں۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم واپس جاؤ اور کوٹھی کی نگرانی جاری رکھو۔''

''ٹھیک ہے آپ مجھے راستے میں کسی ایسی جگہ اتار دیجئے گا جہاں سے رکشہ ٹیکسی مل جائے۔ میری بائیک وہیں رہ گئی ہے۔''

فتح خان کو عبداللہ اور منیر اندر لے گئے تھے۔ میں نے شبیر سے کہا۔ ''ٹھیک ہے آجاؤ...... تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

اس نے اپنی شرٹ اوپر کر کے دکھائی۔ اس کی بیلٹ کے ساتھ ایک چھوٹا سا پستول لگا ہوا تھا۔ ہم روانہ ہو گئے۔ میں نے اسے ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے وہ ٹیکسی لے سکتا تھا۔ اس کے بعد میں اسپتال کی طرف روانہ ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ عتیق کو اٹینڈ کرنے والے ڈاکٹر سے اس کے بارے میں تفصیلی بات کرلوں کہ اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا اور اسے ہوش کیوں نہیں آرہا تھا لیکن اس تک رسائی کے لیے رفیق بھائی کی موجودگی لازمی تھی اس لیے میں نے ان کو کال کی۔ اس بار ان کا نمبر مل گیا۔

''رفیق بھائی میں اسپتال جا رہا ہوں صبح بھی جا چکا ہوں لیکن اسپتال والے آئی سی یو میں آپ کی موجودگی کے بغیر جانے نہیں دے رہے۔''

''مجھے پتا چلا تھا میں نے وہاں بتا دیا ہے اب تم جاؤ گے تو نہیں روکا جائے گا لیکن کیا تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے تب تم وہاں پہنچ کر مجھے کال کر دینا۔''

''میں پہنچ کر کال کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اپنا چہرہ غیر نمایاں کرنے کے لیے میں نے ٹوپی کے بجائے سن گلاس پہن لیا۔ اسپتال کی پارکنگ میں کار کھڑی کر کے میں آئی سی یو کی طرف آیا۔ استقبالیہ پر وہی آدمی تھا۔ میں نے اس سے عتیق کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھ سے شناختی کارڈ مانگا۔ ''سوری وہ میں بھول گیا ہوں لیکن میں عتیق کے والد سے بات کرا دیتا ہوں۔'' میں نے رفیق بھائی کا نمبر ملایا۔ ''رفیق بھائی میں یہاں اسپتال میں ہوں۔''

''میری ریسیپشن سے بات کراؤ۔''

میں نے موبائل آدمی کی طرف بڑھا دیا۔ ''بات کریں۔''

اس نے موبائل لے لیا اور میں نے آس پاس دیکھا۔ آئی سی یو ہونے کی وجہ سے یہاں عام آمد و رفت

نہیں تھی۔ صرف ڈاکٹرز اور نرسیں آجا رہے تھے۔ میرے سامنے سے ایک ڈاکٹر گزرا۔ مجھے تھوڑا سا عجیب سا لگا تھا۔ کیونکہ وہ صرف کوٹ کی حد تک ڈاکٹر نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال لمبے اور شانوں تک آ رہے تھے۔ رنگ سیاہی مائل سرخ اور داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ یا گلے میں کچھ نہیں تھا۔ بہر حال یہ ایسی اہم بات نہیں تھی کیونکہ آج کل ہر شعبے میں ہر طرح کا آدمی نظر آتا ہے۔ اگر وہ ریچھ نظر آ رہا تھا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر نہ ہو۔ استقبالیہ کا آدمی رفیق بھائی سے بات کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔

''ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں لیکن خیال رکھیے گا۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں رکنا ہے اور کوئی شور نہ ہو۔'' اس نے شائستگی سے کہا۔ ''کمرہ نمبر بائیس ہے۔ سامنے دائیں طرف واقع ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے موبائل جیب میں رکھ لیا۔ ''میں خیال رکھوں گا۔''

میں آگے بڑھ گیا۔ بائیں طرف جنرل وارڈ تھا اور دائیں طرف پرائیویٹ رومز تھے اور مجھے بائیس نمبر تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ عبداللہ کا آدمی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ان میں سے ایک تھا جو عبداللہ کے ساتھ میانوالی سے آئے تھے۔ یہاں دکھاوے کے لیے اس نے گارڈ کی وردی پہن رکھی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور اس سے کہا۔

''مجھے اندر جانا ہے۔''

لیکن وہ حرکت کرنے کے بجائے اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا تھا۔ مجھے اس کا انداز غیر فطری لگا تھا۔ میں نے جھک کر اسے دیکھا تو وہ بالکل ساکت تھا۔ اس کی ٹوپی ماتھے پر آگے تک آ رہی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلایا۔ ''تم سن نہیں رہے ہو۔''

وہ یک دم گرا تو میں نے بمشکل اسے سنبھالا تھا۔ وہ بے ہوش تھا یا پھر...... میں نے خدشے کے ساتھ اس کی ٹوپی اوپر کی تو اس کے عین ماتھے پر چھوٹا سا سوراخ نظر آیا جس سے ذرا سا خون نکل کر اس کی آنکھوں تک آیا ہوا تھا۔ کسی نے بڑے سوئے نما چیز سے اس کے ماتھے پر وار کیا تھا اور وہ شاید فوراً ہی مر گیا تھا۔ اچانک مجھے عتیق کا خیال آیا اور میں پستول نکالتے ہوئے کمرے کے اندر گھسا۔ مجھے وہی لمبے والوں والا ڈاکٹر عتیق کے بیڈ کے دوسری طرف کھڑکی کے ساتھ کھڑا نظر آیا اس نے عتیق کے منہ سے آکسیجن ماسک اتار دیا تھا اور وہ بے ہوشی میں اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہی پستول والا ہاتھ سیدھا کیا تھا لیکن اس سے پہلے میں اس پر گولی چلاتا وہ ناقابلِ یقین پھرتی سے حرکت میں آیا اور سیکنڈ سے بھی پہلے وہ کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے باہر جا چکا تھا۔ اس پر گولی چلانے کو بے کار سمجھتے ہوئے میں نے بھاگ کر عتیق کے منہ سے نکل جانے والا ماسک دوبارہ لگایا اس کا جسم سانس کے لیے اینٹھ رہا تھا جیسے ہی ماسک اس کے منہ پر لگا اس کے جسم کی اینٹھن کم ہونے لگی تھی۔ پھر میں نے ایمرجنسی کال کا بٹن دبایا اور پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لمبے بالوں والا لان کے دوسری طرف چھوٹی سی چار دیواری کے پار جا چکا تھا۔ مجھے اس کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ اس طرف پارکنگ تھی۔ میں نے ایک نظر عتیق کو دیکھا اور کھڑکی سے کود گیا۔

ایک تو مجھے اس شخص کے پیچھے جانا تھا جو ڈاکٹر کے بھیس میں قاتل نکل آیا تھا۔ دوسرے میرا یہاں رکنا

خطرناک ہوسکتا تھا۔ ایمرجنسی میں ڈاکٹر اور نرس آتے اور گارڈ کی موت کا راز بھی کھل جاتا اس کے بعد میرا یہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ اگر گارڈ کی موت کے شبہے میں مجھے نہ بھی گرفتار کیا جاتا تب بھی پولیس بغلیں جھانکنے میں حق بجانب ہوتی کیونکہ میں اُسے دیگر بے شمار کیسز میں مطلوب تھا۔ میں باہر کودتے ہی لان پر دوڑا چند سیکنڈ میں اس چھوٹی سی دیوار کے پاس تھا۔ مجھے لمبے بالوں والا گاڑیوں کے درمیان بھاگتا ہوا نظر آرہا میں بھی دیوار پھلانگ کر اس کے پیچھے بھاگا۔

مجھے ایک فی صد بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ عتیق کو مارنے آیا تھا اور اس کام کے لیے اس کو مرشد نے بھیجا تھا۔ ل کے معاملے میں وہ کامیاب نہیں ہوا تھا کم سے کم عتیق کی حالت بہتر ہونے لگی تھی لیکن عبداللہ کا ساتھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

لمبے بالوں والے قاتل کی چالاکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے ڈاکٹر کا کوٹ استعمال کیا۔ ایک اسپتال میں ڈاکٹر سب سے کامن ہوتے ہیں اور سفید کوٹ دیکھ کر ہر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ کوٹ والا ڈاکٹر ہے۔ پھر اسپتال کا عملہ بھی صورت پر غور نہیں کرتا ہے اور غیر متعلقہ شخص بھی آرام سے کہیں بھی جا سکتا ہے۔ ا کہ یہ شخص عتیق کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ اس کے بعد اس نے شاید اندر جانے کے لیے عبداللہ کے ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ وہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دے رہا ہوگا۔ وہ ایک تربیت یافتہ سابق ایس ایس جی تھا۔ اسے اتنی آسانی سے مار دینا قاتل کی صلاحیتوں کو ظاہر کرتا تھا۔ اس نے نہ جانے کون سا ہتھیار استعمال کیا تھا۔ جس سے اس کے ماتھے میں سوراخ ہو گیا تھا۔

میں جب پارکنگ میں گاڑیوں کے درمیان میں پہنچا تو لمبے بالوں والا نہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں بے قراری سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں اسپتال میں ہنگامے کے آثار نظر آنے لگے۔ لان پر چند افراد بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور کسی کے چلانے کی آواز بھی آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا یہاں سے نکل جانا بہتر تھا کچھ دیر اور ہوتی اور پولیس آجاتی تو میں مشکل میں پڑ جاتا۔ گرفتاری تو میں کسی صورت نہیں دیتا لیکن اس کے لیے مجھے کچھ ہنگامے اور مار دھاڑ کرنا پڑتی۔

میں اپنی کار کی طرف لپکا۔ کار میں بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کیا اور پارکنگ سے نکالنے لگا۔ اس دوران میں اسپتال کے محافظ بھاگتے ہوئے باہر آگئے تھے اور وہ یقیناً قاتل کی تلاش میں تھے۔ استقبالیہ پر موجود فرد نے ان کو بتایا ہوگا کہ اس حلیے کا ایک شخص خصوصی اجازت کے بعد عتیق کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اور ہنگامہ شروع ہو گیا اس لیے لازمی بات ہے وہی قاتل تھا۔ میں نے سن گلاس اتار دیئے اور ٹوپی سر پر پہن لی۔ ایک دوڑتے ہوئے محافظ نے میری طرف دیکھا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اسے ایک سن گلاس پہنے شخص کی تلاش تھی۔ میں آرام سے کار سمیت اسپتال سے نکل آیا تھا۔ پھر مجھے رفیق بھائی کا خیال آیا۔ میں نے ان کو کال کی۔

"رفیق بھائی یہاں ایک ہنگامہ ہو گیا ہے۔"

"کیا ہوا ہے؟"

میں نے ان کو مختصراً بتایا کہ کس طرح ایک جعلی ڈاکٹر نے عتیق کا آکسیجن ماسک ہٹا کر اسے مارنے کی

کوشش کی تھی لیکن میں بروقت وہاں پہنچ گیا اور مجھے دیکھ کر قاتل کھڑکی سے نکل کر فرار ہو گیا۔ میں نے عتیق کا آکسیجن ماسک واپس لگا دیا تھا اور ہنگامی مدد کا بٹن دبا دیا تھا۔'' آپ اسپتال فون کر کے معلوم کریں اور اس بات سے انکار کر دیجئے گا کہ آپ نے فون پر کسی کو عتیق کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟''

''ہاں میں سمجھ گیا ہوں۔'' بیٹے کے بارے میں سن کر وہ بے چین ہو گئے تھے اور انہوں نے کال کاٹ دی اب وہ یقیناً اسپتال فون کرنے والے تھے۔ میں نے گہری سانس لی اور سامنے دیکھنے لگا۔ اسی لمحے عقبی نشست سے ایک چہرہ ابھرا اور لمبے بالوں والا سامنے تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا جس میں پستول تھا۔



اس کی منحوس صورت کے ساتھ ہی پستول بھی نظر آیا تھا اس لیے میں نے کوئی حرکت کرنے سے گریز کیا۔
''تم ذلیل...... شخص۔''

وہ مسکرایا۔''ہاں...... قسمت دیکھو شہباز ملک...... میں نے چھپنے کے لیے جو گاڑی چنی وہ تمہاری نکلی۔''

''تم مجھے جانتے ہو؟''

''تمہیں کون نہیں جانتا۔'' اس نے کہا اور حکم دیا۔'' گاڑی مری ہائی وے کی طرف موڑ لو۔''

مری ہائی وے یہاں سے خاصے فاصلے پر تھی اس لیے میں نے اطمینان محسوس کیا۔ ابھی میرے پاس خاصا وقت تھا۔ اس نے اسپتال سے ذرا دور آتے ہی پستول میرے سر پر رکھ دیا اور بولا۔'' اپنا پستول اور موبائل میرے حوالے کر دو۔''

میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔''تمہیں مرشد نے بھیجا ہے؟''

''کون مرشد؟'' اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''اپنے والد ثانی سے اتنے بے خبر ہو تم؟''

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔'' بکواس مت کرو۔''

میں ہنسا۔''تب تم بھی انجان مت بنو۔ مرشد تمہارا آقا ہے افسوس کہ اس کی طرح اس کے آدمیوں میں بھی جرأت نہیں ہے۔''

''جرات کی بات مت کرو۔ ابھی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

''ہاں تمہاری جرأت میں نے خود ملاحظہ کی ہے ایک بے بس نوجوان کو مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔''

''مجھے اس کا حکم دیا گیا تھا؟'' اس نے گویا صفائی پیش کی۔

''گویا تم مرشد کے اشارے پر دم ہلانے والے کتے ہو۔'' میں نے اسے اشتعال دلانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہا۔ غالباً وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اشتعال میں آنے سے گریز کر رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جو اتفاق سے اس کے ہاتھ لگی تھی۔ اگر وہ مجھے مرشد کے حوالے کر دیتا تو مرشد اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا۔ اس لیے وہ میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''تمہیں میرے نام سے کیا ہے؟'' وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ کون ہے جس نے مجھے اتنی آسانی سے قابو میں کرلیا۔ وہ کام کیا جو مرشد کی ساری فوج مل کر بھی نہیں کرسکی۔''

وہ میری باتوں میں آگیا۔ ''میرا نام فاضلی ہے۔ میں مرشد علی کا خاص آدمی ہوں۔''

میں چونکا۔ ''تم فاضلی ہو؟''

''ہاں تم میرے بارے میں جانتے ہو؟''

''خاص نہیں بس نام سنا ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ اب مری ہائی وے کچھ دور تھی اور ہم اسلام آباد کے ایک پُررونق علاقے سے گزر رہے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ اسلام آباد کی اہم ترین شاہراہیں بھی خالی نظر آتی تھیں لیکن اب آبادی بڑھنے کے ساتھ یہ شہر بھی پرہجوم ہوگیا ہے۔ اہم شاہراہوں کے علاوہ عام سڑکوں پر بھی خاصا ہجوم نظر آنے لگا ہے لیکن اس وقت مجھے مرشد کے اس چمچہ خاص کی فکر تھی۔ وہ مجھے مرشد کے کسی ٹھکانے کی طرف لے جارہا تھا اور ایک بار میں وہاں پہنچ جاتا تو گلوخلاصی مشکل ہوجاتی اس لیے مجھے جو کرنا تھا راستے میں ہی کرنا تھا۔ پُرہجوم سڑک پر کچھ کرنے کا موقع تو مل جاتا لیکن اس کے بعد پولیس سے بھی نمٹنا پڑتا۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میری نظر فیول گیج کی طرف گئی۔ اس کا کانٹا آخری سرے سے کچھ پیچھے تھا میں نے فاضلی سے کہا۔

''پیٹرول بھروانا ہے۔''

''بھروالو لیکن کوئی غلط حرکت مت کرنا۔'' اس نے مجھے خبردار کیا۔

''کوئی غلط حرکت کرکے میں نے خود پھنسنا ہے کیا؟'' میں بولا۔ ''اگر تم مجھے جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ پولیس مجھے تلاش کررہی ہے۔''

''جانتا ہوں اور اسی لیے تمہیں پولیس سے بچا کر لے جارہا ہوں۔'' اس نے دانت نکال کر کہا لیکن یہ مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ کسی بھیڑیئے نے دانت نکالے تھے۔ وہ مجھے کسی ہمدردی کی وجہ سے پولیس سے بچا کر نہیں لے جارہا تھا بلکہ مرشد علی کے لیے لے جارہا تھا اور وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا اس کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔ میں نے نظر آنے والے پہلے پیٹرول پمپ پر گاڑی روک لی۔ دن کا وقت تھا اور وہاں اچھی خاصی لائن لگی تھی۔ فاضلی نے دھیمی آواز میں پھر مجھے خبردار کیا۔

''کوئی چکر مت کرنا ورنہ میں گولی چلانے میں دیر نہیں کروں گا۔''

میں خاموش رہا۔ اب تک میں مرشد کے حوالے سے جتنے لوگوں سے ملا تھا ان میں سب سے خطرناک مجھے یہی شخص لگا تھا۔ اس کی پھرتی اور حاضر دماغی میں خود دیکھ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ مرشد کے پاس ایسے لوگ بھی تھے۔ حالانکہ اس میں حیرت کی بات نہیں تھی ایسے لوگ دولت کے لیے سب کرتے ہیں اور مرشد کے پاس دولت بے حساب تھی۔ اپنے بے شمار ناکارہ بندے آزمانے کے بعد اسے شاید عقل آگئی تھی اور اب اس نے کچھ کام کے آدمی بھی رکھ لیے تھے اور ان میں ایک فاضلی بھی لگ رہا تھا میں نے اچانک پوچھا۔

مرشد کے لیے کب سے کام کررہے ہو؟''

''دو سال......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے پھر نہیں پوچھا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے اقرار کر لیا تھا۔ اس دوران میں میری باری آ گئی تھی اور میں نے پیٹرول بھرنے والے کو چابی دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹنکی فل کر دو۔''

اس نے ڈھکن کھولا اور پائپ لگا دیا۔ فاضلی میری پشت سے لگا ہوا تھا تاکہ پستول پیٹرول بھرنے والے کو نظر نہ آئے حالانکہ رنگین شیشوں کے پیچھے ویسے بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند منٹ میں ٹینک فل کر کے پیٹرول بوائے نے رقم لی اور بقایا لینے کے لیے جا رہا تھا کہ فاضلی نے عقب سے کہا۔ ''باقی تم رکھ لو۔''

پیٹرول بوائے کا منہ کھل گیا تھا کیونکہ میں نے اسے ہزار کا نوٹ دیا تھا اور پیٹرول شاید چھ سو کا تھا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ فاضلی کی تائید کی۔ ''ٹھیک ہے تم رکھ لو۔''

''اب چلو۔'' فاضلی نے حکم دیا تو میں نے کار آگے بڑھا دی۔ ''تم نے کچھ زیادہ ہی دریا دلی نہیں دکھائی ہے۔''

''ہاں کیونکہ شاید پھر تمہیں اس رقم کی ضرورت نہ ہو۔''

کچھ دیر بعد ہم راول ڈیم چوک پر تھے۔ مری ہائی وے ویسے تو راولپنڈی سے شروع ہو جاتی ہے لیکن اصل مری ہائی وے یہاں سے شروع ہوتی ہے اور بھارہ کہو کے بعد مارگلہ کی پہاڑیاں آ جاتی ہیں اور یہ سلسلہ بتدریج بلند ہوتے ہوتے مری کے پہاڑوں سے جا ملتا ہے۔ فاضلی نے حکم دیا۔ ''دائیں طرف مڑ جاؤ۔''

دائیں طرف سڑک پنڈی کی طرف بھی جاتی تھی اور پھر ایک راستہ معروف چک شہزاد کی طرف نکلتا ہے۔ یعنی وہ علاقہ جہاں سی ڈی اے نے پولٹری اور فش فارمنگ کے لیے زمین مخصوص کی تھی لیکن وہاں بااثر سیاست دانوں اور امرا نے اس زمین پر قبضہ کر کے اپنے محلات اور فارم ہاؤسز بنا لیے اور اب ان سے یہ علاقہ جنت نظیر بن گیا ہے کیونکہ یہاں سرکاری خرچ پر ہر وہ سہولت مہیا کی گئی ہے جو اسلام آباد میں ان لوگوں کو میسر ہیں۔ فاضلی مجھے ان دو جگہوں میں سے کہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی توقع کے برخلاف میں نے کار کو سیدھا رکھا اور اس کی رفتار بھی تیز کر دی۔

''یہ کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے غرا کر کہا۔

''جہاں میری مرضی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''گاڑی واپس کر دو ورنہ......''

''ورنہ تم مجھے گولی مار دو گے۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''میں سچ مچ گولی مار دوں گا۔'' اس نے کہا اور پستول میرے سر سے لگا دیا۔

''تو مار دو لیکن مرشد کو کیا جواب دو گے۔ اسے میری لاش درکار ہوتی تو تم مجھے اسپتال سے نکلتے ہی گولی مار چکے ہوتے۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہیں ہر قیمت پر زندہ لے کر جاؤں گا اگر تم نے گاڑی نہیں موڑی تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

''ضرور کر دو۔'' میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ گاڑی اب ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی

جو اس سڑک پر خاصی زیادہ تھی کیونکہ یہاں موڑ تھے اور سامنے سے گاڑیاں آرہی تھیں۔

''رفتار کم کرو۔'' پہلی بار اس کے لہجے میں اضطراب محسوس ہوا۔

''جیسا تم کہو۔'' میں نے رفتار مزید بڑھادی اور اسپیڈو میٹر کی سوئی ستر کے آس پاس لرزنے لگی تھی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے ابھی سامنے سے کوئی گاڑی آجائے تو......'' اس نے کہنا چاہا کہ سامنے سے ایک چھوٹا ٹرک نمودار ہوا۔ یہاں سڑک مڑ رہی تھی اس لیے جب ٹرک نظر آیا تو فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے رفتار کم کیے بغیر کار کو بائیں طرف کاٹا اور ٹرک والے نے دائیں طرف کاٹا اور دونوں ایک دوسرے کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے بمشکل کار کو ڈھلان پر چڑھنے سے روکا اور سڑک پر سیدھا کیا لیکن اس دوران میں کار کی رفتار ایک بار بھی کم نہیں کی تھی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ابھی مارے جاتے۔''

''مارا تو اس صورت میں بھی جاؤں گا جب تمہارے ساتھ جاؤں گا تو کیوں نہ اپنے ساتھ ایک دشمن کو لے کر مروں۔'' میں نے کہا اور رفتار مزید بڑھادی اور اب سوئی اسی پر تھی۔ وٹز چھوٹی کار ہے لیکن اس کا پک اپ اور روڈ گرپ بہت اچھی ہے۔ یہ رفتار تو کشادہ اور سیدھی ہائی وے پر بھی کم ہوتی ہے لیکن اس سڑک پر تو خودکشی کے مترادف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فاضلی خوف زدہ ہوگیا تھا اس نے ایک وحشت کے عالم میں پستول میری گردن سے لگایا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

''رفتار کم کرو ورنہ میں تم کو گولی ماردوں گا۔''

''اس کے بعد ہم دونوں ایک ساتھ مریں گے تمہارا کیا خیال ہے اگر میں مرگیا تو کار بچ جائے گی۔'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا لیکن اندر سے میں بھی ڈر گیا تھا۔ وہ گولی چلا سکتا تھا۔ میں نے رفتار بتدریج کم کرلی تھی اور اب یہ ستر پر آگئی تھی۔ بہرحال وہ لمحہ گزر گیا جب وہ ڈر کر مجھے شوٹ کرسکتا تھا۔ اس کی عقل میں بات آگئی تھی کہ اگر اس نے مجھے ماردیا تو اتنی رفتار پر کار کے حادثے میں اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے گولی چلانے سے گریز کیا۔ اس نے پستول کا دباؤ کم کردیا اور آہستہ سے بولا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں کسی قیمت پر مرشد کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا حکم ہے کہ تمہیں زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر تم ہاتھ نہ آؤ تو تمہیں ماردیا جائے۔''

''تم کوشش کرسکتے ہو لیکن اس کے بعد تم بھی نہیں بچو گے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہیں ابھی شوٹ نہیں کرتا ہوں لیکن کار کہیں نہ کہیں تو روکو گے۔''

بھارہ کہو کی آبادی آگئی تھی۔ یہاں ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے رفتار ذرا کم کرنا پڑی تھی لیکن یہ اتنی بھی کم نہیں تھی کہ اسے کچھ کرنے کا موقع ملتا۔ آبادی کے پاس سے گزرتے ہی میں نے رفتار پھر بڑھادی تھی۔ ''ابھی میرے پاس کوئی دو گھنٹے کے سفر کا ایندھن ہے اس سے پہلے میں کہیں نہیں رکوں گا۔''

''اس سڑک پر کئی جگہیں ایسی آئیں گی جہاں تمہیں رکنا پڑے گا۔''

''جب وہ آئیں گی تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے لاپروائی سے کہا مگر میں فکرمند ہوگیا تھا یہ ڈرامہ زیادہ دیر

چلنے والا نہیں تھا۔ واقعی میں کہیں نہ کہیں رکنے پر مجبور ہو جاتا اور اس کے بعد یہ مجھے شوٹ بھی نہ کرتا تب بھی بے ہوش کر سکتا تھا اور اس کے بعد میں اس کے قبضے میں ہوتا یعنی مرشد کے قبضے میں چلا جاتا اور اس سے بچنے کے لیے میں اتنے جتن کر رہا تھا۔ ''ویسے اگر میں اس سے پہلے ہی گاڑی کسی کھائی میں گرا دوں تو؟''

اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''تم مجھے خودکشی کرنے والے تو نہیں لگتے۔''

اس کی بات درست تھی میرے دشمن بھی جانتے تھے کہ میں آخری دم تک مقابلہ کرنے والا شخص ہوں اور خودکشی نہیں کر سکتا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے دیکھتے ہیں ہم میں سے کون جیتا ہے۔''

وہ عقب میں پوری طرح ہوشیار تھا اور جب میں نے رفتار بڑھائی تو اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی۔ میں نے بھی سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ مارگلہ کی پہاڑیاں شروع ہو گئی تھیں اور خطرناکی میں یہ مری کے پہاڑوں سے کم نہیں ہیں بلکہ ان سے زیادہ ہی ہیں کیونکہ مری میں درختوں کی بہتات ہے اور اکثر سڑکوں کے کنارے درخت ہیں اگر کوئی گاڑی سڑک سے اترے تو یہ درخت اسے کھائی میں گرنے سے بچاتے ہیں مارگلہ کی پہاڑیاں درختوں سے خالی ہیں اور سینکڑوں فٹ کی گہرائی تک کوئی روک نہیں ہے اگر گاڑی یہاں سے نیچے جائے تو اسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں سڑک پہاڑوں کے ساتھ چلتی ہے اور کشادہ ہونے کے ساتھ حدِ نظر بھی ہے یعنی سامنے سے آتی گاڑی دور سے نظر آجاتی ہے البتہ کچھ مقامات ایسے ہیں جہاں حدِ نظر محدود ہو جاتی ہے اور سامنے سے آتی گاڑی کا پتا نہیں چلتا ہے۔ ایک ایسے ہی مقام پر اچانک سامنے سے ایک بڑی بس نمودار ہوئی اور سڑک پر گنجائش کم تھی میں نے بے ساختہ بریک لگائی اور تصادم سے بچنے کے لیے کار کو کچے میں اتار لیا۔ بس برابر سے دھواں اُڑاتی گزر گئی تھی۔ اس دوران میں رفتار بہت کم رہ گئی تھی اور کار نے ڈھلان سے رگڑ بھی کھائی تھی۔ فاضلی اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ میں دھچکے سے آگے گیا اور جب واپس پیچھے آیا تو اس نے میرے سر پر اپنا پستول آزمایا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے دوسرا وار کیا اور دل کے ساتھ میرا ذہن بھی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ آخری خیال یہ تھا کہ اب ہوش آیا تو اگلی دنیا میں یا مرشد کے عقوبت خانے میں ہوں گا۔



رفتہ رفتہ میرے حواس بحال ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میں گہرے تاریک سمندر سے سطح پر آ رہا ہوں۔ یہ بے ہوشی بھی عجیب شے ہے جب یہ حواس پر قبضہ کرتی ہے تو ہر بار انسان ہوش میں آتے ہوئے کچھ نیا محسوس کرتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میرے سر میں قیامت کا درد ہو گا۔ کیونکہ فاضلی نے نہایت بے دردی سے وار کیے تھے۔ میرا سر یقیناً پھٹ گیا تھا لیکن میں سکون کی کیفیت میں تھا۔ اس سے مجھے شبہ ہوا کہ میں اس دنیا سے گزر گیا تھا۔ اس دنیا میں میرے لیے بھلا سکون کہاں تھا۔ میں ایک صاف ستھرے لیکن سادہ بستر پر لیٹا تھا اور میرے جسم پر میرا ہی لباس تھا۔ اس کمرے میں سوائے اس بستر کے اور کچھ نہیں تھا۔ میرے سر پر خاصی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کا مطلب تھا کہ میرا سر اچھا خاصا پھٹا تھا۔ کمرہ بتا رہا تھا کہ یہ قید خانہ ہے ورنہ نارمل کمرے میں کچھ فرنیچر تو ہوتا ہے۔ چھت پر ایک بلب جل رہا تھا اور کمرے میں سردی کا احساس بہت کم تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ اتنے سکون کی وجہ یہ تھی میرا باقاعدہ علاج ہوا تھا اور مجھے کوئی طاقتور درد کش دوا دی گئی تھی جس کی وجہ سے مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بازو دیکھا تو مجھے نس میں انجکشن کا نشان نظر آیا۔ میرا لباس پورا تھا البتہ جوتے غائب تھے۔ میں نے جھک کر بستر کے نیچے دیکھا تو مجھے ایک لمحے کو چکر آ گیا تھا۔ جوتے بستر کے نیچے نہیں تھے۔ میرا خالی پیٹ بتا رہا تھا کہ میں کم سے کم دس بارہ گھنٹے سے بے ہوش تھا۔ جب میں اسپتال سے نکلا تھا تو ایک بج رہا تھا اور دو بجے میں نے ہوش و حواس کی دنیا کو خیر باد کہا تھا۔ اس لحاظ سے رات کے بارہ تو بج چکے تھے۔

اس بند کمرے میں پتا نہیں چل رہا تھا کہ باہر رات تھی یا دن اور نہ ہی یہاں کوئی گھڑی لگی تھی۔ میری کلائی سے گھڑی اتار لی گئی تھی۔ موبائل پہلے ہی فاضلی نے لے لیا تھا۔ اب پرس بھی غائب تھا ان لوگوں نے سوائے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے پٹی کو چھوا تو سر میں درد کی لہر اٹھی اور اس نے مجھے سمجھا دیا کہ درد کا عفریت رخصت نہیں ہوا ہے سر میں موجود ہے۔ میں سیدھا لیٹ گیا۔ میں نے دروازہ چیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں مرشد کے قبضے میں آ چکا تھا لیکن اس نے مجھے اس طرح آرام سے کیوں رکھا تھا اور میرے علاج معالجے کی زحمت کیوں اٹھا رہا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

رفتہ رفتہ میرے حواس مکمل طور پر میرے قابو میں آ گئے لیکن میں لیٹا رہا میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ممکن ہے یہاں میری نگرانی کے لیے کوئی کیمرہ ہو اور ان کو پتا چل جائے کہ مجھے مکمل ہوش آ گیا ہے۔ میں ان کا

ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔کوئی نصف گھنٹے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں بے ہوش بن گیا۔دروازہ کھلا اور کچھ افراد اندر آئے۔آنے والوں میں سے ایک نے میری نبض دیکھی اور بولا۔''نبض تو ٹھیک چل رہی ہے اسے اب تک ہوش میں آجانا چاہیے۔''

''تب کیا معاملہ ہے ڈاکٹر اسے ہوش کیوں نہیں آرہا؟'' میں نے مرشد علی کی آواز سنی تو میرا دل چاہا کہ بے ہوشی ختم کر کے اس کی گردن دبوچ لوں۔میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا تھا۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا اسے اسپتال لے جائیں شاید کیس سیریس ہے۔'' ڈاکٹر دبے لہجے میں بولا۔ ''ویسے تو وائٹل سائن ٹھیک ہیں لیکن دماغ کی چوٹ کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔''

اب میری سمجھ میں آیا کہ میری اتنی دیکھ بھال کیوں ہو رہی تھی۔فاضلی نے جو وار کیے تھے ان کا اثر زیادہ تھا اور شاید مجھے ہوش نہیں آیا تھا۔اس لیے ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔مرشد نے ڈاکٹر کی بات پر کہا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے ورنہ تم کو کیوں بلاتا۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر عاجزی سے بولا۔''ابھی انجکشن دیتا ہوں اور پھر بھی ہوش نہیں آیا تو یہ معاملہ میرے بس سے باہر سمجھئے گا۔''

اس نے کوئی انجکشن نکالا اور اس کی سوئی میرے بازو میں ٹھونک دی۔''اس کا ردِعمل چند منٹ میں ظاہر ہو جائے گا۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا یہ بندہ اتنا نازک نکلے گا۔'' فاضلی کی آواز آئی۔

''بکومت۔'' مرشد نے خفگی سے کہا۔''میں نے خود دیکھا اس کا سر بری طرح پھٹ گیا تھا اور تم کو جس کام سے بھیجا تھا وہ بھی نہیں کر سکے۔''

''اس کی وجہ بتا چکا ہوں۔'' فاضلی دبے انداز میں بولا۔وہ ڈاکٹر کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ باہر کا آدمی تھا۔خود مرشد کو بھی احساس تھا اس لیے اس نے زیادہ نہیں کہا۔اب وہ خاموشی سے انجکشن کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔میں نے یہ سن کر اطمینان محسوس کیا تھا کہ عتیق محفوظ تھا اور فاضلی نے اس کی جان لینے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام رہی تھی۔

جب ڈاکٹر نے میرے بازو میں انجکشن لگایا تھا اس وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مجھے ہوش میں آجانا چاہیے ورنہ یہ ڈاکٹر نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتا اور کون کون سے انجکشن میرے جسم میں گھونپتا رہتا۔کوئی پانچ چھ منٹ بعد میں نے چہرے کے عضلات کو ہلانا شروع کر دیا جیسے میں نیند سے جاگ رہا ہوں اور چند منٹ بعد میں نے سر بھی ہلانا شروع کر دیا۔ڈاکٹر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔''اسے ہوش آرہا ہے جناب۔''

ان لوگوں کا صبر آزمانے کے لیے میں کچھ دیر کو ساکت ہوا تھا۔فوراً ہی مرشد کی اضطرابی آواز آئی۔''یہ تو پھر بے ہوش ہو گیا۔''

''نہیں یہ عارضی کیفیت ہے۔'' ڈاکٹر نے یقین سے کہا۔''اصل میں چوٹ بہت گہری ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں فاضلی کو برا بھلا کہا جس نے نہ جانے میرے سر کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔چند منٹ بعد میں نے دوبارہ حرکت شروع کر دی اور اس بار آنکھیں بھی کھول دیں لیکن ساکت پڑا رہا اور چھت کو

گھورتا رہا۔ ڈاکٹر نے میری آنکھوں میں اپنی ٹارچ سے روشنی ڈالی اور بولا۔ ''آنکھ کی پتلیاں ردِعمل دکھا رہی ہیں۔''

اس بار مرشد سامنے آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''شہباز ملک۔''

میں سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ مرشد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''یہ اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم جناب۔'' ڈاکٹر نے کسی قدر بے زاری سے کہا پھر میری طرف جھکا۔ ''تمہیں اپنا نام یاد ہے۔''

''نام۔'' میں نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''میرا نام کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے اس کی یادداشت عارضی طور پر متاثر ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے میری اداکاری سے متاثر ہو کر فوراً مجھے سرٹیفکیٹ دیا۔ فاضلی جو مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے مرشد سے کہا۔

''مجھے تو ڈرامہ لگ رہا ہے۔''

اپنا سرٹیفکیٹ جھٹلائے جانے پر ڈاکٹر نے اسے خفگی سے دیکھا۔ ''ڈاکٹر میں ہوں یا تم ہو؟''

''تم سے ایک بندہ ہوش میں نہیں آ رہا تھا تم کس قسم کے ڈاکٹر ہو؟''

''لڑو مت۔'' مرشد نے رعب سے کہا اور ڈاکٹر سے بولا۔ ''اگر اس کی یادداشت گم گئی ہے تو اسے بحال کرو۔''

''جناب دنیا کی کوئی دوائی یا علاج ابھی تک گم ہونے والی یادداشت کے سلسلے میں کارگر نہیں ہوئی ہے اسے رفتہ رفتہ سب یاد آئے گا۔''

''یا فلمی انداز میں اس کے سر پر ویسے ہی چوٹ لگائی جائے گی اور اس کی غائب ہونے والی یادداشت واپس آ جائے گی۔'' فاضلی نے طنز کیا۔

''لگتا ہے تم اسے مارنا چاہتے ہو۔'' ڈاکٹر نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس کا سر نازک ہو رہا ہے اور اس پر مزید کوئی چوٹ جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔''

خدا نے اس ڈاکٹر کی صورت میں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا تھا جس نے فی الحال مجھے مرشد اور اس کے گرگوں کے عتاب سے بچا لیا تھا۔ اس نے مرشد سے کہا۔ ''جناب اس کے ساتھ ذرا سا برا سلوک نہ صرف اسے مار سکتا ہے بلکہ اس کے ذہن پر اتنا بڑا اثر بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے یادداشت یا ذہنی توازن کھو سکتا ہے۔''

مرشد اس دوران میں میرا معائنہ کر رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ میرے چہرے پر تاثرات یا جذبات کی ہلکی سی رمق بھی نہ آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مرشد عیار ترین شخص تھا اور وہ میرے ذرا سے تاثر سے بھانپ جاتا کہ میں ڈرامہ کر رہا تھا اس لیے میں معصومانہ صورت بنا کر لیٹا رہا۔ کمرے میں سوائے ان تین افراد کے اور کوئی نہیں آیا تھا۔ جب ڈاکٹر چپ ہوا تو اس نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ نگرانی کے خوف سے میں ایسے ہی لیٹا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ سب دوبارہ آئے۔ فاضلی نے آتے ہی کہا۔

''یہ ڈرامہ کر رہا ہے آپ کے عتاب سے بچنے کے لیے۔''

''اگر یہ ڈرامہ کر رہا ہے تو میں ڈاکٹری چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔'' ڈاکٹر نے برافروختہ ہو کر کہا۔

''بکومت۔'' فاضلی جارحانہ انداز میں بولا۔ ''یہ ابھی بولے گا۔''

مرشد ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ فاضلی نے اچانک پستول نکال لیا پستول دیکھ کر ڈاکٹر تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم میرے سامنے ایک مریض کو نہیں مار سکتے۔''

''ہٹ جاؤ سامنے سے۔'' فاضلی نے ڈاکٹر کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن وہ چٹان کی طرح اس کے سامنے ڈٹ گیا تھا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں جناب؟'' اس نے چلا کر مرشد سے کہا۔

''تُو ہٹتا ہے یا پہلے تیرے سر میں سوراخ کروں۔'' فاضلی نے پھنکار کر کہا اور ڈاکٹر کے اوپر سے پستول کا رخ میری طرف کر دیا اور میرا جسم تن گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ فاضلی کے ہاتھ سے پستول نکلا اور اچھل کر بستر پر میرے پاس آ گرا۔ مرشد ابھی تک کچھ کرنے کے بجائے خاموشی سے میرا جائزہ لے رہا تھا اور پستول جب میرے پاس آ کر گرا تب بھی اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور اس کی اسی حرکت نے میرا بھانڈا پھوٹنے سے بچا لیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بروقت خبردار کیا اور میں پستول اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔ اس کے بجائے میں نے خوف زدہ نظروں سے پستول کی طرف دیکھا اور یوں اس سے ذرا دور سرک گیا جیسے یہ پستول کے بجائے کوئی بچھو ہو جو مجھے ڈنک مارنے والا ہو۔ فاضلی نے ڈاکٹر کو ایک طرف دھکیلا اور لپک کر پستول اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر فاتحانہ انداز میں مسکرایا تھا اس نے مرشد کی طرف دیکھا تو اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پھر وہ تینوں خاموشی سے باہر چلے گئے۔ میں نے گہری سانس لی۔ یہ ان لوگوں کا ڈرامہ تھا جس میں فاضلی اور ڈاکٹر اداکار تھے اور اس ڈرامے کا اسکرپٹ رائٹر اور ہدایت کار مرشد علی تھا۔ پستول یقیناً خالی تھا اور فاضلی نے جان بوجھ کر میری طرف پھینک دیا تھا تاکہ پتا چلے کہ میری یادداشت سچ مچ گم گئی ہے یا میں ان کو دھوکا دے رہا ہوں۔

سچی بات تھی کہ میں جب ہوش میں آیا تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا کہ میں یادداشت گم ہونے کا ڈرامہ کروں گا لیکن اس کی راہ خود ان لوگوں نے مجھے سجھائی تھی اور پھر میرا امتحان لے کر انہوں نے مجھے مزید پکا کر دیا تھا۔ پھر مرشد کا رویہ بھی معنی خیز تھا۔ اسے میری یادداشت سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے تو شادیانے وغیرہ بجانے چاہیے تھے کہ میں اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو مرشد مجھ سے معلوم کرنا چاہتا ہو لیکن حالات کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات ہوئی ہو جس کی وجہ سے مرشد اب میرے بارے میں فکر مند تھا۔ دوسری صورت میں مجھے اس کے جلادوں کا سامنا کرنا ہوتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اداکاری جاری رکھوں گا۔ میں ذہنی طور پر خود کو مضبوط کرنے لگا اور ان ممکنہ اقدامات کا سوچنے لگا جو مرشد میری یادداشت کی بحالی کے لیے کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے ذہنی بحالی کا انجکشن دیا تھا اور اس کے بعد درد کش دوا کا اثر کم ہو رہا تھا جس سے سر کی تکلیف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ

رہی تھیں۔ ایسی ہی کچھ ٹیسیں پیٹ میں بھی اٹھ رہی تھیں کیونکہ مجھے کھانا کھائے بہت دیر گزر چکی تھی۔ ان تینوں کے جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آیا۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈونگہ اٹھا رکھا تھا اس نے وہ لا کر بستر پر میرے پاؤں کے پاس رکھ دیا اور بدتمیزی سے بولا۔

''لے کھالے۔''

میں نے اٹھ کر دیکھا تو اس میں سادہ دال اور چاول تھے۔ ساتھ میں ایک چمچ تھا۔ میں نے انہیں چکھ کر دیکھا۔ بدذائقہ تھے لیکن بہرحال کھانے کے قابل تھے اس لیے میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں حلق سے اتار لیا۔ اس دوران میں ڈونگہ لانے والا وہیں موجود رہا تھا وہ کوئی نچلے درجے کا ملازم تھا جسے بے دھڑک میرے پاس بھیج دیا گیا تھا اگر میں اسے مار بھی دیتا تو مرشد کا کچھ نہ جاتا۔ میں نے کھانے کے دوران اس سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے اور وہ کون ہے جس نے سر پر پگڑی پہنی ہوئی ہے؟''

''تُو جہنم میں ہے۔'' اس نے پھر بدتمیزانہ لہجے میں کہا۔ ''وہ موت کا فرشتہ ہے۔''

''اور تم جہنم کے فرشتے ہو؟''

''بکواس نہ کر جلدی کھا کر دے تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں جو یہاں کھڑا رہوں۔''

میں نے ڈونگہ خالی کر دیا اس نے لپک کر ڈونگہ اٹھایا اور دروازے پر دستک دی۔ باہر سے دروازہ کھلا اور وہ باہر چلا گیا۔ پیٹ میں کچھ گیا تھا تو اس کی ٹیسیں تو معدوم ہو گئی تھیں لیکن سر کی ٹیسوں میں اضافہ ہو رہا تھا میں نے مناسب سمجھا کہ آنکھ بند کر کے لیٹ جاؤں لیکن فی الحال سکون سے لیٹنا میرے مقدر میں نہیں تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور فاضلی اندر آ گیا اس نے میرے پاس آ کر دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شہباز تم مرشد کو بے وقوف بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔''

''کیوں نہیں بنا سکتا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔ ''اگر تم چاہو تو تمہیں بھی بنا سکتا ہوں۔ ویسے یہ مرشد کون ہے؟''

''تمہارا باپ ہے۔''

''میرا باپ ہے۔'' میں نے الجھ کر کہا۔ ''لگتا تو نہیں ہے۔''

فاضلی شاید سوچ کر آیا تھا کہ اسے میرے ڈرامے کی اصلیت سامنے لانی ہے اس لیے اس نے مجھے ذہنی طور پر اذیت دینے کے لیے بکواس شروع کر دی۔ میں پہلے ہی اس مرحلے کے لیے تیار تھا اس لیے نارمل ردِعمل کے بجائے میں نے حالات کی مناسبت سے احتجاج کیا۔ ''اے تم مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو؟''

اس پر اس نے مزید بکواس کی اور ان میں بعض باتیں ایسی تھیں کہ میرے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا سر توڑ دوں لیکن اس کے بجائے میں نے اسے ایک بے بس شخص کے انداز میں کلاسیکل گالیاں دیں اور اس کا صبر جواب دے گیا۔ وہ غرا کر میری طرف آیا تھا کہ دروازہ کھلا اور مرشد نے اسے آواز دی۔ ''واپس آ جاؤ۔''

فاضلی اپنے آقا کے حکم پر دم دبا کر باہر چلا گیا اور اس کے فوراً بعد ڈاکٹر اندر آیا اس نے میرے سر کی ڈریسنگ کھول کر دیکھی اور زخم کی بحالی سے مطمئن ہو کر اس پر معمول کی پٹی کر دی۔ اس فلمی اسٹائل کی پٹی سے

نجات پا کر میں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ اس نے زخم خشک کرنے والا پاؤڈر لگایا اور اوپر سے چپکنے والی پٹی لگا دی تھی۔ پھر اس نے مجھے دو عدد انجکشن دیئے جن میں سے ایک اینٹی بایوٹک تھا اور دوسرا یقیناً مسکن تھا کیونکہ جیسے ہی اس نے انجکشن لگایا مجھے غنودگی آنے لگی اور اس کے باہر جانے سے پہلے میں سو چکا تھا۔

میں سو کر اٹھا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی میرے پیٹ میں دباؤ بتا رہا تھا کہ جلد مجھے فراغت کے لیے کچھ کرنا ہوگا میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک دوسری طرف سے کسی نے سخت لہجے میں نہیں کہا۔ ''یہ کیوں شور کر رہا ہے؟''

''مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

''کچھ دیر رک جا۔'' باہر والے نے کہا اور کوئی دس منٹ بعد دروازہ کھل گیا، باہر دو مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں ایک بولنے والا بھی تھا اس کا اندازہ مجھے اس کے بولنے سے ہوا۔ اس نے باہر آنے کو کہا اور میں باہر آ گیا وہ مجھے اس کمرے سے ذرا دور ایک چھوٹے سے اور غلیظ لیٹرین تک لائے۔ میں دل پر جبر کر کے اندر گیا اور یہ سوچ کر گیا کہ اب کم سے کم چوبیس گھنٹے سے پہلے یہاں نہیں آؤں گا۔ مجھے جس کمرے میں رکھا گیا یہ لیٹرین اس سے باہر راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کہ میں اپنے قید خانے کا محل وقوع جان سکوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میں زیرزمین کسی جگہ قید ہوں۔ مرشد مجھے کسی کھلی جگہ رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جہاں سے میں فرار ہو جاؤں اس نے مجھے قید رکھنے کے فول پروف انتظامات کیے ہوں گے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں موقع ملتے ہی فرار ہو جاؤں گا۔

اس ڈرامے کے باوجود صورتِ حال نہایت سنگین تھی۔ پاکستان آنے کے بعد میری ساری جدوجہد کا نکتہ نظر مرشد سے بچنا تھا ایک بار میں اس کی گرفت میں آ جاتا تو میرا کھیل تقریباً ختم ہو جاتا میں آزاد رہ کر ہی اس کے خلاف کچھ کر سکتا تھا اور اسے مجبور کر سکتا تھا۔ میں اس کی گرفت میں آ گیا تھا اور اب میرے ساتھ کیا ہونا تھا یہ صرف خدا ہی جانتا تھا۔ لیٹرین سے آتے ہی ڈاکٹر دوبارہ آ گیا تھا اس نے میرا معائنہ کیا اور میرے بازو میں پھر ایک انجکشن لگایا اور سر پر نئی پٹی کر کے رخصت ہو گیا میں نے اس سے کئی سوالات کیے لیکن اس نے ہر سوال کا خاموشی سے جواب دیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پھر دال چاول کا کھانا مہیا کیا گیا اور یہ کھانا بتانے کے لیے کافی تھا کہ مرشد کے دل میں میرے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا وہ کسی مجبوری کی وجہ سے فی الحال سختی سے گریز کر رہا تھا۔ وہ وجہ بھی جلد سامنے آ جاتی۔

مجھے عبداللہ کا خیال آیا اس نے غائب ہونے کے بعد مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اگر اسے خالی گاڑی مل گئی ہوگی تو اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں دشمن کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ کھانا دینے والا کچھ دیر بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زنجیر تھی اور اس میں ہاتھ میں بند ہو جانے والی ہتھکڑی تھی۔ اس نے زنجیر دیوار میں لگے کنڈے سے منسلک کی اور پھر اس کا کڑے والا سرا میری کلائی میں ڈال دیا۔ اب میں بیڈ پر لیٹ سکتا تھا لیکن اس کے آخری سے تک ہاتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ زنجیر کوئی تین فٹ لمبی تھی اور میری آزادی محدود ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنا کام کر کے گیا تو اس کے جاتے ہی مرشد علی آ گیا تھا۔ اس نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کوئی محافظ نہیں تھا جو اس کو بچاتا۔

''شہباز ملک۔'' اس نے مجھ سے محفوظ فاصلے پر کھڑے ہو کر کہا۔ ''میرا خیال ہے تم اداکاری کر رہے ہو۔''

میں خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر کہا۔ ''مجھے فتح خان چاہیے۔''

''تو لے لو۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ تمہارے پاس ہے۔''

''میں کسی فتح خان کو نہیں جانتا۔''

''بکواس مت کرو تم جانتے ہو۔'' وہ غرانے لگا تھا۔ ''ابھی میرے جلاد جب تمہارے جسم سے بوٹی بوٹی کر کے گوشت اتارنا شروع کریں گے تو تمہیں سب یاد آجائے گا۔''

اگر میں کہوں کہ اس کی دھمکی نے مجھے خوف زدہ نہیں کیا تو یہ غلط ہو گا۔ میں اس کے قبضے میں تھا اور اس کے پاس سچ مچ کے جلادوں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے ایک اشارے پر میرے ساتھ اس سے کہیں زیادہ برا ہو سکتا تھا لیکن میں نے اپنا تاثر برقرار رکھا تھا۔ میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کی دھمکی میرے سر سے گزر گئی ہو۔ میرا رویہ اس بچے جیسا تھا جسے سانپ ایک خوب صورت جانور لگتا ہے اور وہ اس کی ہلاکت خیزی سے بے خبر ہوتا ہے۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''یہ دیکھو مجھے باندھ دیا ہے۔''

مرشد علی بھنا گیا تھا۔ ''ابھی تمہارے ساتھ جو ہو گا تم باندھنا بھول جاؤ گے۔''

میں کسمسایا۔ ''تم کون ہو میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''شہباز ملک میں نہیں مان سکتا کہ سر کی ایک معمولی سی چوٹ نے تمہاری یادداشت چھین لی ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں سب یاد ہے بس تم ڈرامہ کر رہے ہو لیکن یاد رکھو تم اس طرح بچ نہیں سکو گے۔ ابھی تمہیں دکھایا جائے گا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو سکتا ہے اور پھر تمہارے پاس صرف ایک دن کی مہلت ہو گی۔''

مرشد نے کہا اور اپنی عبا لہراتا ہوا کمرے سے رخصت ہو گیا۔ میں اس کے آخری الفاظ پر غور کر رہا تھا مجھے کچھ دکھایا جانا تھا۔ کیا دکھانے کے لیے کہیں لے جایا جاتا۔ میرے اندر امید جاگی تھی اس صورت میں مجھے فرار کا موقع مل سکتا تھا لیکن مجھے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس کے بجائے کچھ دیر بعد مرشد کے دو تنومند آدمی ایک دبلے اور کمسن لڑکے کو لے کر اندر گھس آئے۔ لڑکا رو رہا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ان لوگوں سے رحم کی اپیل کر رہا تھا لیکن اس کو لانے والے گونگے اور بہرے جلاد تھے وہ نہ کسی کی فریاد سنتے تھے اور نہ کسی بات کا جواب دیتے تھے انہوں نے لڑکے کو باندھ کر اوندھے منہ فرش پر لٹا دیا اور اس کے جسم پر موجود چیتھڑا کپڑے الگ کر کے اسے بالکل برہنہ کر دیا۔

میرا دل اندر سے جکڑنے لگا تھا اور مجھے لگا جیسے ابھی کوئی خوفناک منظر میرے سامنے آنے والا ہو لیکن جو منظر سامنے آیا وہ میری سوچ سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔ لڑکے کو لانے والے جلادوں نے اسے بے بس کر کے فرش پر ڈال دیا اور اس کے بعد ان میں سے ایک باہر جا کر دو ڈنڈے لے آیا۔ ان میں سے ایک لڑکے کی کمر پر بیٹھ گیا اور دوسرے نے فوراً ہی ڈنڈہ گھما کر لڑکے کے ٹخنے پر مارا اسے خبر ہی نہیں تھی اور ہڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ لڑکے نے فلک شگاف چیخ ماری تھی۔ وہ تڑپا لیکن اس کے اوپر بیٹھا شخص کم سے کم بھی سو کلو گرام وزنی تھا۔

مارنے والے نے فوراً دوسرا وار کیا اور لڑکے کا دوسرا پاؤں بھی ٹخنے سے توڑ دیا اس بار لڑکے کی چیخیں نہیں رکی تھیں اور پھر وہ مستقل چیختا چلا گیا۔ کیونکہ ڈنڈے والا مستقل اس کے پیروں پر ڈنڈے مار رہا تھا۔ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''حرامیوں یہ کیا کر رہے ہو؟''

لیکن وہ بہرے تھے یا بہرے بنے رہے۔ دونوں کی مکمل توجہ اپنے کام کی طرف تھی۔ بیٹھنے والے نے لڑکے کو مکمل طور پر قابو کر رکھا تھا وہ تڑپ بھی نہیں سکتا تھا جب کہ دوسرا مشینی انداز میں اپنا کام کر رہا تھا وہ ایسے روبوٹ بنے تھے جن میں انسانی حس نہیں ہوتی ہے۔ ان کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ جس چیز کو توڑ پھوڑ رہے ہیں وہ کوئی ناکارہ مشین ہے یا انسان ہے۔ ایسا ہی رویہ ان کا بھی تھا۔ میرا چیخنا چلانا وہ کیا سنتے ان پر تو لڑکے کی چیخوں کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈنڈے والے نے لڑکے کے پیروں کی بیشتر ہڈیاں توڑ دیں تھیں اور اب اسے چھوڑ بھی دیا جاتا تب بھی وہ نہیں ہل سکتا تھا۔ دوسرا جلاد اس پر سے اٹھ گیا اور اس نے دوسرا ڈنڈا سنبھال لیا۔ میرا دل لرزنے لگا کہ ابھی نہ جانے اور کیا کچھ دیکھنا پڑے گا۔ لڑکا ہوش میں تھا اور مار میں وقفہ آیا تو وہ کراہ رہا تھا۔ اس دوران میں، مَیں بھی ان کو اور ان کے آقا کو گالیاں دیتا رہا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی مرشد یا کسی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے یہ سب دکھانے کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ میں جذبات میں آ کر کھل جاؤں اور دوسرے مجھے پتا چل جائے کہ مرشد میرے ساتھ کیا کچھ کروا سکتا تھا۔

وہ دونوں دوسرے مرحلے کی تیاری کر رہے تھے اور اس دوران میں وہ لڑکے کو اوپری جسم پر ڈنڈوں سے ہلکی چوٹیں لگا رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے لڑکے کی کمر پر ضرب لگائی۔ وہ تڑپا اور پھر فلک شگاف انداز میں چیخنے لگا۔ جلاد نے پھر ضرب لگائی اور اس کے ساتھ ہی دوسرا بھی شامل ہو گیا۔ دونوں باری باری اسے ضربیں لگا رہے تھے۔ وہ اسے مار رہے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ بے ہوش بھی نہ ہونے پائے اس کے لیے وہ اسے نازک جگہ ضرب لگانے سے گریز کر رہے تھے۔ ان کا نشانہ زیادہ تر گوشت اور ہڈیاں تھیں۔ اس کے پیروں کی ہڈیاں درجنوں جگہوں سے ٹوٹ گئی تھیں اور اس کی جان بچ بھی جاتی تب بھی اس کی ہڈیوں کو دنیا کا کوئی آرتھوپیڈک سرجن ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ اس کی کمر اور شانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے شانوں کی ہڈیاں بھی توڑ دی تھیں۔ لڑکا ابھی ہوش میں تھا لیکن اس میں چیخنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی وہ سسک رہا تھا۔ جلادوں کے ہاتھ رک گئے۔

''ظالموں بس کرو کیا اسے مارو گے؟'' میں نے چلا کر کہا۔

ظالموں پر میری آواز کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اب وہ نئے زاویے سے لڑکے پر ستم کا نیا پہاڑ توڑنے جا رہے تھے انہوں نے اسے سیدھا کیا۔ ایک جلاد نے ڈنڈا بلند کر کے پوری طاقت سے اس کے گھٹنے پر مارا۔ اس کی ہڈی پیچھے سے ٹوٹ چلی تھی اس بار سامنے والی چپنی بھی چکنا چور ہو گئی۔ لڑکے کی سسکی ذرا تیز ہوئی تھی۔ وہ نیم غشی میں تھا اور اس سے پہلے وہ مر جاتا جلاد اسے زیادہ سے زیادہ تکلیف دینا چاہتے تھے۔ وہ پے در پے اس پر ڈنڈے برسانے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ڈنڈے اس کے جسم سے ٹکرانے اور اس کی دھیمی کراہوں کی آوازیں تو میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں میں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ان آوازوں کی شدت کم کر سکتا تھا لیکن انہیں مکمل طور پر نہیں روک سکتا تھا۔

نہ جانے کب ہوا لڑکا مر گیا اور یہ اس کے مردہ جسم پر مشق ستم کرتے رہے۔ اس کی ایک ایک ہڈی توڑ دی۔ اس کا سر پاش پاش کر دیا۔ اس کا گوشت ڈنڈے سے یوں کوٹ کر قیمہ کر دیا جیسے دھوبی ڈنڈے سے کپڑے کا میل کچیل نکالتا ہے۔ کمرے میں خون کے چھینٹے ہی چھینٹے تھے اور جہاں لڑکے کی لاش تھی وہاں زمین پوری اس کے لہو سے سرخ ہو گئی تھی۔ جب جلادوں نے اپنا کام کر لیا تو وہ لڑکے کی لاش ایسے ہی چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا اور مجھے شدید قسم کی متلی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دیر سے آنکھیں بند کیے بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ میرے سامنے تصور سے بھی زیادہ بھیانک منظر تھا۔ لڑکے کے جسم کو لاش کہنا بھی درست نہیں تھی وہ تو کچلی اور مسلی ہوئی چیز تھی۔ جس کا ایک عضو بھی صحیح سلامت نہیں تھا۔ اس کا سر خون، گوشت، ہڈیوں اور مغز کا ایک ملغوبہ بن گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے متلی کا احساس ہوا اور میں نے منہ بستر سے نیچے کرتے ہوئے الٹی کر دی اور ایک دو لمحے کو مجھے چکر آ گیا تھا نہ جانے کیسے میں بستر سے نیچے گرنے سے محفوظ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شدت سے کمزوری کا احساس ہوا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ حالات نے مجھے سخت جان بنا دیا ہے میں نے اتنی لاشیں اور اتنے پامال جسم دیکھے تھے کہ اب انسان کو اس روپ میں دیکھنا میرے لیے مشکل نہیں رہا تھا لیکن اس ایک منظر نے میری ساری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ میں بالکل بھی سخت جان نہیں تھا۔ ایک معمولی لڑکے کی کچلی مسلی لاش نے میری اندر کی کمزوری کو ایک جھٹکے سے نکال کر باہر کھڑا کر دیا تھا۔ میں بالکل بھی مضبوط نہیں تھا۔ میں کتنی دیر بستر پر پڑا ہانپتا رہا اور خود سے لڑتا رہا۔ میرا مقابلہ ایسے لوگوں سے تھا جو کسی انسان کو اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ میں کس طرح ان لوگوں سے لڑ سکتا تھا اس دن پہلی بار مجھے خیال آیا کہ میری مرشد علی سے لڑائی بے سود ہے۔ میں کسی طور بھی اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

دروازہ کھلا کچھ لوگ اندر آئے وہ پہلے لاش کسی تھیلے میں ڈال کر لے گئے کسی نامعلوم مدفن میں ڈالنے کے لیے اس کے بعد صفائی کرنے والے آئے انہوں نے فرش پر پانی مار کر لڑکے کا خون اور جسم کی باقیات صاف کیں۔ دس پندرہ منٹ میں کمرہ دھو دھلا کر بالکل صاف کر کے وہ واپس چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ لڑکے کی لاش اٹھائی جا چکی تھی لیکن میرے ذہن نے مجھے دکھایا کہ لاش وہیں پڑی ہے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر بعد کھولیں تو کمرہ صاف تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ چند منٹ پہلے تک میں جو دیکھتا رہا تھا وہ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور میں نے خواب دیکھا تھا۔

لیکن میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا یہ خواب نہیں تھا ابھی میرے سامنے ایک جیتا جاگتا انسان بہت اذیت سے اپنی زندگی سے محروم کیا گیا تھا۔ ایک بار میں نے ایک ناکارہ ہو جانے والی کار کو کرشر میں ڈال کر اسے اسکریپ کرتے دیکھا تھا۔ اس نے کار کی صورت ختم کر کے اسے ایک دھاتی بکس کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس انسان کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا تھا اسے اس کی انسانی صورت سے محروم کر کے گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر بنا دیا تھا۔ میرے دماغ کے سیلف ڈیفنس سسٹم نے اس وقت مجھے سوچنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا ورنہ میں شاید ہمیشہ کے لیے نہیں تو عارضی طور پر ضرور پاگل ہو جاتا۔ نہ جانے کتنی دیر میں اسی طرح خالی ذہن کے ساتھ

بیٹھا تھا جب مرشد علی اندر آیا اور میں نے اسے سچ مچ اجنبی نظروں سے دیکھا تھا۔ چند لمحے تک تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون تھا اور پھر میں نے اسے پہچانا۔

''تم......تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیا......کیوں کیا؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔

میں دکھی ہو رہا تھا۔ ''اس بے چارے لڑکے کا کیا قصور تھا وہ تو شاید پندرہ سولہ برس کا تھا؟''

''ہاں یہی عمر تھی اس کی۔'' مرشد نے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی کم عمری سے اس کے جرم پر کوئی فرق نہیں آتا تھا۔''

''کیا کیا تھا اس نے......؟''

''اس حرامزادے نے سرِعام سب کے سامنے مجھے گالیاں دی تھیں۔'' مرشد کا چہرہ یہ کہتے ہوئے بگڑ گیا تھا۔ اگرچہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے نزدیک یہ کتنا بڑا جرم تھا یہ فرعون صفت لوگ تھے جو اس زمین پر خود کو خدا سمجھتے تھے لیکن میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''صرف گالیاں دینے پر تم نے اسے اتنی سفاکی سے مروا دیا۔ ایسا تو درندے بھی نہیں کرتے ہیں۔''

اس نے بدمزگی سے مجھے دیکھا۔ ''اس کے کیے کی یہ سزا بہت کم ہے کاش کہ میں اسے سب کے سامنے یہ سزا دلواتا۔ جن کے سامنے اس نے مجھے گالیاں دی تھیں۔''

''وہ بے چارہ غریب اور معمولی سا لڑکا لگ رہا تھا وہ تمہیں کیسے گالیاں دے سکتا تھا۔''

''اس نے دی تھیں میرے منہ پر دی تھیں۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی ماں کے اغوا اور آبروریزی میں میرا ہاتھ تھا۔''

''تو تمہارا ہاتھ نہیں تھا؟'' میں نے سادگی سے پوچھا تو اس کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

''اگر تھا بھی تو یہ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی اور اس کی ماں کون سی پارسا تھی۔ علاقے کے ہر آدمی سے اس نے یاری لگا رکھی تھی لیکن جب اس کی لاش ملی تو اس کا پلا مجھ پر بھونکنے چلا آیا۔''

بات واضح تھی۔ اس لڑکے کی ماں مرشد اور اس کے آدمیوں کی چیرہ دستی کا نشانہ بنی تھی۔ پھر انہوں نے اسے قتل بھی کر دیا۔ اس پر لڑکے نے غم و غصے سے پاگل ہو کر مرشد کو سب کے سامنے گالیاں دیں۔ وہ بے چارہ یہی کر سکتا تھا اور اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ گویا اپنی ماں کی موت اور بے آبروئی کا ممکنہ حد تک بدلہ لینے کے لیے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ مرشد نے اس کی موت سے دو فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک تو اسے مروا کر اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کر لی اور دوسرے اس نے مجھے بھی بتا دیا کہ اگر میں راہِ راست پر نہ آیا تو وہ میرے ساتھ بھی ایسا کر سکتا تھا۔

''تم لوگ جرائم پیشہ ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لوگوں کو مارتے اور اغوا کرتے ہو۔''

''بکواس۔'' وہ بولا۔ ''ہم عزت دار گدی نشین ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''عزت دار لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے ہیں۔ تم تو مجھے کوئی سکہ بند بدمعاش

لگ رہے ہو۔''

''چلو ایسا ہی سہی......تم نے دیکھ لیا کہ میں اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے کس حد جا سکتا ہوں۔ مجھے ہر صورت فتح خان چاہیے۔''

''تم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا یہ شخص کون ہے اور تمہیں کیوں چاہیے؟''

''میرا اس سے ایک کام ہے۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ''شہباز ملک......''

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا میرا نام شہباز ہے؟''

''ہاں تمہارا نام شہباز ہے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام......ہے۔'' اس بار اس نے بے قابو ہو کر اپنے لیے ایک ناپاک نام تجویز کیا میں ہنس دیا تھا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہی بات جب اس لڑکے نے کہی تو تم نے اسے مروا دیا۔''

مرشد شاید پچھتا رہا تھا کہ وہ میرے سامنے یوں بے قابو کیوں ہوا میں اس کا دشمن تھا اور وہ میرے سامنے ذرا رکھ رکھاؤ سے رہنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس رکھ رکھاؤ کی اس نے خود ایسی کم تیسی کر دی تھی۔ اب وہ پھر سے اپنا نقاب اوڑھنے کی فکر میں تھا۔ میں نے اس کی چٹکی لی۔ ''کیا میں سب کے سامنے تمہیں اسی نام سے پکاروں تو تم میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرواؤ گے؟''

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا نام مرشد علی ہے۔''

''مرشد علی......یہ سچ ہے مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں یاد ہے لیکن تمہارا طرز عمل بتا رہا ہے کہ ہم آپس میں دشمن ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں تم میرے بدترین دشمن ہو اور تم نے مجھے شدید نقصان پہنچائے ہیں۔ یقین کرو تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اس کا وجود میرے کتوں کے معدے میں جا کر ہضم ہو چکا ہوتا۔''

''لیکن تم نے میرے ساتھ مہربانی کی اور مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''اگرچہ میں یادداشت کھو چکا ہوں لیکن عقل نہیں کھوئی ہے۔ تم بے سبب کسی پر مہربانی کرنے والے شخص نہیں ہو۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''مجھے تم سے ایک کام ہے اور اگر تم میرا کام نہیں کرتے ہو تو تم میرے لیے بے کار ہو اس صورت میں، مَیں تمہیں نادر کے حوالے کر دوں گا۔''

''نادر کون......یہی منحوس صورت جلاد جنہوں نے اس لڑکے کو قتل کیا ہے؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔

اپنے بھائی کی شان میں گستاخی پر اس کا چہرہ پھر بگڑ گیا تھا لیکن اس نے خود پر قابو پا کر میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''نادر میرا بھائی ہے جو تمہاری وجہ سے ہمیشہ کے لیے معذور ہو کر بستر پر پڑ گیا ہے۔''

''میری وجہ سے کیوں؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم نے اس پر فائر کیا تھا جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی اور اس کا جسم مفلوج ہو گیا۔ اب اسے ڈاکٹروں نے مکمل طور پر جواب دے دیا ہے اور ابھی اسے معلوم نہیں ہے کہ تم میرے قبضے میں آ گئے ہو ورنہ وہ آسمان سر پر اٹھا لے گا اور مجھے تمہاری جان بچانا دشوار ہو جائے گا۔''

"خوب یعنی تم میری جان بچانا چاہتے ہو؟" میں نے طنزیہ لہجہ برقرار رکھا۔
"یہ حقیقت ہے میں تم سے دشمنی ختم کرنا چاہ رہا ہوں۔"
"نادر کے ہوتے ہوئے؟"
"ہاں اس کا مسئلہ نہیں ہے میں اسے باہر بھیج دوں گا وہ اب وہیں رہے گا اور اس کی جتنی بھی زندگی ہے وہ عیاشی سے گزارے گا پھر اسے تمہاری پروا نہیں ہوگی میں اسے بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں مار دیا ہے تو وہ اس بات پر یقین کرلے گا۔"
"لیکن سوال وہی ہے تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو جب کہ تم یہ کام سچ مچ کر سکتے ہو بلکہ اپنے معذور بھائی کے ہاتھ سے کروا سکتے ہو۔ وہ بھی خوش ہو جائے گا۔"
"میں تمہیں بتا چکا ہوں مجھے فتح خان چاہیے۔"
"یہ کون ہے اور اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"
"یہ تمہارا دشمن اور میرا ساتھی ہے اور اس وقت تمہارے قبضے میں ہے۔"
میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تو کیا میں بھی تمہاری طرح کا کوئی گینگسٹر ہوں۔ میں بھی دشمنوں کو اغوا کرتا ہوں۔"
"تم اس معاملے میں مجھ سے بہت آگے ہو۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "یہ تو میری قسمت ہے کہ تم میرے آدمی کے ہاتھ اتفاق سے آ گئے۔"
"ٹھیک ہے میں مان لیتا ہوں کہ فتح خان میرے پاس ہے لیکن میں نے اسے کہاں رکھا ہے مجھے بالکل نہیں معلوم ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔"
"مجھے شک ہے تم یادداشت غائب ہونے کا ڈھونگ رچا رہے ہو۔" اس نے ایک بار پھر صاف گوئی سے کہا۔
"لیکن یہ حقیقت ہے مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔"
وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ "شہباز تمہارا یہ ڈرامہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔"
"نہیں اسٹار پلس سے آنے والے سوپ ڈرامے تو بہت طویل عرصے تک چلتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"تمہیں اسٹار پلس یاد ہے۔" اس نے طنز کیا۔
"پتا نہیں بہت ساری باتیں یاد ہیں۔ بس اپنے بارے میں بھول گیا ہوں۔"
وہ جانے کے لیے مڑا اور رک کر بولا۔ "شہباز ملک اس پر سنجیدگی سے سوچنا، تمہارے پاس وقت کم ہے۔ بہتر ہے میری بات مان لو اور فتح خان کو میرے حوالے کر دو تو میں تمہیں جانے دوں گا۔"
"تمہاری بات سے لگ رہا ہے فتح خان تمہیں ساتھی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے کسی مطلب سے واپس چاہیے۔"
"اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے کہا اور حسبِ عادت لبادہ لہراتا ہوا کمرے سے رخصت ہو

گیا۔ میں بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اکیلے ہوتے ہی مجھے پھر اس مظلوم لڑکے کی یاد آئی جس کی ماں اس سے چھین لی گئی تھی اور جب اس نے قاتلوں کو گالیاں دیں تو انہوں نے اسے بھی عبرت ناک انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے وہ سب میں نے کس طرح برداشت کیا اور مرشد کے ساتھ نارمل ہو کر بات کرتا رہا تھا۔ یہی نہیں میں نے اپنی اداکاری بھی برقرار رکھی تھی اور مرشد کا شک رفتہ رفتہ کم ہونے لگا تھا۔ جب وہ مجھے دھمکی دے کر گیا تھا تب بھی اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔ یعنی اس کا امکان کم تھا کہ مجھے اس کی طرف سے کسی تشدد آمیز کارروائی کا نشانہ بننا پڑے۔ اصل خطرہ یہ تھا کہ نادر کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو جاتا تو وہ یقیناً پاگل ہو جاتا اور ممکن ہے اس کی ضد کے آگے مرشد مجبور ہو جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مرشد کیوں فتح خان کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک ممکنہ وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ پرانا ساتھی ہونے کے ناطے مرشد اسے میری قید سے چھڑانا چاہتا تھا لیکن یہ وجہ میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ مرشد تعلق پالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ فتح خان اہم شخص سہی لیکن مرشد کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر وہ میری قید میں تھا تو مرشد کو اس سے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی اور اگر وہ اسے آزاد کرانے کی کوشش کرتا تو کم سے کم میری قیمت پر آزاد کرانے کی کوشش نہ کرتا کیونکہ میں اس کے لیے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ میں اس کے لیے ایک ایسا دشمن بن چکا تھا جو اب اسے براہِ راست ناقابلِ تلافی قسم کے نقصانات پہنچا سکتا تھا اور میں اسے اس کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھا چکا تھا۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ مرشد علی ان ہیروں کے چکر میں ہے جو ایک طرح سے فتح خان کے قبضے میں تھے۔ کیونکہ ان ہیروں کے بارے میں دنیا کا ایک ہی شخص جانتا تھا کہ وہ کہاں موجود ہیں۔ یعنی برٹ شا اور یہ برٹ شا اس وقت فتح خان کی قید میں تھا۔ شاید اس بات کا مرشد علی کو بھی علم تھا اور اب وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح فتح خان سے برٹ شا کو حاصل کر لے اور پھر ان ہیروں تک رسائی حاصل کرے جن کی مالیت آج سے بارہ سال پہلے بھی کوئی پچیس کروڑ ڈالرز تھی اور اب اس مالیت میں یقیناً کئی گنا اضافہ ہو گیا ہو گا اگر پاکستانی روپوں میں ان کی قیمت نکالی جاتی وہ دسیوں ارب روپے میں جاتی۔ آج سے کوئی پانچ سال پہلے جب مہنگائی کا آغاز تھا۔ لاکھ کی نہ سہی لیکن کروڑ اور ارب کی اہمیت ہوتی تھی۔

مرشد کتنا ہی دولت مند سہی لیکن دولت کی اہمیت اس کے نزدیک کسی مفلس سے بھی زیادہ تھی۔ اسے دولت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی ہوس ضرور تھی اور ہیرے سب کو للچاتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ ایک وجہ آ رہی تھی جس کے لیے مرشد علی فتح خان کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے بے چین تھا اور اس کے لیے مجھ جیسے دشمن کو بھی رعایتیں دے رہا تھا۔ اگرچہ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ فتح خان کو حاصل کر کے بھی مجھے چھوڑے گا۔ فی الحال تو وہ مجھ سے فتح خان کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ ایک بار اس کے قبضے میں آ جاتا تو وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوتا۔

وقت گزرتا گیا۔ کھانا لانے والے نے حسبِ معمول مجھے دال چاول مہیا کیے۔ ان کا معیار گھٹیا تھا اور اپنے لیے کوئی بھی اس طرح کا کھانا نہیں بناتا ہے۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ کوئی جیل تھی اور یہاں کھانے کا یہی مینو تھا۔ تین ٹائم یہی ملتا تھا۔ تیسری بار ڈاکٹر کوئی دس بارہ گھنٹے بعد آیا تھا اس نے میرے زخم کا معائنہ کیا اور کسی قدر حیران ہو کر بولا۔ ”یہ تو تقریباً بھر گیا ہے اب اس پر پٹی لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

''انجکشن کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تمہاری مرضی۔'' اس نے کہا اور زخم پر دوا لگا کر رخصت ہو گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرے زخم اتنی جلدی کیوں بھر جاتے تھے۔ شاید وہ اسے قدرتی طور پر ایسا سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ یہ ان دواؤں کی وجہ سے تھا جو حکیم قادس نے مجھے ہاتھ بچانے کے لیے بے تحاشہ کھلائی تھیں اور ان کے اثر سے میرے گہرے زخم بھی حیرت انگیز طور پر جلدی بھر جاتے تھے۔ جب کھانے والا دن میں تیسری بار کھانا دینے آیا تو میں نے اس سے کہا۔

''کیا بات ہے یہاں کا مینو یہی ہے رات میں بھی یہی کھانا۔''

''تو تمہارے لیے ککڑ بنائیں۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔ وہ مخنی سا لیکن بدتمیز قسم کا شخص تھا اور شاید یہاں قیدیوں سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا۔ بہر حال اس کی بات سے تصدیق ہو گئی تھی کہ رات ہو چکی ہے۔ ان کی قید میں مجھے یہ دوسری رات تھی۔ اس نے دال چاول کا ڈونگہ میرے سامنے رکھا تو میں نے اس کی گردن دبوچی اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی آواز تو کیا سانس بھی رک گئی تھی اور آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے تو میں نے اسے یوں پھنسا لیا کہ اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔

''تم مجھے جانتے نہیں ہو ابھی میں گلا دبا کر تمہیں مار دوں تو مرشد مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ اس لیے میرے ساتھ احتیاط سے بات کیا کرو، سمجھ گئے؟''

میری گرفت نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ واقعی مر کر ہی اس سے نکل سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''اب مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اگر تم نے درست جواب دیئے تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔''

اس نے پھر جلدی سے سر ہلا کر مجھے تعاون کا یقین دلایا۔ میں نے گرفت ذرا نرم کی لیکن اتنی کہ وہ صرف بول سکے میں نے چلانے کی گنجائش نہیں رکھی تھی پھر بھی اسے خبردار کر دیا۔ ''آواز بس اتنی ہو کہ میرے کانوں تک آجائے اس سے آگے نہ جائے۔''

''تم...... کیا پوچھنا...... چاہتے ہو؟'' اس نے سہمی آواز میں کہا۔

''یہ جگہ کہاں ہے؟''

''مرشد بادشاہ کا ڈیرہ ہے۔'' اس نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ شاید میں مرشد ہاؤس میں ہوں لیکن یہ کسی ڈیرے کا ذکر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کہاں ہے؟''

اس نے مجھے جو محل وقوع بتایا یہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں اسلام آباد کی حدود سے باہر کوئی جگہ تھی۔ یہ ان کا آبائی گھر تھا لیکن اب یہ خاندان راولپنڈی میں مرشد ہاؤس میں رہتا تھا اور اس آبائی جگہ کو دوسرے کاموں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ''قید خانہ کہاں ہے؟''

''حویلی کے نیچے تہہ خانے میں۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن ادھر سے کوئی فرار نہیں ہو سکتا ہے۔ بہت سارے پہریدار ہیں اور باہر کتے ہیں۔ جس کو نہیں پہچانتے اسے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔''

میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ کوئی جیل تھی جس میں مرشد کے معتوبین رکھے جاتے تھے اور ان پر تشدد اور سختیاں کی جاتی تھیں۔ اگر یہ مشہور جگہ تھی تو یقیناً دوسرے لوگوں کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس آدمی سے ممکنہ حد تک معلومات حاصل کر کے اسے چھوڑ دیا اور چھوڑنے سے پہلے اسے سمجھایا۔ ''اس واقعے کا کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ مرشد کو پتا چل گیا کہ تم نے مجھے یہ سب بتایا ہے تو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک......''

''نہیں جی۔'' اس نے لرز کر کہا۔ ''میری زبان بند رہے گی آپ بھی مت بتانا۔ میرے چھوٹے بچے ہیں۔''

''میں کیوں بتانے لگا۔ اب تم جاؤ۔''

وہ چلا گیا اور میں نے دال چاول سے ڈنر کیا۔ ابھی دو دن پہلے تک میں راجا عمر دراز کی کوٹھی میں شاندار قسم کے کھانے کھا رہا تھا لیکن یہ میری زندگی کا ایک سائیکل تھا کبھی مزے اور کبھی سزا۔ مرشد نے مجھے کل تک کی مہلت دی تھی۔ اگرچہ یہ تو مشکل تھا کہ وہ میرے ساتھ وہی سلوک کرتا جو اس مظلوم لڑکے کے ساتھ کیا لیکن مجھ پر تشدد تو کیا جا سکتا تھا اور وہ اس معاملے میں اتنا مجبور بھی نہیں تھا۔ بس وہ اس وجہ سے رکا ہوا تھا کہ میری اداکاری نے اسے شک میں ڈال دیا تھا۔ اگر میں سچ مچ سب بھول چکا تھا تو مجھ پر تشدد بھی بے سود ہوتا۔ اس کے باوجود مرشد کی احتیاط مجھے حیران کر رہی تھی۔

رات سکون سے گزری اور صبح سویرے جیل کے نگران خود مجھے اس لیٹرین میں لے گئے جہاں جانے کا سوچ کر میری روح فنا ہو رہی تھی اور جانا مجبوری تھی۔ میں رات سے برداشت کر رہا تھا اور اب معاملہ برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ شکر ہے یہ خود آ گئے ورنہ اب میں دروازے تک نہیں جا سکتا تھا جو دروازہ بجا کر ان کو متوجہ کروں۔ یہ لوگ بھی شاید اسی وجہ سے قیدیوں کو بہت کم کھانا پانی دیتے تھے تاکہ اخراج کا مسئلہ دیر سے پیدا ہو۔ تین وقت چھوٹی پلیٹ کے مساوی دال چاول دیئے جاتے تھے اور ہر بار ساتھ میں ایک گلاس پانی ملتا تھا۔ اس کے باوجود چوبیس گھنٹے میں ایک بار تو لیٹرین جانا لازمی ہوتا تھا۔

ویسے پانی کی یہ مقدار اس مقدار سے بہت کم تھی جو ایک آدمی کو چوبیس گھنٹے میں درکار ہوتی ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس جیل میں چند مہینے گزارنے والے شخص کو لازمی طور پر گردے کا تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ پھر کھانے کی مقدار اتنی کم تھی کہ کھانے سے سیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور مشکل سے ایک گھنٹے بعد پھر بھوک لگ جاتی تھی۔ مجھے دو دن میں خاصا فرق محسوس ہونے لگا تھا جو لوگ یہاں مہینے یا اس سے زیادہ عرصے سے ہوں گے ان کا وزن بہت کم ہو گیا ہوگا۔ مرشد کو چاہیے تھا یہاں سلمنگ کلینک کھول لیتا اور لوگوں سے اچھی خاصی فیس بھی وصول کر لیتا لیکن یہ صرف ایک طنزیہ خیال تھا جو میرے ذہن میں آ گیا تھا۔

میں منتظر تھا کہ مرشد آئے گا لیکن دوپہر ہو گئی اور پھر شام ہو گئی لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ شاید وہ کہیں پھنسا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں نہیں آ پایا تھا۔ یہاں بھی وہ شاید صرف میری خاطر آیا ہوگا۔ ورنہ اس کا بیشتر وقت تو مرشد ہاؤس میں گزرتا تھا۔ مرشد تو نہیں آیا لیکن رات کے کھانے میں میرے ساتھ ہاتھ دکھا دیا گیا۔ جیسے ہی میں نے ڈونگا ختم کیا یک لخت کمرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور میں کوشش کے باوجود خود کو نہ سنبھال سکا میں بستر پر ہی لڑھک گیا تھا۔ دال چاول میں شامل دوا یقیناً زود اثر تھی۔ مجھے زیادہ دیر سوچنے کی مہلت بھی نہیں

ملی تھی۔



میری آنکھ کھلی تو پہلا احساس شدید سردی کا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درجہ حرارت نکتہ انجماد سے گر گیا تھا اور سردی کی شدت رگ و پے میں گھسی جا رہی تھی۔ میں بے ساختہ اٹھ بیٹھا تھا۔ یہ ایک پتھر کی دیواروں پر مشتمل کمرہ تھا جس میں ایک طرف فولادی دروازہ لگا تھا اور اس کے مخالف سمت دیوار میں کوئی دس فٹ کی بلندی پر روشن دان تھا اس میں شیشہ لگا تھا اور باہر ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔ یعنی دن نکل آیا تھا لیکن ابھی صبح کا آغاز تھا۔ میں نے چند گہرے سانس لیے تو مجھے ہوا بھی ہلکی محسوس ہوئی تھی اور اس میں نباتات کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یعنی میں کسی بلند مقام پر تھا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی میں فرش پر ایک بھورے اور موٹے سے کمبل پر پڑا تھا اور اس کے علاوہ میرے جسم پر صرف میرے کپڑے تھے۔ اگر چہ یہ بھی گرم کپڑے تھے لیکن سردی جس حساب سے تھی اس حساب سے گرم نہیں تھے۔ یہ اسلام آباد کی سردی کے لحاظ سے تھے اور یہاں تو مری جیسی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کمبل اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ شکر ہے یہاں میرے پیروں میں میرے جوتے تھے مجھے یہاں لانے سے پہلے پہنا دیئے تھے ورنہ میرے پاؤں ٹھٹھر جاتے۔

کچھ دیر میں جسم ذرا گرم ہوا تو میں نے اٹھ کر دروازہ بجایا۔ فولاد برف سے بھی زیادہ سرد ہو رہا تھا۔ اس پر ہاتھ لگتا تو باقاعدہ تکلیف ہوتی تھی لیکن یہ کام کرنا تھا۔ چند لمحے بعد باہر سے کسی نے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''میں سردی سے مر رہا ہوں۔'' میں نے چلا کر کہا۔ ''مجھے یہاں سے نکالو۔''

''شکر کرو اندر صرف سردی ہے باہر آ گئے تو اندر جانے کی آرزو کرو گے۔'' اس آدمی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ لہجے وہ پڑھا لکھا اور کوئی اہم شخص لگ رہا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''جہنم میں اور جلد یہاں تمہاری قبر بنے گی اس لیے سردی کے بجائے منکر نکیر کی فکر کرو۔'' اس نے کہا اور پھر اس کی آواز نہیں آئی تھی میں اسے پکارتا رہا۔ تھک ہار کر میں واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا تھا۔ یہاں فضا میں ایسا سناٹا تھا جیسے آس پاس کوئی ذی روح نہ ہو۔ جب کہ مرشد کے آبائی حویلی والے قید خانے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ شاید یہ کوئی ویران جگہ تھی لیکن مرشد نے مجھے یہاں کیوں منتقل کیا۔ کیا میری وہاں موجودگی سے اسے کوئی پریشانی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ مجھے بلا سبب تو یہاں منتقل نہیں کر سکتا تھا۔ باہر روشنی تیز ہو رہی تھی یعنی سورج نکل آیا تھا۔ صبح ہونے کے ساتھ ہی صبح سے منسلک مخصوص مسائل بھی سر اٹھا رہے تھے اور میں نے ایک بار پھر دروازہ پیٹا اور اس وقت تک پیٹتا رہا جب تک اس آدمی کی آواز نہیں سنائی دی۔

''کیا ہے؟'' اس نے دھاڑ کر کہا۔ دروازے کو اس بار میں نے جوتے سے بجایا تھا اور اس کی آہنی آواز نے میرا دماغ بھی خراب کر دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے کیا مسئلہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''کمرے کے ایک کونے میں دیکھو فرش میں ایک پتھر الگ سے نظر آئے گا اسے ہٹاؤ اس کے نیچے سوراخ ہے جو کرنا ہے اس میں کر لو۔''

میں بھنا گیا تھا۔ ''دھونے کے لیے پانی تو چاہیے ہوگا۔''

اس پر کچھ دیر بعد جب میں کمرے کے اس پتھر کا معائنہ کر رہا تھا اس پر درمیان میں چھوٹا سا لوہے کا کڑا

لگا تھا جس سے اس پتھر کو اٹھایا جا سکتا تھا کہ دروازے کا نچلا حصہ ذرا سا کھلا اور اس سے ڈیڑھ لیٹر والی کولڈ ڈرنک کی بوتل اندر آئی جس میں تقریباً برف نما پانی تھا۔ یورپ اور دنیا کے دوسرے سرد علاقوں میں لوگوں میں سردی کی وجہ سے طہارت کا رواج نہیں ہے وہ کاغذ سے کام چلا لیتے ہیں لیکن ہم مسلمان اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قطب شمالی یا قطب جنوبی پر بھی ہمیں صفائی کے لیے پانی درکار ہوتا ہے۔ اگر برف نما پانی کے بجائے برف بھی ہوتی تب بھی میں اسے ضرور استعمال کرتا۔ اگرچہ میرا برا حال ہو گیا تھا لیکن اس سے صفائی کا جو احساس ہوا اس کی بات ہی الگ تھی۔ پتھر بہت صفائی سے اس سوراخ پر لگا تھا اس لیے کمرے میں ذرا بھی بو نہیں تھی میں نے پتھر دوبارہ اپنی جگہ لگا دیا اور کمبل اوڑھ کر خود کو گرم کرنے لگا کیونکہ ذرا سی دیر میں صرف ہاتھ اور بعض مخصوص مقامات پر پانی لگنے سے جسم کی ساری حرارت زائل ہو گئی تھی اور میں کوئی ایک گھنٹہ کمبل میں رہا تب کہیں جا کر جسم پہلے کی طرح گرم ہوا تھا۔ پھر سورج بلند ہونے سے پہلے جیسی سردی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے کمبل ایک طرف رکھا اور ورزش کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ تک ورزش کرنے سے جسم تو گرم ہو گیا لیکن ساتھ ہی پیٹ میں بھوک کی الجھن بھی شروع ہو گئی تھی۔ پہلے قید خانے میں کم مقدار میں سہی لیکن باقاعدگی سے کھانے کو مل جاتا تھا یہاں کا کچھ پتا نہیں تھا اس لیے میں نے پھر دروازہ بجایا اور اس بار وہ پوچھے بغیر سمجھ گیا تھا۔ جب میں تھک ہار کر کمبل پر جا بیٹھا تو دروازے کا نچلا خانہ کھلا اور اس سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک ٹرے اندر آئی اس میں مکئی کی موٹی روٹی اور ایک چائے کا پیالہ تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جب تک میں دروازے کے پاس پہنچا خانہ بند ہو گیا تھا۔ یہ الگ سے ایک پلیٹ لگی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی اور اسے باہر سے کنڈی لگا کر بند بھی کیا جا سکتا تھا کیونکہ جب میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پلیٹ ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ اگر یہ کھلی بھی ہوتی تو میں اس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ مشکل سے چھ انچ چوڑی اور ایک فٹ لمبی تھی۔

مکئی کی روٹی نے تو شکم سیری کی تھی لیکن چائے کی گرمی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے کھا پی کر خدا کا شکر ادا کیا جو اس عالم میں بھی بندے پر مہربان تھا۔ جب میں ناشتہ کر رہا تھا تو خانہ کھلا اور اس میں سے ڈیڑھ لیٹر والی ایک بوتل اور اندر آئی اور اس آدمی نے باہر سے کہا۔ ''یہ پینے کے لیے ہے۔ برتن اور خالی بوتلیں اس خانے کے پاس رکھ دینا میں اٹھا لوں گا۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ جب میں خانے سے دور ہوتا تھا تب ہی وہ خانہ کھولتا تھا۔ اگرچہ میں اس خانے سے باہر صرف اسی صورت میں جا سکتا تھا جب میں کوئی بلا ہوتا۔ کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اس خانے سے کسی صورت نہیں نکل سکتا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ چیز رکھنے یا نکالنے کے دوران میں میں اس کا ہاتھ نہ پکڑ لوں کیونکہ اسے ہاتھ تو بہرصورت اندر لانا پڑتا تھا اور میں اس بات سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جب میں ناشتہ کر کے برتن رکھنے گیا تو میں نے اس خانے کا معائنہ کیا اور مجھے خیال آیا کہ اسے کس طرح پتا چلتا ہے کہ میں دروازے سے دور بیٹھا ہوں اور وہ خانہ کھول کر چیز اندر ڈال دیتا ہے۔ میں نے باریک بینی سے دروازے کا جائزہ لیا تو مجھے اس کے درمیان میں موجود باریک سوراخ نظر آ گئے تھے جن سے کمرے میں جھانکا جا سکتا تھا اور وہ ان سے جھانک کر دیکھ لیتا تھا کہ میں دور دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ تب وہ پھرتی سے خانہ کھولتا اور چیز اندر رکھ کر فوراً خانہ بند کر دیتا تھا۔

اتنی احتیاط کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اس جگہ اکیلا تھا اور اسے میرے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا اس لیے وہ بہت محتاط تھا مجھے کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے مجھے فرار میں مدد مل جائے۔ میں نے پانی کی بوتل پاس رکھ لی یہ مختلف کولڈ ڈرنک کی بوتل تھی اس لیے پینے اور طہارت کے پانی کی بوتلیں آپس میں ملنے کا امکان نہیں تھا ویسے وہ بوتل میں نے سوراخ والے پتھر کے ساتھ ہی رکھ دی تھی۔ کھا پی کر میں پھر کمبل میں لپٹ کر لیٹ گیا تھا اور میں نے کمبل یوں لپیٹ لیا تھا کہ میں اس میں پوری طرح چھپ گیا تھا لیکن میں نے ایک جھری چھوڑ دی تھی جس سے مجھے دروازے کا نچلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی دس منٹ بعد اس نے خانہ کھولا اور ناشتے کے برتن باہر کھینچ لیے اور خانہ بند کر دیا۔ اس کام میں اسے مشکل سے دس سیکنڈ لگے ہوں گے اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اس کام میں مہارت تھی۔ شاید وہ پہلے بھی یہاں قیدیوں کی میزبانی کرتا رہا تھا۔

دن چڑھنے کے ساتھ سردی کا احساس کم ہوتا جا رہا تھا۔ میں کمبل میں لپٹ کر سو گیا تھا۔ پھر میری آنکھ خانے کے بند ہونے کی آواز سے کھلی میں نے کمبل سے جھانکا تو مجھے ایک پلاسٹک کا پیالہ نظر آیا اس میں چمچ بھی تھا اور اس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس چلا آیا۔ مجھے خاص بھوک نہیں تھی لیکن اس پیالے سے اٹھتی گرمی بڑی قیمتی تھی میں نے پیالہ کمبل کے اندر کر لیا اور اس گرمی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پیالے میں سادہ دلیہ تھا جس میں ہلکا سا نمک مرچ ڈال دیا گیا تھا اور یہ تقریباً بے ذائقہ تھا لیکن اس دال چاول سے بہت اچھا تھا جو مجھے پہلے قید خانے میں ملتا تھا۔ جب دلیہ کسی قدر ٹھنڈا ہو گیا تو میں نے اسے کھا لیا۔ خالی پیالہ واپس دروازے کے پاس رکھ دیا جو باہر موجود شخص نے اچانک ہی اٹھا لیا لیکن اس نے خانہ فوراً بند نہیں کیا تھا بلکہ اس نے کوئی چیز اور اندر رکھی اور پھر خانہ بند کیا تھا۔ اس بار میں نے پھرتی دکھائی لیکن جب تک خانے تک پہنچا وہ بند ہو گیا تھا۔ میں اس چیز کو دیکھ کو حیران رہ گیا۔ یہ ایک موبائل فون تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ آن تھا بیٹری پوری تھی اور خاص بات یہ تھی کہ اس پر سگنل بھی آ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ میں شہر سے دور بالکل ہی کسی ویران جگہ نہیں تھا بلکہ شہر کے پاس ہی تھا۔ میں نے اس پر ایک نمبر ملا کر دیکھا لیکن آگے سے ریکارڈ آواز نے بتایا کہ بیلنس نہیں ہے۔ میں واپس آ کر کمبل میں گھس گیا میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ موبائل کس لیے مجھے دیا گیا ہے فوراً ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور بیل بجی۔ میں نے نمبر دیکھا اور اسے ذہن نشین کر کے کال ریسیو کی۔

''شہباز ملک۔'' دوسری طرف سے مرشد کی آواز آئی۔ ''میرا خیال ہے تم آرام سے ہو گے۔''

''ہاں جتنا کوئی قیدی آرام سے ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے مجھے یہاں سوائے سردی کے اور کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔''

''تم میری مہربانی کو کہاں مانو گے؟'' اس نے طنز کیا۔

''بات یہ ہے مرشد کہ شیطان کی مہربانی اس کا دھوکا ہوتی ہے اور اس کی آڑ میں وہ انسان سے اس کی سب سے قیمتی چیز چھین لیتا ہے۔ تم شیطان تو نہیں ہو لیکن اس کے چھوٹے موٹے چیلے ضرور ہو۔ اس لیے مجھے بیوقوف مت بناؤ اور کام کی بات کرو۔''

''تمہارے انداز سے تو لگ رہا ہے تمہیں سب یاد آ گیا ہے۔'' اس نے عیاری سے کہا۔ ''تبھی تم میرے

بارے میں اتنی روانی سے تبصرہ کر رہے ہو۔''

مجھ سے غلطی ہوئی تھی اصل میں موبائل دیکھ کر میں حیران ہوا تھا اور یہ بات بھول گیا تھا کہ میری یادداشت گم ہے لیکن میں اتنی آسانی سے اس بات کا اقرار کس طرح کر سکتا تھا اس لیے میں نے فوراً جواب دیا۔

''بے شک مجھے پچھلی باتیں یاد نہیں ہیں لیکن تم نے اپنا تفصیلی تعارف کرا دیا ہے۔''

''یعنی تم اپنی بات پر قائم ہو خیر مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔''

''یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں منتقل کیا ہے؟''

''اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو میں نے تمہارے لواحقین سے رابطہ کر لیا ہے۔''

''میرے لواحقین۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کون...... کس سے رابطہ کیا ہے؟''

''ایک تو تمہارا چمچہ خاص وکیل ہے۔ ندیم اس سے رابطہ کیا تھا اور پھر اس کے توسط سے اس راجا کے بچے سے رابطہ کیا تھا۔''

''ان سے کیا بات ہوئی ہے؟''

''فی الحال تو ان کو یہ بتایا ہے کہ تم میرے پاس ہو اور جب مجھے فتح خان مل جائے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''مجھے یہاں بھیجنے کی دوسری وجہ کیا ہے؟''

''جو عمارتیں میری ملکیت ہیں ان کے آس پاس مشکوک افراد نظر آنے لگے تھے اور ایک کار کو روکنے کی کوشش کی تو اس میں موجود افراد نے میرے آدمیوں پر فائرنگ کر دی اور فرار ہو گئے۔ اس واقعے میں میرے دو آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔''

''تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ کارروائی میری خاطر کی گئی ہے تمہارے اور دشمن بھی تو ہوں گے۔ دوسرے وکیل تو سمجھ میں آتا ہے یہ راجا کون ہے۔''

''ہے ایک نام نہاد راجا...... تمہاری ہمدردی میں کچھ زیادہ ہی آگے آ گیا ہے۔'' مرشد کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ ''ابھی میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ہے لیکن جس دن......''

''مرشد تم فضول باتیں کرنے کے بجائے ان سے بات کرو اپنے آدمی کو حاصل کر لو اور میری جان چھوڑو۔''

''فکر مت کرو۔'' اس نے برا مانے بغیر کہا۔ ''جیسے ہی مجھے فتح خان ملے گا میں تم کو چھوڑ دوں گا۔''

''تب تم مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ جب کہ میں کچھ نہیں جانتا کہ جو تم کہہ رہے ہو وہ درست بھی ہے یا نہیں اور تم میری یادداشت غائب ہونے کا کتنا فائدہ اٹھا رہے ہو۔''

''میں تم کو خبردار کر رہا ہوں اس جگہ سے فرار کا خیال بھی مت لانا ایسی کسی کوشش کا مطلب موت بھی ہو سکتی ہے۔''

''میں ڈر گیا۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''اور کچھ......؟''

اس نے بھنا کر فون بند کر دیا۔ مجھے لگا جیسے مرشد مجھے مرعوب کرنے کے لیے احمقانہ حرکتیں کر رہا ہے۔

اس نے مجھے بے ہوش کروا کے یہاں منتقل کیا تھا حالانکہ یہ کام وہ ہوش میں بھی کرا سکتا تھا۔ باہر موجود شخص ہماری باتیں سن رہا تھا اس لیے جیسے ہی میں خاموش ہوا اس نے دروازہ بجایا۔

''موبائل خانے کے پاس رکھ دو۔''

''کس خوشی میں۔'' میں نے موبائل کا جائزہ لیا۔ ''یہ میرے پاس ہی مناسب ہے۔''

''تم شرافت سے دیتے ہو یا......''

''تم لینے کے لیے اندر آ جاؤ گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''صبح سے تمہاری بہادری کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔''

''اگر تم نے موبائل یہاں نہیں رکھا تو میں تمہارا کھانا اور پانی بند کر دوں گا۔'' اس نے دھمکی دی۔

''شوق سے کر دو۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اب بیٹھے رہو کھانے اور پانی کے بغیر۔'' اس نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ مرشد کے آدمی بھی اس کی طرح حماقتیں کرنے کے ماہر لگ رہے تھے۔ اول تو اسے موبائل دینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ مجھے ہینڈ فری پکڑا دیتا اور میں اس سے بات کر لیتا۔ ہینڈ فری میرے کسی کام کا نہیں تھا اور مجھے واپس کرنا ہی پڑتا لیکن موبائل کیوں واپس کرتا۔ جب کہ مجھے اس سے ایک امید کی کرن نظر آئی تھی کہ شاید اس کی مدد سے میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکوں۔ اس زمانے میں موبائل کمپنیز نے لون کی سہولت متعارف نہیں کرائی تھی۔ جس سے آدمی لون لے کر آرام سے بات کر سکتا ہے۔ یہ عام سا موبائل تھا جس میں اسکرین بھی بلیک اینڈ وائٹ ہوتی ہے بس یہ موبائل والا کام خوب کرتا ہے۔ اس دور دراز پہاڑی علاقے میں بھی اس کے سگنل آ رہے تھے۔

شام قریب تھی اور سردی میں اب اضافہ ہو رہا تھا۔ میں کمبل میں لپٹ کر بیٹھ گیا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ رات بہت مشکل گزرے گی۔ سردی شدت اختیار کر جائے گی۔ ابھی تو اسلام آباد میں بھی بغیر ہیٹر کے گزارا نہیں تھا یہاں تو درجہ حرارت لازمی نکتہ انجماد سے نیچے چلا جاتا ہوگا۔ سورج غروب ہوا اور رات ہو گئی۔ موبائل کے مطابق ابھی پانچ بج رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں ویسے بھی تاریکی تیزی سے آتی ہے۔ اسی حساب سے سردی کی شدت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ میں سر بھی کمبل میں کر کے خود کو گرم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک موبائل کی بیل بجی تو میں اچھل پڑا تھا۔ دوسری طرف مرشد تھا۔ اس نے بلاتمہید کہا۔

''تم نے ابھی تک موبائل واپس نہیں کیا؟''

''اگر موبائل میرے پاس رہتا ہے تو اس کا تمہیں کیا نقصان ہے؟''

''مجھے کوئی نقصان نہیں ہے لیکن تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ موبائل اسے واپس کر دو۔''

''سوری مرشد میں اسے اپنے پاس رکھوں گا بلکہ تم ایسا کرو مجھے کچھ بیلنس بھجوا دو تا کہ میں تم سے بات کر کے وقت گزاری کر سکوں۔''

''شہباز۔'' اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔ ''تم اپنی مشکلات میں اضافے کے خود ذمے دار ہو گے۔ بعد میں مجھ سے کوئی شکایت نہ کرنا۔''

میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ اس کے ذہن میں یقیناً کوئی ایسا عمل تھا جس سے وہ مجھے نقصان کر سکتا

تھا یا مجھ سے موبائل واپس لے سکتا تھا۔ مجھے ایک موقع بھی نظر آیا تھا اور اگر میں ضد کرتا تو شاید اس موقع سے محروم ہو جاتا۔ میں نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے میں موبائل واپس کر دیتا ہوں لیکن اپنے آدمی سے کہو میرے ساتھ ذرا بہتر سلوک کرے اگر مجھے یہاں انگیٹھی مہیا کر دے تو میں سردی میں ٹھٹھرنے سے بچ سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ''تم موبائل اسے واپس کرو۔''

میں نے جا کر دروازہ بجایا۔ ''موبائل لے لو۔''

میں نے موبائل وہیں رکھ دیا لیکن میں خود واپس نہیں گیا بلکہ دروازے کے پاس کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔ ''تم اپنی جگہ واپس جاؤ۔''

میں پیچھے ہٹا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم کچھ زیادہ ہی محتاط نہیں ہو؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے پھرتی سے خانہ کھول کر موبائل باہر نکال لیا اور پہلی بار میں نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ میں دم بخود رہ گیا تھا چونکہ ہاتھ سو فی صد نسوانی تھا لیکن جو شخص باہر سے بولتا تھا اس کا لہجہ تو خالص مردانہ سے کچھ زیادہ ہی تھا تو کیا یہ اس عورت کی آواز تھی۔ ایسا ہوتا ہے کہ بعض عورتوں کی آواز مردانہ قسم کی ہوتی ہے اور اسی طرح بعض مردوں کی آواز میں نسوانیت پائی جاتی ہے۔ خانے سے جس ہاتھ نے موبائل اٹھایا تھا وہ میدے کی طرح سفید اور نرم و نازک سا تھا۔ انگلیاں گول اور ہتھیلی گداز تھی۔ ایسا ہاتھ عورت کا ہی ہو سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ بہت محتاط تھی اور اسے خوف تھا کہ خانے سے چیزیں اندر باہر کرتے ہوئے میں اس کا ہاتھ نہ پکڑ لوں۔ خانے کے تختے کے باہر چٹخنی لگی تھی جسے سرکا کر تختہ بند کر دیا جاتا تھا اور میں اسے کھول کر باہر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد خانہ کھلا اور اس سے رات کا کھانا اندر آیا۔ ٹرے میں آلو گوشت اور موٹی روٹی تھی۔ کئی دن کے بعد مجھے ڈھنگ کا کھانا صحیح مقدار میں ملا تھا اور یہ شاید موبائل واپس کرنے کا انعام تھا۔ کھانے کے ساتھ پانی کی تازہ بوتل بھی تھی کیونکہ صبح ملنے والی بوتل میں نے خالی کر دی تھی۔ ساتھ ہی طہارت والی بوتل بھی خالی ہو گئی تھی۔ میں نے وہ بھی دے دی تھی لیکن وہ واپس نہیں ملی تھی۔ جب میں کھا چکا اور میں نے برتن واپس رکھ دیئے تو اس نے برتن اٹھانے کے ساتھ پانی کی دوسری بوتل بھی اندر کر دی تھی۔ یعنی وہ میرا خیال رکھ رہی تھی۔ اس بار بھی میں نے دیکھ لیا کہ ہاتھ عورت کا تھا۔ دروازے کے عین اوپر ایک بلب لگا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ بلب آن ہو گیا تھا یعنی یہاں لائٹ تھی۔

اس جگہ دن میں بھی سناٹا ہی رہتا تھا لیکن رات کو یہ سناٹا اس قدر شدید ہو گیا کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دنیا میں اب کوئی باقی نہیں رہا ہے بس میں ہوں اور اس ویران جگہ قید ہوں۔ ایک بار میرے دل میں آئی کہ میں دروازہ بجا کر اس مردانہ آواز والی عورت کو پکاروں لیکن پھر میں نے خود کو روک لیا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے خود کو کمبل میں لپیٹ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ جب میں نے مرشد علی سے انگیٹھی کا مطالبہ کیا تھا تب ہی مجھے یقین تھا وہ یہ بات نہیں مانے گا اور عورت نے مجھے انگیٹھی فراہم نہیں کی تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ اس چھوٹے سے خانے سے کوئی انگیٹھی اندر نہیں آ سکتی تھی۔

سناٹا شدید ہونے کی وجہ سے میری سماعت بہتر انداز میں کام کرنے لگی تھی۔ کئی بار مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے تک آیا ہے اور میرا معائنہ کر کے چلا گیا ہے۔ رات دس بجے ایک بار خانہ کھلا اور اس میں سے چائے کا بھاپ اُڑاتا پیالہ اندر آیا۔ خانہ بند ہونے کے بعد میں نے پیالہ اٹھالیا۔ مجھے جو برتن بھی دیا جاتا تھا وہ بہت ہلکے پلاسٹک کا ہوتا تھا جس سے میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ پیالہ بھی اتنا ہلکا تھا کہ چائے کی تپش اس سے باہر آ کر ہاتھوں کو لگ رہی تھی لیکن اس موسم میں یہ گرمی بھلی لگ رہی تھی۔ چائے اچھی بنی تھی اور اس میں دودھ اور چینی دونوں کم تھے۔ چائے پی کر میں نے خالی پیالہ دروازے کے پاس رکھ دیا۔ اس بار میں کمبل میں لیٹا تو مجھے نیند آ گئی تھی۔

صبح چھ بجے روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور سردی بدستور غضب کی تھی۔ کمبل کو گول مول کر کے پوری طرح اوڑھ لینے کے بعد بھی سردی لگ رہی تھی۔ سات بجے سورج کی روشنی روشن دان پر نظر آئی۔ یعنی یہ حصہ مشرق کی طرف تھا۔ آٹھ بجے دروازے کا خانہ کھلا اور کھولنے سے عورت نے یقیناً جھانک کر دیکھ لیا ہوگا کہ میں کمبل میں لپٹا بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اندر ڈال کر ناشتے کی ٹرے رکھی اور جیسے ہی اس نے یہ کام کیا میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے تڑپ کر کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں میری گرفت اتنی سخت ہو چکی تھی کہ اس کی ہڈیاں کڑکڑا گئیں اور اس کے منہ سے تیز کراہ نکلی تھی اور یہ کراہ سو فی صد نسوانی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ مزید اندر رکھ لیا اور اس نے بلبلا کر کہا۔

''چھوڑ میرا ہاتھ۔''

''واہ اب تم بالکل عورت والے لہجے میں بول رہی ہو۔''

''میں کہہ رہی ہوں میرا ہاتھ چھوڑو۔'' اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اگر چہ میری سخت گرفت سے اسے تکلیف ہو رہی تھی لیکن اس کے لہجے سے اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب کلائی تک اندر تھا اور وہ یقیناً فرش پر لیٹ گئی تھی۔ دودھ ایسا سفید ہاتھ جس میں ہلکی سی گلابیت کی آمیزش تھی اور بہت خوب صورت اور سڈول نسوانی ہاتھ تھا یقیناً اس ہاتھ کی مالکہ بھی اتنی ہی حسین ہوگی لیکن فی الحال مجھے اس کی خوب صورتی سے زیادہ اپنی آزادی کی فکر تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے بھی اسے پکڑ لیا اور سفا کی سے بولا۔ ''مجھے لگ رہا ہے تم کوئی حسین اور نازک عورت ہو لیکن میں تم پر ذرا بھی ترس نہیں کھاؤں گا اور تمہارا یہ ہاتھ جسم سے الگ کر دوں گا۔''

''نہیں۔'' وہ کانپ گئی تھی۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ بتاؤ تمہارے علاوہ اور کتنے لوگ ہیں یہاں؟''

''کوئی نہیں بس میں ہوتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے دروازہ کھولو میں اس قید خانے سے آزادی چاہتا ہوں۔''

''میں تمہیں نہیں کھول سکتی اس کے دروازے پر تالا لگا ہے اور چابی میرے پاس نہیں ہے۔'' وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے میرا ہاتھ چھوڑ دو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

میں نے ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ''جھوٹ مت بولو، جب یہاں سب تم کر رہی ہو تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے اس تالے کی چابی تمہارے پاس نہ ہو۔''

وہ کراہنے لگی تھی۔ ''میں...... سچ کہہ رہی ہوں۔''

''میں نہیں مان سکتا۔ تم نے میری گرفت سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں طاقتور شخص ہوں اور میں سچ کہہ رہا ہوں تمہارا ہاتھ الگ کردوں گا۔''

''میں بھی سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ لہجے سے وہ تعلیم یافتہ اور ذہین لگ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مرشد نے مجھے اس کی قید میں رکھوایا تھا اور وہ یہاں اکیلی میری نگرانی کررہی تھی۔

''او کے چابی تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر کس کے پاس ہے؟''

''کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایک اور جگہ رکھی ہے میں اسے ہر وقت لے کر نہیں گھوم سکتی ہوں۔''

میں نے ایک لمحے کے لیے اپنی گرفت نرم نہیں کی تھی حالانکہ میری انگلیاں اس کی نرم جلد میں گڑی جا رہی تھیں اور یقیناً ان جگہوں پر گہرے نشان بن گئے تھے۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''زرین۔'' اس نے جواب دیا۔

''زرین یہ جگہ کہاں ہے؟''

''مری ٹول پلازہ سے ذرا آگے ہے۔''

''تب یہ جگہ یقیناً ویران ہوگی تم اکیلی یہاں کیسے رہ رہی ہو؟''

''میں بالکل اکیلی نہیں ہوں۔ اس جگہ کا ایک چوکیدار بھی ہے لیکن وہ کوٹھی سے باہر ہوتا ہے اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ چوکیداری کے علاوہ سامان بھی لاتا ہے۔''

''مرشد سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

میرے اس سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس نے مجھے یہاں رکھا ہوا ہے۔''

اس کا جواب واضح نہیں تھا لیکن اس کا مطلب شاید یہ تھا کہ مرشد نے اسے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے اور اس کا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ایسی صورت میں وہ واضح بتا سکتی تھی لیکن ایک یہی ایسی بات ہے جو عورت بتاتے ہوئے ہچکچاتی ہے چاہے وہ کتنی بے باک کیوں نہ ہو۔ سچی بات ہے یہ بات سن کر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ خوب صورت عورت تھی بلکہ اس لیے کہ وہ عورت تھی اور مرشد نے اس کی کسی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ میں نے اس سے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

''زرین اگر مجھے آزادی نہیں ملے گی تو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم کب تک مجھے اس طرح پکڑ کر بیٹھے رہو گے۔'' اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''جلد چوکیدار یا مرشد کو میری غیر موجودگی کا علم ہو جائے گا۔''

''تم نے کہا کہ چوکیدار کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے؟''

''ہاں مرشد نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے۔'' اس نے ذرا بدلے انداز میں کہا جیسے یہ بات اسے ناگوار گزرتی ہو۔

''یعنی اسے تم پر اعتبار نہیں ہے۔''

''اگر تم اسے جانتے ہو تو وہ ایسا شخص ہے جو اپنی ماں پر اعتبار نہ کرے۔'' اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''اگر تم سمجھ رہے ہو کہ مجھے یرغمال بنا کر مرشد کو کسی طرح مجبور کر دو گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں اس کی غلام ہوں اور میری اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔''

''لہجے سے تم پڑھی لکھی لگتی ہو؟''

''میں نے انٹر تک کالج سے تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر بابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تو میں اس کے پاس یہاں آ گئی۔''

''بابا...... یہاں کیا کرتا تھا؟''

''وہ مرشد کی اس کوٹھی کا چوکیدار تھا لیکن بابا نے کبھی مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی میں گاؤں میں اپنی موسی کے پاس رہتی تھی۔''

''جب تم یہاں آئیں تو پھر کیا ہوا؟''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''مرشد نے بابا کی چھٹی کر دی اور مجھے ملازم رکھ لیا۔ بابا میں انکار کی مجال نہیں تھی۔ پھر شاید اسی صدمے نے اس کی جان لے لی۔ تب سے میں یہاں ہوں۔''

''مرشد نے یہاں قید خانہ بھی بنوایا ہے؟''

''نہیں یہ پیچھے کا ایک کمرہ تھا۔ پھر اس نے اس پر لوہے کا دروازہ لگا دیا اور دوسرے کچھ انتظامات کیے اور اس کے بعد کبھی کبھی وہ کسی کو یہاں بھیج دیتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے یوں سمجھ لو کہ تم یہاں چھٹے یا ساتویں قیدی ہو۔''

ہمارے درمیان گفتگو اسی طرح جاری تھی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ اسے کھینچ رہی تھی۔

''مجھ سے پہلے جو قیدی یہاں آئے ان کا کیا ہوا؟''

''ان میں سے کچھ تو واپس چلے گئے اور کچھ......'' وہ کہتے ہوئے رک گئی۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں کچھ کا کیا ہوا؟''

''ان کا مجھے نہیں معلوم۔'' وہ پریشان ہو گئی۔ ''میں تم سے پہلے ہی بہت باتیں کر چکی ہوں اگر مرشد کو پتا چل گیا تو وہ نہ جانے میرے ساتھ کیا کرے گا۔''

''یقیناً اچھا نہیں کرے گا۔'' میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''زرین اگر تم چاہتی ہو کہ مرشد تمہاری کھال نہ اتارے تو تمہیں میرے ساتھ پورا تعاون کرنا ہو گا۔''

''کیسا تعاون؟''

''مجھے یہاں سے آزاد کراؤ۔''

''کیسے اور تمہارا کیا خیال ہے اگر میں نے تمہیں آزاد کرا دیا تو مرشد مجھے بخش دے گا۔''

''تم اسے بتا سکتی ہو میں نے تمہیں کس طرح مجبور کیا۔''

''وہ کسی کی مجبوری سنتا اور مانتا ہے؟''

مجھے دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ مرشد واقعی کسی کی مجبوری ماننے والا شخص نہیں تھا۔ اگر اس کے کسی آدمی سے

غلطی ہو جائے تو وہ اسے لازمی سزا دیتا ہو گا۔ معاف کرنا اس کی سرشت میں نہیں ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ ''سنو تم کسی طرح چوکیدار کو یہاں بلا سکتی ہو؟''

''نہیں میں نے کہا نا اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ہنگامی حالات میں بھی نہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''دیکھو اگر تم چلاؤ تو کیا وہ تمہاری آواز سن کے بھی باہر بیٹھا رہے گا؟''

''نہیں......شارق فوراً اندر آ جائے گا۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

اس نے جس طرح شارق کا نام لیا تھا اور اس کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا۔ مجھے لگا ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق تھا۔ میں نے انجان بن کر کہا۔ ''کیوں اسے تم سے ایسی کیا ہمدردی ہے جو وہ تمہاری آواز سن کر فوراً دوڑا آئے گا؟''

''سب مرشد کی طرح سنگ دل نہیں ہوتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کا ایک مطلب تو عام تھا لیکن ایک مطلب یہ بھی تھا کہ مرشد اس سے متاثر ہوئے بغیر اسے صرف اپنی داشتہ بنائے ہوئے تھا لیکن شارق اسے پسند بھی کرنے لگا تھا لیکن یہ اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''شارق کو آواز دو۔''

''نہیں۔'' وہ بولی۔ ''اسے اس معاملے میں شامل نہ کرو ورنہ مرشد کا عتاب اس پر بھی آئے گا۔''

''فی الحال تم مرشد کے بجائے میرے عتاب کی فکر کرو۔ اگر مجھے آزادی نہ ملی تو تمہارا ہاتھ تمہارے جسم سے ضرور آزاد ہو جائے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں شاید غلط فہمی ہے کہ میں نرم دل ہوں۔ کیا مرشد نے تمہیں میرے بارے میں بتایا نہیں ہے؟''

''بتایا ہے۔'' وہ کراہی۔ ''مرشد نے بتایا تھا تم بہت سفاک انسان ہو اور اگر تمہیں موقع مل گیا تو تم مجھے قتل بھی کر سکتے ہو۔''

''اس نے درست کہا ہے اپنی آزادی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں اب تم اسے آواز دے رہی ہو یا......'' میں نے اس کا ہاتھ ذرا سا مروڑا تو اس نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔ ''یہ صرف نمونہ ہے اگر میں نے تمہارا ہاتھ اوپر کی طرف کھینچ لیا تو اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔''

''نہیں خدا کے لیے۔'' وہ رونے والے انداز میں بولی۔ ''تم جیسا کہو گے میں کروں گی، لیکن میں تمہیں آزاد نہیں کرا سکتی۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔''

''بالکل ہے تم شارق کو آواز دو اور اس سے چابی منگوا کر تالا کھول دو۔''

''شاید میری آواز اس تک نہ پہنچے۔''

''زرین مجھے مجبور مت کرو تمہارا ہاتھ توڑنے سے پہلے میں صرف یہ چھوٹی انگلی توڑ دوں تو تمہارا واویلا سن کر خود مرشد دوڑا آئے گا۔'' میں نے کہا اور تجربے کے طور پر اس کی چھوٹی انگلی پکڑ کر پیچھے کی طرف کی تو وہ چلا اٹھی تھی۔ ''شاباش اسی طرح چیخو۔''

''شارق۔'' اس نے چلا کر کہا۔
''ذرا زور سے۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔
''شارق۔'' اس بار اس نے سچ مچ پورا زور لگایا اور اس کا نتیجہ بھی حوصلہ افزا رہا۔ باہر سے کسی مرد کے چلانے کی آواز آئی۔
''زرین۔''
''شارق جلدی آؤ۔'' زرین چلائی۔
اس کے بعد کچھ دیر دونوں فلمی اسٹائل میں چلا چلا کر ایک دوسرے کا نام پکارتے رہے۔ پھر شارق نے آگاہ کیا کہ دروازہ اندر سے بند ہے وہ کیسے آئے؟ زرین نے اسے دیوار پھلانگ کر آنے کا مشورہ دیا۔ ایک منٹ بعد شارق اندر آ گیا تھا اس کی آواز پاس سے آئی تھی۔ ''تم کہاں ہو؟''
''میں یہاں قیدی والے کمرے کے پاس ہوں اس نے مجھے پکڑ لیا ہے۔ کمرے کے تالے کی چابی لیتے آؤ۔''
یہ سن کر شارق تیزی سے اندر آیا اور زرین کو میری گرفت میں دیکھ کر مضطرب ہو گیا اس نے مجھے دھمکی دی۔ ''چھوڑ اسے ورنہ گولی مار دوں گا۔''
''کیسے؟...... میں تو اندر ہوں اور اگر تم نے کسی طرح سے گولی مار بھی دی تو اس وقت تک میں اس کا ہاتھ توڑ چکا ہوں گا۔''
''شارق...... اس کی بات مان لے۔'' زرین رونے لگی۔ ''مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔''
حالانکہ میں نے اسے مضبوطی سے ضرور پکڑا تھا لیکن اب میری گرفت تکلیف دینے والی نہیں تھی۔ یہ بات غالباً اس نے شارق کو متاثر کرنے کے لیے کہی تھی اور وہ فوراً متاثر ہو گیا اس نے گھبرائے انداز میں کہا۔ ''اسے چھوڑ دو میں چابی لا رہا ہوں۔''
''ایک منٹ رکنا تم مجھے کس چیز سے گولی مار رہے تھے؟''
''میرے پاس پستول ہے۔''
''وہ پستول زرین کے حوالے کر دو اور زرین تم پستول مجھے دو گی۔''
''میں پستول نہیں دے سکتا۔'' شارق نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔
''تم نے مجھے کیا بے وقوف سمجھا ہے۔ اگر پستول تمہارے پاس ہو گا تو مجھے تالا کھولتے ہی گولی نہیں مار دو گے۔ شرافت سے پستول زرین کو دے دو ورنہ......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر زرین کا ہاتھ ذرا کھینچا تو اس نے ایسی چیخ ماری کہ میرے کان بھی جھنجھنا گئے تھے۔ شارق جلدی سے بولا۔
''اچھا میں دیتا ہوں۔ اسے تکلیف مت دو۔''
میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ ان دونوں میں کوئی چکر تھا اور شارق اگر صرف چوکیدار ہوتا تو اسے زرین کی اتنی پروا نہیں ہوتی جب کہ اسے مرشد کا خوف زیادہ ہونا چاہیے تھا لیکن اس وقت میری ساری حسیات ان پر مرکوز تھیں کہ کسی طرح میں پستول حاصل کر کے تالا کھلوا لوں اس کے بعد ہی یہاں سے میری آزادی کی راہ

ہموار ہو سکتی تھی۔ شارق کی بات سن کر میں محتاط ہو گیا تھا میں نے زرین سے کہا۔
''پستول نال سے پکڑ کر اندر کرنا اور کوئی چکر مت چلانا ورنہ تم بھگتو گی۔''
لیکن اس کی جان پر بنی تھی۔ اس نے شرافت سے پستول نال سے پکڑ کر اندر کی اور میں نے جلدی سے اس پر قبضہ کر لیا۔ پستول لوڈ تھا اور بہترین قسم کا ہتھیار تھا۔ میں نے اس کا رخ ایک طرف کر کے فائر کر دیا۔ بند کمرے میں اس کا دھماکہ بم سے کم نہیں تھا کچھ دیر کے لیے میرے کان بند ہو گئے تھے پھر زرین کے چلانے کی آواز آئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟''
''چیک کر رہا ہوں کہ یہ کام کرتا ہے یا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب شارق سے کہو چابی لا کر تالا کھول دے۔''
''وہ چابی لینے گیا ہے۔'' زرین بولی۔ میں نے گرفت دوبارہ نرم کر دی تھی۔ اب وہ سکون سے تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم بہت ظالم آدمی ہو تمہیں عورت پر رحم نہیں آتا ہے۔''
''آتا ہے لیکن خود پر زیادہ آتا ہے۔ ویسے یقین کرو مجھے خود بھی کسی عورت کو تکلیف دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے لیکن اس وقت مجبوری ہے۔''
''مرشد کو کسی عورت کو تکلیف دیتے ہوئے بالکل رحم نہیں آتا ہے۔''
''وہ مرشد ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا اسی لمحے شارق چابی لے آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔
''میں نے دروازہ کھول دیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''زرین کو چھوڑ دو۔''
''شاباش اب تم اوندھے منہ زمین پر لیٹ جاؤ۔'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''دروازے کے بالکل سامنے لیٹنا۔ اگر مجھے تم نظر نہیں آئے تو اس کی سزا زرین کو ملے گی۔''
''میں لیٹ گیا ہوں۔'' شارق نے کہا تو میں نے ذرا سا دروازہ کھولا اور وہ سامنے نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے ہی پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے زرین کا ہاتھ چھوڑا اور پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ مختصر سی راہداری تھی۔ زرین اپنا ہاتھ تھامے دیوار سے لگی کھڑی تھی اور شارق فرش پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ میں زرین کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بہت حسین ہو گی لیکن وہ بہت ہی حسین ترین عورت تھی۔ بلکہ اسے عورت کہنا بھی درست نہیں تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے لڑکی تھی مشکل سے بائیس برس کی ہو گی۔ شہابی رنگت اور سر سے پاؤں تک جیسے کسی سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ اس نے سردی کی مناسبت سے ویلویٹ کا سوٹ اور اوپر سویٹر پہن رکھا تھا۔ سویٹر اس کو بالکل فٹ تھا اور اس کی نازک بدنی کو ظاہر کر رہا تھا وہ میری نظر محسوس کر کے شرما گئی تھی لیکن اس نے شارق کی وجہ سے سوال کسی اور طرح کیا۔
''اب تم کیا چاہتے ہو؟''
''پہلے تو رہائی چاہتا تھا۔'' میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ صیاد ایسا ہو گا تو کبھی رہائی کی خواہش نہ کرتا۔''
زرین کا چہرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔ ہر حسین عورت کی طرح اس نے میرے الفاظ کو نذرانہ حسن سمجھ کر قبول

کرلیا تھا اور اس کا بالکل بھی برا نہیں منایا تھا۔ البتہ نیچے لیٹے شارق نے برا منایا تھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔
''اب تم جا سکتے ہو؟''
شارق بھی کم عمر نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سے زیادہ نہیں تھی اور وہ چھریرے جسم کا اچھے نقوش کا حامل لڑکا تھا۔ اگرچہ وہ کسی طرح زرین کے لائق نہیں تھا۔ اس کی جہالت اس کے چہرے پر لکھی تھی جب کہ زرین تعلیم یافتہ بھی تھی۔ شاید مرشد جیسے خبیث آدمی کی قید نے اسے شارق کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کمر پر پاؤں رکھا۔
''برخوردار مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے یہ مجھے تم نہیں بتاؤ گے۔ ابھی تو تم اٹھ کر اندر جاؤ۔'' میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
''میں اندر؟'' اس نے یوں تعجب سے کہا جیسے یہ کوئی ناقابلِ یقین بات ہو۔
''ہاں تم اب اٹھ جاؤ۔''
وہ اٹھ گیا اور اس نے زرین کی طرف دیکھا۔ ''تم ہم دونوں کو یہاں بند کر جاؤ گے؟''
میں نے محسوس کیا اس کے لہجے میں خوف کے بجائے دلچسپی تھی جیسے زرین کے ساتھ قید ہونا بھی کوئی خوش کن بات ہو۔ ''تم دونوں کو نہیں صرف تمہیں۔'' میں نے کہا اور اسے دروازے کی طرف دھکیل دیا اور اس سے پہلے وہ سنبھلتا میں نے لات مار کر اسے اندر کیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ تڑپ کر واپس آیا اور دروازہ پیٹنے لگا۔ ''دروازہ کھولو۔''
میں نے تالا لگا کر چابی اپنے قبضے میں لے لی۔ زرین سہمے انداز میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ میں نے شارق سے کہا۔ ''ذرا دیر آرام سے بیٹھو، جاتے ہوئے میں تمہیں آزاد کر جاؤں گا۔''
لیکن اس نے شور جاری رکھا۔ میں نے زرین کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ راہداری کے آخر میں دروازہ تھا اور یہ دروازہ قید خانے کا تھا گویا یہ بس اسی مقصد کے لیے تھی۔ دروازے کے دوسری طرف ایک خوب صورت نشست گاہ تھی جس میں وال ٹو وال دبیز قالین بچھا تھا اور برما ٹیک کا فرنیچر تھا۔ مرشد علی کی کسی رہائش گاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ذرا دیر میں، میں نے زرین کے ساتھ ساری کوٹھی دیکھ لی تھی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مشکل سے ایک کنال رقبے پر تھی جس میں اس کا بڑا سا لان اور گیراج بھی شامل تھا۔ کوٹھی میں تین بیڈ رومز تھے اور ایک سرونٹ کوارٹر بھی تھا۔ شارق کی رہائش کوٹھی کے باہر مین گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی۔ جس سے کوٹھی کے اندر صرف ایک کھڑکی کھلتی تھی۔ گویا مرشد نے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ چوکیدار اپنی مرضی سے کوٹھی کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے حیرت تھی کہ اس نے کس طرح زرین جیسی خوب صورت عورت کو اس ویرانے میں ایک چوکیدار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں نے لان پر نکل کر دیکھا آس پاس کوئی اور عمارت نہیں تھی۔ میں نے زرین سے پوچھا۔
''یہاں آس پاس کوئی آبادی ہے؟''
''ہاں ادھر ہمارا گاؤں ہے؟''
میں چونکا۔ ''ہمارا کیا شارق بھی تمہارے گاؤں کا ہے؟''

''ہاں وہ میرے چچا کا لڑکا ہے۔''

ایک لمحے کو مجھے طیش آیا تھا وہ بے غیرت اس کا چچازاد تھا اور مرشد کے لیے چوکیداری کر رہا تھا جو اس کی چچازاد بہن کو داشتہ بنائے ہوئے تھا۔ زرین کو دیکھنے سے پہلے مجھے جو تھوڑا بہت شک تھا اب وہ بھی نہیں رہا تھا مرشد جیسے عیاش کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ زرین جیسی حسین لڑکی کو چھوڑ دیتا۔ کوٹھی ذرا بلندی پر تھی اور مجھے کوشش کے باوجود مری شاہراہ نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے زرین سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے سامنے پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کے پیچھے ہے۔''

گویا مری شاہراہ وہاں سے کوئی تین چار کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ میں نے کوٹھی کے آس پاس کا معائنہ کیا۔ اس کے تین طرف ڈھلان تھی اور چوتھی طرف آمد و رفت کے لیے سڑک بنی تھی یہ پتھروں سے بنائی سڑک تھی جو مرشد نے شاید خود بنوائی تھی۔ زرین توقع کر رہی تھی کہ میں اب رخصت ہو جاؤں گا لیکن اس کی توقع کے خلاف میں کوٹھی کے اندر آ گیا۔ میں نے اس سے موبائل فون کا پوچھا۔ ''تمہارے پاس موبائل فون ہوگا؟''

''بس وہی ہے جو تم کو دیا تھا۔''

''لیکن اس میں تو بیلنس ہی نہیں ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''شارق کے پاس ہے؟''

''پتا نہیں ویسے میں نے کبھی دیکھا نہیں۔'' اس نے کہا۔

میں اسے لے کر اندر آیا اور شارق سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس موبائل ہے؟''

''نہیں غریب آدمی موبائل کہاں رکھے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''غریب آدمی موبائل نہ سہی لیکن غیرت ضرور رکھے۔'' میں نے اسے جواب دیا اور زرین کو لے کر باہر آ گیا۔ میں نے ایک لمحے کو بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہیں دیا تھا۔ ''کچن کہاں ہے مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

زرین مجھے کوٹھی کے بہترین کچن میں لے آئی یہاں تمام جدید سہولتیں تھیں۔ جن میں مائیکروویو اوون اور ایل پی جی سلینڈر بھی شامل تھا۔ وہاں پکانے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن میں اب جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے اس سے انڈے ابالنے اور ساتھ میں چائے بنانے کا حکم دیا۔ وہ کام میں لگ گئی اور میں ایک طرف کرسی پر ٹک گیا تھا۔

''تم کب سے مرشد کے پاس ہو؟''

وہ میرے سوال میں چھپے معنی کو سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا لیکن یہ شرم نہیں تھی بلکہ خفت تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''دو سال سے ہوں۔''

''تم نے کبھی اس کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش کی یا سوچا یا پھر اس قید میں خوش ہو؟''

اس نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور مجروح لہجے میں بولی۔ ''کوئی عورت ایسی قید میں خوش ہو سکتی ہے۔''

''یہاں تمہارا گاؤں ہے تمہارے رشتے دار ہیں ان کے ہوتے ہوئے مرشد نے تم پر کس طرح قبضہ بنا

رکھا ہے۔''

''وہ سب بے غیرت ہیں۔ مرشد سے ڈرتے ہیں۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''میرے چچازاد بھائی کو تم نے دیکھ لیا ہے۔''

''میں نے محسوس کیا ہے وہ تم میں دلچسپی رکھتا ہے۔''

''ہاں رکھتا تو ہے لیکن وہ بھی مرشد سے ڈرتا ہے۔''

''اگر وہ تم سے سچ مچ کی محبت کرتا ہے تو اسے اب تک مرشد کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔''

''ہمارے ہاں کوئی مرشد یا اس کے کسی معمولی آدمی کے لیے بھی اس طرح نہیں سوچ سکتا ہے۔'' وہ بے دلی سے بولی۔

''وہ تمہیں لے کر بھاگ تو سکتا تھا؟''

زرین ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''میں نے کئی بار اس سے کہا لیکن وہ نہیں مانتا ہے اس کا کہنا ہے اس ملک میں ہم کہیں بھی مرشد سے محفوظ نہیں ہوں گے۔ وہ ہر جگہ ہمیں تلاش کر لے گا۔''

''بکواس کرتا ہے وہ...... مرشد کوئی خدا ہے نعوذ باللہ...... جو اس کی پہنچ ہر جگہ ہو۔ میری اس سے دشمنی ہے لیکن وہ آج تک میرا کیا بگاڑ سکا ہے۔''

وہ خاموشی سے کام کرتی رہی شاید اسے بھی احساس تھا کہ شارق اسے بے وقوف بنا رہا تھا اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرین اس کے لیے ایک رشتہ نہیں بلکہ صرف ایک حسین عورت تھی جو اس کے آقا کی داشتہ تھی اور خوش قسمتی سے آقا نے اسے اس کی چوکیداری پر مامور کر دیا تھا اور وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر نقب لگانا چاہتا تھا۔ بہرحال یہ ان لوگوں کا مسئلہ تھا اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ زرین نے انڈے ابال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور میں ان کو نگلنے لگا اس دوران میں چائے بھی تیار ہو رہی تھی۔ جب تک میں نے چار عدد انڈے نوش جاں کیے چائے بھی آ گئی اور میں اس کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔ زرین مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تم مجھے یونہی چھوڑ جاؤ گے؟''

''تو پھر کیسے چھوڑ کر جاؤں؟''

''مجھے ساتھ لے چلو...... یہاں مرشد میری کھال اتار دے گا۔ وہ بہت ظالم آدمی ہے ایسے ایسے ظلم کرتا ہے کہ میں مرنے کے قریب ہو جاتی ہوں اور ایسا وہ پیار میں کرتا ہے جب سزا دے گا تو......''

''مس زرین یہ میرا مسئلہ نہیں ہے تم اسے جو چاہے بتا سکتی ہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''خدا کے لیے۔'' وہ گڑگڑائی۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں وہ بہت ظالم ہے۔ میں تمہیں اس کے ظلم کے نشانات دکھاؤں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا لیکن وہ اس سے پہلے ہی اپنا سویٹر اتار چکی تھی اور پھر اس نے رخ پھیرتے ہوئے اپنی قمیص بھی اوپر کر دی۔ مخمل کی قمیص تلے سے اس کی کھال بھی مخملی نکلی تھی لیکن اس پر مرشد کی وحشتوں کے نشان پوری طرح نمایاں تھے۔ یہ جلانے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے کے نشانات تھے جو بتا رہے تھے کہ

ایک صاحبِ اختیار مرد ایک مجبور عورت کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔

''پلیز شرٹ نیچے کر لو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ''تمہیں مرشد کی بربریت بتانے کے لیے اپنا بدن دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اس کی درندگی کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔''

اس نے قمیص نیچے کر لی اور بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس سے زیادہ گہرے زخم میرے سامنے والے جسم پر ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی اور کسی قدر درشت لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا نا تمہیں یہ سب دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ بتانے کی ضرورت ہے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے تم مرشد کی داشتہ ہو۔''

وہ شرمندہ ہو گئی تھی۔ مجھے بھی اپنے الفاظ کی بے رحمی کا احساس ہوا۔ میں نے معذرت کر لی۔ ''معاف کرنا...... اصل میں، مَیں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ مجھے عورت کی عزت کرنا سکھایا گیا ہے۔''

''تب تم مجھے اس جہنم سے نکال کر نہیں لے جا سکتے؟'' اس نے سویٹر پہنتے ہوئے التجا کی۔

''میں کہاں لے جا سکتا ہوں۔ میں تو خود در بدر پھر رہا ہوں اور تم نے خود کوشش کیوں نہیں کی؟''

''میں اکیلی عورت کہاں جا سکتی ہوں اور تم دیکھ رہے ہو مقدر نے مجھے کیسا بنایا ہے کیا میں کہیں مردوں سے بچ کر سکون سے رہ سکتی ہوں۔ اگر میں یہاں سے بنا سوچے سمجھے نکل جاتی تو آج ایک مرشد کے بجائے نہ جانے کتنے مرشدوں کا شکار ہوتی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو جب تک تقدیر تمہارے لیے آسانی نہیں کرتی ہے، تمہیں یہیں رہنا چاہیے۔''

''بس یہی سوچ کر یہاں سے نہیں نکلی لیکن اب تم ایک امید بن کر آئے ہو۔ تم مرشد کے دشمن ہو، طاقتور بھی ہو تم مجھے پناہ دے سکتے ہو۔ تم یقین کرو میں دو وقت کے کھانے اور تن کے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ میں ملازمہ بن کر رہ لوں گی۔''

''زرین میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ابھی مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کہاں جاؤں گا۔ تمہیں بچانے کے لیے میں یہ کر سکتا ہوں کہ تم دونوں کو بند کر جاؤں۔''

''شارق کے ساتھ۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں...... میں اس کے ساتھ بند ہونا پسند نہیں کروں گی۔''

''وہ تمہارا چچازاد بھائی ہے۔''

''بے شک ہے لیکن وہ میرے لیے اچھے ارادے نہیں رکھتا ہے ابھی تک تو اسے مرشد کا خوف اور میرا رویہ مجبور کرتا رہا ہے لیکن اگر میں اس کے ساتھ بند ہوئی تو شاید وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔''

پہلے میرا خیال تھا کہ زرین نے مرشد کے دیئے موقع سے فائدہ اٹھا کر چوکیدار سے تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن اب مجھے پتا چلا کہ وہ اندر سے شریف عورت ہی ہے۔ مرشد سے تعلق اس کی مجبوری ہے اور اس سے اس کی شرافت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے اور اسی وجہ سے وہ شارق میں دلچسپی لینے کے باوجود اس سے وہ تعلق قائم کرنے کو تیار نہیں تھی جس کی ہمارا معاشرہ اور مذہب اجازت نہیں دیتا ہے۔ اپنی عزت کے خوف سے وہ یہاں رہنے اور شارق کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہونے کو تیار نہیں تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ اس کی بات کا کیا

جواب دوں۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے چائے کا مگ نیچے رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی اس نے سمجھ لیا کہ میں اسے نہیں لے جا سکتا تھا اور نہ اس کی کوئی اور مدد کر سکتا تھا۔

''مجھے افسوس ہے زرین میں چاہنے کے باوجود تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔''

وہ میرے ساتھ باہر تک آئی۔ ''تو کیا تم مجھے ایسے ہی چھوڑ جاؤ گے؟''

''ہاں تو کیسے چھوڑ کر جاؤں؟''

''تم مجھے باندھ جاؤ تاکہ مرشد کو کسی حد تک یقین دلا سکوں کہ میں نے اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا بلکہ مجبوری میں کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے ویسے تمہاری ہاتھ کا نیل بھی یہ بتانے کے لیے کافی ہے۔''

''مرشد جیسے شخص کے لیے کافی نہیں ہے۔''

میں اسے اندر لایا اور اس کے اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ اور پیر باندھ دیئے۔ یہ کام خاصا مشکل تھا کیونکہ دوپٹہ بھی ریشمی تھا اور اس کی جلد بھی اس لیے گرہ مضبوطی سے نہیں آ رہی تھی اور میں زیادہ کس کر نہیں باندھنا چاہتا تھا اسے تکلیف ہوتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے دوران میں اس کے قریب ہوا تو اس کی جسمانی کشش واضح ہونے لگی تھی اور میں گھبرا رہا تھا بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے اسے باندھ ہی دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر مرشد کو کال کر کے بتا دوں گا کہ میں اس کے آدمیوں کو بے بس کر کے نکل آیا ہوں۔ زرین کو باندھ کر میں نے کہا۔ ''بس کچھ دیر برداشت کر لو، پھر مرشد کے آدمی آ کر تمہیں آزاد کر دیں گے۔''

''ہو سکتا ہے زندگی کی قید سے ہی آزاد کر دیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''ویسے بھی مرشد کا دل اب مجھ سے بھر گیا ہے اور ایسا لگ رہا ہے وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔''

''مرشد جیسے لوگ کسی کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اس نے تم سے جان چھڑانی ہوتی تو وہ اب تک یہ کام کر چکا ہوتا۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ کبھی تمہیں چھوڑنا پسند کرے گا۔''

''کیوں؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''کیونکہ میں نے دنیا بھر کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن تمہاری جیسی خوب صورت عورتیں بہت کم دیکھی ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی شخص تم سے جان چھڑانا چاہے گا چاہے ہو مرشد جیسا عیاش ہی کیوں نہ ہو۔''

وہ شرمائی تھی اور پھر بولی۔ ''لیکن مرشد انسان نہیں ہے جو کسی عورت کی خوب صورتی سے ہمیشہ کے لیے متاثر ہو جائے۔ وہ ایک ایسا درندہ ہے جسے گوشت کھانے سے مطلب ہے اور اس کا دل بہت جلد بھر جاتا ہے۔''

میں نے اس بارے میں اس سے بحث نہیں کی کیونکہ ایک تو بندے کو مرد عورت کے تعلقات کا صرف زبانی کلامی علم تھا اور اس کی باریکیوں کا تو بالکل پتا نہیں تھا دوسرے میں مرشد کے بارے میں یقیناً اتنا نہیں جانتا تھا جتنا کہ یہ عورت یا لڑکی جانتی تھی۔ میرا کام ہو چکا تھا اس لیے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ''مجھے امید ہے مرشد تمہارے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گا۔''

''وہ بے وقوف نہیں ہے۔'' زرین نے مسکرانے کی کوشش کی۔''وہ جان جائے گا کہ میں نے تمہیں کس طرح آزاد کرایا اور اس کے بعد وہ شاید مجھے معاف نہ کرے تم اس کے لیے بہت اہم آدمی ہو۔''

یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میں مرشد کے لیے کتنا اہم تھا اور میرے فرار کے بعد اس کا عتاب یقیناً ان دونوں پر نازل ہوتا۔ خاص طور سے زرین اس کے غصے کا نشانہ بنتی کیونکہ اسی نے شارق کو آواز دے کر باہر سے بلوایا تھا۔ جس کے بعد میں آزاد ہو گیا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ پہلی فرصت میں یہاں سے نکل بھاگو لیکن دوسری طرف میرا ضمیر اس مجبور اور مظلوم عورت کو اس طرح چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا جو بعد میں یقینی طور پر اس کے عتاب کا نشانہ بنتی لیکن میں اسے ساتھ لے کر کہاں پھرتا۔ اچانک مجھے خیال آیا میں اسے عبداللہ والی کوٹھی میں رکھوا سکتا تھا اگر عبداللہ اسے ملازم نہ بھی رکھتا تو اسے کہیں اور ملازمت دلوا سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اس کی بندشیں کھول دیں اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں نے فیصلہ بدل دیا ہے اب تم میرے ساتھ چل رہی ہو میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کہیں نوکر رکھوا دوں۔''

''سچ۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''ہاں لیکن اس سے آگے میری ذمے داری نہیں ہو گی۔ مرشد سے بچنا بھی تمہارا کام ہو گا۔''

''مجھے منظور ہے ایک بار اس جہنم سے نکل جاؤں تو سب کر لوں گی بس مجھے کھڑے ہونے کے لیے پاؤں بھر زمین چاہیے۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہم ہو رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں اگر عورت کسی مرشد سے نہ بھی چھپ رہی ہو تب بھی اس کے لیے اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے خاص طور سے جب وہ زرین کی طرح بے پناہ حسن بھی رکھتی ہو لیکن یہ سب بعد کے معاملات تھے۔ ابھی تو یہاں سے نکلنا تھا۔ اسے کھولنے کے بعد میں نے اسے مشورہ دیا۔''اپنی جو چیزیں لینی ہیں ساتھ لے لو۔''

وہ لپک کر ایک کمرے میں گئی میں اس کے پیچھے تھا اگرچہ میں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا تھا لیکن ابھی میں اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس نے ایک الماری کھولی اور اس میں موجود سارے کپڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

''اوہ بی بی یہ کیا کر رہی ہو......بس ضرورت کے چند کپڑے رکھ لو۔''

''اس پر جب اس نے ضرورت کے کپڑے نکالنا شروع کیے تو میں نے جھینپ کر رخ دوسری طرف کر لیا۔ اس نے ایک چھوٹا بیگ نکالا اور اس میں ساری چیزیں بھر لیں۔ اس نے چپل پہن رکھی تھی میں نے اشارہ کیا۔''اگر مضبوط جوتے ہیں وہ پہن لو کیونکہ ہمیں پیدل جانا ہو گا۔''

اس نے جوتے نکال کر پہن لیے۔ ہم باہر آئے تو اس نے شارق کے بارے میں پوچھا۔''اس کا کیا ہو گا؟''

''کیا اسے بھی لے کر چلنا ہے؟'' میں بھنا گیا۔

''نہیں...... میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ میرے لہجے سے ڈر گئی۔ اس بار میں نے نرمی سے کہا۔

''اسے یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ جلد یہاں سے کوئی آ کر اسے نکال لے گا آگے اس کی قسمت کہ مرشد اسے معاف کرتا ہے یا نہیں۔''

شارق کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا اس لیے وہ اس کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی لیکن اس نے مجھ سے دوبارہ نہیں کہا۔ ہم باہر آئے اور ابھی ہم لان میں گیٹ سے دور تھے کہ مجھے سڑک پر ایک بڑی گاڑی مڑتی دکھائی دی۔ خطرے کے احساس کے ساتھ میں نے زرین کی طرف دیکھا تو وہ خود بھی پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے میرے سوال کرنے سے پہلے کہا۔ ''یہ مرشد کے لوگ ہیں میں اس گاڑی کو پہچانتی ہوں۔''

اب سامنے سے جانا ممکن نہیں رہا تھا اول تو ان کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے دوسرے سڑک پر پکڑے جانے کا زیادہ امکان تھا۔ ''اس جگہ سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟''

''نہیں تین طرف ڈھلان ہے اور اس سے اترنا بہت مشکل کام ہے۔'' اس نے انکار کیا لیکن میں اس سے پہلے بھی اس قسم کے مشکل کام کرتا رہا تھا۔ میں نے پہلے گیٹ کو اندر سے بند کیا اور پھر اس کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں دیوار کے پاس کچھ زمین تھی لیکن اس کے بعد ڈھلان ایسے نیچے گئی تھی کہ بس اللہ ہی اللہ تھا۔ میں نے زرین سے کہا۔ ''تم اس ڈھلان سے اتر سکتی ہو؟''

''میں کوشش کرتی ہوں۔'' اس نے ڈر کر کہا۔

''بس تو چلو۔'' میں نے اس کا بیگ دیوار کے دوسری طرف پھینک دیا اور پھر اسے کمر سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس کی مخملی قمیص اور جلد نے پھسل کر یہ کوشش ناکام بنا دی میں نے خفیف ہو کر گھوڑا بننا منظور کیا اور اس سے کہا۔ ''میری کمر پر چڑھ کر دوسری طرف کود جاؤ۔''

وہ دیوار پر چڑھ گئی لیکن دوسری طرف نہیں اتری اسے ڈر لگ رہا تھا میں دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودا اور پھر سہارا دے کر اسے بھی اتار لیا۔ جب اس نے پہلی بار عملی طور پر اس ڈھلان کو دیکھا تو اترنے سے صاف انکار کر دیا۔ ''میں اس سے نہیں جا سکتی۔''

''اگر تم نہیں گئیں تو یہیں رکو میں جا رہا ہوں۔ بعد میں مرشد اور اس کے جلادوں کو جواب دیتی رہنا۔'' مرشد اور اس کے جلادوں کے تصور نے اسے لرزا دیا تھا اور اس کا انکار فوراً اقرار میں بدل گیا۔ ''میں چلتی ہوں۔''

''شاباش۔'' میں نے اس کا بیگ اٹھا لیا۔ ''میرے پیچھے آؤ اور آواز مت نکالنا بے شک کھائی میں بھی گر جاؤ۔''

میں نیچے اترنے لگا۔ یہ ڈھلان دیکھنے میں خطرناک لگ رہی تھی درحقیقت اتنی خطرناک نہیں تھی کیونکہ اس میں پتھر بھی ابھرے ہوئے تھے اور جھاڑیاں بھی تھیں جن کو پکڑ کر آرام سے نیچے اترا جا سکتا تھا لیکن یہ آسانی تو میرے لیے تھی کیونکہ مجھے اس قسم کی ڈھلانوں پر چڑھنے اور اترنے کا وسیع تجربہ تھا۔ زرین کو اس قسم کا تجربہ نہیں تھا اگرچہ وہ ایک پہاڑی گاؤں کی رہنے والی تھی لیکن اس نے شاید ہی کبھی ایسی ڈھلان پر قدم رکھا ہو اور اس نے فوراً اس کی تصدیق بھی کر دی۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

''میں کبھی ایسی پہاڑی سے نہیں اتری۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ''یہ اتنی بھی مشکل نہیں ہے۔''

''لیکن اس نے فوراً پھسل کر میری بات کو غلط ثابت کیا وہ میرے پاس سے ہوتی نیچے جا رہی تھی کہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ ورنہ اس کا سفر دوڈھائی سوفٹ سے پہلے رکنے والا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے چیخ ضبط کی اور مجھ سے لپٹ کر تھر تھر کانپنا شروع کر دیا۔ ''میں...... میں نہیں اتر سکتی۔''

''تم اتر سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا میں تم کو سہارا دیتا ہوں۔''

اب میں خود اترنے کے ساتھ اسے بھی سہارا دے رہا تھا نتیجے میں میری رفتار نصف بھی نہیں تھی۔ بہر حال اب میں کیا کر سکتا تھا یہ مصیبت میں نے خود گلے لگائی تھی۔ مصیبت صرف گلے لگنے سے مطمئن نہیں تھی بلکہ ذرا سا لڑکھڑاتے ہی وہ پیر تسمہ پا کی طرح مجھ سے چمٹ جاتی تھی اور ہر بار مجھے لاحول ولاقوۃ کا ورد کرنا پڑتا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا لیکن مجھے تو تھا۔ شاید اللہ نے ہر مرد کے اندر عورت کو محسوس کرنے کی ایسی حس رکھی ہے جو موت کے منہ میں بھی کام کرتی رہتی ہے۔ میرے اندر بھی یہ برابر کام کر رہی تھی اور زرین کے ساتھ تو کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھی۔ زرین کا بیگ میرے لیے مشکل کر رہا تھا کیونکہ اس کا لٹکانے والی صرف ایک بیلٹ تھی جس سے اسے شانے سے لٹکایا جا سکتا تھا۔ اگر اس کے پشت پر لٹکانے والے اسٹرپ ہوتے تو میرے لیے بہت آسانی ہو جاتی۔ ایک مشکل جگہ سے اترتے ہوئے زرین لڑکھڑائی تو میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور بیگ میرے شانے سے پھسل کر نیچے جانے لگا۔ اگر میں اسے روکنے کی کوشش کرتا تو زرین نیچے جاتی اس لیے میں نے بیگ گرنے دیا اور زرین کو پکڑ لیا۔ اس نے فریاد کی۔ ''میرا بیگ......''

''شکر کرو بیگ کی جگہ تم نہیں گئیں۔'' بیگ لڑھک کر ایک ایسی جگہ اٹک گیا تھا جہاں سے اسے حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اس دوران میں دشمن کنارے تک آ گیا۔ ابھی ہم نصف راستے پر تھے یعنی کوئی ڈیڑھ سوفٹ نیچے آئے تھے کہ اوپر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔ ''اوئے میدے ادھر تھلے وکیھ......''

''کتھے تھلے۔'' میدے نے چلا کر کہا۔ ''ایتھے آ کر مرنا اے۔''

''موت تجھے آ رہی ہے کام کرتے ہوئے۔'' پہلے والے نے کہا۔ ''دیکھ ادھر اپنی بے بے دے یارنوں۔''

زرین نے بلاوجہ لرزنا شروع کر دیا۔ ''ان کو پتا چل گیا ہے وہ آ رہے ہیں۔''

''ابھی اوپر ہیں اور ہم ان کو نظر نہیں آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جلدی اترو اگر ان کی نظر پڑ گئی تو وہ پکڑنے کے بجائے اوپر سے گولی مار دیں گے۔''

اس بار ہم ذرا تیزی سے نیچے گئے کیونکہ ڈھلان کسی قدر بہتر ہو گئی تھی اور زرین بھی اب خود اتر رہی تھی۔ اس لیے مزید پانچ منٹ بعد ہم نیچے پہنچ گئے تھے اور اسی لمحے اوپر موجود افراد کی نظر میں آ گئے۔ انہوں نے چلانے کے ساتھ فائرنگ بھی شروع کر دی تھی۔ تین سوفٹ کی دوری کچھ خاص نہیں ہوتی ہے لیکن خوش قسمتی سے ان کے پاس رائفلیں نہیں تھیں۔ ان کے پاس پستول اور شاٹ گن تھیں جن کی مار زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہم نیچے تھے اور گولیاں بلندی کی وجہ سے مہلک ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں نے زرین سے کہا۔ ''بھاگو۔''

اور ہم بھاگے میں نے خیال رکھا کہ ہم اس رخ سے بھاگیں کہ مری شاہراہ کی طرف نکلیں۔ کہیں مارگلہ کی

پہاڑیوں میں نہ بھٹکتے رہ جائیں۔ یہ مارگلہ کا کوئی حصہ تھا۔ مارگلہ اگرچہ اونچائی میں زیادہ بلند نہیں ہے لیکن یہ راولپنڈی اور ہزارہ کے وسیع حصوں میں پھیلا ہوا ہے۔ مرشد علی کی کوٹھی کے آس پاس بلندی زیادہ ہونے کی وجہ سے موسم بے پناہ سرد تھا لیکن یہ اونچائی اتنی بھی نہیں تھی کہ یہاں برف باری ہوتی۔ سبزہ اگرچہ مرجھایا ہوا تھا لیکن یہاں سبزہ موجود تھا۔ جب کہ مری اور اس کے آس پاس کے پہاڑ یقیناً برف سے ڈھک چکے تھے۔

سورج نکلا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے سردی کی شدت کم ہوئی تھی لیکن یہ سورج فی الحال مصیبت بھی بن گیا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ہم دور سے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ کچھ دور نکلنے کے بعد ہم گولیوں کی زد سے نکل گئے تھے لیکن مرشد کے گرگوں کو یہ پتا چل گیا تھا کہ ہم کہاں تھے۔ اب وہ یقیناً ہمارے پیچھے آتے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ان کے لیے مجھے پکڑنا آسان نہیں ہوتا بلکہ امکان تھا کہ میں پیچھے آنے والوں کو پکڑ لیتا۔ مگر زرین کی وجہ سے مجھے مشکل ہو رہی تھی۔ رفتار سُست تھی اور اگر تعاقب کرنے والے ہمیں گھیر لیتے تو زرین کی وجہ سے ان سے مقابلہ بھی مشکل ہو جاتا۔ میرے پاس صرف شارق سے چھینا ہوا پستول تھا۔ پیچھے آنے والے دانتوں تک مسلح ہوتے۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ پیچھے آنے والوں سے آگے رہیں۔

زرین بار بار لڑکھڑا ہی تھی اور ایک دو بار وہ گری بھی تھی۔ دوسری بار گری تو اس کے گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی۔ اس وقت تو مجھے پتا نہیں چلا لیکن جب ایک ڈھلان سے اسے سہارا دے کر اتار رہا تھا تو میری نظر اس کی گھٹنوں کے پاس نمودار ہونے والے خون کے دھبوں پر گئی۔ ''تم زخمی ہو؟''

''ہاں معمولی زخم ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

رکنے اور اس کے زخم دیکھنے کا وقت نہیں تھا اس لیے ہم چلتے رہے۔ میں خود بھی تیز چل رہا تھا اور جہاں وہ سُست ہوتی اسے بھی کھینچنے لگتا اس لیے ہم کچھ دیر بعد مرشد علی کی کوٹھی سے دور نکل آئے۔ ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کوٹھی نظر نہیں آئی تھی۔ میرا سانس ہموار تھا اور میں صرف ذرا زور سے سانس لے رہا تھا لیکن زرین کی حالت بری تھی اسے سانس ہی نہیں آ رہا تھا اور اس کا سینہ دھونکنی کے طرح ہو رہا تھا ایک جگہ وہ رک گئی۔

''اب...... مجھ سے...... نہیں...... چلا...... جا رہا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

کیونکہ مجھے عقب میں آنے والوں کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے رک جانا مناسب سمجھا لیکن کھلی جگہ کے بجائے میں زرین کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں لے آیا۔ کچھ دیر میں اس کی سانس بہتر ہوئی تو اس نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے بھی مصیبت بن گئی ہوں۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

''نہیں اگر میں نہ ہوتی تو تم کہیں نکل چکے ہوتے۔ تمہاری سانس بالکل ٹھیک ہے اور میرا حال دیکھ رہے ہو۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میرے بچ نکلنے یا نہ نکلنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

میرے جواب سے اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ ''یعنی تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے؟''

''ظاہر ہے ورنہ تم کو وہاں سے لے کر کیوں نکلتا میں کوئی فیصلہ کر کے اسے ترک کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

''تم نے یقیناً مرشد کو بہت پریشان کیا ہوا ہے؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرے پیچھے پاگل ہو جائے گا جب اسے اطلاع ملے گی کہ میں ایک بار پھر اس کی گرفت سے نکل گیا ہوں۔''

''تم پہلے بھی اس کے ہاتھ آ چکے ہو؟'' زرین نے حیرت سے کہا۔

''کئی بار اور ہر بار فرار میں کامیاب رہا۔''

''تم قسمت والے ہو ورنہ میں نے بڑے بڑوں کو مرشد کے سامنے مجبور ہی دیکھا ہے۔ اسی کوٹھی میں اسلام آباد کا ایک بڑا سرکاری افسر بھی قید ہو کر آیا تھا اور وہ مرشد کے سامنے روتا گڑگڑاتا تھا۔ اس نے مرشد کا کوئی کام کرنے سے انکار کر دیا۔ مرشد نے اسے اغوا کروالیا اور وہ اس سے کتے جیسا سلوک کرتا تھا۔ کام تو اس نے کسی اور سے کروالیا تھا لیکن اس افسر کو سزا بھی دی۔''

''اس کا کیا ہوا؟''

''مجھے نہیں معلوم لیکن اسے کوٹھی سے زندہ سلامت ہی لے جایا گیا تھا۔ مجھے کوٹھی سے باہر کی باتوں کا علم نہیں ہوتا ہے۔''

''مرشد پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا ہے لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں میرا ایمان ہے کہ یہ کتنے ہی طاقتور ہو جائیں۔ ایک پل کی مار ہوتے ہیں۔ وہ پل جوان کی موت کا ہوتا ہے اور جسے یہ کسی صورت ٹال نہیں سکتے۔'' میں نے کہتے ہوئے جھاڑی کے باہر کا معائنہ کیا اور یہی چیز کام آ گئی۔ مرشد کے آدمی نیچے آ چکے تھے اور ہمارے رکنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خاصے قریب آ گئے تھے۔ میں نے زرین کو جھاڑی کے اندر کھینچ لیا اور سرگوشی میں کہا۔

''کوئی حرکت مت کرنا اور نہ آواز نکالنا وہ قریب آ گئے ہیں۔''

دہشت اور پکڑے جانے کے خوف سے زرین کی بڑی آنکھیں مزید پھیل گئی تھیں لیکن وہ میری ہدایت کے مطابق ساکت اور خاموش ہو گئی۔ یہ زیادہ بڑی جھاڑی نہیں تھی لیکن اس کے ایک طرف چٹان تھی ہم جھاڑی اور چٹان کے درمیان میں تھے۔ میں نے زرین کو اندر کر دیا اور خود سامنے والے حصے میں تھا اگر کوئی اس طرف آ جاتا اور جھاڑی کے اندر جھانکتا تو میں بلا تامل اسے شوٹ کر دیتا۔ ان کی آوازیں قریب آ گئی تھیں۔

''اوئے وہ تو اِدھر نہیں ہیں۔'' میدے کو پکارنے والے اور مجھے اس کا والد قرار دینے والے نے کہا۔

''اتنی جلدی وہ کہیں نہیں جا سکتے۔'' مجھے فاضلی کی آواز آئی تو میرا دل رک گیا۔ عام لوگوں کی بات الگ تھی میں ان سے آسانی سے نمٹ سکتا تھا لیکن فاضلی بہت تیز بندہ تھا اور اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ میری وجہ سے مرشد نے فوری طور پر اسے روانہ کیا تھا لیکن اسے کیسے اندازہ ہوا کہ میں قید سے نکل گیا ہوں؟ اس سوال کا فوری جواب بھی مل گیا۔ شارق کی آواز آئی۔ ''تم لوگوں نے آنے میں دیر کی ورنہ میری کال ملتے ہی چل پڑتے تو اسے نکلنے کا موقع نہ ملتا۔''

''بکواس نہ کر۔'' فاضلی نے اسے لتھاڑا۔ ''تجھے معلوم ہے کہاں سے آئے ہیں۔ اور تُو نواب کا بچہ کیا کر رہا تھا۔ تجھے اس کام کے لیے رکھا گیا تھا۔''

''میرا کیا قصور ہے اگر زرین کو کچھ ہو جاتا تو مرشد بادشاہ نے مجھے نہیں چھوڑنا تھا۔''

''وہ تو اب بھی نہیں چھوڑے گا۔ تجھے معلوم ہے کون بندہ کوٹھی سے فرار ہوا ہے۔ اگر زرین اس کے ساتھ نہ بھاگتی تو مرشد اسے بھی نہیں چھوڑتا۔ بہر حال اب تُو تیار ہو جا۔''

میں نے اپنی حماقت پر خود کو دل میں سنائیں۔ مجھے شارق کی بات پر یقین کرنے کے بجائے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ اس کے پاس موبائل فون تھا اور اس نے مرشد کو اطلاع دے دی۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ فاضلی اور اس کے ساتھی دیر سے آئے تھے کیونکہ اسے کمرے میں بند کرنے کے بعد بھی میں کوئی پون گھنٹہ کوٹھی میں رہا تھا لیکن میری قسمت اچھی تھی ورنہ میں دوبارہ وہیں پکڑا جاتا۔ اب بھی صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ آس پاس دشمن پھیلے ہوئے تھے اور وہ جھاڑیوں کی تلاشی لے رہے تھے لیکن ان کا زور دوسری طرف ڈھلان پر واقع جھاڑیوں کی طرف تھا اس طرف اتفاق سے یہ ایک ہی بڑی جھاڑی تھی اس لیے ان کے خیال میں ہم یہاں چھپنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم نے کوشش بھی نہیں کی تھی ہم تو یہاں ستانے کے لیے رکے تھے۔ فاضلی اور شارق کو اتنے قریب پا کر زرین کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ چٹان اور میرے درمیان گھسی جا رہی تھی۔ میں نے پستول بالکل تیار کر لیا تھا اگر ان میں سے کوئی اس جھاڑی کی طرف آتا تو فوراً آں جہانی ہو جاتا۔ مجھے فاضلی کو مار کر زیادہ خوشی ہوتی۔ اس نے عتیق کو مارنے کی کوشش کی تھی اور مرشد کے آدمیوں میں وہ مجھے سب سے زیادہ خطرناک لگا تھا۔ اگرچہ فتح خان اس سے زیادہ خطرناک تھا لیکن وہ مرشد علی کا خاص آدمی نہیں تھا بس اس کے لیے کام کرتا تھا اور فاضلی اس کے لیے کام کرتا تھا ایسے شخص سے جلد از جلد چھٹکارا ہی ٹھیک تھا۔

لیکن ان دونوں یا میری قضا نہیں آئی تھی اس لیے وہ وہاں سے ہٹ کر آگے جانے لگے۔ ان کے ساتھ کم سے کم نصف درجن افراد تھے۔ اتنے لوگوں سے مقابلہ نہایت دشوار تھا وہ بھی صرف ایک پستول کے ساتھ۔ اس لیے میری کوشش تھی کہ ایسی نوبت نہ آئے۔ مگر ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ وہ اس جھاڑی کی تلاشی بھی ضرور لیں گے۔ زرین پشت سے مجھ سے اس طرح چپکی ہوئی تھی کہ جیکٹ کے باوجود میں اس کے وجود کی نرمی اور لطافت محسوس کر رہا تھا اس میں نہ اس کا قصور تھا اور نہ میرا کیونکہ یہاں جگہ ہی اتنی تھی۔ پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''مجھے لگ رہا ہے ادھر چٹان میں خلا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے سر گھما کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن جھاڑی کے اس حصے میں روشنی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میرا ہاتھ چلا گیا تھا اس خلا میں۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''شکر ہے میری چیخ نہیں نکلی۔''

خواتین کو بلا وجہ بھی چیخ مارنے کی عادت ہوتی ہے اور وہ بھی ایک خاتون تھی۔ میں نے اسے ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں جھاڑی ہلنے لگی اور میں یک دم ساکت ہو گیا۔ جھاڑی ہلانے کا مطلب آ بیل مجھے مار کہنا تھا۔ دوسرے فوراً متوجہ ہو جاتے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم پیچھے ہو کر اس خلا کا جائزہ لو۔''

''نہیں۔'' اس نے منمنا کر کہا۔ ''اس میں کوئی کیڑا یا چوہا ہو گا۔''

''تو وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''مجھے جانے کے لیے تم پر سے گزرنا پڑے گا

اور اس دوران میں جھاڑی ہلی تو ان لوگوں کو پتا چل جائے گا اور وہ ہمیں یہیں گولی مار دیں گے۔''

''تم مجھ پر سے گزر جاؤ۔'' اس نے اجازت دے دی۔ مجبوراً مجھے اس پر سے جانا پڑا تھا۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا کیونکہ ایک طرف مجھے جھاڑی کو ہلنے سے بچانا تھا تو دوسری طرف اس کے نرم و نازک جسم کو اپنے اور چٹان کے بیچ میں پسنے سے بھی محفوظ رکھنا تھا لیکن میری اولین ترجیح جھاڑی سے بچنا تھا اس لیے سارا ستم اسے برداشت کرنا پڑا۔ وہ صبر سے برداشت بھی کر رہی تھی لیکن بعض نازک مقامات پر اس کی ہلکی سی کراہ بھی نکل جاتی تھی۔ خدا خدا کر کے میں اس پر سے گزر کر چٹان کے دوسری طرف پہنچا اور اس خلا میں جھانکا تو پہلے مجھے مایوسی ہوئی تھی یہ اتنا چھوٹا لگ رہا تھا کہ اس میں، مَیں تو کیا شاید زرین بھی نہیں جا سکتی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے میں جسم کو توڑ مروڑ کر اس خلا میں داخل ہوا۔ ج[illegible]دوں میں بری طرح پھنس رہا تھا۔ رگڑ سے کپڑے پھٹ رہے تھے اور جہاں جسم تھا اس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ خلا تنگ تھا لیکن اس میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں نے ممکن حد تک اندر ہو کر زرین کو آواز دی۔

''تم بھی آ جاؤ لیکن بہت تنگ جگہ ہے۔''

وہ آئی اور میری نسبت وہ آسانی سے اس خلا میں سما گئی۔ ایک تو اس کا جسم چھریرا تھا دوسرے اس میں لچک زیادہ تھی۔ چٹان میں یہ سوراخ صدیوں سے جاری موسمی تغیرات کی وجہ سے ہوا تھا۔ سردی، گرمی بارش اور کبھی کبھی کی برف باری سے چٹان چھیل اور سکڑ کر ٹوٹتی رہی اور بالآخر اس میں خلا بن گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ فطری علاقوں میں زمین اور چٹانوں کے اس قسم کے سوراخوں میں چھوٹے جانور اور حشرات الارض رہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہاں پر بھی تھے۔ کچھ دیر بعد زرین نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

''میرے پاؤں پر کچھ چل رہا ہے۔''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی۔ ''لال بیگ ہوگا۔''

میری توقع کے عین مطابق اس نے چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن میں پہلے ہی ہاتھ رکھ چکا تھا۔ خواتین کی دنیا میں لال بیگ، چھپکلی اور چوہے سے بڑا درندہ کوئی نہیں ہے۔ میں نے بڑی بڑی بہادر خواتین کو جو اپنے مجازی خدا سے بھی نہیں ڈرتی ہیں ان کی دہشت سے تھر تھر کانپتے دیکھا ہے۔ اور اگر میں زرین کا منہ چھوڑ دیتا تو اس نے چیخیں مار کر سب کو بلا لینا تھا۔ یقیناً لال بیگ کے علاوہ بھی اس کے جسم پر مزید کیڑے مکوڑے چل رہے ہوں گے جو میرے جسم پر بھی چل رہے تھے۔ خلا تنگ ہونے کی وجہ سے میرا اس کے منہ پر جما ہاتھ کہنی سے ایک نامناسب مقام پر ٹکا ہوا تھا اور میں شرمندہ ہو رہا تھا اسے اس کا ہوش بھی نہیں تھا کہ میری کہنی کہاں ہے۔

میرے کان باہر سے آتی آوازوں پر لگے تھے اور اب اس جھاڑی کی باری آ گئی تھی۔ وہ لوگ اسے کھنگال رہے تھے۔ یہ میدے اور شیدے قسم کے لفنگے تھے جو کام کم کر رہے تھے اور ان کی زبان زیادہ چل رہی تھی اور جو گفتگو وہ اس وقت کر رہے تھے اس کا ایک لفظ بھی اشاعت کے قابل نہیں تھا۔ وہ ذہنی طور پر دیوالیہ لوگ تھے۔ میرا غصے سے برا حال تھا کیونکہ میرے ساتھ ایک عورت بھی کھڑی یہ سب سن رہی تھی اور بات بھی اس کے بارے میں تھی۔ کاش کہ میں اکیلا ہوتا تو ان کی زبانیں کھینچ لیتا۔ زرین بھی کیڑے مکوڑوں کا خوف بھول گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ دونوں اپنے اندر کی غلاظت باہر نکالتے رہے۔ جب وہ دفع ہوئے تو میں نے سکون کا سانس

لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ زرین رو رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا۔

''مجھے افسوس ہے۔''

''تمہیں کیوں افسوس ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''میں ہوں ہی اس قابل......''

''فضول باتیں نہ کرو اگر تم اس قابل ہوتیں تو کیا میں تم کو ایسے لیے لیے پھر رہا ہوتا۔ میں نے تم میں کچھ دیکھا ہے تب ہی اپنی جان کی پروا کیے بغیر تمہیں ساتھ لیا ہے۔ یہ بھونکنے والے کتے ہیں ان کی پروا کرو گی تو زندگی حرام ہو جائے گی۔'' میں نے کسی قدر برہمی سے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو کیا تمہارے نزدیک میں اچھی عورت ہوں۔''

''اتنی ہی اچھی جتنی کہ وہ عورت ہو سکتی ہے جسے سوائے اس کے باپ، بھائی اور شوہر کے کسی نے نہ دیکھا ہو۔ تمہارے ساتھ جو ہوا اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ اگر پاگل کتا آدمی کو کاٹ لے تو قصور آدمی کا ہوتا ہے یا کتے کا۔''

میری باتوں سے اس کی اعصابی کشیدگی کم ہونے لگی تھی ورنہ ان حرامزادوں کی باتیں سن کر وہ ہسٹریا کے قریب پہنچ گئی تھی اور اگر وہ کچھ دیر اور یہاں رہتے تو شاید اسے دورہ پڑ جاتا لیکن اب یہ ہسٹریا اشکوں میں ڈھل کر بنا کسی شور کے نکل رہا تھا۔ وہ میرے شانے سے سر ٹکائے بے آواز روتی رہی اور میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے مجھے توفیق دی میں ایک عورت کو ظلم اور ناانصافی کے ماحول سے نکال سکوں۔ ہم کوئی نصف گھنٹہ اس چٹانی خلا میں رہے تھے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ فاضلی اور اس کی پارٹی دفع ہو گئی ہے تو میں نے پہلے زرین کو نکلنے کو کہا۔ وہ آرام سے نکل گئی۔ اصل مشکل مجھے پیش آئی تھی۔ میری جیکٹ دو جگہ سے پھٹ گئی اور جسم پر کئی خراشیں آ گئی تھیں۔ زرین کو کم رگڑ کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن حالت اس کی بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کا سویٹر اور شانے سے قمیص پھٹ گئی تھی۔ ایک کہنی سے خون جھلک رہا تھا۔ ابھی ہم جھاڑی میں ہی تھے میں نے زرین سے کہا۔ ''تم یہیں رکو میں ذرا باہر کا جائزہ لے لوں۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں ان لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے دور نکل جاؤں گا اور اگر میں تم سے بچھڑ جاؤں تو تم اسلام آباد کے پتے پر پہنچ جاؤ گی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''کوشش کروں گی۔ کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟''

''نہیں میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر اسے عبداللہ کی کوٹھی کا پتا یاد کرایا۔ جب اس نے ذہن نشین کر لیا تو میں نے اس سے کہا۔

''تم شہر پہنچنے کے بعد کسی بھی ٹیکسی یا رکشے میں بیٹھ کر یہاں پہنچ سکتی ہو تمہیں صرف پتا بتانا پڑے گا۔''

''لیکن میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ وہاں پہنچ کر تم صرف میرا نام لو گی۔ میں ہوں یا نہ ہوں تمہیں وہاں پناہ مل جائے گی۔''

''کیا تم مجھے چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟'' وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔

''نہیں بابا میں حفظ ماتقدم کے طور پر کہہ رہا ہوں۔''

''کیا کس کا کہہ رہے ہو؟'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''احتیاطاً۔'' میں نے مختصراً کہا اور جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ سورج خاصا بلند ہو گیا تھا اور اس کی روشنی میں دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی اس جگہ کی کہیں سے چھپ کر نگرانی کر رہا تھا تو میں کہہ نہیں سکتا تھا لیکن سامنے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ جگہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک کسی قدر چوڑی گھاٹی کی صورت میں تھی۔ آگے جا کر یہ ایک پہاڑی ڈھلان پر ختم ہو رہی تھی۔ جس کے پار میرے اندازے کے مطابق مری شاہراہ کو ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ وہاں نہ بھی ہوتی تو ہمیں اس جگہ سے تو نکلنا تھا۔ ہم جتنا مرشد علی کی کوٹھی سے دور جاتے اتنا ہی محفوظ ہو جاتے۔ میں نے اسے آواز دی۔

''باہر آ جاؤ۔''

زرین باہر آئی اور ہم تیزی سے آگے روانہ ہو گئے۔ اتنی دیر کے آرام نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ پوری طرح میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں تیز قدمی کر رہا تھا اور اسے میرا ساتھ دینے کے لیے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ مگر وہ احتجاج کیے بغیر بھاگ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اس زحمت سے وہ مستقل طور پر ایک بڑے عذاب سے بچ جائے گی۔ جو مرشد کی صورت میں اس کی زندگی پر مسلط تھا۔ ہم کوئی نصف گھنٹے تک بھاگتے رہے اور اس کے بعد زرین کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ہانپتے ہوئے رک گئی۔

''مجھے کچھ دیر سانس لینے دو۔''

''لے لو لیکن ہم پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں رک سکتے۔''

زرین کا جسم اس دوران میں ٹیون ہو گیا تھا اور وہ پہلے سے بہتر لگ رہی تھی اس بار اس کا سانس بھی جلد معمول پر آ گیا اور ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ اس بار ہم سامنے نظر آنے والی چوٹی کے دوسری طرف اترنے والی ڈھلان پر رکے تھے۔ یہاں سے مارگلہ کے پہاڑ دور تک پھیلے نظر آ رہی تھی لیکن مری ہائی وے نظر نہیں آئی شاید وہ مزید کسی پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا سلسلہ پیر سہاوا کی طرف جاتا تھا لیکن ہم اتنا طویل سفر نہیں کر سکتے تھے۔ شہر تک رسائی کے لیے سب سے قریبی راستہ مری ہائی وے ہی تھا لیکن مجھے خدشہ تھا کہ مری ہائی وے پر مرشد کے آدمی ہماری تاک میں ہوں گے اور ممکن ہے پولیس کو بھی ہمارے بارے میں بتا دیا گیا ہو۔ اس صورت میں مری ہائی وے کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اور جانا بھی ضروری تھا۔

''سڑک کہاں ہے؟'' زرین ایک اور پہاڑی دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''میرا خیال ہے اس پہاڑی کے پار ہے۔''

''یعنی ایک پہاڑی اور......'' وہ کراہی۔ اس نے اپنا پھٹا سویٹر کسی طرح سے اوپر کر لیا تھا۔

''جانا تو ہے ورنہ تم جانتی ہو ان پہاڑوں میں رات ہو گئی تو کل صبح ہماری لاشیں ملیں گی اکڑی ہوئی۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' اس نے جھرجھری لی۔ ''رات کو بہت زیادہ سردی ہو جاتی ہے۔''

''اس لیے چلنا شروع کر دو تاکہ رات سے پہلے کسی جگہ پہنچ جائیں۔'' میں نے کہا اور ڈھلان سے اترنا شروع کر دیا۔ وہ میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اب وہ ان راستوں کی عادی ہو چلی تھی اور آسانی سے چل رہی تھی مجھے صرف مشکل مقامات پر اسے سہارا دینا پڑتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ خود میرے لیے مشکل مقام یہی ہوتا تھا۔ مسلسل سفر نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اس کے باوجود اس کی کشش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اس

کے قریب جانے سے گریز کروں لیکن اس سفر میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ دو پہر تک ہم ڈھلان سے اتر آئے تھے اور اگلی پہاڑی کی ڈھلان چڑھ رہے تھے۔ پھر مجھے ایک نالا سا نظر آیا۔ جس نے پہاڑ کو کاٹ کر اپنا راستہ بنا لیا تھا اور اس سے گزر کر ہم آسانی سے دوسری طرف جا سکتے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں بتایا تو زرین خوش ہوگئی تھی کیونکہ اس کوہ پیمائی سے اس کی جان جا رہی تھی لیکن نالے میں جانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا تھا کیونکہ ایسا ممکن تھا آگے کہیں یہ بند ملے اور ہمیں پلٹ کر واپس آنا پڑے۔ مگر زرین کی حالت کے پیشِ نظر میں نے نالے کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اس کا رخ بتا رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے یہ مری ہائی کے نیچے سے گزرے گا۔ موسم خشک ہونے کی وجہ نالے میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے اس میں سفر کرنا مشکل نہیں تھا۔ ہم اس میں اترے تو یک دم ہی آس پاس کے سارے مناظر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یعنی اب ہم بھی دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ نالا شارٹ کٹ نہیں تھا کیونکہ یہ بہت گھوم پھر کر جا رہا تھا لیکن اس میں ہم نسبتاً آسانی سے سفر کر سکتے تھے۔ البتہ جہاں کہیں پتھر تھے وہاں ذرا مشکل آ رہی تھی لیکن نالے کے کنارے ریتیلے تھے اور اس میں سفر کرنا کوہ پیمائی کرنے کی نسبت آسان ہی تھا۔ جہاں کہیں نالے کی گہرائی زیادہ تھی وہاں پانی جمع تھا اور ہم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ سرد موسم کے باوجود اتنی مشقت کرنے سے پیاس لگنا لازمی تھی۔

ہمیں چلتے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور سورج سر پر سے گزر کر اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ زرین ایک بار پھر تھکنے لگی اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اب مجھ سے مزید نہیں چلا جا رہا ہے۔''

''ہمت کرو ہمیں شام سے پہلے پہلے اس نالے سے نکلنا ہے ورنہ اس میں رات ہو گئی تو سوچو سردی سے کیا حال ہوگا۔''

''کچھ دیر تو رک جاؤ۔'' اس نے التجا کی تو میں نے سر ہلایا اور ایک طرف نالے کے اندر اُگے درخت کے تنے سے ٹک گیا۔ وہ سامنے دھوپ میں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وقت گزاری کے لیے وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگی اور میں حتیٰ الامکان جھوٹ بولے بغیر اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد میں نے اسے اٹھا دیا۔ اس نے کہا۔ ''ابھی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔''

درحقیقت یہ مشکل سفر اس کے لیے بہت زیادہ مشکل تھا۔ وہ نازک اندام عورت تھی جسے اب مشقت کرنے کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ دو سال سے وہ مرشد کی کوٹھی میں پُر آسائش اور آرام کی زندگی گزارتی رہی ہے۔ اس لیے یہ اچانک مشقت اس کے لیے کچھ زیادہ ہی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا لیکن میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بس بہت آرام ہو گیا۔ اب چلو ہمیں رات سے پہلے کسی ٹھکانے پر پہنچنا ہے۔''

وہ بادلِ ناخواستہ چلنے لگی اس کا انداز خود کو گھسیٹنے والا تھا۔ میں نے سہارا دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ شاید میرے سخت لہجے پر ہوا تھا۔ پر میں انجان بنا چلتا رہا کم سے کم اس طرح وہ چل تو رہی تھی۔ اگر میں اس سے نرمی سے بات کرتا تو وہ پھر بیٹھ جاتی۔ شام تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ دسمبر کے آخر میں اس علاقے میں سورج پانچ بجے ہی ڈوب جاتا ہے۔ پہاڑوں میں رات اور بھی پہلے اتر آتی ہے۔ کوٹھی میں مجھے موبائل لینے کا خیال نہیں آیا تھا ورنہ اس سے وقت دیکھا جا سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت چار بج رہے تھے۔ نالے کے اندر سے روشنی غائب ہو چکی تھی اور جہاں دونوں طرف سے

جھاڑیاں جھکی ہوئی تھیں وہاں تو تاریکی آ چکی تھی۔ یہ نالا شیطان کی آنت کی طرح چلا جا رہا تھا اور اب تک نہ تو کوئی پل آیا تھا اور نہ آس پاس کوئی آبادی محسوس ہوئی تھی۔ زرین نے خاصی دیر بعد کہا۔

''یہ نالا کب ختم ہوگا؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ میں بھی اب نالے سے نکلنے کا سوچ رہا تھا کیونکہ اس میں بالکل اندھے تھے اور پھر باہر پھیلتی تاریکی کا اثر اندر کہیں زیادہ تھا اور صاف لگ رہا تھا کچھ دیر میں نالا اندھیرے میں ڈوب جائے گا اور ہم اس میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ ''میرا خیال ہے ہمیں نالے سے نکلنا چاہیے۔''

وہ خوش ہوگئی۔ ''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ یہاں سے نکلیں گے تو کوئی راستہ نظر آئے گا۔''

ایک نسبتاً کم ترچھی ڈھلان سے میں پہلے خود اوپر چڑھا اور پھر زرین کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ ''تم تھکے ہوئے ہو لیکن کتنی آسانی سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔''

''اتنا نہیں تھکا ہوں کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے سے زندگی اسی طرح بھاگ دوڑ میں گزر رہی ہے اب میں عادی ہو گیا ہوں۔'' میں نے لاپروائی سے کہا اور آس پاس دیکھا۔ ہم نہ جانے کہاں نکل آئے تھے۔ یہاں چھوٹے بڑے ٹیلے تھے جن کے درمیان سے نالا گھومتا ہوا جا رہا تھا اور دور پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ مری شاہراہ مغرب کی طرف ہونی چاہیے تھی۔ میں نے ڈوبتے سورج کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں اس طرف جانا ہوگا۔''

خوش قسمتی سے ہم مغرب والی سمت نالے سے باہر آئے تھے ورنہ ہمیں ایک بار پھر نالے میں اتر کر اسے کراس کرنا پڑتا۔ زرین کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ خود میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ مگر میں نے اس سے سچ کہا تھا اب میں ایسے حالات کا عادی ہو گیا تھا۔ میں جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں میں عبداللہ سے رابطہ کر سکتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں مرشد کی قید سے نکل آیا ہوں اور وہ فتح خان کو اس کے حوالے نہ کرے۔ اول تو مجھے یقین تھا کہ عبداللہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ جب تک وہ اس کی تصدیق نہیں کر لے گا کہ میں قید میں ہوں یا نہیں اور دوسرے وہ اپنی صوابدید پر فتح خان کو نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میں یا راجا عمر دراز اسے واضح حکم نہ دیں۔ پھر بھی میں اس سے رابطہ کر لینا چاہتا تھا۔ زرین کچھ دیر بعد رک گئی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔

''اب نہیں چلا جا رہا مجھے لگ رہا ہے میں گر جاؤں گی۔''

سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی تیزی سے چھا رہی تھی ہم بالکل نہیں رک سکتے تھے۔ مجبوراً میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا۔ میں اس سے جتنا دور رہنا چاہ رہا تھا قدرت مجھے اتنا ہی پاس لا رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس کی کشش کا اسیر ہو گیا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے جب سے اس کی کشش کو محسوس کیا تھا میں اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ میں بندہ بشر ہوں اور میں نے کبھی اس معاملے میں لاپروائی نہیں کی۔ کیونکہ عورت کے معاملے میں انسان اسی وقت ٹھوکر کھاتا ہے جب وہ اس کی طرف سے لاپروا ہو جاتا ہے۔ اس کے لمس سے ایک لمحے کو میرا وجود سنسنا اٹھا تھا۔ شاید اس کی نسوانی حس نے اسے میرے احساسات سے آگاہ کر دیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

''شہباز تم بہت اچھے انسان ہو۔''

''نہیں میں صرف انسان ہوں اور انسان خطا کا پتلا ہے۔''

''نہیں تم اچھے انسان ہو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''اتنی دیر سے میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم نے مجھے چھوا بھی ہے لیکن ایک بار بھی تم نے مجھے غلط نظروں سے نہیں دیکھا۔''

''ایسا نہیں ہے میں نے تمہیں پسند کی نظر سے تو دیکھا ہے۔'' میں نے شرارت سے کہا۔ وہ شرمائی۔

''مجھے معلوم ہے کوئی شخص مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔'' اس کے لہجے میں یقین آ گیا۔ اسے اپنی خوب صورتی کا بہ خوبی علم تھا۔ ''تم نے مجھے پسند کی نظر سے ضرور دیکھا ہے لیکن اس مردانہ نظر سے نہیں دیکھا جو صرف عورت کا جسم دیکھتی ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس وہ نظر ہے بھی نہیں...... نہیں میں شاید غلط کہہ گیا ہوں۔ وہ نظر تو ہر مرد کے پاس ہوتی ہے لیکن شریف مرد کے پاس صرف ایک عورت کے لیے ہوتی ہے جو اس کی بیوی ہوتی ہے اور بدمعاش کے پاس ہر عورت کے لیے ہوتی ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں تم ایک اچھے انسان ہو۔''

اگرچہ میری اس قسم کی گفتگو سے ذرا کوفت ہوتی ہے لیکن زرین کو یہ گفتگو اچھی لگ رہی تھی اور اس کا مورال بڑھانے کے لیے میں اس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا اچھا اثر نکلا بہت سارا راستہ ان ہی باتوں میں گزر گیا اور اس دوران میں تاریکی چھا چکی تھی۔ اسی لحاظ سے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں سڑک مل گئی۔ نظر نہ آنے کے باوجود اس سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کا انعکاس بتا رہا تھا کہ سڑک کس طرف ہے۔ میں نے زرین کو اس بارے میں بتایا تو وہ باتیں بھول کر سڑک تک جانے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی۔ ہمارے قدم تیز ہو گئے۔ سڑک تک پہنچنے کی بے تابی اور پھر تاریکی نے ہمیں زمین کی طرف سے لاپروا کر دیا تھا۔ اس لاپروائی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا تھا۔ چلتے ہوئے میرا پاؤں کسی چیز میں گیا اور کھٹ کی آواز کے ساتھ مجھے لگا جیسے میرا پاؤں کسی مگرمچھ کے جبڑے میں آ گیا ہو۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ میں نے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی لیکن نیچے گر گیا۔ زرین نے چیخ ماری۔

''شہباز کیا ہوا؟''

میں اس چیز کو ٹٹول رہا تھا اور میرے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ میرے پاؤں کو ایک شکنجے نے جکڑ لیا تھا۔ اس کا فولادی جبڑا میرے پاؤں کو ٹخنے سے ذرا اوپر سے پکڑے ہوئے تھا اور اس کے دندانے میرے پاؤں میں اتر گئے تھے۔ اس سے خون رس رہا تھا۔ مجھے ہڈی کا تو نہیں معلوم تھا لیکن تکلیف شدت کی تھی۔ زرین نیچے بیٹھ کر ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''شکاری پھندا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ چابی سے کھلتا ہے۔''

''چابی کہاں ہے؟'' اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

''اس کے پاس جس نے...... اسے لگایا ہے۔'' میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''زرین سڑک کچھ دور ہے تم جا کر مدد لا سکتی ہو۔''

''میں اکیلے......'' وہ ڈر گئی تھی۔

''ہاں تو کیا لشکر بھیجوں تمہارے ساتھ۔'' میں جھنجھلا گیا تھا۔ اصل میں یہ حادثہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ کچھ دیر کے لیے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی میں زرین سے سخت لہجے میں بات کر گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی پھر کھڑی ہوگئی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں نے احمقانہ بات کی تھی۔ میں جا کر کسی کو مدد کے لیے لاتی ہوں۔''

''لیکن احتیاط سے کوئی اور مسئلہ نہ بن جائے۔'' میں نے اسے سمجھایا اور وہ سمجھ کر تلخی سے بولی۔

''میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ میرے پاس گنوانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس سے پہلے میں اسے کچھ کہتا وہ سڑک کی طرف بڑھ گئی۔ میں موسم کی مناسبت سے ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اتنی دیر میرے ساتھ رہ کر وہ مجھ سے اٹیچ ہوگئی تھی اس لیے زود رنج دکھا رہی تھی۔ سڑک یہاں سے پاس تھی لیکن نظر نہیں آ رہی تھی البتہ اب گاڑیوں کی روشنیوں کے ساتھ ان کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ٹٹول کر پھندے کا جائزہ لیا۔ اس علاقے میں لومڑیاں اور گیدڑ عام ملتے ہیں اور مقامی لوگ ان کی کھال کے چکر میں اس قسم کے پھندے ان جگہوں پر لگا دیتے ہیں جہاں ان جانوروں کا گزر رہتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ پھندہ ایسی جگہ نہ ہو جہاں سے انسانوں کا گزر رہتا ہے۔ یہ جگہ بھی ایسی ہی تھی یہاں سے لوگوں کا گزر نہیں تھا بس میں شامت کا مارا یہاں سے گزرا اور اس مصیبت میں پھنس گیا۔ پھندہ وزنی نہیں تھا شاید دو کلوگرام کا ہوگا لیکن یہ زنجیر کے ساتھ زمین سے منسلک تھا اور میں اس زنجیر کو نہیں نکال سکتا تھا۔

زرین سڑک کی طرف چلی گئی تھی کیونکہ اس کا ہیولہ نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ مجھے خدشہ ستانے لگا۔ زرین غیر معمولی حسین تھی اور اس ویرانے میں وہ کسی اوباش کو روک لیتی اور اس کی نیت زرین پر خراب ہو جاتی تو یہ نیا مسئلہ بن جاتا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کاش میں اسے پستول دے دیتا۔ اگر چہ اسے چلانا نہیں آتا تھا۔ البتہ اس کی زرین کے ہاتھ میں موجودگی بڑے بڑوں کو نیت کی خرابی سے باز رکھ سکتی تھی۔ مگر اب وہ جا چکی تھی اور میں اسے آواز دے کر بھی نہیں بلا سکتا تھا۔

کبھی کبھی انسان کچھ سوچتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ ابھی مجھے خیال آیا تھا کہ سڑک کی طرف سے زرین کی چیخ سنائی دی۔ چیخ نسوانی تھی اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ زرین کی چیخ ہے۔ میں نے چلا کر پوچھا۔

''زرین کیا ہوا ہے؟''

جواب میں اس کی دوسری چیخ سنائی دی اور اس کے چند لمحے بعد اس کا ہیولہ نمودار ہوا وہ تاریکی اور ناہموار زمین کی پروا کیے بغیر دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ پھر اس کے پیچھے دو مردانہ ہیولے نمودار ہوئے۔ میں نے پستول نکال لیا اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ زرین کے بالکل پیچھے تھے اور اگر میں گولی چلاتا تو زرین کو لگنے کا امکان تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے ڈری ڈری آوازیں نکال رہی تھی جب کہ اس کے پیچھے آنے والے اسے رکنے کو کہہ رہے تھے۔ ان کا انداز ڈرانے والا تھا۔ وہ اسے روکنا چاہ رہے تھے۔ زرین ان سے آگے تھی اور اس کی رفتار بھی خوف نے تیز کر دی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والے اس سے دور تھے اور شاید سست بھی تھے لیکن زرین کی بدقسمتی کہ اس کا پاؤں کہیں اٹکا اور وہ قلابازی کھا کر گری۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی یا میں اس

کے تعاقب میں آنے والوں پر گولی چلاتا انہوں نے زرین کو چھاپ لیا تھا۔ اس نے چیخ ماری۔

''چھوڑو مجھے۔''

''ایسے کیسے چھوڑ دیں تجھے۔'' ان میں سے ایک بولا لہجے سے وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ ''کتنے دنوں بعد تو ایسا مال ملا ہے۔''

''یار مزے آجائیں گے۔'' دوسرے کی ابھی سے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں زرین سے چمٹے ہوئے تھے اور شاید اس کی مزاحمت سے بھی لطف اٹھا رہے تھے۔ ابھی تک ان کی نظر مجھ پر نہیں گئی تھی۔ زرین نے پھر چیخ ماری۔

''شہباز...... مجھے بچاؤ۔''

''اوئے یہ شہباز کون ہے؟'' پہلا والا چونکا۔

انہوں نے پہلی بار آس پاس کا معائنہ کیا تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ دوسرے نے پہلے والے سے کہا۔

''اسے قابو کر میں اسے دیکھتا ہوں۔''

میں نے اب تک گولی نہیں چلائی تھی کیونکہ وہ زرین کے پاس تھے اور اس تاریکی میں نشانہ چوک جانے کا امکان تھا۔ اس لیے میں خون کھولنے کے باوجود صبر سے ان کے زرین سے الگ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسرا میری طرف آنے لگا۔ اس موقع پر زرین نے حماقت کی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''شہباز ان کو گولی مار دو۔''

''اوئے یہ مسلح ہے۔'' دوسرا بولا اور پلٹ کر بھاگا تھا کہ میں نے عقب سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے جسم کے درمیانی حصے میں اتر گئی تھی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور زمین پر تڑپنے لگا۔ جس نے زرین کو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا اور بے ساختہ سڑک کی طرف بھاگا۔ اسے اپنے ساتھی کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلانے سے گریز کیا کیونکہ پھر زرین درمیان میں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر میری طرف بھاگی اور پاس آتے ہی لپٹ گئی۔ میرا پاؤں ہلا تو میں کراہا تھا۔

''میرا پاؤں......''

اس نے میری بات سنی نہیں وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھے ان درندوں سے بچالیا۔''

''ان میں سے ایک مارا گیا ہے۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''اس کا ساتھی جا کر پولیس کو بلا لائے گا۔''

پولیس کا سن کر وہ بھی پریشان ہوگئی تھی۔ ''پولیس تو مرشد کی ساتھی ہے وہ ہمیں اس کے حوالے کر دے گی۔''

''سنو ہمیں پولیس یا کسی اور کے یہاں آنے سے پہلے نکلنا ہوگا۔''

اس ایک تجربے کے بعد وہ سہم گئی تھی اس نے سڑک کی طرف جانے سے انکار کر دیا۔ ''میں اب نہیں جاؤں گی۔''

''پلیز زرین ہمت کرو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''ضروری نہیں ہے سب بدمعاش ملیں۔ اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے رونا شروع کر دیا۔ ''یہ دنیا اتنی گندی کیوں ہے۔ عورت کو دیکھا اسے ایک

ہی خیال کیوں آتا ہے۔''

اب میں اسے دنیا اور خاص طور سے مردوں کی دنیا کے بارے میں نہیں سمجھا سکتا تھا۔''زرین پلیز میری حالت کا خیال کرو۔ میرا پاؤں پھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ تمہیں دنیا کی پڑی ہے۔ ایسا کرو یہ پستول رکھو اور اگر اس بار کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش کرے تو اسے شوٹ کر دینا۔''

اس نے پستول لے لیا۔ اس دوران میں جب اسے سمجھا رہا تھا تو ہماری توجہ گولی کھا کر گرنے والے کی طرف نہیں رہی تھی اور وہ کس وقت خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا۔ اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب میں نے اس طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔ میں نے اضطراب سے کہا۔''زرین وقت کم ہے جلدی کرو ورنہ ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔''

پستول لینے کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سڑک کی طرف جائے۔ میں نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''زرین شاباش ہمت کرو، تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ مرشد سے جان بچانی ہے تو تمہیں ہمت کرنا ہی ہوگی۔''

اس نے سر ہلایا۔''میں...... میں کوشش کرتی ہوں۔''

وہ سڑک کی طرف چلی گئی۔ اس بار اس کی چال میں تیزی کے بجائے ہچکچاہٹ تھی۔ ابھی چند لمحے پہلے اس نے مردوں کا ایک اور روپ دیکھا تھا اور مجھے اس کی اندر کی کیفیت کا اندازہ تھا اس کے باوجود وہ بہت ہمت کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اسی لمحے مشرق سے چاند نے سر اٹھایا۔ یہ چھٹی ساتویں کا چاند تھا یعنی آدھا تھا اور اس کی روشنی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن جتنی بھی تھی اس سے کم سے کم آس پاس کا منظر صاف نظر آنے لگا تھا۔

مجھے دبئی والوں کا خیال آیا۔ وہ غائب تھے اور اب میں بھی غائب ہو گیا تھا۔ میرے دشمن میری قید میں تھے اور میں ان کی قید میں چلا گیا تھا۔ قدرت مہربان ہوئی تو قید سے نکل گیا تھا لیکن اب اس پھندے میں آن پھنسا تھا۔ سوچتے سوچتے میں چونکا نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ زرین کو گئے ہوئے کم سے کم ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اب تک اسے واپس آجانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ ایک بار مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے لیکن میں نے فوراً اس خیال کو مسترد کر دیا کیونکہ جہاں تک میں نے اسے سمجھا تھا وہ مجھے اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ یقیناً کسی مشکل میں پڑ گئی تھی۔

کچھ دیر اور گزری اور مجھے لگا کہ مجھے اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا تھا۔ میں نے پھندے کا جائزہ لیا۔ یہ مضبوط لوہے کا تھا اور بغیر چابی یا آری کے اسے کھولنا ناممکن تھا۔ میں نے زنجیر کا جائزہ لیا جو زمین میں گڑی ہوئی تھی اور اسے کھینچ کر نکالنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں پھندہ ہلا تو مجھے تکلیف سے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا اور میں نے بے ساختہ پھندہ لگانے والے کی شان میں اعلیٰ درجے کی گستاخیاں کیں۔ اس کا زاویہ بدلا اور یہ ایک اور تکلیف دہ مرحلہ ثابت ہوا لیکن اس سے میں اس پوزیشن میں آ گیا کہ بغیر پھندہ ہلائے زنجیر کھینچ سکوں۔ میں نے آزاد پاؤں زمین پر ٹکایا اور زنجیر کو زور سے کھینچا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ زنجیر آسانی سے نکلتی چلی گئی تھی۔ ظاہر ہے لگانے والے نے اسے لومڑی یا گیدڑ کی طاقت کے لحاظ سے زمین میں لگایا ہوگا کہ وہ پھندے میں پھنسنے کے بعد اسے کھینچ کر نہ لے جائیں۔ میری طاقت ان سے زیادہ ہی تھی اس لیے زنجیر نکل آئی تھی۔

پھندہ زنجیر سمیت کوئی تین کلوگرام وزنی ہوگا۔ میں نے سیدھا ہوکر اسے اوپر کیا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ میرے پاؤں پر زور آرہا تھا اگر ہڈی کو نقصان ہوا ہوتا تو اس پاؤں پر زور ڈالنا ناممکن تھا لیکن جب میں نے قدم آگے بڑھایا تو ٹیس اٹھی تھی۔ میں نے برداشت کرتے ہوئے چند قدم اٹھائے اور اس کے بعد تکلیف قابلِ برداشت ہوگئی تھی لیکن یہ اتنی بھی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ بس اتنا تھا کہ میں رک نہیں رہا تھا اور سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب قدم بڑھاتا تو زنجیر چھنکتی تھی۔ اس ویرانے میں ایسی آوازیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں اور بے خبر افراد اسے آسانی سے کسی چڑیل کے پازیب کی آواز سمجھ سکتے تھے۔ میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ میں قدم قدم کرکے سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ چاند نکل آنے سے راستہ نظر آنے لگا تھا اور اب میرا پاؤں کسی گڑھے میں جانے کا امکان نہیں تھا۔ شام ہونے کے بعد مری ہائی وے پر ٹریفک کم ہوگیا تھا اور وقفے کے بعد کسی گاڑی کی روشنی نمودار ہوتی تھی۔

رک رک کر اور تکلیف برداشت کرتا میں کسی طرح ہائی وے تک پہنچ ہی گیا تھا۔ میرے دل میں کہیں امید تھی کہ شاید زرین مجھے سڑک پر مل جائے لیکن جب میں سڑک تک پہنچا تو مجھے دھچکا لگا تھا۔ زرین وہاں نہیں تھی۔ دونوں طرف کوئی سو گز تک سڑک صاف نظر آرہی تھی اور اس پر کوئی ذی روح نہیں تھا۔ سوائے میرے، میں نے چلا کر زرین کو آواز دی۔

''تم کہاں ہو؟''

لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میں نے کئی بار اسے آواز دی اور جب کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر غلط گاڑی کو روک بیٹھی تھی اور گاڑی والوں نے اس بار اسے فرار کی مہلت نہیں دی تھی۔ یقیناً اسے پستول استعمال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس میں اناڑی تھی اور اگر دوسرے کھلاڑی تھے تو انہوں نے با آسانی اس پر قابو پا لیا ہوگا۔ میں نے مایوسی سے سر جھٹکا اس عورت کی قسمت خراب تھی۔ اسے مرشد کے قبضے سے نکال کر لایا تو وہ کسی اور مرشد کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر سڑک کی طرف دیکھا۔ مجھے امید تھی کہ یہاں سے کوئی نہ کوئی گاڑی گزرے گی جس میں مجھے لفٹ مل جائے گی۔ مگر ابھی کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میری قسمت کہ جب سڑک سے دور تھا تو گاڑیاں گزر رہی تھیں اور جب یہاں تک آیا تو کوئی گاڑی نہیں تھی۔



زرین غائب تھی لیکن میں اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتا تھا اس لیے میری توجہ اب اپنی طرف تھی مجھے کسی سے مدد حاصل کرکے یہاں سے نکلنا تھا اس کے بعد ہی میں زرین کے لیے کچھ کرسکتا تھا ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ وہ کہیں مرشد علی کے آدمیوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی ہے لیکن اس صورت میں وہ مجھے بھی تلاش کرنے آتے۔ انہیں اصل میں تو میری تلاش تھی۔ زرین تو ان کو خود مل جاتی اور نہ بھی ملتی تو مرشد کو یقیناً اس کی اتنی پروا نہیں ہوتی۔ البتہ میرے لیے وہ پاگل ہو رہا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مری والی سائیڈ سے ایک گاڑی کی روشنیاں نمودار ہوئیں۔ گاڑی دیکھ کر میں نے زور و شور سے ہاتھ ہلائے اور جب گاڑی قریب آئی تو آواز بھی دی تھی۔

''اے......رکو......میری مدد کرو۔''

لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ زن سے میرے پاس سے گزر گئی تھی۔ مایوسی کے ساتھ میں نے ان کی سنائیں۔ مگر اسی لمحے گاڑی کے بریک پُرشور انداز میں چرچرائے۔ وہ رکی اور پھر ریورس ہو کر تیزی سے واپس آئی میں نے پُرامید نظروں سے گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پاس آ کر رکی۔ اس کا پچھلی نشست والا شیشہ نیچے ہوا۔ اندر تاریکی تھی اور اس تاریکی سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ''آہا......شہباز صاحب۔''

مجھے لگا جیسے میں مایوسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا ہوں۔ جن کی قید سے فرار کے بعد ان سے بچنے کے لیے میں نے اتنی جدوجہد کی تھی اور تقریباً کامیاب بھی ہو گیا تھا تو عین موقع پر جب منزل دو چار ہاتھ لب بام رہ گئی تھی اچانک میری کمند ٹوٹ گئی۔ گاڑی سے آنے والی آواز فاضلی کی تھی اور اس نے فوراً مجھے خبردار کیا تھا۔ ''کوئی غلط حرکت مت کرنا شہباز تم میرے پستول کی زد پر ہو۔''

میں کوئی غلط حرکت کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے میرے پاس ہتھیار ہونا ضروری تھا اور پستول میں نے زرین کو دے دیا تھا۔ اگر پستول نہ ہوتا تب بھی میں ان لوگوں کی قید میں جانے سے بچنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر گزرتا لیکن اس پھندے کے ساتھ میں دو قدم صحیح سے چل نہیں سکتا تھا۔ فرار کی کوشش کہاں سے کرتا۔ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''میں غلط حرکت کر بھی نہیں سکتا ہوں ویسے اس وقت میں خود کو وہ کھوتا محسوس کر رہا ہوں جو اپنی جگہ آ کھڑا ہوا ہو۔ یعنی جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔''

یہ بڑی جیپ تھی جس میں آگے پیچھے نشستوں کے علاوہ عقب میں بھی خاصی جگہ ہوتی ہے۔ اس میں فاضل چیزیں اور اسٹپنی رکھی جاتی ہے لیکن اس کی حالت اچھی نہیں تھی لگتا تھا اسے رگڑا جاتا تھا۔ فاضلی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ ''حیرت ہے تمہیں اس عالم میں بھی شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔'' پھر اس کی نظر نیچے گئی۔ ''یہ کیا ہے تمہارے پاؤں کے ساتھ؟''

''خود دیکھ لو......اس کی وجہ سے بھاگ نہیں سکتا ورنہ تمہارا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا تھا۔''

فاضلی نے ٹارچ سے روشنی ڈالی اور ہنسا۔ ''صحیح پھنسے تم اور بھاگے بھی خوب تھے۔''

''اپنے مرشد کا کیا حال ہے؟''

''تمہارے فراق میں برا ہے۔'' اس نے طنز کیا۔ ''ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔''

میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ فاضلی مرشد کے لیے اس طرح عزت و احترام سے بات نہیں کرتا تھا جیسے مرشد کے دوسرے چیلے کرتے تھے۔ شاید وہ اس کے کچھ زیادہ ہی قریبی لوگوں میں سے تھا۔ فاضلی نے مجھ سے کہا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔''

وہ ابھی تک میری طرف سے پوری طرح محتاط تھا اور اس نے ایک حد سے زیادہ نزدیک آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بہت شاطر تھا اور میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ ''اور کوئی حکم؟''

اس نے میرے عقب میں آ کر میری تلاشی لی لیکن میرے پاس کچھ ہوتا تو برآمد ہوتا۔ اس دوران میں جیپ کی درمیانی نشستوں سے دو مسلح افراد اتر آئے تھے اور انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کے

آنے کے بعد فاضلی نے نیچے بیٹھ کر پھندے کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کہ وہ ایک لمحے میں کھل گیا اور میرا پاؤں اس کی گرفت سے آزاد ہوا تو مجھے ناقابلِ بیان راحت ملی تھی۔ حالانکہ پاؤں کا زخم اپنی جگہ تھا لیکن شکنجے کی اذیت ختم ہوگئی تھی۔ میں نے فاضلی سے پوچھا۔

''تم نے کس طرح کھولا؟''

''اس سے۔'' اس نے تار کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا سامنے کر دیا۔

''یعنی اس میں دسترس ہے۔'' میں ہنسا۔

''اب چلو۔'' اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''چل اوئے۔'' ایک مسلح شخص نے مجھے دھکا دیا۔

میں نے اب تک زرین کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ جس طرح ان لوگوں نے مجھے پالیا تھا اسی طرح زرین بھی ان کے ہتھے چڑھ سکتی تھی۔ فاضلی نے بھی مجھ سے زرین کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔ اسے یقیناً میرے ساتھ زرین کی تلاش بھی ہوگی اور ممکن ہے وہ بھی ان کے ہاتھ آ گئی ہو۔ میں نے آگے جانے کے بجائے اپنے قدم زمین پر جما لیے تھے اس لیے دھکے کے باوجود آگے نہیں گیا۔ مسلح شخص مشتعل ہوگیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ''چلتا ہے یا......؟''

''فاضلی اپنے کتوں کو روکو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں مزاحمت نہیں کر رہا ہوں لیکن مجھے ایک سوال کا جواب چاہیے؟''

''پوچھو۔'' خلافِ توقع فاضلی نے شرافت سے کہا۔

''زرین کہاں ہے؟''

''اسے کہاں ہونا چاہیے؟'' فاضلی کا لہجہ معنی خیز ہوگیا تھا۔

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ فاضلی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس کے پاس زرین کے بارے میں کوئی خاص خبر ہے۔ ''میرا خیال ہے وہ تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے۔''

''میرے تو نہیں ان لوگوں کے ہاتھ لگی تھی۔'' اس نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ورنہ اس کا اتنا برا حال نہیں ہوتا۔ بہرحال اسے بعد میں تو یہ سزا ملنا تھی۔''

''کیا......کیا مطلب؟''

''مرشد نے اس کے لیے اپنے آدمیوں سے کہا تھا کہ جو بھی اسے پکڑیں گے وہ ان کو انعام میں دی جائے گی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''وہ اسی گاڑی میں ہے دیکھنا چاہتے ہو اسے؟''

''فاضلی کیا کیا ہے تمہارے آدمیوں نے اس مظلوم عورت کے ساتھ؟'' میرے اندر آتش فشاں سر اٹھانے لگا تھا لیکن میرا لہجہ اس کی چوٹی پر جمی برف کی طرح سرد تھا۔

''تم دیکھنا چاہتے ہو؟'' وہ بولا۔ ''شادا سے دکھا دو۔''

ایک مسلح آدمی نے مجھے رائفل کی نال سے دھکیلا وہ مجھے جیپ کے پچھلے کے حصے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں جیپ کے پچھلے دروازے کے سامنے رکا تو اس نے کہا۔ ''رک کیوں گئے اسے کھول کر دیکھ لو۔'' اس کے

لہجے میں خباثت تھی۔ ''تمہیں مزہ آجائے گا۔''

میں نے ہچکچاتے ہوئے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور جیسے ہی دروازہ کھلا زرین مجھے سامنے تڑی مڑی حالت میں نظر آئی تھی۔ اس کے جسم پر نا کافی اور پھٹا ہوا لباس تھا۔ جہاں جہاں سے اس کا بدن جھلک رہا تھا وہاں صرف لہو کے داغ تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ ان درندوں کے ہاتھوں اس پر کیا گزری تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں بہت ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہوں اور کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کرنے کا عادی ہوں لیکن اس وقت میرا فیوز اُڑ گیا اور میں نے جو کیا سوچے سمجھے بغیر کیا۔ میں بہ ظاہر جذباتی ہو کر زرین کی طرف جھکا تھا لیکن اس دوران میں میری لات پیچھے کھڑے شخص کی رانوں کی درمیان لگی۔ اس وار میں میری ساری طاقت کے ساتھ میرا سارا غصہ بھی تھا اور وہ دھاڑ مار کر پیچھے جا گرا تھا اس سے پہلے وہ اٹھتا اور مجھ پر اپنی رائفل آزماتا یا فاضلی اور اس کا دوسرا ساتھی گاڑی کے پیچھے آتے، میں اندر گھسا اور عقبی دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اس کے بعد بہت تیزی سے درمیانی نشست کے دونوں دروازے بھی لاک کر دیئے تھے۔ کیونکہ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے اس لیے باہر والوں کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں اندر کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا۔ درمیانی نشست کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس دوران میں، مَیں درمیانی نشست سے ہوتا ہوا اگلی نشست تک آ گیا تھا۔ فاضلی کے ساتھی نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور یہ سوچ کر کی کہ یہ دروازہ بھی لاک ہے لیکن دروازہ کھلا تھا اور جب اس نے کھینچا تو پوری قوت سے باہر گیا اور رہی سہی کسر میں نے لات مار کر پوری کر دی۔ دروازہ غیر متوقع طور پر اسے لگا اور وہ پیچھے جا گرا۔ اس دوران میں میرے ہاتھ ڈیش بورڈ کے خانے کو ٹٹول رہے تھے اور حسبِ توقع مجھے اس میں سے ایک ہتھیار مل گیا۔ یہ ریوالور تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے بھی اندر سے لاک کر لیے تھے۔ اچانک فائر ہوا اور گولی کھڑکی کے شیشوں سے گزر گئی۔ میں بال بال بچا تھا اور ڈیش بورڈ پر قدم جماتے ہوئے میں نے خود کو درمیانی نشست پر پھینکا تھا اگر میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو دوسرا فائر مجھے چاٹ جاتا۔ یہ پستول کا فائر تھا اور پستول فاضلی کے پاس تھا۔ اس کے چلانے کی آواز آ رہی تھی اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی خواتین سے اپنے ناجائز رشتے جوڑ رہا تھا۔

میرے آگے پیچھے ہونے کے دوران جیپ بری طرح ہل رہی تھی اور ان کو اندازہ نہیں تھا کہ میں اس میں کہاں تھا۔ فاضلی اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ میں جیپ لے کر فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ درمیانی نشست پر آتے ہی میں نے ریوالور کا رخ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کر دیا اور جیسے ہی کسی کا سایا کھڑکی پر نمودار ہوا میں نے بلاتکلف اسے گولی ماری دی تھی۔ گولی شیشہ کراس کرتی اس کے سر پر لگی اور وہ غائب ہو گیا۔ اس فائر نے باہر والوں کو پاگل کر دیا تھا اور انہوں نے جیپ کے درمیانی اور اگلے حصے پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے خیال میں، مَیں آگے کہیں تھا جب کہ اس شخص کو شوٹ کرتے ہی میں پچھلے حصے میں آ گیا تھا جہاں زرین بے ہوش پڑی تھی۔ مجھے مجبوراً اس کے کومل وجود پر آنا پڑا تھا یہاں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ دوسرے اس وقت میں زندگی اور موت کے معرکے سے گزر رہا تھا اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میری زندگی کا چراغ گل ہو جاتا۔ ایک آدمی کم ہونے کے باوجود باہر والوں کا پلہ بھاری تھا۔ میرے ہاتھ زرین کو ٹٹول رہے تھے۔ باہر سے فاضلی کے چلانے کی آواز آئی۔

''شہباز باہر آجاؤ ورنہ کتے کی موت مرو گے۔''

مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ میں باہر آیا تو وہ مجھے کتے کی موت مار دیں گے۔ میں زرین کو ہٹا کر ٹٹول رہا تھا پھر میرے ہاتھ میں وہ چیز آ گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہ ایک بھاری پانا تھا جو ٹائر کے نٹ کھولنے اور بند کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے اسے کھینچ کو ڈیش بورڈ پر مارا اور خاصی بلند آواز آئی تھی۔ فاضلی کا ساتھی چلایا۔

''استاد حرامی اگے اے۔''

آواز سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے عقبی دروازہ کھولا اور نیچے لڑھک گیا۔ اس کی چلائی گولی ٹائر کے پاس زمین پر لگی تھی اور اس سے پہلے وہ شاٹ گن کا رخ دوبارہ میری طرف کرتا میں نے اسے بھی گولی مار دی۔ وہ ایک جھٹکے سے سڑک پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ اسے شوٹ کرتے ہی میں گھوم کر جیپ کے دائیں طرف والے حصے میں آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ فاضلی کہاں تھا۔ میں نے کھڑے ہونے کی حماقت نہیں کی تھی۔ اس کے بجائے میں نے لیٹ کر جیپ کے نیچے سے جھانکا لیکن مجھے اس کے پاؤں نظر نہیں آئے تھے۔ وہ سڑک سے اتر کر کہیں جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میں دوبارہ عقبی حصے سے جیپ کے اندر گھس گیا۔ جیسے ہی میں نے دروازہ بند کیا ایک گولی آ کر اس پر لگی تھی میرا اندازہ درست نکلا تھا فاضلی اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ میں تیزی سے جیپ کے اگلے حصے کی طرف آیا۔ سڑک کا یہ ڈھلان تھا اور جیپ کے ہینڈ بریک لگے تھے میں نے گیئر نیوٹرل کرتے ہوئے ہینڈ بریک کھینچ دیا تھا۔ جیپ ڈھلان پر رینگنے لگی۔

فاضلی نے جیپ کو رینگتے دیکھا تو اس نے بے ساختہ کئی فائر کیے لیکن اس نے سڑک پر آنے کی حماقت نہیں کی۔ میں اسٹیرنگ سنبھالنے کے ساتھ اس خانے میں گولیاں تلاش کر رہا تھا جس سے ریوالور برآمد ہوا تھا۔ بالآخر مجھے ایک چھوٹا سا ڈبا مل گیا جس میں ریوالور کی گولیاں تھیں میں نے اس کے خالی ہو جانے والے خانے دوبارہ لوڈ کر لیے۔ جیپ کی چابیاں اگنیشن میں لگی تھی۔ کچھ آگے آتے ہی میں نے چابی گھما کر انجن اسٹارٹ کیا اور گیئر تبدیل کرتے ہوئے ایکسلریٹر دبایا۔ ابھی تک میں نشستوں کے نیچے تھا اور میں نے اوپر ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فاضلی نے جیپ اسٹارٹ ہوتے دیکھی تو دیوانہ ہو گیا اس نے اپنے پستول کا بقیہ میگزین خالی کر دیا اور جذباتی ہو کر سڑک پر آ گیا تھا۔ موڑ پاس آتے ہی میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

زندگی میں شاید ہی کبھی میں نے اتنی تیزی سے زندگی و موت کا کھیلا تھا۔ میں اپنے پاؤں کے زخم کے باوجود کسی مشین کی طرح حرکت میں آیا تھا اور اب میں جیپ کو دور لے جا رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے پاؤں میں شدید تکلیف ہو رہی ہے لیکن ابھی اس کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں آیا تھا۔ مجھے قدرت نے ایک موقع اور دیا تھا اور میں اسے پوری طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ قدرت بار بار موقع نہیں دیتی ہے۔ درحقیقت میں نے جان پر کھیل کر یہ موقع حاصل کیا تھا۔ میرے مقابل تین چھٹے ہوئے اور مسلح بدمعاش تھے اور میں اکیلا اور نہتا تھا۔ ذرا سی غفلت اور سُستی کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ان کے بجائے میری لاش سڑک پر پڑی ہوتی۔ موڑ مڑتے ہی میں نے سر اوپر کر لیا اور جیپ کا ایکسلریٹر دبایا۔ اس نے چیتے کی طرح جست بھری اور میں نے بمشکل اسے

سڑک سے اترنے سے روکا۔ ظاہری حالت سے قطع نظر اس کا انجن اور سسپنشن بہت اچھی حالت میں تھا۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ اس سیدھی سڑک پر مجھے گھیرنا بہت آسان تھا۔ فاضلی کے پاس موبائل کی موجودگی یقینی تھی۔ وہ دوسروں کو اطلاع کر دیتا تو وہ آگے ناکا لگا کر بیٹھ جاتے اور مجھے پکڑ لیتے۔ اس جیب سے چھٹکارا ضروری ہو گیا تھا۔ پھر ٹول پلازہ بھی آ جاتا اور اسے کراس کرنا تھا۔ میری حالت تو خراب تھی ساتھ ہی گاڑی میں زخمی اور بے ہوش زرین بھی تھی اور اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو ایک الگ مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ اس کا سب سے اچھا حل یہ تھا کہ میں گاڑی بدل لیتا۔

قدرت بعض اوقات کیسے آدمی کی مدد کرتی ہے۔ ادھر میرے ذہن میں خیال آیا اور ادھر ایک پلیا سے گزرتے ہوئے مجھے سڑک کے کنارے ایک سرخ کار دکھائی دی اس کے سوار فی الحال پل کی منڈیر پر بیٹھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ دونوں کم عمر تھے اور شاید حال ہی میں گرفتار محبت ہوئے تھے اور ظالم سماج سے چھپ کر اس ویرانے میں ڈیٹ پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور جیب ان کے پاس روک دی۔ اس سے پہلے وہ چونکتے میں نے نیچے اتر کر ریوالور نکال لیا۔ ریوالور دیکھتے ہی ان کی حالت خراب ہو گئی۔ لڑکا ہکلایا۔

"کیا......کیا چاہتے ہو تم؟"

"تمہاری مدد۔" میں نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ ایک زخمی عورت ہے اور میرے دشمن پیچھے ہیں۔ وہ اس جیپ کو پہچانتے ہیں تم مجھے اپنی کار میں شہر تک پہنچاؤ گے۔"

لڑکا اسمارٹ اور چھریرے جسم کا تھا۔ لڑکی کی عمر انیس برس سے زیادہ نہیں تھی اور اس نے چست جینز پر چست تر سویٹر پہن رکھا تھا، نقوش معمولی تھے لیکن رنگ گورا چٹا تھا اور باقی کسر اس نے اپنی اداؤں سے پوری کر لی تھی۔ لڑکے کا رنگ مزید اُڑ گیا تھا اس نے ڈر کر کہا۔

"دشمن......"

"ہاں اور بہت خون خوار قسم کے دشمن ہیں۔ کیا تم بھی ان کے ہاتھ فوت ہونا چاہتے ہو۔"

"نن......نہیں۔"

"تب آؤ۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا تو وہ بادلِ ناخواستہ حرکت میں آیا تھا۔ میں نے اسے جیپ کے پیچھے پڑی زرین کو دکھایا۔ "اسے اپنی کار میں منتقل کرو۔"

اس نے دلچسپی سے زرین کو دیکھا۔ حالانکہ اس کی حالت عبرت ناک ہو رہی تھی لیکن لڑکے نے صرف اس کا عورت ہونا دیکھا۔ میں نے اس کی گدی پر ہاتھ مارا اور دھاڑ کر کہا۔ "کیا یہ تمہاری گم شدہ ماں ہے جو اتنے غور سے دیکھ رہے ہو اٹھاؤ اسے۔"

اس نے زرین کو اٹھایا اور اپنی کار کی عقبی نشست پر لا کر لٹا دیا۔ اس کی کار کی ڈکی میں ایک ترپال تھی وہ میں نے زرین پر ڈلوا دی تا کہ وہ باہر سے نظر نہ آئے۔ لڑکی اس کے ساتھ بیٹھ گئی تھی اور میں لڑکے کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ میں نے ان دونوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا اور ممکنہ حد تک ان کو خوف زدہ رکھا تھا تا کہ وہ کوئی غلط حرکت کرنے کا مت سوچیں میں نے کار کے آگے بڑھنے کے بعد کہا۔

''تمہارے لیے صرف آدھے گھنٹے کی پریشانی ہے اس کے بعد تم جانے کے لیے آزاد ہو گے لیکن کسی حماقت کے نتیجے میں یہ پریشانی بہت بڑھ سکتی ہے اس لیے جیسا میں کہوں ویسا ہی کرتے رہو۔''

''ہم کوئی حرکت نہیں کریں گے۔'' لڑکی نے سہمے انداز میں کہا۔

''تمہارے پاس کوئی کھانے پینے کی چیز ہے؟''

لڑکی نے عقب سے ایک۔ باسکٹ میری طرف بڑھا دی اس میں ایک زنگر برگر اور ساتھ میں کولڈ ڈرنک تھی۔ میں خوش ہو گیا تھا۔ صبح کا ناشتہ فرار کے چکر میں رہ گیا تھا اور سارا دن صرف دھکے کھانے کو ملے تھے۔ میں نے برگر کھایا اور کولڈ ڈرنک کا ٹن کھول لیا۔ پھر میں نے لڑکے سے اس کا موبائل فون طلب کیا۔ اس پر ابھی سگنل نہیں آئے تھے وہ کہیں بھارہ کہو کے پاس جا کر ملے تھے۔ مجھے عبداللہ کا نمبر یاد تھا۔ میں نے کال ملائی اور میری آواز سن کر وہ اچھل پڑا تھا۔ ''شہباز صاحب آپ کہاں ہیں آپ کے غائب ہونے پر یہاں بہت ہنگامہ ہے۔''

''فی الحال میں مری روڈ پر ہوں۔ ایک کار میں بھارہ کہو سے ذرا آگے آ چکے ہیں تم مجھے کہاں سے پک کر سکتے ہو میرے ساتھ ایک زخمی اور بے ہوش عورت بھی ہے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ''آپ اسلام آباد میں داخل نہ ہوں بلکہ راول ڈیم کی طرف جائیں میں وہاں آ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے کوئی بات ہو تو مجھے اسی نمبر پر رنگ کرنا۔'' میں نے فون بند کر دیا اور لڑکے سے کہا۔ ''راول ڈیم کی طرف چلو۔''

''اس وقت۔'' وہ ڈر گیا تھا۔

''جب اس وقت تم لوگ اس ویرانے اور تاریکی میں جا سکتے ہو تو راول ڈیم تک جاتے ہوئے کیوں جان جا رہی ہے۔''

''دیکھو تمہیں جو چاہیے لے لو اور ہمیں جانے دو۔'' لڑکے نے رو دینے والے لہجے میں کہا تو میں نے بڑی مشکل سے اسے جھانپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پایا تھا۔ اسے نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں کوئی ڈاکو نہیں تھا۔

''بکواس کرنے کے بجائے ڈرائیو کرو اور رفتار ذرا تیز کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔ مجھے زرین کی فکر ہو رہی تھی اگرچہ اس کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن پھر بھی اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ مجھے خیال آیا اور میں نے دوبارہ عبداللہ کو کال کی۔ ''کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر کے رکھنا۔''

''آپ بے فکر رہیں میں یہ کام پہلے ہی کر چکا ہوں اور اس وقت راستے میں ہوں آپ پارکنگ میں رکیے گا، گاڑی کیسی ہے؟''

''سرخ رنگ کی ہنڈا اکارڈ ہے نئے ماڈل کی ہے۔''

''میں دیکھ لوں گا۔'' اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

''آپ کسی اور کو بلا رہے ہیں؟'' لڑکے نے ہمت کر کے پوچھا۔

''ہاں راول ڈیم سے تم جانے کے لیے آزاد ہو گے۔''

کوئی پندرہ منٹ بعد ہم ڈیم کے پاس تھے۔ یہاں کئی ایک تفریح گاہیں ہیں لیکن موسم اور رات ہونے کی

بنا پر وہ سب ویران پڑی تھیں۔ لڑکے نے کار پارکنگ میں روک دی۔ اس وقت وہاں سوائے چند ایک گاڑیوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ عبداللہ کو آنے میں کچھ وقت لگتا۔ میں اتر کر پچھلی سیٹ پر آیا۔ لڑکی کو میں نے آگے بھیج دیا تھا۔ ان دونوں کے پاس بہ ظاہر کچھ نہیں تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔ زرین نشست پر نیم دراز تھی۔ ترپال اسے گرم بھی رکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ وہ بہتر تھی۔ پھر میں نے اس کے منہ میں تھوڑی سی کولڈ ڈرنک ڈالی۔ اس کا ردِعمل حوصلہ افزا تھا۔ وہ چونکی اور پھر کراہی تھی۔ میں نے اس کا گال تھپکا۔

''زرین آنکھ کھولو......شاباش۔''

میں مسلسل اسے پکارتا رہا۔ آخر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لڑکے نے اندر کی لائٹ جلا دی تھی۔ زرین کچھ دیر مجھے خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ لڑکا بوکھلا گیا تھا۔

''کیا......کیا ہوا؟''

''زرین......یہ میں ہوں......اب تم محفوظ ہو۔''

وہ لرز رہی تھی۔ ''وہ......وہ لوگ......''

''وہ سب جہنم رسید ہو چکے ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جسم پر لگنے والے ایک ایک زخم کا حساب معہ سود لیا ہے۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہم اس جگہ سے دور نکل آئے ہیں لیکن تم کہو تو تمہیں واپس لے جا کر ان کی لاشیں دکھا دوں۔ اگر وہاں پولیس نہ آگئی ہوئی تو وہیں پڑی ہوں گی۔''

زرین کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ ''مجھے یقین ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔''

اس گفتگو کے دوران آگے موجود لڑکے اور لڑکی کی حالت پھر خراب ہونے لگی تھی۔ یہ سن کر کہ میں کئی افراد کو جہنم رسید کر کے آیا ہوں۔ ان کی موجودگی محسوس کر کے زرین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی میں نے اسے کولڈ ڈرنک کا ٹن تھما دیا۔ وہ بے تابی سے اسے پینے لگی تھی۔ بہ ظاہر اس کی حالت بہت خراب لگ رہی تھی لیکن اس کے سارے زخم سطحی تھے۔ اس لیے جب اس نے محسوس کیا کہ وہ محفوظ ہے تو اس کی حالت بہت تیزی سے سنبھل گئی تھی۔ یہاں چاروں طرف تاریکی تھی۔ اس میں کہیں روشنی چمکی اور ایک منٹ بعد ایک وین آ کر وہاں رکی تھی۔ اس سے عبداللہ اترا تھا۔ میں نے لڑکے اور لڑکی سے کہا۔

''نیچے اتر آؤ۔''

''کیوں اب ہمیں جانے دو۔''

''بحث مت کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ نیچے اتر آئے۔ میں بھی نیچے آیا۔ عبداللہ تیزی سے میرے پاس آیا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''شکر ہے آپ سلامت ہیں۔''

''ہاں ہمیں فوری روانہ ہونا ہے۔'' میں نے کہا اور زرین کو کار سے اتارا۔ وہ کمزور ہو رہی تھی اسے وین

کے عقبی حصے میں بٹھایا پھر میں نے لڑکے سے کہا۔ ''تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ ابھی آدھے گھنٹے میں جو ہوا وہ بھول جاؤ۔''

''میں بالکل بھول جاؤں گا۔'' اس نے مجھے یقین دلایا۔

''اگر تم نے کسی کو بتایا تو مشکل میں تم پڑو گے میں نے تمہارا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔'' میں نے غلط بیانی کی۔

''اس کی مدد سے تمہارا پتا چلانا مشکل نہیں ہے۔''

''یہ کسی کو نہیں بتائے گا۔'' اس بار لڑکی نے کہا۔ ''اگر اس نے ایسا کیا تو میں دوبارہ اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔''

''اتنی سخت سزا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں مسکرایا اور وین میں آ گیا۔ وین میں عبداللہ کے علاوہ ایاز بھی تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہ اب عبداللہ کے پاس ہوگا میرا خیال تھا کہ وہ واپس جا چکا ہوگا۔ عبداللہ میرے اور اس کے درمیان میں آ گیا تھا۔

''اسلام وعلیکم شہباز صاحب۔'' ایاز نے کہا۔

''وعلیکم اسلام۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے تم کو دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے میرا خیال تھا کہ تم......''

''واپس جا چکا ہوں گا۔'' اس نے میرا جملہ مکمل کیا۔ ''میرا ارادہ تو یہی تھا کہ آپ سے اجازت لوں کیونکہ بہ ظاہر آپ کو میری خدمات کی ضرورت نہیں تھی لیکن جب آپ غائب ہوئے تو میں رک گیا۔''

''اب یہ ہمارا ساتھی ہے۔'' عبداللہ نے مجھے آگاہ کیا۔ ''میں نے اسے اپنی ٹیم میں شامل کرلیا ہے۔''

''مجھے خوشی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

میرے بیٹھتے ہی ایاز نے وین آگے بڑھا دی تھی۔ زرین اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی لیکن جب اسے تحفظ کا احساس ملا تو کمزوری پھر غالب آ گئی اور وہ سو گئی یا شاید غشی میں تھی۔ عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کے بارے میں گھر پہنچ کر بتاؤں گا لیکن فی الحال اتنا جان لو کہ یہ بھی مرشد کی زخم خوردہ ہے۔''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''کیا اس کے ساتھ کسی نے مس بی ہیو کیا ہے؟''

''کم سے کم دو افراد نے اور میں ان کو جہنم رسید کر کے آیا ہوں۔''

''مرشد نے آپ کے وکیل ندیم سے رابطہ کیا تھا اس نے آپ کے بدلے فتح خان کو مانگا تھا۔ ندیم صاحب کو ان سارے معاملات کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے راجا صاحب سے رابطہ کیا اور اس کے بعد معاملات انہوں نے سنبھال لیے تھے۔''

''مذاکرات کہاں تک پہنچے تھے؟''

''راجا صاحب نے صاف انکار کر دیا تھا کہ فتح خان ہمارے پاس نہیں ہے۔''

''شکر ہے ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم لوگ بوکھلا کر اس کا مطالبہ نہ مان لو۔''

''ہمیں آپ کی پروا بہت ہے لیکن ہم بے وقوف نہیں ہیں اگر بات طے ہوتی تو آپ کے توسط سے ہوتی۔ ویسے یہ مرشد کی طرف سے آپ کے بدلے فتح خان کو مانگنے کی تک سمجھ میں نہیں آئی۔''

''سچی بات ہے کہ میں خود بھی اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا تعلق ان ہیروں سے ہے جن کے بارے میں صرف فتح خان جانتا ہے۔''

''کیسے ہیرے؟'' عبداللہ کے انداز میں تجسس آ گیا تھا۔ میں نے اسے مختصراً اُن ہیروں کے بارے میں بتایا جو راجا عمر دراز کی وادی سے کچھ دور ایک ویرانے میں پہاڑوں میں کہیں دفن تھے اور ان کی مالیت اتنی زیادہ تھی کہ ہمارے ملک میں امیر ترین شخص بھی ان کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے برٹ شا کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اس سے بات لمبی ہو جاتی۔

''مرشد کا راجا صاحب سے رابطہ تمہارے توسط سے تھا؟''

''نہیں میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا مجھے بیگ صاحب کے توسط سے ان باتوں کا علم ہوا۔'' اس نے بتایا۔ اب مجھے بیگ یا راجا عمر دراز سے معلوم کرنا پڑے گا کہ ان کی مرشد سے کیا گفتگو ہوئی ہے اور دونوں کو راز داری کا مرض ہے۔ بہر حال یہ بعد کا مسئلہ تھا۔ میری پھٹی ہوئی جیکٹ کو دیکھ کر عبداللہ نے اپنی جیکٹ دینے کی پیش کش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وین کے اندر ہیٹر آن تھا اس لیے سردی بہت کم رہ گئی تھی۔ اسی لیے مجھے زرین کی طرف سے اطمینان تھا۔ اس کا سویٹر غائب تھا اور لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ ذہنی اور جسمانی تکلیف کے ساتھ سردی بھی اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ وین کے ہیٹر سے اسے یقیناً سکون ملا ہو گا۔ ہم ابھی راجا صاحب کی کوٹھی سے دور تھے۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اور آرام کرنا چاہ رہا تھا پھر مجھے خیال آیا اور میں نے عبداللہ سے کہا۔

''میرا موبائل تو مس ہے تمہارے پاس ندیم کا نمبر ہے؟''

''ہاں ہے جناب۔'' اس نے مجھے اپنے موبائل سے نمبر ملا کر دیا۔

''کیا میرے گھر والوں یا دوسرے لوگوں کو میری گمشدگی کا علم ہے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اس بارے میں ندیم صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔''

بیل جا رہی تھی پھر ندیم نے کال ریسیو کی۔ ''کون ہے بھائی؟''

''میں بات کر رہا ہوں نام مت لینا۔'' میں نے کہا۔

''ابے تم بچ کر آ گئے پھر یا ابھی تک دشمنوں کی قید میں ہو۔''

''ڈھیٹ ہڈی ہیں بھائی...... لیکن تم نے یہی واویلا کرنا ہے کہ میں غائب ہوں۔''

''اس کی فکر مت کر میں نے پہلے ہی نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر لکھوادی ہے۔''

''میرے گھر والوں میں سے کسی نے رابطہ کیا؟''

''ہاں تیرے ابا اور بھائی سے رابطہ ہے۔''

''دبئی والوں کی کوئی خبر؟''

''نہیں بھائی سب با جماعت غائب ہیں۔'' اس نے بھنا کر کہا۔ ''میں نے ایک جاننے والے کے توسط سے وہاں ایئر پورٹ ریکارڈ چیک کرایا ہے اس دوران میں وہ دبئی سے بائی ایئر باہر نہیں گئے ہیں۔''

''بس تو اپنا کام کر۔''

''اپنا کام کہاں سے کروں، تیرے کاموں سے فرصت ملے تو کروں نا......'' اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے فون بند کر دیا۔ پھر میں نے بابا کو کال کی انہوں نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔

''بابا میں بات کر رہا ہوں۔''

''تم ٹھیک تو ہونا؟'' انہوں نے نام لینے سے گریز کیا۔

''جی بابا...... میں نے صرف آپ کو اطلاع دینے کے لیے کال کی ہے اور عتیق کے بارے میں کوئی خبر ہے؟''

''اس کی حالت ویسی ہی ہے۔'' انہوں نے مایوسی سے کہا۔ ''اللہ اس کو صحت دے۔''

''آمین۔'' میں نے کہا۔ ''میں رفیق بھائی کو کال کروں گا۔''

فون بند کر کے میں نے موبائل عبداللہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے جیب سے ایک اور موبائل نکالا۔

''جب تک آپ کوئی دوسرا موبائل لیں یہ رکھ لیں۔''

مجھے موبائل کی ضرورت تھی اس لیے میں نے لے لیا۔ ''فتح خان اور شریف ٹھیک ہیں؟''

''جی میں نے شریف پر محنت کی ہے اور اس نے خاصا کچھ اگلا ہے۔ البتہ فتح خان کو نہیں چھیڑا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کیا ہے۔ شہلا کے بارے میں معلوم کیا؟''

''وہ اسی دن گھر واپس آ گئی تھی لیکن اس نے پولیس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ البتہ چوکیدار بدل دیا ہے۔''

''میرا خیال ہے پرانا آدمی اب قابلِ اعتبار نہیں رہا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''بیتو کیسا ہے؟''

''بے تاب ہے اگر میں اسے نہ روکتا تو وہ آپ کی تلاش میں نکل چکا ہوتا۔ فی الحال میں نے اسے عتیق کی حفاظت کے لیے اسپتال میں چھوڑ دیا ہے۔''

''یہ تم نے اچھا کیا وہ اس کام کے لیے بہترین آدمی ہے۔''

''جب میں نے اسے بتایا کہ وہ آپ کا رشتے دار ہے تو وہ خود بے چین ہو گیا تھا۔''

ایاز خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ دنیا کا ہر شخص کوئی ایک کام پرفیکشن سے کرتا ہے۔ ایاز ڈرائیونگ کے معاملے میں پرفیکٹ تھا۔ جب وہ کوئی گاڑی ڈرائیو کر رہا ہوتا تو ایسا لگتا کہ گاڑی اس کے جسم کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم راجا صاحب کی کوٹھی پہنچ گئے۔ وہاں ایک ڈاکٹر ہمارا منتظر تھا۔ عبداللہ زرین کو اٹھا کر اندر لے گیا اور ایاز نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے منع کر دیا۔ ''اب ایسا بھی زخمی نہیں ہوں یار۔''



میں اندر آیا تو عبداللہ اس کمرے کے باہر تھا جس میں ڈاکٹر زرین کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔ ڈاکٹر کوئی پندرہ منٹ بعد آیا اور اس نے زرین کے بارے میں کہا۔ ''شاک میں ہے لیکن زیادہ نہیں ہے جسمانی طور پر کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے اسے اعصاب کو سکون دینے والی دوا اور کچھ طاقت والی دوائیں دی ہیں۔ آرام کرے گی تو زخم دو دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔''

''ان کو بھی دیکھ لیں۔'' عبداللہ نے کہا۔

ڈاکٹر نے میرے پاؤں کے زخم کا معائنہ کیا۔ اس نے اس کی ڈریسنگ کی اور مجھے دو عدد انجکشن لگائے۔ اس نے کوئی تشویش ظاہر نہیں کی تھی اس کی مطلب تھا کہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے پاؤں کی ہڈی کو نقصان نہیں ہوا۔ جسم پر چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن یہ ایک دو دن میں خود ٹھیک ہو جاتیں۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ اس دوران میں منیر چائے اور ری فریش منٹ کا سامان لے آیا تھا کیونکہ ابھی ساڑھے سات بجے تھے اور رات کے کھانے میں کچھ وقت تھا۔ مجھے زرین کا خیال تھا لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ضروری کام کرنا تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

''کوئی ایسی سم ہے جو تمہارے یا کسی جاننے والے کے نام پر نہ ہو؟''

''کئی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''ہمارے کام میں اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔''

عبداللہ نے مجھے ایک سم دی اور میں نے اسے اپنے موبائل میں لگایا۔ مجھے وہ نمبر یاد تھا جس سے مرشد نے مجھے قید میں فون کیا تھا اور میں نے نمبر ملایا تو چند لمحے بعد کسی دوسرے آدمی کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے مرشد علی سے بات کرنی ہے۔''

''آپ کون بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے محتاط انداز میں پوچھا گیا مجھے یہ وہی شائستہ آدمی لگا جس سے پہلے بھی ایک بار میری بات ہو چکی تھی۔

''شہباز ملک۔''

یہ سنتے ہی اس نے موبائل مرشد کو دے دیا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا یہ نمبر مرشد کے پاس رہتا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ''شہباز تمہیں یہ نمبر کہاں سے ملا؟''

''بس مل گیا۔ مرشد میں نے صرف ایک بات کہنے کے لیے کال کی ہے۔ اب میرے یا میرے لوگوں

کے ساتھ تمہاری طرف سے کوئی شرارت نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں فتح خان کو مار کر اس کی لاش تمہیں بھیج دوں گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو شریف میرے پاس ہے اور اس نے کئی انکشافات کیے ہیں مجھے مجبور مت کرنا کہ میں ان انکشافات کو کسی ٹی وی چینل کو بھیج دوں۔''

''شہباز......'' اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ دی اور موبائل بند کر کے سم نکال لی تھی۔ میں نے احتیاطاً یہ سم اپنے پاس رکھ لی تھی۔ چائے اور ری فریش منٹ سے انصاف کرتے ہوئے میں نے عبداللہ سے زرین کے بارے میں پوچھا۔

''نرس اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔'' عبداللہ نے تجسس سے کہا۔ ''آپ نے اس کے بارے میں بتانے کا کہا تھا۔''

''ہاں یہ مرشد کی ایک قیدی تھی۔ اس نے اسے اپنی ایک پہاڑی کوٹھی میں رکھا ہوا تھا۔ پھر اس نے مجھے بھی وہیں بھیج دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جہاں رکھا ہوا تھا وہ جگہ بہت بڑی جیل تھی۔''

عبداللہ مسکرایا۔ ''اسے ہم نے یہ کام کرنے پر مجبور کیا تھا۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تم نے؟''

''ہاں...... جب آپ غائب ہوئے اور مرشد نے راجا صاحب سے رابطہ کیا تو میں نے اپنے آدمیوں سمیت مرشد علی کے تمام ممکنہ ٹھکانوں کی نگرانی شروع کر دی۔ پھر میں نے اس کو دھمکانے کے لیے ان ٹھکانوں پر ہلکے پھلکے حملے کیے اور ان سے ڈر کر اس نے آپ کو وہاں سے منتقل کر دیا ہوگا۔''

''بالکل یہی بات ہوگی۔ جہاں میں قید تھا وہاں یہ لڑکی اور اس کا ایک کزن نگران تھے۔''

''لڑکی آپ کے ساتھ کیوں نکل آئی؟''

''پہلے تو میں نے اسے قیدی بنا لیا تھا لیکن جب اس نے مرشد کی قید سے رہائی چاہی تو میں مجبوراً اسے ساتھ لے آیا۔ میرے فرار کی سزا اسے ملتی اور میرے ضمیر نے یہ بات گوارا نہیں کی تھی۔''

عبداللہ ہنسا۔ ''آپ کو وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اسے کیوں لائے ہیں۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

میرا پیٹ کسی حد تک بھر گیا تھا۔ صفائی ستھرائی اور خراب کپڑے بدلنے کے بعد میں خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کمرے کی طرف آیا جہاں زرین تھی۔ میں اندر آیا تو زرین کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ جب عبداللہ نے اسے گاڑی سے اتارا تھا تو وہ تباہ حال اور اجڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ لباس تار تار تھا اور پورا بدن خراشوں اور زخموں سے بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ چہرہ بھی کئی جگہ سے زخمی تھا لیکن اس وقت وہ صاف ستھرے لباس اور چہرے کے ساتھ بستر پر نیم دراز بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ نرس نے اس کے بال تک صاف کر کے ان کو سلیقے سے باندھ دیا تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا پاجامہ اور اسی رنگ کا آدھی آستین کا کرتا پہن رکھا تھا۔ اندر کا درجہ حرارت خوشگوار حد تک گرم تھا اس لیے اندر گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی۔ لباس کسی قدر ڈھیلا سا تھا لیکن وہ اس میں بھی اس کی جسمانی دل کشی نمایاں تھی۔ عملی طور پر وہ عورت تھی لیکن اس کی جسمانی ساخت لڑکیوں کی سی نازک اور ہلکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک کر اٹھ گئی۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ میں نے نرس کی طرف دیکھا۔

''سسٹر پلیز لیو روم۔''

نرس خاموشی سے باہر چلی گئی۔ نرس کے جاتے ہی زرین بستر سے اتر کر میرے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ میں ایک لمحے کو بوکھلا گیا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ''تم نہیں جانتے کہ کیا ہوا ہے؟''

پھر میں نے اس کا شانہ تھپکا اور اسے بستر پر بٹھا دیا۔ ''میں جانتا ہوں اور مجھے ساری عمر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میرے ہوتے ہوئے بھی تم کچھ درندوں کا نشانہ بنیں لیکن میں ان سے تمہارا بدلہ لے چکا ہوں۔''

''یہی بات مجھے سنبھالے ہوئے ہے ورنہ شاید میں مر جاتی۔'' اس نے آنسو صاف کیے۔ ''جب میں سڑک کی طرف آئی تو کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں ایک طرف چلنے لگی۔ میں کچھ دور گئی ہوں گی کہ ان دونوں نے اچانک جھاڑیوں سے نکل کر مجھے پکڑ لیا۔ مجھے پستول استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر وہ مجھے کھینچ کر جھاڑیوں میں لے گئے اور......'' وہ چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ آگے کہنے کی ضرورت نہیں تھی اس کی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ سے پوچھا۔

''میں تم کو کہاں ملی؟''

''وہ تمہیں گاڑی میں ڈال کر لے جا رہے تھے اور اتفاق سے میں بھی پھندے سمیت کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا۔'' میں نے کہا اور پھر اسے بقیہ رُوداد کسی قدر اختصار کے ساتھ سنائی لیکن وہ درمیان میں سوال کر کے خود تفصیل معلوم کرتی رہی۔ یہ سن کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں کہ میں نے کس طرح ان لوگوں پر قابو پایا تھا اور اس کے دونوں مجرموں کو جہنم رسید کیا تھا۔ جب میں چپ ہوا تو اس نے سرد آہ بھری۔

''کاش میں تم سے الگ نہ ہوتی تو مجھے یہ سب نہ دیکھنا پڑتا۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''زرین تمہارا زخم بڑا ہے لیکن وقت کے ساتھ بھر جائے گا۔ اللہ نے چاہا تو اب تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور تم بالکل محفوظ رہو گی۔''

اس نے مجھے دیکھا۔ ''تمہارے ساتھ؟''

اس لمحے مجھے اس کی آنکھوں میں ایک سوال سا محسوس ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ''میرے پاس نہیں......البتہ یہاں تم محفوظ ہو۔''

اس کی آنکھوں کا سوال بجھ گیا تھا۔ ''یہاں کا مجھے نہیں معلوم لیکن جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ اب بھی میں کچھ دیر کے لیے تم سے دور ہوئی اور ان درندوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔''

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے بے دلی سے کہا۔ ''اس ڈاکٹر نے کچھ دوائیں دی ہیں ان کے بعد سے مجھے سکون محسوس ہو رہا ہے ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا میں مر جاؤں۔''

''زرین میری ایک بات یاد رکھنا......ظالم کی وجہ سے اپنی جان گنوانے والے دنیا کے بزدل ترین لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کچھ کرنا ہے تو ان ظالموں کا مقابلہ کرو اگر تم اپنا بدلہ نہ لے سکو تب بھی اتنا ہوگا کہ کچھ دوسرے

لوگ ظلم سے بچ جائیں گے۔ ورنہ تمہارے مرنے سے کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اپنی زندگی کو کارآمد بناؤ اسے بے کار میں ضائع کرنے کا مت سوچو۔"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "میں ان لوگوں کا کیا بگاڑ سکتی ہوں؟"

"یہ تو وقت بتائے گا۔ ابھی تم آرام کرو اور اپنے آنے والے وقت کے بارے میں سوچو۔"

اس نے مجھے دیکھا۔ "مجھے اکیلا مت چھوڑو مجھے نیند نہیں آئے گی اور سوچیں مجھے پاگل کر دیں گی۔"

میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ اپنے اندر سے کس ٹوٹ پھوٹ سے گزر رہی تھی۔ "میں ڈاکٹر سے کہتا ہوں وہ تمہیں کوئی نیند کی دوا دے دے گا تمہارے لیے آرام کرنا بہت ضروری ہے۔"

زرین کا انداز اگرچہ فرار کے بعد سفر میں بھی خاصا بدل گیا تھا وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی اٹیچ ہو رہی تھی۔ عام طور سے کوئی عورت کسی اجنبی مرد سے اس طرح منسلک نہیں ہوتی ہے لیکن ابھی اس کا انداز بہت زیادہ بدل چکا تھا اور وہ واضح طور پر میرے ساتھ کی طلب گار لگ رہی تھی۔ جب کہ اس کی مدد کرتے وقت میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ میری مدد ایک حسین عورت کے لیے نہیں تھی بلکہ ایک مظلوم کے لیے تھی۔ اگر زرین کی جگہ کوئی مرد ہوتا اور وہ بھی اسی طرح میری مدد کا مستحق ہوتا تو میں کرتا۔ میں کھڑا ہوا تو اس نے مجھے دیکھا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

میں باہر آیا اور نرس سے کہا۔ "اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اسے کوئی خواب آور دوا دے دو۔"

نرس نے سر ہلایا۔ "میں ڈاکٹر سے پوچھتی ہوں۔"

"اسے کھانے کو کیا دیا ہے؟"

"فی الحال اسے صرف سوپ دیا ہے۔" نرس نے بتایا۔ "ڈاکٹر نے اسے ٹھوس غذا دینے سے منع کیا ہے۔"

"اس کا پورا خیال رکھنا۔" میں یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ چائے اور کھانے کی دوسری چیزیں لینے کے بعد مجھے بھوک نہیں تھی۔ اس لیے میں لیٹ گیا۔ مسلسل بھاگ دوڑ کی تھکن اب محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں لیٹنے کے کچھ دیر بعد سو گیا۔ بعد میں منیر نے بتایا کہ وہ مجھے کھانے کے لیے بلانے آیا تھا لیکن مجھے بے خبر سوتا دیکھ کر واپس چلا گیا۔

میں صبح اٹھا اور ناشتے سے پہلے زرین کو دیکھا۔ وہ دوا کے زیر اثر ابھی تک سو رہی تھی۔ نرس ڈیوٹی آف کر کے جا چکی تھی۔ اسے مزید دیکھ بھال کی ضرورت نہیں تھی۔ عبداللہ کہیں گیا ہوا تھا اور ایاز اپنی چہیتی جیپ کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ ناشتے کے بعد میں لان پر نکل آیا اور موبائل پر رفیق بھائی سے رابطہ کیا۔ "شہباز تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" انہوں نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ "اسپتال میں کیا ہوا تھا؟"

"رفیق بھائی مجھے دشمن اغوا کر کے لے گیا تھا جس نے عتیق کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا اور ان کو مختصراً اپنے حالات سنائے اور پھر عتیق کے بارے میں پوچھا۔ "اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"مقامی ڈاکٹر اس کے بارے میں مایوس ہیں۔ میں نے ایک ماہر باہر سے بلوایا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "وہ آج شام آ رہا ہے۔"

"میرے ساتھی بیتو کے علاوہ بھی کوئی گارڈ رکھا ہے؟"

''ہاں میں نے ایک مقامی ایجنسی سے تربیت یافتہ گارڈ منگوالیا ہے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''یہ آپ نے اچھا کیا ہے لیکن مجھے بڑی حد تک یقین ہے اب میرے دشمن یہ حرکت دوبارہ نہیں کریں گے۔ان کی کچھ دکھتی رگیں میرے قابو میں بھی آ گئی ہیں۔''

''شریف کی بات کر رہے ہو؟''

''نہیں شریف سے بڑھ کر ایک بدذات ہے اور میرے دشمنوں کا اہم ترین مہرہ ہے۔'' میں نے کہا اس دوران میں میرا ذہن کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔ مجھے کوئی چیز اندر سے چبھ رہی تھی لیکن پوری طرح ذہن میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ پھر وہ چیز اچانک ہی ذہن میں آ گئی میں نے رفیق بھائی سے کہا۔''اگر میں آپ سے کہوں کہ عتیق کو اسپتال سے یہاں ایک جگہ منتقل کر کے اس کا علاج کیا جائے تو آپ مان جائیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں......کیا کوئی اور اسپتال ہے؟'' انہوں نے کہا۔

''نہیں جہاں میں ہوں وہیں لا کر عتیق کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ میں جس کے گھر میں ہوں اس کا ایک ذاتی معالج ہے اور اس کے عجیب طریقہ علاج کا میں خود مشاہدہ کر چکا ہوں۔ ڈاکٹروں نے گیگرین کی وجہ سے میرے بائیں ہاتھ کو کلائی سے کاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے آپریشن تھیٹر سے نکال کر لایا گیا تھا۔ اس شخص نے میرے بے جان ہو جانے والے ہاتھ کا علاج کیا اور اب میرا ہاتھ تقریباً ٹھیک ہے۔''

''یہ شخص کون ہے؟''

''اس کے بارے میں، مَیں آپ کو بعد میں بتاؤں گا لیکن آپ اپنا ذہن بنا لیں اور شام کو جو ماہر آ رہا ہے اس کی رائے بھی لے لیں۔ یہ بتائیں کہ بیتو سے بات ہو سکتی ہے؟''

''نہیں ابھی میں اسپتال سے دور ہوں جا کر اس سے تمہاری بات کراتا ہوں۔ ماہر آ جائے تو اس سے بات کر کے تم سے رابطہ کرتا ہوں۔'' رفیق بھائی بولے۔''تمہارا یہی نمبر ہے؟''

''نہیں لیکن ابھی یہ نمبر بھی میرے پاس ہے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے اندر جا کر منیر سے عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔

''وہ کہاں گیا ہے؟''

''مرنے والے گارڈ کی لاش اس کے گاؤں بھیجنے گئے ہیں۔'' منیر نے بتایا۔ وہ بھی غم زدہ تھا کیونکہ مرنے والا اس کا ساتھی بھی رہا تھا۔ میں اس گارڈ کو بھول گیا تھا جسے فاضلی نے مار دیا تھا۔ اگر وہ کل رات جھاڑیوں میں نہ بھاگ جاتا تو میں شاید اس کا حساب بھی برابر کر کے آتا۔ بہرحال ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں نے فتح خان کے بارے میں سوچا کہ اس سے ملاقات کر لی جائے۔ میں نے منیر سے کافی کا کہا اور کچن کے خفیہ دروازے سے گزر کر نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ جہاں فتح خان اور شریف قید تھے۔ دونوں الگ الگ پنجروں میں تھے۔ شریف کسی جانور کی طرح ٹہل رہا تھا اور فتح خان کمبل میں لپٹا خراٹے لے رہا تھا۔ تہہ خانہ سینٹرلی ہیٹ نہیں تھا۔ اس لیے یہاں اوپر سے زیادہ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے شریف کو نظر انداز کیا اور فتح خان کے پاس آیا۔

''فتح خان۔'' میں نے آواز دی تو اس کے خراٹے رک گئے تھے۔ پھر اس نے کمبل سے منہ نکالا اور مجھے

دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''شہباز خان۔''

''شہباز ملک۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''اس بار ہم پھیر میں آ گیا۔''

''فتح خان اس بار تم برے پھیر میں آئے جن پر تمہارا تکیہ تھا اب وہی تمہارے دشمن بن گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' اس نے انجان بن کر کہا۔ ''فتح خان کسی پر تکیہ نہیں کرتا ہے۔''

''وہ لوگ جن کی اب تک تم چاکری کرتے آئے ہو فتح خان اب وہ تمہیں پکڑنا چاہتے ہیں۔'' میں نے طنز کیا۔

''فتح خان کسی کی چاکری نہیں کرتا ہے بس اپنا مطلب نکالتا ہے۔''

''اس کا تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔'' میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے پنجرے کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ آٹھ بائی پانچ فٹ کا مضبوط فولاد سے بنا پنجرہ تھا جس میں ایک بستر، ایک کموڈ اور ایک چھوٹا سا واش بیسن بھی تھا۔ شریف بھی ایک ایسے ہی پنجرے میں تھا اور یہ پنجرے عبداللہ نے خاص طور سے اس تہہ خانے میں بنوائے تھے ایک تو ان سے قیدیوں پر ہر وقت نظر رکھی جا سکتی تھی دوسرے کسی بھی کام کے لیے ان کو پنجرے سے باہر نکالنا نہیں پڑتا تھا۔ فتح خان کمبل لپیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ''مرشد علی سے تمہاری لڑائی کس بات پر ہوئی ہے؟''

''مرشد علی سے ہمارا کوئی لڑائی نہیں ہے۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں مسکرایا۔

''یعنی اگر میں تمہیں مرشد کے حوالے کر دوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

فتح خان ایک عیار آدمی تھا اس کے چہرے سے ذرا بھی فکر نہیں جھلک رہی تھی۔ ''بے شک کر دو۔''

''فتح خان یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا اور مرشد کا معاملہ ہے۔ اس لیے اسے چھوڑتے ہیں اور اب ذرا کام کی بات ہو جائے۔ یہ بتاؤ کہ تم شہلا رضوی کے گھر اور اس کے بیڈروم میں کیا کر رہے تھے؟''

وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ ''تم نے دیکھا تھا۔ میں تم کو بستر پر دیکھ کر حیران ہوا تھا۔''

''اوکے یہ بیڈروم والا معاملہ بھی چھوڑتے ہیں اب یہ بتاؤ کہ تم اس کے گھر میں کیا کر رہے تھے اور بیٹو کو کیوں یرغمال بنایا ہوا تھا جب کہ مجھے تم مرشد کی ہدایت کے مطابق میری حویلی بھیج چکے تھے۔''

''یہ کام میں نے مرشد کے کہنے پر نہیں کیا تھا۔'' اس نے انکار کیا۔ ''وہ تو تمہیں مانگ رہا تھا۔''

''یہ سفید جھوٹ ہے۔ میں کسی صورت تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''مت کرو، جو حقیقت ہے وہ میں نے بتا دیا۔ مرشد نے تم کو مانگا پر میں نے نہیں دیا اور تم کو تمہاری حویلی بھیج دیا۔''

''شہلا رضوی سے تمہاری جان پہچان کہاں سے نکل آئی جو بڑھ کر بیڈروم تک جا پہنچی؟''

''دونیا نے بتایا اور جب میں اس کے پاس پہنچا تو اسے خوب پایا۔ کتنے عرصے بعد ڈھنگ کا عورت ملا تھا وہ بھی تمہارے چکر میں ہاتھ سے نکل گیا۔'' اس نے افسوس سے کہا۔

''فتح خان مجھے بے وقوف مت بناؤ، تم شہلا کے گھر صرف اس لیے نہیں جا سکتے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ''تو پھر تم بتا دو میں کیوں گیا تھا؟''

''تم اس لیے شہلا رضوی کے گھر پہنچے اور اس پر اور اس کے گھر پر قابض ہوئے کہ تمہیں پروفیسر کے بینک لاکر میں محفوظ بلیک میلنگ اسٹف چاہیے۔''

''چلو اگر ایسا ہے تو تم کو کیا؟''

''مجھ کو یہ کہ تم نے بیتو کو کیوں پکڑ رکھا تھا اور دوسرے مجھے بھی اس اسٹف سے دلچسپی ہوگئی ہے۔''

''بیتو تم کو مل گیا ہے اور اگر تم کوشش کرے تو بینک لاکر سے یہ چیز بھی لے سکتا ہے اب میرا درمیان میں کوئی تعلق نہیں بنتا ہے۔''

''معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے فتح خان جتنا تم بنا کر پیش کر رہے ہو۔ دونیا کہاں ہے؟''

''مر گیا۔'' فتح خان کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ ''اس نے فرار کا کوشش کیا تھا چھت سے گر کر اس کا گردن ٹوٹ گیا۔''

مجھے بھی دونیا سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے دلچسپی اس بات سے تھی کہ فتح خان شہلا رضوی کے گھر میں کیا کر رہا تھا اور اس نے شہلا رضوی کو کس طرح قابو کیا؟ جب کہ وہ ایک اعلیٰ بیوروکریٹ کی رہائش گاہ تھی فتح خان نہ صرف اس کے بیڈ روم میں دندنا رہا تھا بلکہ اس نے بیتو کو بھی وہیں قیدی بنا کر رکھا تھا۔ اسے اور شہلا رضوی کو کوئی خوف نہیں تھا۔ فتح خان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے تم کو میرا بات کا یقین نہیں آیا؟''

میں ہنسا۔ ''پوچھنا اس دن جب مجھے تمہاری کسی بات کا یقین آ جائے۔ ابھی تو میں کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ جب تک میں اپنے طور پر تصدیق نہ کر لوں۔''

''تم کیسے تصدیق کرے گا؟''

''فتح خان کیا تم نہیں جانتے کہ کسی قیدی کے الفاظ کی تصدیق کس طرح کی جاتی ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''اگر تم کو یہ شوق ہو رہا ہے تو یہ بھی پورا کر لو۔ تم کو پتا چل جائے گا فتح خان مارتا ہے تو مار کھانا بھی جانتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں فتح خان۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگرچہ تم میرے دشمن ہو لیکن اعتراف ہے کہ تم حوصلہ مند آدمی ہو۔ شاید جسمانی تشدد بھی تم کو سچ بولنے پر مجبور نہ کر سکے لیکن اگر میں کچھ اور کروں تب تم کیا کرو گے۔''

''تم کیا کرے گا؟''

''مثلاً میں برٹ شا کو اس قید خانے سے نکال لاؤں جہاں تم نے اسے قید کر رکھا ہے۔''

پہلی بار اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آئے۔ ''تم کو کیا پتا وہ کہاں ہے؟''

''یہ مت پوچھو...... فتح خان میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم برٹ شا کو مارو گولی مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن مجھے یہ تو معلوم ہے کہ اس نے ہیرے کس علاقے میں چھپائے ہیں اگر میں چاہوں تو وہ ہیرے خود بھی تلاش کر سکتا ہوں۔ اگر کرنا چاہتا تو اب تک کر چکا ہوتا۔''

''تب تم نے کیا کیوں نہیں؟''

''کیونکہ مجھے یہ ہیرے نہیں چاہئیں۔ تم ان کے لیے اتنے سالوں سے ہلکان ہو رہے ہو لیکن تمہیں بھی نہیں ملے ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہارے مفادات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ پر تم مجھے کہیں چوٹ کرنا چاہو تو میں برداشت نہیں کروں گا اور پھر تمہیں نقصان ہوگا۔ دشمنی میں آدمی ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی وہ میری ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اس دوران میں منیر اوپر سے کافی لے آیا اور میں کافی پیتے ہوئے فتح خان کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر بعد اس نے کہا۔ ''تم نہیں جانتا میں نے برٹ شا کو کہاں رکھا ہے؟''

''یہ بات تم اس وقت کہتے اچھے لگو گے جب میں برٹ شا کو لانے میں ناکام رہوں۔ اگر تم کہو تو میں اسے زیادہ سے زیادہ تین دن میں لے آؤں گا اتنا وقت بھی خراب راستوں کی وجہ سے لگے گا۔''

فتح خان پھر سوچ میں پڑ گیا لیکن وہ شاطر آدمی تھا سمجھ گیا کہ میں بلاوجہ چیلنج کرنے والا آدمی نہیں ہوں اس لیے اس بار اس نے جلدی جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے شہباز خانا...... پوچھو تم کیا پوچھنا چاہتا ہے؟''

''تم شہلا رضوی کے گھر کس طرح پہنچ گئے؟''

''بہت آسانی سے دونیا کے پاس وہ تصویر ہے جس سے پروفیسر شہلا کو بلیک میل کر رہا تھا وہ میں نے لے لیا اور شہلا میرا بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔''

''لیکن اس نے تمہیں کوٹھی میں کیسے جگہ دے دی۔ اسے اپنے شوہر کا خوف نہیں رہا؟''

''اس کا اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گیا ہے۔'' فتح خان نے انکشاف کیا۔ ''اب وہ اس کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔''

میں چونکا۔ ''کوٹھی اس کے شوہر کی نہیں ہے؟''

''نہیں شہلا کا ہے وہ خود بھی بہت دولت مند ہے۔ خوب صورت بھی ہے تم نے دیکھا تو ہوگا۔'' فتح خان کے لہجے میں خباثت آگئی۔ ''اگر میرے پاس اس کا تصویر نہ ہوتا تو وہ میرے کو منہ لگاتا؟''

''یہی تو میں حیران تھا۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''لیکن فتح خان میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم صرف بلیک میلنگ اسٹف کے چکر میں ہو۔''

''تب تم بتاؤ کہ اور کیا چکر ہو سکتا ہے؟''

مجھے شبہ تھا کہ دونیا نے فتح خان کو اس بریف کیس کے بارے میں بتایا تھا جو چینی حکومت کی امانت تھا۔ وہ بریف کیس پروفیسر نے مجھ سے ہتھیا لیا تھا اور اب وہ اس کے لاکر میں محفوظ تھا۔ فتح خان کو اس کی بھنک پڑ گئی تھی۔ اور وہ اس کے چکر میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''پروفیسر کا لاکر کس بینک میں ہے؟''

فتح خان نے خلاف توقع مجھے شرافت سے بینک کا نام اور برانچ کا پتا بتا دیا۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔ ''تم لوگوں نے لاکر سے چیزیں نکالنے کا کوئی نہ کوئی پروگرام تو بنایا ہوگا؟''

اس بار وہ چالاکی سے بولا۔ ''موقع ہی نہیں ملا...... شہلا کو دیکھ کر میں سب بھول گیا تھا۔''

فتح خان عورت کا شوقین تھا لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اس میں کھو کر اپنا مقصد بھول جائے۔ چاہے وہ شہلا جیسی حسین عورت ہی کیوں نہ ہو۔ فتح خان نے یقیناً کچھ نہ کچھ سوچا ہوگا۔ بہرحال میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ میں کھڑا ہوگیا۔ ''اب تم آرام کرو۔ اگرچہ تم نے بیتو کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی تمہیں یہاں کوئی اضافی تکلیف نہیں دی جائے گی۔''

''اس نے مجبور کیا تھا اس میں بہت انرجی ہے اس لیے وہ فساد کرتا رہتا تھا۔'' فتح خان نے وضاحت کی۔ ''ورنہ میرے کو اچھا نہیں لگتا کہ قید میں آدمی سے برا سلوک کرے۔''

میں اوپر آیا تو عبداللہ آگیا تھا۔ ''میں نے شیر خان کی لاش اس کے گاؤں بھجوا دی ہے۔''

''اس کے قاتل کی قسمت اچھی تھی وہ بال بال بچ گیا ورنہ میں اس کی لاش بھی وہیں چھوڑ کر آتا۔''

''کوئی بات نہیں جناب...... یار زندہ صحبت باقی۔ اسے بھی دیکھ لیں گے میری خواہش ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے جہنم رسید کروں۔''

''دبئی والوں کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' میں نے موضوع بدل دیا۔ عبداللہ چونکا۔

''ہاں یاد آیا، کل رات دبئی سے کال آئی تھی۔ پتا چلا ہے کہ ہاربر سے ایک لانچ ہائر کرائی گئی تھی جس میں دو مرد اور دو خواتین سمندر میں گئے تھے لیکن لانچ واپس نہیں آئی۔ دبئی پولیس کے پاس ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کی جا چکی ہے۔''

میرا دل دھڑکا تھا۔ ''کیا لانچ کے ساتھ کوئی ڈرائیور بھی تھا؟''

''نہیں لانچ خالی لی گئی تھی اور اس کا دو دن کا پیشگی کرایہ بھی دیا جا چکا تھا۔''

''کیا ان کے نام معلوم ہوئے ہیں؟''

''ہاں جس نے لانچ ہائر کی ہے اس کا نام سفیر شایان ہے۔''

اس بار میرا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ بالآخر میرے پیاروں کا کچھ سراغ لگا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بری خبر تھی کہ لانچ غائب تھی اور ان لوگوں کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ آخر وہ کہاں گئے تھے؟ ''لانچ کتنے دن پہلے ہائر کی گئی تھی؟''

''دو ہفتے ہوگئے ہیں۔'' عبداللہ نے بتایا۔

دو ہفتے پہلے وہ کہاں جانے کے لیے نکلے تھے۔ اگر ان کا مقصد سمندر کی سیر تھی تو ان کا کچھ نہ کچھ سراغ تو ملتا۔ دبئی کے آگے خلیج کا سمندر اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہاں جا کر کوئی بالکل ہی غائب جائے۔ لانچ اگر ڈوب بھی گئی ہوتو اس کا کچھ نہ کچھ سراغ تو ملتا۔ سمندر میں لاشیں غائب نہیں ہوتی ہیں۔ میرا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ میرے ساتھی یوں دنیا سے جا سکتے ہیں۔ وسیم اور سفیر دونوں آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ مونا اور سادھنا بھی مشکل حالات میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ ایسے لوگ حادثوں کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ یہ حادثوں سے بچ نکلتے ہیں۔ عبداللہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

''اللہ سے اچھی امید رکھیں شہباز صاحب۔''

''اس سے اچھی امید ہی ہے اور میرے ساتھی بھی باحوصلہ ہیں۔ وہ موت سے اتنی آسانی سے ہار ماننے

والے نہیں ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہ کسی وجہ سے اس طرح دبئی سے نکلنے پر مجبور ہوئے ہیں۔" عبداللہ نے سوچتے ہوئے کہا تو میں چونک گیا۔

"ہاں وجہ تو ہے، سادھنا کے پاس پاکستانی پاسپورٹ نہیں ہے اور وہ سیدھے راستے سے یہاں نہیں آ سکتی ہے۔"

"تب وہ کسی غیر قانونی طریقے سے یہاں آنے کے لیے روانہ ہوئے ہوں گے۔"

"لیکن ان کو اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟" مجھے غصہ آنے لگا۔ "جب میں نے ان کو آنے سے منع کیا تھا۔"

عبداللہ خاموش رہا پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا ابھی کچھ معلوم نہیں تھا اور میں نے فیصلہ بھی کر دیا کہ وہ کسی غیر قانونی راستے سے پاکستانی آنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ اگر وہ اس طریقے سے روانہ ہوئے تھے تب بھی ان کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور عبداللہ سے بیتو کے بارے میں پوچھا۔ "وہ کب تک اسپتال میں رہے گا۔"

"کچھ دیر میں میرا ایک آدمی وہاں پہنچ جائے گا اور بیتو آ جائے گا۔" عبداللہ نے جواب دیا۔

"کس کے ساتھ؟"

"ایاز کے ساتھ، اس کے آنے سے یہ بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے ورنہ جتنے لوگ ہیں اتنی گاڑیاں استعمال کرنا پڑتی ہیں آنے جانے کے لیے۔" عبداللہ نے بتایا۔ "بیتو کچھ دیر میں آ جائے گا۔"

"مجھے ایک اہم معاملے میں راجا صاحب سے بات کرنی ہے۔"

عبداللہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تو آپ کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"پوچھ نہیں رہا ہوں، مجھے نمبر چاہیے۔"

"اوہ میں بھول گیا تھا آپ کا موبائل مس ہو گیا ہے۔" اس نے ندامت سے کہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک موبائل فون برآمد کیا۔ "یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔ آپ کا پرانا نمبر بھی نکلوا دیا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "کتنے کا لیا ہے؟"

"شرمندہ مت کریں شہباز صاحب، یہ آپ کے دوست کی طرف سے تحفہ ہے۔"

"شکریہ دوست لیکن اس قسم کے تکلف مت کیا کرو۔"

یہ اس وقت کا جدید ترین کلر اسکرین موبائل تھا جس میں کیمرے کے علاوہ بھی کئی خصوصیات تھیں۔ میرے نمبر کی سم واپس مل گئی تھی لیکن میرے بہت سارے اہم نمبر غائب تھے۔ اب مجھے وہ پھر سے جمع کرنا تھے۔ میں نے راجا صاحب کے محل کا نمبر ملایا۔ نمبر مجھے عبداللہ نے بتایا تھا لیکن بیل جا رہی تھی اور کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ عبداللہ بولا۔ "میرا خیال ہے موسم کی خرابی سے محل کی فون لائن خراب ہو گئی ہے۔"

"پھر رابطے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"میرے ساتھ آیئے۔" اس نے کہا اور مجھے کوٹھی کے ایک کمرے میں لایا۔ اس میں دو عدد کمپیوٹر لگے تھے

اور اس کے متعلق کئی آلات تھے۔ ان میں ایک ٹیلی فون نما آلہ بھی تھا۔ عبداللہ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سیٹلائیٹ انٹرنیٹ کے ذریعے استعمال ہونے والا فون ہے۔ ایسا ہی ایک فون راجا صاحب کے محل میں ہے اگر رابطے کے دوسرے ذرائع ناکام ہو جائیں تب بھی یہ کام کرتا رہتا ہے۔''

''اسے صرف مخصوص حالات میں استعمال کیا جاتا ہوگا؟''

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ''جی...... کیونکہ اس سے کی جانی والی کال نہایت مہنگی پڑتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ صرف رابطے کی خاطر ایک کمرشل سیٹلائیٹ کا ایک دوطرفہ چینل کرائے پر حاصل کیا ہوا ہے۔''

عبداللہ نے کام ملائی اور حسبِ معمول پہلے بیگ سے رابطہ ہوا۔ ''میں عبداللہ بات کر رہا ہوں جناب...... شہباز صاحب راجا صاحب سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

دوسری طرف سے سن کر عبداللہ نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''کیا حال ہیں شہباز صاحب؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''راج صاحب سے کس سلسلے میں بات کرنی ہے؟''

میں نے سوچا اور اسے بتا دیا۔ ''مجھے اپنے ایک بہت قریبی عزیز کے لیے حکیم قادس کی خدمات چاہئیں۔''

بیگ نے کچھ دیر توقف کیا۔ ''آپ دس منٹ رکیں میں راجا صاحب سے رابطہ کراتا ہوں۔'' اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے بھی فون رکھ دیا۔ وہاں انٹرنیٹ دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ میں نے ایک کمپیوٹر کے سامنے کرسی سنبھال لی اور اپنا ای میل اکاؤنٹ چیک کیا۔ اس میں ڈھیر ساری میلز جمع ہو گئی تھیں اور ان میں سب سے زیادہ ایمن کی تھیں۔ میں نے اس کی تین دن پہلے بھی آنے والی میل چیک کی۔ اس نے لکھا تھا۔

''شہباز تم کہاں ہو، تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔ کیا تم مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔ میرے پاس ڈیوڈ شا سے متعلق کچھ معلومات ہیں۔''

نیچے اس نے اپنا نمبر دیا ہوا تھا۔ میں نے وہ نمبر اپنے موبائل میں نوٹ کر لیا۔ اس کے چند سابقہ میلز اسی طرح کی تھیں۔ اس دوران میں فون کی بیل بجی اور عبداللہ نے کال ریسیو کی اور فون میری طرف بڑھا دیا۔ دوسری طرف راجا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔ ''حکیم قادس کی مدد تمہیں کس سلسلے میں درکار ہے؟''

میں نے اسے عتیق کے بارے میں بتایا۔ ''وہ میرا عزیز بھی ہے اور میری بھانجی کا ہونے والا شوہر بھی ہے۔ ڈاکٹروں نے اسے جواب دے دیا۔''

''اگرچہ میں نے حکیم کو اب محل سے نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن معاملہ تمہارا ہے اس لیے میں اسے بھیج دیتا ہوں۔ البتہ اسے آنے میں وقت لگے گا۔ راستے بہت خراب ہیں۔''

''ہیلی کاپٹر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا کیونکہ مجھے امید نہیں تھی کہ راجا عمر دراز اتنی آسانی سے مان جائے گا۔ وہ حکیم قادس کو قیمتی متاعِ حیات کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی جب حکیم میرے علاج کی خاطر اسلام آباد آیا تھا تو ڈیوڈ شا اسے اغوا کر کے لے گیا تھا اور وہ خاصے عرصے غائب رہا تھا مجھے نہیں معلوم کہ راجا عمر دراز نے اسے دوبارہ کیسے حاصل کیا تھا۔

''ہیلی کاپٹر سے بہت آسانی ہو جائے گی بشرطیکہ موسم صاف ہو۔ میرے محل میں ہیلی کاپٹر اترنے کی جگہ ہے۔''

''ٹھیک ہے میں پروگرام طے کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔''

''خیال رکھنا جس کا علاج کرانا ہو اسے اسپتال سے دور رکھنا۔ حکیم دنیا میں سب سے زیادہ اسپتال اور ڈاکٹروں سے چڑتا ہے۔''

''یہ تو ہمارے اطبا کی خاص بات ہے۔'' میں ہنسا۔ ''اچھا ایک سوال کر سکتا ہوں۔''

''پوچھو برخوردار تمہیں کسی بھی معاملے میں مجھ سے کچھ بھی پوچھنے کی اجازت ہے؟'' اس نے فراخدلی سے کہا۔

''ڈیوڈ شا کے بارے میں آپ کی تازہ ترین معلومات کیا ہیں؟''

''دو ہفتے پہلے وہ انڈیا سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد وہ کہاں ہے مجھے علم نہیں ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی خیال آ گیا تھا۔ وہ پاکستان میں نہیں ہے لیکن اس کے چیلے سرگرم عمل ہیں۔''

''وہ اس کے چیلے نہیں ہیں۔ جب اس کا کام نکل جاتا ہے تو وہ پلٹ کر بھی انہیں نہیں پوچھے گا۔''

''مجھے حیرت ہے مرشد جیسا طاقتور اور بارسوخ شخص اس کے آگے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا۔''

''ہم اب بھی گوروں سے مرعوب ہیں۔'' راجا عمر دراز کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''یہی وجہ ہے مرشد اس کے سامنے دست بستہ رہتا تھا۔''

راجا عمر دراز نے درست کہا تھا۔ ہمارا حکمران طبقہ آج بھی ذہنی طور پر انگریزوں کا غلام ہے۔ اس کا مظاہرہ کچھ عرصے پہلے ملکہ برطانیہ کے دورہ پاکستان کے موقع پر کیا گیا تھا جب ہمارے حکمران بڑھ چڑھ کر ملکہ کے حضور عقیدت کا اظہار کر رہے تھے اور اسے آج بھی اپنا حکمران قرار دے رہے تھے۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد میں نے فون رکھ دیا اور عبداللہ سے کہا۔

''اس کوٹھی میں ایک جگہ مخصوص کر دو۔ عتیق یہیں آئے گا اور اس کا علاج ہوگا۔'' ابھی میری بات ختم ہوئی تھی اور عبداللہ کچھ کہنے جا رہا تھا کہ بیتو اندر آیا اور مجھ سے چمٹ گیا۔

''یہ کیا شوبی بھائی...... ہم آیا تو آپ غائب ہو گیا۔''

''بس اب تم مت غائب ہو جانا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ دو دن میں اس کی صحت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ آرام اور خوراک نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس نے شکوہ کیا۔

''ہم آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا پر عبداللہ بھائی نے کچھ کرنے ہی نہیں دیا۔''

''مثلاً کیا کرنا چاہتے تھے؟''

''ہم اس حرامی کے گھر میں گھس کر اسے گولی مار دینا چاہتا تھا۔'' اس کا اشارہ یقیناً مرشد کی طرف تھا۔

''یہ اتنا آسان نہیں ہے وہ بزدل سات پردوں میں بیٹھتا ہے۔''

''پردوں میں۔'' بیتو نے تعجب سے کہا۔ ''وہ تو یہاں کا عورت کرتا ہے بلکہ ہم نے دیکھا عورت بھی کم کرتا

ہے۔"

"مطلب یہ کہ محافظوں کے حصار میں ہوتا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔ "عبداللہ نے تمہیں ٹھیک روکا اور آئندہ بھی ایسی کوئی صورت حال پیش آئے تو تم وہی کرنا جو عبداللہ کہے۔"

"جیسا آپ کہو۔" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ پھر بولا۔ "وسیم بھائی اور سادھنا دیدی کا کچھ پتا چلا؟"

"ہاں بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ دبئی سے کشتی لے کر سمندر میں گئے تھے اور پھر کشتی واپس نہیں آئی۔ یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔"

"شاید وہ پاکستان آنے کے لیے نکلا ہو۔" بیتو نے امید سے کہا۔

"لیکن بہت دیر نہیں ہوگئی۔"

"ہم کو بھی تو انڈیا سے اِدھر آنے میں کتنا دیر لگا۔ اُدھر تو درمیان میں سمندر بھی ہے۔"

"انڈیا میں ہماری جان کو خطرہ تھا اور وہ دبئی میں سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔"

"پھر بھی وہ آجائے تو اچھا ہے ہم کو بہت یاد آتا ہے۔" بیتو بولا۔ پھر اسے خیال آیا۔ "آپ کیسے نکلا اس کے پاس سے؟"

عبداللہ کھڑا ہو گیا۔ "آپ لوگ گپ شپ کریں اور مجھے اجازت دیں کچھ کام نمٹا لوں۔"

"ضرور۔" میں نے کہا اور بیتو کو لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دوپہر کے کھانے میں کچھ وقت تھا۔ میں نے اسے اپنی روئیداد سنائی وہ زرین کے بارے میں سن کر چونکا اور پھر بولا۔

"شوبی بھائی کیا بات ہے آپ جہاں جاتا ہے کوئی نہ کوئی مظلوم لڑکی مل جاتا ہے۔" پھر اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ "دیدی، کاکی اور اب یہ زرین بی بی۔"

اصل تعداد اس سے زیادہ ہی تھی لیکن میں نے بیتو کو ٹوکا نہیں۔ "کیا کروں یار خود مل جاتی ہیں۔ اور مظلوم مردوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اصل میں، مَیں خود مظلوم ہوں اس لیے مجھے ملتے بھی مظلوم ہیں اب اس میں مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

"ہم جانتا ہے...... آپ اپنا گھر گیا تھا گھر والا کیسا ہے؟"

میں نے اسے گھر والوں کے بارے میں بتایا تو وہ پُر جوش ہو گیا۔ "شوبی بھائی ہم بھی ملے گا اُن سے۔"

"بس یار کچھ سکون مل جائے تو تمہیں لے کر چلتا ہوں یہاں تو میری جان کے دشمن آتے ہی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں ان سب کا ایسی کم تیسی ہوگا۔" بیتو۔ نے یقین سے کہا۔ "آپ کا دشمن کو ہمیشہ کتے کی موت مرتے دیکھا ہے۔"

"ہاں لیکن مرنے سے پہلے وہ مجھے نقصان تو کر جاتا ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ مجھے شاہد بھائی کی یاد آگئی۔ بیتو میرے چہرے سے سمجھ گیا تھا۔

"ہم کو آپ کے بھائی کا سن کر افسوس ہوا تھا۔"

''تمہیں کس نے بتایا؟''

''فتح خان نے......اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو آپ کے گھر بھیج دیا ہے پر ہم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے بہت ہنگامہ کیا اس پر وہ حرامی ہم کو بہت پٹوایا۔ دو بار ہم نے بھاگنے کا کوشش کیا پر پکڑا گیا۔''

''تمہارا بھاگنا ہی تو کام آیا۔'' میں نے کہا۔ ''جب تم گیلری سے کودنے کی کوشش کر رہے تھے تو عبداللہ کے آدمی نے تمہاری تصویریں لے لی تھیں اور ان سے مجھے معلوم ہوا کہ تم شہلا کی کوٹھی میں ہو ورنہ میں تو دوسرے چکر میں اس جگہ کی نگرانی کروا رہا تھا۔''

''جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے کیا کیا؟''

''میں نے اندر گھسنے کا فیصلہ کیا اور خدا کی مہربانی سے کامیاب بھی رہا لیکن فتح خان کی اندر موجودگی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔''

بیتو بولتے ہوئے جھجکا۔ ''وہ شہلا کے ساتھ ہی سوتا تھا۔''

''میں نے اسے وہیں سے پکڑا ہے۔''

بیتو نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''ہم کو معلوم نہیں تھا وہ کردار کا اتنا برا عورت نکلے گا۔''

''وہ مجبور تھی فتح خان کے ہاتھ وہ تصویریں آ گئی ہیں جو پروفیسر کے پاس تھیں ان کی وجہ سے شہلا اس کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔ وہ فتح خان کے سامنے بھی مجبور ہو گئی۔''

''پر اس کا ایسا تصویر تھا تب ہی تو وہ مجبور ہوا نا؟'' بیتو نے دبے انداز میں کہا۔

''ہاں یار انسان خطا کا پتلا ہے اس سے بھی غلطی ہوئی ہو گی۔'' میں نے موضوع بدل دیا۔ ''اسے چھوڑو یہ بتاؤ کہ تمہاری صحت اب کیسی ہے؟''

اس نے ہاتھ پھیلائے۔ ''آپ دیکھ رہا ہے بالکل ٹھیک ہے۔''

''ممکن ہے عتیق کو اسپتال سے یہاں منتقل کرنا پڑے اور اس دوران میں دشمنوں کی طرف سے مداخلت ہو سکتی ہے۔''

''ہم سب اس کی حفاظت کرے گا۔''

''دوسرے دشمنوں کو اس جگہ کا علم نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ ہم سے جو کہے گا ہم وہ کرے گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی ایاز کھانا لگنے کی اطلاع دینے آیا تھا۔ صبح کا ناشتہ ہضم ہو چکا تھا اس لیے ہم کھانے والے کمرے میں آ گئے۔ کھانے کے بعد بیتو سونے چلا گیا کیونکہ وہ رات سے جاگ رہا تھا۔ میں کمرے میں آ گیا میرا ارادہ اب ایمن کو کال کرنے کا تھا۔ مجھے تجسس تھا کہ اس کے پاس ڈیوڈ شا کے بارے میں کون سی اہم معلومات ہیں۔ کمرے میں ایک فون ایکسٹینشن تھا میں نے اس سے ہی کال کی۔ دوسری بیل پر ایمن نے فون اٹھا لیا اور وہ بولی تو اس کی آواز پُر جوش ہو رہی تھی۔ شاید اس نے پاکستان کا کوڈ دیکھ لیا تھا اور اسے امید تھی کہ یہ میری کال ہو گی۔

''ہیلو کون بول رہا ہے؟''

''شہباز بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ظالم آدمی...... تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں آتا۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''نہیں آتا تو ہے۔'' میں نے ندامت سے کہا کیونکہ یہ سچ نہیں تھا۔

''جھوٹ مت بولو...... جب تمہیں مجھ سے کوئی خاص بات کرنی ہوتب ہی تم رابطہ کرتے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے کیونکہ مجھے سکون کا سانس بہت کم ملتا ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے گھر کے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

اگرچہ میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن جب میں نے بتانا شروع کیا تو اس نے سوال کر کے خود داستان طویل کر لی تھی۔ شاہد بھائی کا سن کر اسے بھی افسوس ہوا تھا اور جب میں نے سویرا کا ذکر کیا تو اسے ذرا چپ لگی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے سویرا سے اس کا ذکر کیا تھا تو اسے بھی کچھ دیر کے لیے ایسی ہی چپ لگ گئی تھی۔ عورتوں کے اندر ایسی حِس ہوتی ہے جو ان کو بتا دیتی ہے کہ جسے وہ چاہتی ہیں اسے کوئی دوسری عورت بھی چاہتی ہے۔ سویرا اور میری بات الگ تھی۔ یہ وہ محبت تھی جسے ہم نے روزِ اول سے خالص محبت سمجھا تھا لیکن برسوں پہلے جب ایمن نے مجھ میں دلچسپی ظاہر کی تھی تو میں اسے اس کے معاشرے کی مخصوص ذہنیت سمجھا تھا جس میں جنس کی آزادی ہے۔ دوسرے میں نے کئی بار اس کی جان اور عزت دونوں کو بچایا تھا تو میں اس کے رویے کو شکر گزاری بھی سمجھ رہا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کے جذبے کو پہلے سے کہیں بڑھ کر پایا تھا۔ رفتہ رفتہ میں جان گیا تھا کہ وہ مخصوص مغربی محبت نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایمن اور سویرا دونوں ایک دوسرے سے کھٹکتی تھیں۔

''وہ کیسی ہے۔'' ایمن نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''ٹھیک ہے ان دنوں عدت گزار رہی ہے۔''

''عدت کیا ہوتی ہے؟''

میں نے اسے بتایا کہ عدت کیا ہوتی ہے۔ ''اس کے بعد عورت دوسری شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتی ہے۔''

اس کے لیے شاید اب سویرا کا ذکر ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا اس لیے اس نے موضوع بدل دیا۔ ''میں نے میل میں ڈیوڈ کا ذکر کیا تھا؟''

''ہاں تم اس کے بارے میں کیا بتانا چاہ رہی تھیں؟''

''نہیں پہلے تم بتاؤ کہ اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''دو ہفتے پہلے تک وہ انڈیا میں تھا اور اب شاید انگلینڈ میں ہے۔''

''درست ہے اور ان دنوں ہمارے خاندانی پیلس میں ہے۔ وہ پیلس جو اصل میں میرے باپ کا ہے۔''

''چیز کسی کی نہیں ہوتی ہے۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''آدمی صرف سمجھتا ہے کہ یہ چیز اس کی ہے۔''

''وہ بھی یہی سمجھتا ہے۔'' ایمن کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''اس کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا ہے شاید قدرت نے اسے سزا دی ہے۔''

''کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟''

''اس کا بایاں ہاتھ کلائی سے کہنی تک آبلوں سے بھر گیا ہے اور سنا ہے کوئی علاج اس پر کارگر نہیں ہو رہا ہے۔''

''کوئی بیماری ہے؟''

''شاید...... یا پھر اسے قدرت کی طرف سے سزا ملی ہے۔''

''حیرت ہے کیا تم لوگ ان چیزوں کو مانتے ہو؟''

''کیوں نہیں...... مزے کی بات بتاؤں میں نے مشرق اور افریقہ کا بڑا حصہ دیکھا ہوا ہے لیکن جتنی توہم پرستی مغرب میں اتنی شاید ہی ان پسماندہ سمجھے جانے والے علاقوں میں ہو۔''

''تمہیں کیسے علم ہوا؟''

''خاندان کی ایک تقریب میں ڈیوڈ شا بھی شریک تھا اور وہاں اس نے ایک لارڈ کو یہ بات بتائی تھی اتفاق سے میں ان دونوں کے پاس تھی اس لیے میں نے سن لیا۔ ڈیوڈ نے ہاتھ پر سفید کپڑا لپیٹ رکھا تھا اس لیے آبلے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ تکلیف میں ہے۔''

''ایمن وہ بہت عجیب اور پُر اسرار سا شخص ہے۔ میرا خیال ہے اس نے اپنی تکلیف چھپائی ہے ورنہ ایک آبلہ کم تکلیف نہیں دیتا ہے اور اس کا ہاتھ آبلوں سے بھرا ہوا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ بولی۔ ''پھر میں نے اس معاملے کی باقاعدہ کھوج کی تھی۔ یہ بیماری یا تکلیف وہ انڈیا سے لایا تھا لیکن انڈیا میں اسے یہ بیماری کس طرح لگی یہ میں نہیں جان سکی۔''

''شاید میں جان سکتا ہوں۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''وہ کیسے؟''

میں نے اسے راجا عمر دراز کی گمشدگی اور پھر اس کی اچانک واپسی کے بارے میں بتایا۔ ''خاص بات یہ ہے کہ حکیم قادس ڈیوڈ شا کے قبضے میں تھا اور وہ راجا عمر دراز کے ساتھ واپس آیا ہے۔''

''راجا نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا؟''

''نہیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے انڈیا میں کیا ہوا ہوگا؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''وہی جو تمہارا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''کھیلو نہیں کھل کر بتاؤ پھر میں تمہیں اپنا خیال بتاؤں گا۔''

''میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اس پُر اسرار وادی کی طرف گیا تھا جہاں کبھی میرا دادا ولیم شا گیا تھا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے دوسری طرف راجا عمر دراز بھی اس وادی کے عشق میں گرفتار ہے اور وہ کلکتہ سے

اچانک غائب ہو گیا تھا میرا خیال ہے وہ بھی وادی کی طرف گیا تھا یا اس کا کہیں ڈیوڈ شا سے ٹکراؤ ہوا اور راجا نے حکیم کو واپس حاصل کر لیا اور اسے لے کر پاکستان آ گیا۔"

"لیکن تم ڈیوڈ شا کے زخموں کو کیا کہو گے؟"

"اس بارے میں مجھے راجا عمر دراز ہی بتا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اس سے پوچھوں گا۔"

"یہ شخص مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔" ایمن خفا ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے جس کی وجہ سے اس کا باپ گم ہوا اور ابھی تک لاپتا تھا وہ اسے کیسے پسند کر سکتی تھی۔

"مجھے اندازہ ہے لیکن راجا عمر دراز اتنا برا آدمی نہیں ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن نہ جانے کیوں جب اس کا خیال آتا ہے تو مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔"

میں نے موضوع بدل دیا۔ "آج کل تم کیا کر رہی ہو؟"

"میں نے چینل چھوڑ کر ایک گروپ جوائن کر لیا ہے جو ماحول اور جانوروں کے بارے میں ڈاکومینٹریز بناتا ہے۔"

"تم کہیں گئیں نہیں۔"

"نہیں لیکن تم کہو تو پاکستان آ جاؤں۔"

"نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "ابھی یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔"

"کس کے ملک کے یا تمہارے؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"دونوں کے۔" میں نے جواب دیا۔ "اچھا میرا نمبر نوٹ کر لو۔"

اس نے میرا بتایا ہوا نمبر نوٹ کیا۔ "جس نمبر سے بات کر رہے ہو یہ کہاں ہے؟"

"یہ ایک فکسڈ فون ہے میرا نمبر موبائل ہے اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو یہ تمہیں ہمیشہ میرے پاس ملے گا۔"

کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ اگرچہ اس نے کوئی خاص اطلاع نہیں دی تھی۔ ڈیوڈ شا کا زخمی ہونا اتنا اہم نہیں تھا۔ بعض اوقات انسان کو ایسی بیماری ہو جاتی ہے جو آسانی سے ٹھیک نہیں ہو جاتی ہے لیکن اسے پُراسرار کہنا ٹھیک نہیں ہوتا ہے۔ ایمن کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ڈیوڈ شا کی بیماری کو کچھ ایسے معنوں میں لے رہی تھی۔ فی الحال کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے فون ڈائریکٹری لی اور اس سے شہلا رضوی کا نمبر تلاش کیا۔ اتفاق سے گھر کا نمبر اس کے نام ہی تھا۔ میں نے یہ نمبر اپنے موبائل سے ملایا۔ کچھ دیر بعد کسی عورت نے اٹھایا لیکن وہ شہلا نہیں تھی۔

"مجھے شہلا سے بات کرنی ہے۔"

"آپ کا نام کیا ہے؟" عورت نے پوچھا شاید وہ ملازمہ تھی۔

"شہباز ملک۔" میں نے سوچ کر نام بتا دیا۔ یقیناً اسے میرے بارے میں علم ہو گیا ہو گا۔ اس لیے میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شہلا کچھ دیر بعد لائن پر تھی۔

"تم شہباز ملک ہو؟"

"ہاں کیا تمہیں شک ہے؟" میں نے طنز کیا۔ "کہو تو [illegible] کہ میں [illegible] تمہیں کس حال میں بے ہوش کیا

تھا اور مجھے نہیں معلوم ہوش میں آنے کے بعد تم لباس پہن کر بھاگی تھیں یا ایسے ہی نکل گئی تھیں۔"

"او کے میں نے مان لیا۔" اس کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "کیوں فون کیا ہے؟"

"فتح خان میرے پاس ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"فتح کان کے پاس تمہارے کچھ فوٹو گرافس ہیں۔"

"وہ یقیناً تمہارے پاس آ گئے ہوں گے اور اب تم بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہو گے۔" اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"اول تو وہ ابھی فتح خان کے پاس ہیں اور دوسرے اگر وہ میرے پاس ہوتے تب بھی میں کم سے کم کسی عورت کو بلیک میل کرنے والا شخص نہیں ہوں وہ بھی اتنے گھٹیا انداز میں۔" میں نے رسانیت سے کہا۔

وہ کچھ دیر کو چپ ہوئی۔ "ٹھیک ہے پھر تم کیا چاہتے ہو؟"

"کیا تم وہ تصویریں حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"اس کا مطلب ہے تصویریں تمہارے پاس ہیں؟" اس نے فوراً کہا۔ "میرا کہنا ٹھیک تھا۔"

"تم جو چاہے سمجھتی رہو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "تم نے جواب نہیں دیا؟"

"کیوں نہیں حاصل کرنا چاہوں گی۔ ان کے لیے تو میں پروفیسر جیسے ذلیل شخص کے ہاتھوں میں کھلونا بنی رہی اور اس جنگلی نے مجھے حاصل کر لیا جسے میں اپنے پاس بھی دیکھنا پسند نہ کروں۔" اس کا اشارہ فتح خان کی طرف تھا۔ میں ہنسا۔

"ابھی تم اس جنگلی کی اصلیت سے واقف نہیں ہو یہ بہت اونچے درجے کا جرائم پیشہ ہے اور اس کے قبضے میں کروڑوں ڈالرز مالیت کے ہیرے ہیں۔"

"کروڑوں ڈالرز کے ہیرے؟" اس نے شک سے کہا۔ "دیکھنے میں تو وہ بالکل ایسا نہیں لگتا ہے۔"

"میں نے کہا نا اس کے ظاہر پر مت جاؤ۔ میرے سوال کا جواب اب نہیں ملا ہے۔"

"ہاں میں ہر قیمت پر وہ تصویریں چاہتی ہوں چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"میں تمہیں فتح خان سے تصویریں دلوا سکتا ہوں لیکن اس کے بدلے تمہیں میرا کام کرنا ہو گا۔"

"تم فتح خان کو درمیان کیوں لا رہے ہو اگر تم براہِ راست بھی کہو تو میں تمہاری بات مانوں گی۔" اس نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔

"اگر میرے پاس ہوتی تو میں شاید تم سے بات کرنے کے بجائے ان کو جلا دیتا لیکن یہ سچ ہے وہ فتح خان کے پاس ہیں۔ البتہ میں تمہارے لیے ان کو حاصل کر سکتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی پھر بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"جس بینک میں پروفیسر کا لاکر ہے تم وہاں لاکر توڑنے کا منصوبہ بنا رہی تھیں میں چاہتا ہوں تم اس منصوبے پر عمل کرو۔"

"کیوں؟"

''کیونکہ ایک تو میں ایسا چاہتا ہوں۔ اس میں میرا ایک بریف کیس ہے جو پروفیسر نے ہتھیا لیا تھا اور دوسرے ممکن ہے ان تصویروں کی اور کاپیاں یا نیگیٹوز ہوں۔ فتح خان کے پاس صرف تصویریں ہو سکتی ہیں۔''

''ہاں اس کے پاس صرف تصویریں تھیں۔'' اس کا لہجہ تشویش زدہ ہو گیا تھا۔

''تب ان کے نیگیٹو یقیناً پروفیسر نے لاکر میں رکھے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''شہلا یہ ہم دونوں کا مفاد ہے۔ کہ اس لاکر سے یہ چیزیں لازمی حاصل کرنی ہیں۔''

''لیکن یہ کام فتح خان کو کرنا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے تصویریں بھی دے دے گا اور میرے لیے لاکر کی چیزیں بھی حاصل کر لے گا۔''

''فتح خان انتہائی ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔ اس کے وعدے کا کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف مطلب براری کے لیے تمہاری کوٹھی میں براجمان تھا اور دوسری بات یہ کہ جب تمہیں یقین تھا کہ تمہاری تصویریں اصل میں فتح خان کے پاس ہیں تو تم کو لاکر سے کیوں دلچسپی تھی؟''

''وہ...... میں......'' وہ بولتے بولتے رکی۔ ''تم کو اس سے کیا؟''

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے تو اس سے کچھ نہیں ہے لیکن لگتا ہے تم پروفیسر کی سیٹ سنبھالنا چاہتیں ہو۔ ورنہ تمہیں اس بلیک میلنگ اسٹف سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اتنی رحم دل تم ہو نہیں کہ ان چیزوں کو ضائع کر دو یا ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دو۔''

''شہباز اگر فتح خان تمہارے قبضے میں ہے تو پلیز اس سے میری تصویریں نکلوا دو۔''

''یہ کام میں کرلوں گا لیکن تمہیں بینک والے معاملے میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

''میں کمزور عورت تمہارا کیا ساتھ دے سکتی ہوں۔''

''تمہاری کمزوری میں پروفیسر کے گھر میں دیکھ چکا ہوں جب تم نے بے دردی سے اسے قتل کیا تھا۔ شہلا اپنی مطلب براری کے لیے تم کچھ بھی کر سکتی ہو۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس کا لہجہ شکست خوردہ ہو گیا تھا۔

''تم نے اس دوران میں یقیناً بینک پر ہوم ورک کر لیا ہوگا مجھے وہ ہوم ورک چاہیے۔ ساتھ میں تمہاری عملی مدد بھی درکار ہوگی۔''

''میں عملی مدد نہیں کر سکتی۔''

''شہلا مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں تم جیسی عورتیں فتح خان کی محتاج نہیں ہوتی ہیں اور تم نے یقیناً اس سلسلے میں بھی بندوبست کر رکھا ہوگا۔ وہ تو درمیان میں فتح خان آگیا ورنہ اب تک تم کام دکھا چکی ہوتیں۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔'' وہ صاف مکر گئی۔

''فتح خان نے مجھے اس برانچ کا نام اور پتا بتا دیا ہے۔ اگر وہاں کوئی ایڈونچر ہوا تو پولیس سیدھے تمہارے گھر آئے گی۔''

وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی تھی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے کہا نا میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے اسے اسی لیے فون کیا تھا۔ کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں کوئی چکر چلا کر بینک لاکر تک رسائی حاصل کر لے گی اور اس کی ساری چیزیں اس کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ مجھے باقی چیزوں کی پروا نہیں تھی لیکن بریف کیس لازمی چاہیے تھا۔ وہ مجھے اپنے اوپر ایک ذمے داری محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اسے چین کی حکومت تک لازمی پہنچاؤں گا۔ فون بند کرنے سے پہلے میں نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔

''تم یہ مت سمجھنا کہ میری لاعلمی میں کچھ کرلوگی۔ یقین کرو ذراسی غلطی تمہیں اس شہر اور اس ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔''

''نہیں۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔ ''میں کچھ نہیں کروں گی۔''

یہ معاملہ اہم تھا لیکن فی الحال اس سے بھی زیادہ اہم معاملے میری توجہ کا مرکز تھا اس لیے میں نے اسے کچھ عرصے کے لیے سرد خانے میں ڈالنے کی خاطر شہلا کو فون کیا تھا۔ یہ جان کر کہ فتح خان اور اس کے توسط سے اس کی تصویریں میرے قبضے میں ہیں۔ اب وہ مجھے ڈبل کراس کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر میں نے زرین کو جا کر دیکھا وہ اب بھی سو رہی تھی شاید ڈاکٹر اس کی جسمانی توانائی بحال کرنے اور اس کی ذہنی حالت کو اعتدال پر رکھنے کے لیے اسے مسلسل خواب آور دوا دے رہے تھے اور میرے خیال میں یہ ایک لحاظ سے ٹھیک تھا۔ نرس پھر آگئی تھی۔ وہ زرین کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آگیا اور وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگالیا۔ شام کے قریب عبداللہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا۔

''شہباز صاحب کیا عتیق کو یہاں آج منتقل کرنا ہے؟''

''نہیں یہ کام اس کے باپ کی رضامندی اور حکیم قادس کے یہاں آنے کے بعد کیا جائے گا تاکہ اس کا فوری علاج شروع کیا جائے۔ تم نے دیکھا ہوگا وہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں ہے اور وہ زیادہ دیر ان مشینوں یا دیکھ بھال کے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''حکیم قادس کو لانے کے لیے ہیلی کاپٹر ہائر کرنا ہوگا؟''

''لازمی بات ہے۔ کیا تمہاری نظر میں کوئی ایسا ہیلی کاپٹر اور پائلٹ ہے جو اس موسم میں پہاڑوں میں جا سکے۔''

''بالکل ہے کیا اس سے بات کرلوں؟''

''کرلو لیکن وقت کا مت طے کرنا البتہ اسٹینڈ بائی پر رکھ لینا۔ اگر رات میں پرواز کرنے والا ہیلی کاپٹر ہو تو بہتر ہوگا۔''

''میں کوشش کرتا ہوں لیکن رات میں پرواز کرنے والا ہیلی کاپٹر مشکل سے ملے گا۔''

''ابھی تو تم دیکھو...... میں رفیق بھائی سے بات کرتا ہوں۔''

عبداللہ چلا گیا۔ میں رفیق بھائی کا نمبر ملانے لگا۔ مجھے خدشہ تھا کہ شاید وہ حکیم قادس کا تجربہ کرنے پر آمادہ نہ ہوں کیونکہ اس میں ناکامی کا نتیجہ جوان بیٹے سے محرومی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ بہرحال میں ان کے سامنے تجویز رکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

''رفیق بھائی میں شہباز بات کر رہا ہوں۔ ماہر نے عتیق کو دیکھ لیا؟''

''ہاں ابھی دیکھ کر گیا ہے۔'' انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''اس نے کیا کہا ہے؟''

''وہی جو مقامی ماہر کہہ رہے ہیں۔'' رفیق بھائی کا لہجہ بھرا گیا۔ ''کوئی امید نہیں ہے۔''

''رفیق بھائی ڈاکٹروں کے بس میں اتنا ہی کچھ ہے۔ میں نے آپ سے ایک حکیم کا ذکر کیا تھا۔''

''یہ ڈاکٹر کا کیس ہے کوئی حکیم اس معاملے میں کیا کر سکتا ہے۔'' انہوں نے بجھے انداز میں کہا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا وہ عام معالج نہیں ہے اس نے میرا وہ ہاتھ کٹنے سے بچا لیا تھا جسے ماہرین بھی بچانے سے معذرت کر چکے تھے اور اسے بچانے کے لیے تمام جتن کر لیے گئے تھے۔''

''ہاتھ کی بات الگ ہوتی ہے۔ یہاں اس کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''پلیز رفیق بھائی آپ ایک بار اسے آزما کر تو دیکھیں۔'' میں نے التجا کی۔ ''اس صورت میں کیا حرج ہے جب کہ ڈاکٹرز پہلے ہی ناامیدی ظاہر کر چکے ہیں۔''

''شہباز بے شک ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں لیکن ابھی عتیق میرے سامنے تو ہے مجھے ڈر ہے کسی تجربے میں یہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے نہ چھن جائے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''رفیق بھائی میرا ایمان ہے زندگی اور موت اور خدا کے ہاتھ میں ہے اور پچھلے کچھ عرصے سے میں ایسے حالات سے گزرا ہوں کہ اس پر ایمان اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اللہ کا نام لیں اور ہمت کریں۔ میں نے حکیم کے لیے بات کر لی ہے۔ کل صبح وہ ہیلی کاپٹر سے اسلام آباد آ سکتا ہے۔''

''کہاں سے آ سکتا ہے؟''

میں نے ان کو راجا عمر دراز کے بارے میں بتایا۔ ''وہ اس کا ذاتی معالج ہے۔''

''اگر وہ بھی کچھ نہ کر سکا تو......؟''

''رفیق بھائی میں آپ کو اتنا کمزور نہیں سمجھتا ہوں۔ آپ ہمت کریں آگے جو اللہ کی رضا ہو۔''

خلافِ توقع وہ جلد مان گئے۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شہباز زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنی سی کوشش کریں گے اور اس کی رضا میں راضی رہیں گے۔''

''رفیق بھائی میں انتظامات کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو کل تک وہ معالج یہاں ہوگا اور اس کی رضا ہو گی تو عتیق بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

رفیق بھائی سے بات کر کے میں نے عبداللہ کو بتایا۔ ''کیا حکیم قادس کل صبح تک آ سکتا ہے؟''

''میں نے ہیلی کاپٹر ہائر کر لیا ہے لیکن یہ صرف دن میں اور صاف موسم میں پرواز کر سکتا ہے۔ یہاں کسی نجی ایئر کلب میں ایسا ہیلی کاپٹر نہیں ہے جو رات اور خراب موسم میں بھی پرواز کر سکے۔''

''یعنی کل دن میں موسم کا ٹھیک ہونا بھی شرط ہے؟'' میں نے سوچ کر کہا۔

''جی...... ویسے پائلٹ ماہر آدمی ہے۔ پندرہ سال سے ناردرن ایریاز میں ٹورسٹ لے کر جا رہا ہے۔''

''یہ اچھا ہے وہ وہاں کے چپے چپے سے واقف ہوگا۔''

عبداللہ نے کوٹھی کا ایک بڑا کمرہ دکھایا جس میں عتیق کو رکھا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اسپتال جا کر دیکھے کہ عتیق کے ساتھ کون کون سی مشینیں آئیں گی اور ان کی سیٹنگ کیا کرنا ہوگا۔ تاکہ کل صبح اسے منتقل کرنے سے پہلے یہاں تمام انتظامات مکمل ہو جائیں۔ عبداللہ کے جانے کے بعد میں نے آپا کو کال کی۔ آپا موبائل استعمال کرنا نہیں جانتی تھیں ان کا موبائل ہمیشہ شمی کی تحویل میں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی کال اس نے ریسیو کی۔

"شیی کہاں غائب تھے آپ؟" وہ چیخ اٹھی تھی۔ "میں آپ کے نمبر پر مسلسل کال کر رہی تھی اور وہ بند جا رہا تھا۔"

"کیونکہ میں خود بند تھا۔" میں نے دل میں سوچا اور منہ سے بولا۔ "بس گڑیا کچھ مسئلے تھے۔"

"عتیق کیسا ہے؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "رفیق تاؤ سے پوچھو تو وہ کچھ بتاتے نہیں ہیں۔"

"اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "لیکن اب اس کا علاج ایک اچھا معالج کرے گا وہ کل صبح یہاں آ جائے گا اور عتیق کو اس کوٹھی میں منتقل کر دیا جائے گا جہاں میں مقیم ہوں۔"

"کیسا معالج ہے؟"

میں نے شمی کو حکیم قادس کے بارے میں بتایا تو وہ پُر جوش ہو گئی تھی۔ "شیی مجھے یقین ہے اس کے علاج سے عتیق بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے کہا۔ "آپا سے بات کراؤ۔"

آپا سے بات کر کے میں نے فون بند کر دیا۔ بیتو سو رہا تھا۔ اس لیے میں کوٹھی کے جمنازیم میں آ گیا اور ورزش کرنے لگا۔ زندگی ایک مسلسل بھاگ دوڑ میں گزر رہی تھی اور میرا جسم چست تھا لیکن باقاعدہ ورزش کی بات الگ ہوتی ہے اور جب میں نے دو گھنٹے جمنازیم میں گزارے تو مجھے اپنی کمزوریوں کا علم ہوا۔ خاص طور سے میرا اسٹیمنا بہت کم ہو گیا تھا۔ پہلے میں بہت دیر ورزش کر کے بھی نہیں تھکتا تھا لیکن اس دن ذرا دیر بعد ہانپنے لگتا تھا۔ نہا دھو کر میں فریش ہوا اور بیتو کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمبل میں لپٹا ہوا جاگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے برخوردار اٹھنے کا موڈ نہیں ہے؟"

"آپ بھی یہیں آ جاؤ۔" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے انٹرکام پر چائے اور کھانے کے لیے کچھ لانے کو کہا۔ "آپ کیا کرتا رہا؟"

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ میں کیا کرتا رہا تھا۔ شہلا کا سن کر اس نے سر ہلایا۔ "آپ نے ٹھیک کیا، ہم نے ایسا بدمعاش عورت زندگی میں نہیں دیکھا۔ وہ تو گھر میں بھی آدھے ادھورے کپڑے پہن کر گھومتا تھا اور اس کو بالکل شرم نہیں آتا تھا۔"

"مجھے خطرہ ہے کہ وہ خود لاکر میں رکھا سامان نکالنے کے لیے کوئی کارروائی نہ کر گزرے اور وہ بریف کیس ہمارے ہاتھ سے نکل جائے جو ہمارے پاس کسی کی امانت ہے۔"

"ایک بار وہ اور فتح خان ہمارا سامنے بات کر رہا تھا۔ شہلا اسے کہہ رہی تھی کہ اس نے پورا منصوبہ بنا لیا ہے اور وہ آرام سے بینک لاکر سے سامان نکال سکتے ہیں۔"

''فتح خان نے کیا جواب دیا؟''

بیتو نے سوچ کر کہا۔''اس نے اسے ٹال دیا تھا لیکن ہم کو لگ رہا ہے کہ فتح خان کو لاکر اور اس کے سامان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ شہلا کو بے وقوف بنا رہا تھا۔''

میں نے حیرت سے بیتو کو دیکھا۔''منے تم تو بہت ہوشیار ہو گئے ہو؟''

وہ مسکرایا۔''آپ کا بات سن کر ہم کو وسیم بھائی یاد آ گیا وہ بھی ہم کو منا کہتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم لوگوں کو اس حد تک سمجھنے لگے ہو۔''

''اس کا وجہ ہے شوبی بھائی، آپ کے ساتھ رہ کر ہم لوگوں کو سمجھنے لگا ہے اب ہم منا نہیں رہا ہے۔''

''وہ تو میں نیپال اور چین کے سفر کر دوران ہی سمجھ گیا تھا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو بیتو جھینپ گیا تھا۔ میں نے کامی کا حوالہ دیا تھا۔ بیتو اور کامی اس سفر میں ایک دوسرے کے بہت پاس آ گئے تھے۔ اگر چہ اسے مخصوص طرز کی محبت تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن وہ اسی قسم کی کوئی انسیت تھی جو قدرت نے ان کے دلوں میں ڈالی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دور ہو کر افسردہ اور پریشان تو نہیں تھے کیونکہ نوعمری کی محبت ایسی ہوتی ہے جب تک پاس ہوتے ہیں تو اس میں پہاڑی ندیوں جیسی شدت ہوتی ہے اور جب دور ہوئے تو سارا ابال ختم ہو جاتا ہے۔ بیتو اور کامی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ یادیں تو باقی ہوتی ہے۔

''شوبی بھائی آپ کا کیا خیال ہے وسیم بھائی لوگ کہاں سے پاکستان آ سکتا ہے؟'' بیتو نے سوال کیا اور میں چونک گیا تھا۔ میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اگر وہ دبئی سے قانونی طریقے سے نہیں آ سکتے تھے تو پھر وہ کون سا راستہ اختیار کرتے جہاں سے آسانی سے سرحد عبور کر کے پاکستان آ سکتے تھے۔ اس دوران میں منیر چائے اور دوسرے لوازمات لے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔''یار کوئی ایسا نقشہ ہے جس میں پاکستان اور اس کے آس پاس کے ممالک کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہو۔''

''ابھی لایا جناب۔'' اس نے کہا اور ایک منٹ بعد چکنے کاغذ پر پرنٹ ہوا ایک تفصیلی نقشہ لا دیا جو برصغیر، افغانستان، ایران اور مشرق وسطیٰ پر مشتمل تھا اس میں چھوٹے چھوٹے شہروں، ریل لائنوں اور سڑکوں کی وضاحت تھی۔ میں نے اسے بستر پر بچھایا۔ ہم اس پر جھک گئے۔ دبئی پاکستان سے زیادہ دور نہیں۔ یہ کراچی سے اتنا ہی دور جتنا لاہور ہے اور اسلام آباد اس سے زیادہ دور پڑتا ہے۔ گوادر تو بالکل برابر میں رکھا ہے۔ پھر میری توجہ ایران کے نقشے کی طرف چلی گئی۔ میں نے سمندر کے راستے سے دیکھا۔ دبئی سے صرف سو میل کے فاصلے پر ایران کا وہ جزیرہ ہے جس پر عرب ملکوں سے بنا کسی ویزے کے جا سکتے ہیں اور اس جزیرے پر یو اے ای کا کونسل خانہ بھی ہے جو ویزہ جاری کرتا ہے اس لیے جب کسی کو دبئی میں نئی ملازمت ملتی ہے یا اسے اپنا ویزہ بڑھوانا ہوتا ہے تو وہ واپس اپنے ملک جانے کے بجائے اس جزیرے تک چلا جاتا ہے اور وہاں سے ویزہ لگوا کر آرام سے واپس آ جاتا ہے۔ جزیرے کی آبادی کو مشترکہ طور پر دونوں ملکوں کی شہریت حاصل ہے۔

اگر میں وسیم اور سفیر کی جگہ ہوتا تو پاکستان کی حدود میں غیر قانونی داخلے کے لیے کیا کرتا؟ میں نے سوچا اور نقشے کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد سب سے آسان روٹ مجھے سمجھ میں آ گیا تھا۔ دبئی سے نکلنے کے بعد اس ایرانی جزیرے تک رسائی اصل کام تھا کیونکہ یہاں سے ہی غیر قانونی سفر کا آغاز ہو جاتا

تھا۔ اس کے بعد ایران تک رسائی ذرا مشکل کام تھا کیونکہ لازمی بات ہے۔ عرب ممالک سے قربت اور بین الاقوامی سیاسی حالات کے تناظر میں ایرانی اس سرحد کی سختی سے نگرانی کرتے ہوں گے اور یہاں سے کسی بھی شخص کے لیے بنا کاغذات کے ایران کی سرزمین پر داخل ہونا آسان نہیں ہوگا۔

بیتو غور سے نقشہ دیکھ رہا تھا اور ظاہر ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ ایک تو اسے پڑھنا نہیں آتا تھا دوسرے اسے دنیا کے بارے میں اتنا پتا نہیں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''شوبی بھائی دبئی کہاں ہے۔''

میں نے اسے نقشے پر انگلی رکھ کر سمجھایا۔ ''یہ دبئی ہے اور یہ اس کے برابر میں ایران ہے اور یہ ایران کے برابر میں پاکستان ہے۔''

بیتو نے غور کیا۔ ''یہ درمیان میں سمندر ہے۔''

''ہاں یہ سمندر ہے۔''

بیتو نے انگلی سے لکیر کھینچ کر کہا۔ ''ان کا پاکستان آنے کا سب سے آسان راستہ یہ ہے۔''

مجھے ایک بار پھر اس کی سمجھ بوجھ پر حیرت ہوئی کیونکہ اس نے ٹھیک وہی روٹ بتا دیا تھا جو میں نے سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جزیرے سے وہ بندر عباس جانے کے بجائے اس سے ذرا جنوب مشرق میں واقع میناب یا ایران کے بالکل جنوب میں واقع چھوٹے ساحلی شہر جاسک تک جانے کی کوشش کریں گے جو آبنائے ہرمز کے بالکل دہانے پر ہے لیکن یہ جزیرے سے خاصا دور ہے اور ان کو دوبارہ سمندر میں خاصا طویل سفر کرنا پڑتا اور سمندر کا سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خشکی پر چھپ کر اور تیزی سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے یہ دنیا کا مصروف ترین سمندر ہے اور یہاں انٹرپول سمیت بے شمار ممالک کی بحری ایجنسیاں سرگرم عمل رہتی ہیں اور ذرا سے شک پر جہازوں اور کشتیوں کو روک کر ان کی تلاشی لی جاتی ہے۔ اس لیے میرے حساب سے ان لوگوں کو میناب جانا چاہیے تھا یہ شہر یا قصبہ سمندر سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس کے بعد یہاں سے سب سے آسان روٹ صحرا سے گزرتے ہوئے زاہدان کے راستے پاکستانی بلوچستان میں تافتان کے راستے آسانی سے داخل ہوا جا سکتا تھا کیونکہ یہ علاقہ کھلا ہوا تھا۔ اب یہاں بھی سرحد پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں اور سکیورٹی فورسز کا پہرہ بھی سخت ہو گیا ہے لیکن اس وقت تافتان کھلی سرحد تھا اور سرحد کے دونوں طرف سے لوگ آسانی سے آتے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں گوادر کی سرحد دور بھی تھی اور وہاں سرحد عبور کرنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ پھر اس کے بعد کراچی تک اور اس سے آگے اسلام آباد تک کا سفر بھی بہت طویل ہو جاتا اس کے مقابلے میں تافتان سے کوئٹہ اور وہاں سے سڑک کے راستے اسلام آباد تک آنا مشکل نہیں تھا۔ میری معلومات کے مطابق وسیم کے اس علاقے میں اسمگلروں سے تعلقات بھی رہے ہیں جب وہ باقاعدہ ایک جرائم پیشہ گروپ چلا رہا تھا جو اپنی خدمات خطیر معاوضے کے عوض امرا کو فراہم کرتا تھا۔ میں نے بیتو کو بتایا کہ اس کا اندازہ تقریباً درست تھا اور اگر وہ غیر قانونی راستے سے سرحد پار کر کے ملک میں آنا چاہتے تھے تو اس کے لیے سب سے آسان راستہ یہی تھا۔

''لیکن وہ اپنے طور پر یہ کام نہیں کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''انہوں نے یقیناً کسی ایسے شخص کی خدمات حاصل کی ہوں گی جو یہ کام کرتا ہوگا یعنی انسانوں کو اسمگل کرنے کا اور اس کی مدد سے وہاں سے نکلے ہوں گے۔''

''تب وہ اب تک پہنچے کیوں نہیں؟'' بیتو نے پوچھا۔

یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ اگر سب ٹھیک رہا تھا تو ان کو سرحد عبور کر کے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں اس طرف آجانا چاہیے تھا جب کہ ان کو دبئی سے نکلے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ان کو غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ ایران میں کہیں پھنس گئے تھے کیونکہ دبئی سے ان کی کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سفیر نے یہ حماقت کیوں کی۔ وہ اور مونا اچھے بھلے دبئی میں موجود تھے اور اب ان کا داخلہ بھی وہاں ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو پولیس کو نہیں معلوم تھا لیکن جلد ان کے بارے میں علم ہو جاتا اور اس کے بعد ان کا ویزہ کینسل ہو جاتا اور آئندہ وہ اس پاسپورٹ پر دبئی میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ وسیم کے پاس بھی اس کا پاکستانی پاسپورٹ آجاتا اور سادھنا کو بھی کسی نہ کسی طرح پاکستان لایا جا سکتا تھا تو انہوں نے اتنا مشکل اور غیر قانونی طریقہ کیوں استعمال کیا تھا جس میں پکڑے جانے کے خطرات بھی بہت زیادہ تھے۔

بیتو کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''شوبی بھائی ایک بات کہے آپ ہم کو ڈانٹے گا تو نہیں۔''

''کہو۔'' میں نے کہا ویسے مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

''اگر ہم ایران جا کر ان کی مدد کرے۔ میرا مطلب ہے میں اور آپ جا کر۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے اسے نرمی سے کہا۔ ''اول تو یہ صرف ایک اندازہ ہے کہ وہ اس طرح سے دبئی سے نکلے ہوں گے۔ دوسرے اگر وہ اس طرح بھی نکلے ہیں تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت وہ کہاں ہیں۔ جہاں جا کر ہم ان کی مدد کر سکیں۔''

''گویا ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ہے۔''

''عملی طور پر کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے البتہ ان کے لیے دعا کی جا سکتی ہے کہ خدا ان کو ہر مشکل سے محفوظ رکھے۔''

''کیا خدا ہمارا دعا سنے گا؟''

''کیوں نہیں وہ سب کا خدا ہے اور سب کی سنتا ہے۔''

''تب ہمارا اس سے دعا ہے کہ وہ سب کو خیریت سے رکھے اور جلد ہمارے پاس لے آئے۔''

جب میں بیتو سے بات کر رہا تھا تو اوپر سے پُرسکون تھا لیکن اندر سے میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اگر وہ لوگ کسی مشکل میں نہیں تھے تو ان کو لازماً اب تک آجانا چاہیے تھا۔ ورنہ ہم سے رابطہ لازمی کرنا چاہیے تھا۔ سفیر اور وسیم کو بھی اندازہ تھا کہ اتنے دنوں سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میں اور بیتو ان کی طرف سے پریشان ہوں گے۔ اصل پریشانی یہ تھی کہ ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں تھے صرف اندازہ لگا سکتے تھے۔ ایک بے بسی کا احساس تھا۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کرنا کیا ہے۔ اس موقع پر سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

بیتو چائے اور کھانے کی چیزوں کے ساتھ مگن ہو گیا تھا میں نے صرف چائے لی تھی۔ عبداللہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ہیلی کاپٹر سمیت سارے انتظامات اُسے ہی کرنا تھے۔ اس نے مجھے ساتھ لے جانے سے بھی انکار کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ اب میری پاکستان میں موجودگی سب پر واضح ہو گئی تھی اور میں پولیس کو مطلوب تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ پولیس کے مخبر اسپتال کے آس پاس موجود ہوں اور مجھے دیکھتے ہی پولیس آن موجود ہو۔ عبداللہ کا کہنا تھا کہ اب مجھے اپنے حلیے میں تبدیلی لانی تھی۔ فی الحال مجھے باہر جانے سے گریز کرنا تھا۔

عبداللہ رات تک واپس آیا تھا اور اس نے آتے مجھے اطلاع کر دی تھی وہ نشست گاہ میں میرا منتظر تھا۔

''سب انتظام ہو گیا ہے۔ عتیق کے جسم سے تین اہم مشینیں منسلک ہیں۔ ایک جو اس کے دل کی دھڑکن کو چلا رہی ہے دوسری اسے سانس دلانے والی مشین اور تیسری اس کے گلے سے بلغم صاف کرنے والی مشین لگی ہے ان تینوں کا مستقل لگے رہنا لازمی ہے اس کے علاوہ اسے خون اور ڈرپ کے ذریعے طاقتور ادویات بھی دی جا رہی ہیں۔ جو اسے زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔''

''یہ سب یہاں آئیں گی؟''

''جی جناب یہ سب اس کے ساتھ ہی یہاں منتقل ہوں گی ان کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔''

''حکیم قادس کو کب لانا ہے؟''

''صبح سورج نکلتے ہی ہیلی کاپٹر روانہ ہو جائے گا کیونکہ صبح کے وقت میں ان علاقوں میں موسم بہتر ہوتا ہے۔ امید ہے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر کاپٹر حکیم کو لے کر واپس اسلام آباد آ جائے گا۔''

''یعنی کل صبح کے کسی وقت عتیق کو یہاں منتقل کیا جا سکتا ہے؟'' میں نے امید سے کہا۔

''ان شاء اللہ۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

''لیکن اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے مرشد کو خبردار کر دیا ہے اب اس کی طرف سے کسی حرکت کا مطلب کھُلی جنگ ہوگا لیکن وہ کتے کی دم ہے اور اس کی طرف سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''میں نے اس پہلو سے بھی سوچا ہے۔ عتیق کو لانے والی ایمبولینس میں دو گارڈز ہوں گے اور اس کے علاوہ ایک کار پیچھے ہوگی جس میں مجھ سمیت چار افراد ہوں گے۔ جب ہم اس علاقے میں آئیں گے تو کوشش ہو گی کہ کسی تعاقب کرنے والے کو ایمبولینس کے پیچھے نہ آنے دیں۔''

''اس جگہ کا خفیہ رہنا ضروری ہے۔''

''یہی میں نے بھی سوچا ہے۔''

''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''اس میں بہت خطرہ ہے۔''

''اگر میں بھیس بدل لوں؟''

''آپ کے دشمن بہت ہوشیار ہیں۔ وہ صرف شکل سے نہیں بلکہ بہت ساری چیزوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ہی ہیں۔ دوسرے مجھے شبہ ہے کہ جب میں عتیق کو لے کر آ رہا ہوں گا تو تعاقب کے ساتھ پولیس کی

مدد سے ہمیں روک کر تلاشی بھی لی جائے گی اور جس پر شبہ ہوا پولیس اسے گرفتار کر سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں پولیس کس کے پیچھے آ سکتی ہے۔ آپ کل والے ہنگامے کو بھولے ہوئے ہیں۔ اس میں دو افراد مارے گئے تھے اور اس وجہ سے پولیس بھی الرٹ ہو گی۔"

مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ اگر چہ میں اس کوٹھی میں بند نہیں تھا لیکن باہر نہ جانے کی اختیاری پابندی بھی مجھے کھل رہی تھی۔ میں شاید عتیق کو لانے کے بہانے باہر جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ میری موجودگی کئی طرح کے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ عبداللہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں نے صرف تجویز دی ہے ورنہ یہاں کے اصل انچارج آپ ہیں۔"

"میں جانتا ہوں یار لیکن تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے میرا تم لوگوں کے ساتھ ہونا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔"

"ویسے ایک صورت ہو سکتی ہے۔" اس نے سوچ کر کہا۔ "اگر آپ بائیک پر اور ہیلمٹ میں ہوں اور ہم سے دور ہوں تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" میں خوش ہو گیا۔ "عبداللہ یو آر گریٹ۔"

"ناچیز خادم ہے آپ کا۔" اس نے انکساری سے کہا۔

"بائیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل گیراج میں ایک بہترین ون ٹو فائیو کھڑی ہے۔"

"ٹھیک ہے تب ٹیسٹ میں ابھی کر لیتا ہوں۔" میں کھڑا ہو گیا۔

"چابی بائیک میں لگی ہے اور اس کے کاغذات ٹنکی کے نیچے والے خانے میں ہیں لیکن آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے اس لیے ذرا احتیاط کیجیے گا۔ اسلام آباد پولیس فوراً روک لیتی ہے۔"

"میں خیال رکھوں گا۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کر کمرے کی طرف آیا۔ مجھے جیکٹ لینی تھی کیونکہ باہر سردی بہت غضب کی تھی۔ زرین کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا سامنا اسے چیک کرنے والے ڈاکٹر سے ہو گیا۔ وہ اسے دیکھ کر نرس سمیت نکل رہا تھا۔ میں رک گیا۔

"اب طبیعت کیسی ہے اُس کی؟"

"شی اِز آل رائٹ اب ان کو علاج کی ضرورت نہیں ہے۔ دو دن دوا اور لینی ہے اور کچھ زخموں کو دوا لگانی ہو گی۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اب میری یا نرس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تھینک یو ڈاکٹر۔" میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کمرے میں داخل ہوا زرین سرہانے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ ایک دن کے بھرپور آرام، علاج اور خوراک نے اسے بالکل بدل دیا تھا۔ آج شاید اس نے غسل بھی کیا تھا کیونکہ اس کے براؤن بالوں میں ریشم جیسی چمک نظر آ رہی تھی۔ جلد چمک رہی تھی اور آنکھوں کی فسوں خیزی بھی لوٹ آئی تھی۔ نصف آستین سے جھانکتے بازو پھر سنہری رنگ کے ہو گئے تھے۔ میں ایک لمحے کو دنگ رہ گیا۔ وہ کہیں سے بھی وہ زرین نہیں لگ رہی تھی جیسے زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ مجھے یوں یک ٹک دیکھتے ہوئے اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

''یوں کیوں دیکھ رہے ہو؟''
میں چونکا اور جھینپ گیا لیکن میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں اس کے حسن کی سحر انگیزی سے نہیں بلکہ ایک دن میں اس کی رعنائی لوٹ آنے سے دم بخود تھا۔ میں اس کی گزشتہ حالت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا اور اگر وہ خود بھی بھول گئی تھی تو یہ اچھی بات تھی۔ ''آج تم الگ ہی لگ رہی ہو۔''
''ہاں کل کے مقابلے میں بہت مختلف ہوں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''لیکن تم صبح سے آئے نہیں۔''
''میں صبح اور پھر دوپہر میں آیا تھا لیکن دونوں بار تم سو رہی تھیں۔''
''ہاں یہ مجھے نیند کی دوا دے رہے تھے آج دوپہر میں لینے سے انکار کر دیا لیکن رات والی دوا کا کچھ اثر تھا۔''
میں کرسی لے کر بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''
''بہت اچھا۔'' اس نے کسمسا کر کہا۔ ''لیکن میں ایک ہی جگہ بند رہ کر تنگ آ گئی ہوں۔''
یہی حالت میری بھی تھی میں نے اس سے کہا۔ ''میں باہر جا رہا ہوں چلو گی؟''
وہ کھل اٹھی۔ ''ہاں چلوں گی لیکن میرے پاس کپڑے نہیں ہیں۔''
وہ بدستور پاجامے اور آدھی آستین کے کُرتے میں تھی جو مشکل سے اس کی رانوں تک آ رہا تھا۔ اصل میں یہ مریضوں کے لیے مخصوص لباس تھا۔ واقعی اسے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ''یار زنانہ کپڑے ہیں؟''
عبداللہ ہنسا۔ ''یہاں زنانہ کپڑوں کا کیا کام جناب۔''
''اچھا کوئی چھوٹے سائز کی جیکٹ ہو تو وہ لے آؤ۔ اور ہاں جوتے بھی۔''
''کہاں لاؤں؟''
''زرین والے کمرے میں۔''
عبداللہ خود نہیں آیا لیکن اس نے منیر سے یہ دونوں چیزیں بھیج دیں۔ جیکٹ چھوٹی تھی اس کے باوجود وہ زرین کو ڈھیلی تھی اور جوتے بھی آرام سے آ گئے تھے۔ وہ جھینپ رہی تھی۔ ''ایسے لے کر جاؤ گے مجھے باہر؟''
''تو کیا ہوا؟ کسی اچھے اسٹور سے کپڑے لے کر تم وہیں بدل لینا۔ تم رکو میں رقم لے آؤں۔''
میری ساری چیزیں معہ موبائل اور پرس مرشد کے گرگوں نے ہتھیا لیے تھے لیکن بابا کی دی ہوئی رقم کا پاؤچ اتفاق سے میں کمرے کی الماری میں چھوڑ گیا تھا اس لیے وہ رقم محفوظ تھی اور یہ کوئی چالیس ہزار روپے تھے۔ میں نے رقم نکالی اور واپس آیا تو زرین تیار تھی۔ مجھے اس کے اعصاب کی مضبوطی پر رشک آیا۔ ایک دن پہلے وہ اندوہناک صورت حال سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کا جسم ہی نہیں روح بھی زخمی ہوئی تھی لیکن اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ یہ تو یقینی تھا کہ وہ ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی لیکن یہ بات بھی بڑی تھی کہ وہ حوصلے سے دوبارہ نارمل زندگی کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا باہر چلنے پر آمادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔
ہم گیراج میں آئے۔ وہاں بائیک تھی لیکن ہیلمٹ ایک ہی تھا اور مجھے دو چاہیے تھے۔ دوسرا ہرفن مولا منیر

سے مل گیا۔ یہ زرین کے لیے تھا۔ وہ ہیلمٹ پہننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن میں نے اسے سمجھایا۔ ''یہ ضروری ہے باہر ہر نظر تم پر لازمی جائے گی اور اگر ان میں کوئی مرشد کا چیلا نکل آیا تو ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔''

''تو کیا ہوا تم ہونا میرے ساتھ۔'' اس نے ناز سے کہا۔

''اس سے بھی زیادہ ضروری بات ابھی بائیک پر سردی لگے گی۔ ہیلمٹ سے کسی حد بچاؤ گا۔''

اس دلیل نے اسے قائل کر لیا تھا۔ اس نے ہیلمٹ پہن لیا۔ نیچے سوائے جیکٹ کے سردی سے بچاؤ کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خواتین کی طرح دونوں پاؤں ایک طرف کر کے بیٹھے گی لیکن وہ مردوں والے انداز میں بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ کس طرح بیٹھ رہی ہو؟''

''میں تو اسی طرح بیٹھتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا اور دونوں ہاتھ میری کمر میں ڈال کر جکڑ لیے۔ ''اب چلو۔''

بادلِ ناخواستہ میں نے بائیک باہر نکالی۔ وہ جان بوجھ کر اس انداز میں مجھ سے چپک کر بیٹھی تھی کہ دو عدد جیکٹس کے باوجود اس کے وجود کی نرمی اور گدازیت مجھے محسوس ہو رہی تھی لیکن جیسے ہی بائیک گیٹ سے باہر آئی وہ لرز کر مجھ سے مزید چمٹ گئی تھی۔ ''میرے خدا اتنی سردی.....'' وہ چلائی۔

''تم ابھی تک اندر کے گرم ماحول میں رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ دیر برداشت کرو ابھی سب سے پہلے کہیں سے کپڑے لیتے ہیں۔''

وہ کانپ رہی تھی۔ جناح سپر مارکیٹ یہاں سے پاس ہی تھی اور وہاں ایسے گارمنٹس اسٹور تھے جہاں ہر قسم کے کپڑے مل سکتے تھے اور وہاں ٹرائی روم میں کپڑے بھی تبدیل کیے جا سکتے تھے۔ زرین سے سردی برداشت نہیں ہو رہی تھی حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ سرد علاقے سے آئی تھی لیکن بائیک پر سردی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی خود میرے ہاتھ بھی خالی ہونے کی وجہ سے سن ہوئے جا رہے تھے۔ دس منٹ بعد جناح سپر مارکیٹ آئی تو ہم دونوں کی جان میں جان آئی تھی میں نے بائیک ایک گارمنٹس اسٹور کے سامنے روکی اور زرین سے کہا۔

''ابھی ہیلمٹ مت اتارنا۔''

''تم کہو تب بھی نہ اتاروں۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا شہر میں بھی اتنی سردی ہو گی۔''

ہم جلدی سے اس اسٹور میں گھس گئے جو اندر سے گرم تھا اور یہاں زرین کی جان میں جان آئی تھی۔ اس نے ہیلمٹ اتار دیا اور پھر جب بال جھٹکے تو اسٹور میں موجود ہر فرد کی نظر اس کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ مضحکہ خیز حلیے میں بھی دلکش لگ رہی تھی۔ اسے لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ کسی قدر نروس نظر آنے لگی۔ میں اسے لے کر لیڈیز والے کارنر کی طرف بڑھا۔ وہاں صرف خواتین ملبوسات تھے۔ زرین خوش نظر آنے لگی اور فوراً ہی اس نے اپنے لیے کپڑے پسند کرنا شروع کر دیئے۔ سب سے پہلے اس نے ایک ویلوٹ وٹ منتخب کیا۔ یہ ڈبل شیٹ کا ٹراؤزر اور پورے آستین کا چھوٹا کرتہ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

''یہ لے لوں؟''

''تمہارا جو دل چاہے لے لو۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''تم اپنے لیے کپڑے لو جب تک میں ذرا اپنے لیے کچھ لے لوں۔''

وہاں سیلز گرل تھی لیکن زرین نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے کپڑے پہن کر بھی دیکھنا ہیں۔''

''یہاں ٹرائی روم ہے؟'' میں نے سیلز گرل سے پوچھا۔

''یس سر۔'' اس نے جواب دیا۔

''پلیز اسسٹ ہر۔'' میں نے کہا اور مردوں والے سیکشن کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں میں نے اپنے لیے کچھ گرم کپڑے لیے میرے پاس ان کی کمی تھی۔ جیکٹ صرف ایک تھی۔ پھر دستانے اور موزے لیے۔ یہ ساری چیزیں لے کر ان کو چیک کرایا اور ادائیگی کر کے خواتین والے حصے کی طرف آیا تو زرین نظر نہیں آئی میں نے سیلز گرل سے پوچھا تو اس نے کہا۔

''آپ کی مسز اندر ٹرائی روم میں ہیں۔''

ٹرائی روم پاس ہی تھا۔ میں انتظار کرنے لگا لیکن جب دس منٹ گزر گئے تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے فوراً کھول کر باہر جھانکا۔

''کیا سارے کپڑے چیک کر رہی ہو؟''

''ہاں تو اور کیا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بس میں ابھی آئی۔''

زرین نے تمام سوٹ سلے سلائے لیے تھے اور اب ایک ہوشیار خاتون کی طرح تمام کپڑوں کو پہن کر چیک کر رہی تھی کہ ان میں کوئی خامی یا فٹنس کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ میں سچ مچ کسی بے بس شوہر کی طرح اس کا انتظار کرنے لگا۔ سیلز گرل مسکرا رہی تھی اور اسے دکھانے کے لیے میں بھی جبراً مسکرا رہا تھا لیکن اسی دوران میں ایک ایسی شخصیت اندر آئی جسے دیکھ کر میں جبراً مسکرانا بھی بھول گیا تھا اور یہ شخصیت ایس آئی اکرم چشتی کی تھی۔ جب میں انڈیا نہیں گیا تھا تو اس سے کئی بار ٹکراؤ ہوا تھا۔ واپس آنے کے بعد بھی یہ ایک بار مجھے نظر آیا تھا اور میں چاہنے کے باوجود اس سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکا تھا۔ آج بھی یہ نہایت غلط موقع پر اندر آیا تھا اور میں کسی صورت اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگرچہ میرے پاس پستول تھا اور اس کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ اب کوئی ہتھیار پاس نہ ہو تو لگتا تھا کہ لباس میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میں نے آتے ہی عبداللہ سے ایک پستول لے لیا تھا اور وہ اس وقت بھی میرے پاس تھا۔ اگر میں نہتا بھی ہوتا تو اکرم چشتی جیسا شخص مجھے مجبور نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ پولیس والا تھا اور اس سے ٹکراؤ کے بعد میرا فرار مشکل ہو جاتا۔ اسلام آباد کی پولیس بہت مستعد تو نہیں ہے لیکن یہ پھر بھی پاکستان کے دوسرے صوبوں کی پولیس سے بہتر تھی اور اسے گاڑیاں اور آلات بھی بہتر ملے تھے۔ اکرم چشتی سیدھا بچوں والے سیکشن کی طرف گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ پولیس کی وردی میں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ بچوں کا سیکشن ذرا دور تھا اور وہاں سے اکرم مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اگر اس بد بخت کو کسی نسوانی ملبوس کی ضرورت پڑ جاتی تو وہ اس طرف کا رخ بھی کر سکتا تھا۔ اس صورت میں اس کا مجھ سے سامنا لازمی تھا۔ میں یہاں ہیلمٹ بھی نہیں پہن سکتا تھا کیونکہ اس طرح میں بلا وجہ مشکوک ہو جاتا۔ میں نے دوبارہ دروازے پر دستک دیا۔ اس بار زرین نے ذرا سا کھولا۔

''کیا بات ہے ایک منٹ کی تو بات ہے۔''

''تمہارا ایک منٹ مہنگا پڑ جائے گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''میرا ایک دشمن یہاں آ گیا ہے۔ اگر اس کی نظر پڑ گئی تو ہم پھنس جائیں گے۔''

زرین کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ ''مرشد کا آدمی ہے؟''

''یہی سمجھو...... پولیس کا بندہ ہے۔''

''بس میں آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر دیا لیکن اسی لمحے میں نے اوپر لگے ایک آئینے میں اکرم چشتی کو لیڈیز سیکشن کی طرف آتے دیکھا۔ میرے پاس صرف ایک لحہ تھا اور اگر اکرم اس طرف آ جاتا تو مجھے دیکھ لیتا یہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا اور دوسرے لمحے ٹرائی روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ زرین نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن میں نے بروقت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے تاثرات نارمل ہوئے تو میں نے ہاتھ ہٹا کر سرگوشی میں کہا۔

''وہ بدبخت اسی طرف آ گیا ہے۔''

ابھی تک میں نے اس کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا لیکن چند لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ کس حال میں تھی اور میں نے بوکھلا کر منہ پھیر لیا۔ ''سوری مجھے پتا نہیں تھا۔''

وہ بھی جھینپ کر جلدی سے جامے میں آنے لگی۔ جب اس نے شرٹ پہن لی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شرمائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''زرین میری بات سنو۔ شاید سیلز گرل نے مجھے اندر آتے نہیں دیکھا ورنہ وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتی۔ دوسرے وہ ہمیں میاں بیوی سمجھ رہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے اس بات کو نظر انداز کر دے۔''

''میاں بیوی۔'' وہ مزید شرما گئی۔

''میری بات پوری سنو۔ ممکن ہے اب وہ یہاں آئے اور مجھے نکالنا چاہے تو تم اسے روکو گی اور کہو گی کہ تم نے مجھے کسی معاملے میں مدد کے لیے اندر بلایا ہے۔''

''کس معاملے میں؟''

''بابا کسی بھی معاملے میں...... کچھ بھی کہہ دینا۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

میرا خدشہ فوراً ہی درست نکلا تھا۔ سیلز گرل نے محسوس کر لیا تھا کہ میں بھی ٹرائی روم میں ہوں اور وہ باہر تک آئی تھی اس نے دروازہ بجایا۔ زرین نے میرے اشارے پر ذرا سا دروازہ کھولا۔

''لیں؟''

''سوری میڈم...... آپ کے ہسبینڈ بھی اندر آ گئے ہیں یہ ہمارے رول کے خلاف ہے لیڈیز ٹرائی روم میں کوئی مرد نہیں جا سکتا۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا۔'' زرین نے گھبرائے بغیر سکون سے کہا۔ ''اصل میں مجھے ان کی مدد کی ضرورت تھی اس لیے میں نے ان کو اندر بلا لیا۔''

''ٹھیک ہے اب میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ پلیز ان کو باہر بھیج دیں۔''

میں نے زرین کو اشارہ کیا کہ وہ بحث جاری رکھے تا کہ اکرم چشتی یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس سیکشن میں تین سیلز گرل تھیں اور مجھے امید تھی کہ یہ کسٹمر کو چھوڑ کر نہیں آئی ہو گی۔ دوسرے وہ اتنی آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی کہ دروازے سے بالکل لگے کھڑے ہونے پر بھی مجھے مشکل سے سنائی دے رہی تھی۔ ''اس میں حرج ہی کیا ہے آخر یہ میرے شوہر ہیں اور بس ایک منٹ کی تو بات ہے۔''

سیلز گرل نے زیادہ بحث بھی مناسب نہیں سمجھی۔ بہر حال کسٹمر از آل ویز رائٹ والا محاورہ ان کو اچھی طرح یاد ہوتا ہے۔ ''او کے لیکن زیادہ دیر مت کیجئے گا۔''

ٹرائی روم میں چھت پر تیز روشنی والے بلب تھے اور تین طرف آئینے لگے تھے جب کہ چوتھی طرف ملبوسات ٹانگنے کے لیے ہینگرز لگے تھے۔ زرین نے وہی لباس پہن لیا تھا۔ جو اس نے سب سے پہلے لیا تھا۔ اس نے خود کو نمایاں کیا۔ ''کیسی لگ رہی ہوں؟''

میرے کان باہر کی آوازوں پر مرکوز تھے۔ اکرم چشتی کی منحوس آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ وہ کوئی اچھا نئے فیشن کا لباس لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے بے خیالی میں کہا۔ ''ہاں ٹھیک لگ رہی ہو۔''

وہ خفا ہو گئی۔ ''دیکھے بغیر ٹھیک لگ رہی ہوں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ عام طور سے ریڈی میڈ ملبوسات ہماری خواتین پر فٹ نہیں آتے کیونکہ وہ مروجہ فٹنس کے معیار سے کہیں دور جا چکی ہوتی ہیں اور پھر وہ یہ ملبوسات لے کر اپنے ٹیلرز کے پاس دوڑی جاتی ہیں جو ان کو پھر سے ان کے سائز کا کرتے ہیں لیکن زرین کا جسم متناسب اور معیار پر پورا اترتا تھا اس لیے اسے یہ لباس اس طرح فٹ آ گیا جیسے خاص طور سے اس کے لیے سلا گیا ہو۔ ٹراؤزر اور کرتہ اس کے تناسب پر ڈھل گیا تھا۔ کرتے کا گریبان کسی قدر کشادہ تھا اور اوپر سے ڈھلان بدن سنہری گھاٹی کو چھپا رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

''اچھی لگ رہی ہو لیکن اس میں تمہیں سردی نہ لگ جائے۔''

''ابھی مجھے سویٹر بھی لینا ہے۔'' اس نے کہا۔ اس نے چار پانچ سوٹ لیے تھے۔

''وہ بھی لے لینا اسے دفع ہو جانے دو اور تم مزید کپڑے لے لو۔''

''اتنے کافی ہیں۔'' اس نے شاپرز اٹھا کر دکھایا۔ ''میں زیادہ کپڑے نہیں رکھتی ہوں بس اچھے ہونے چاہئیں۔''

اس نے ایک شاپر ذرا پیچھے رکھا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا اس میں خواتین کی مخصوص اشیا تھیں۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ اکرم چشتی ابھی تک کاؤنٹر پر موجود تھا۔ سیلز گرل مضطرب تھی اور بار بار ٹرائی روم کی طرف دیکھ رہی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر صبر نہیں کرے گی اور پھر اس طرف آئے گی۔ دوسری طرف اکرم چشتی جانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر سیلز گرل دوبارہ اپنے کاؤنٹر سے نکلی اور ٹرائی روم کی طرف آنے لگی۔

''شامت آ رہی ہے۔'' میں نے زرین سے کہا۔ ''کیا تم کچھ کر نہیں سکتیں۔''

اس نے شوخی سے مجھے دیکھا۔ ''کر تو سکتی ہوں اگر تم کہو تو......''

اس کا انداز سراسر دال میں کالا والی بات تھی لیکن اس وقت میں پھنسا ہوا تھا اور مجھے اس مشکل سے نکلنا

تھا۔ ”تو کہہ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں باہر جا رہی ہوں اور جب جھگڑا ہو تو تم موقع پا کر نکل جانا۔“

”اور تم؟“

”میں آجاؤں گی۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے رقم دے کر جاؤ ابھی ادائیگی کرنی ہے۔“

میں نے اسے جیب میں موجود ساری رقم دیدی۔ اس نے رقم ایک شاپر میں ڈالی اور باہر نکل گئی۔ سیلز گرل راستے میں تھی اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”آپ کے ہسبنڈ ابھی تک باہر نہیں آئے۔“

”وہ میرا سامان لا رہے ہیں۔“ زرین کہتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے بعد زرین نے اکرم چشتی کی موجودگی سے انجان بنتے ہوئے سیلز گرل سے خواتین کے زیر جامے مانگے اور اس کے بعد اس نے اکرم چشتی کو دیکھنے کو ”دیکھ“ لیا اور اس نے چیخ ماری۔ ”یہ اکیلا آدمی یہاں خواتین کے سیکشن میں کیوں ہے؟“

”تمہیں کیا ہے؟“ اکرم چشتی نے حسبِ توقع اکھڑ لہجے میں کہا۔ زرین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی ہے اس حصے میں آتے ہوئے۔“

اکرم چشتی پکا پولیس والا تھا اور اس کی زبان بھی پولیس والی تھی۔ اس نے بدتمیزی کی اور زرین نے ہنگامہ کر دیا۔ اس دوران میں اکرم نے بعض ایسی باتیں کیں جو میری برداشت سے باہر تھیں اور چپکے سے باہر جاتے ہوئے میرا دل چاہا کہ پلٹ کر اس کی گردن مروڑ دوں لیکن اس صورت میں زرین کی کوشش ناکام ہو جاتی جو وہ صرف میری خاطر کر رہی تھی۔ اس نے اتنا ہنگامہ کر دیا تھا کہ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور میں با آسانی باہر نکل آیا۔ میں نے ہیلمٹ پہنا اور بائیک اسٹور کے سامنے سے ہٹا کر ذرا دور چلا گیا۔ شیشوں کے پیچھے سے میں دیکھ رہا تھا کہ اسٹور کا منیجر اور دوسرے ملازم جمع ہو گئے تھے اور وہ شاید اکرم چشتی کو اس کی بدزبانی پر سمجھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بکتا جھکتا اندر سے نکلا اور ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک ایس آئی کے ٹھاٹ دیکھنے والے تھے۔ اس کی تنخواہ میں بائیک بھی نہیں آسکتی تھی اور وہ دس لاکھ کی کار میں گھوم رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں اندر کی طرف لپکا۔

زرین سرخ چہرے کے ساتھ اپنے شاپرز لے کر باہر آرہی تھی اس نے میرے شاپرز بھی اٹھا لیے تھے جو میں اندر ہی بھول آیا تھا۔ میں نے اس سے شاپرز لے لیے۔ اس نے باہر آتے ہی شوخی سے کہا۔ ”کیسا رہا؟“

”شاندار...... تم نے اپنی اداکاری سے مجھے حیران کر دیا۔“

”تو اب کوئی انعام ملنا چاہیے۔“ اس کا لہجہ مزید شوخ ہو گیا تھا۔

”آؤ کچھ کھاتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ”لیکن نہیں پہلے تمہارے لیے جوتے اور اوپر پہننے کو کچھ لیتے ہیں۔“

ہم ایک شوز اسٹور میں داخل ہوئے اور یہاں زرین نے اپنے لیے کئی طرح کے جوتے اور گھر میں پہننے والی چپلیں لیں۔ اس کے بعد ایک گرم کپڑوں کی دکان سے اس نے سویٹر اور شال لی اور پھر ہم ایک اوپن ایئر ریستوران کے اندر والے حصے میں کیبن میں آبیٹھے۔ سامان خاصا ہو گیا تھا اس لیے ایک بیگ بھی لے لیا تھا جس

میں سب ڈال لیا۔ شاپنگ اور اکرم چشتی سے نہ ہونے والے ٹکراؤ کے بعد مجھے بھوک لگنے لگی تھی۔ زرین نے سموسہ اور چاٹ منگوائی۔ میں نے برگر اور فنگر فرائی منگوائے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ اکرم چشتی سے ناگوار ملاقات کے باوجود زرین بہت خوش تھی۔ اس نے اچھا وقت گزارا تھا اور شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح سے شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ مرشد نے اسے محبوبہ بنا کر رکھا ہوا لیکن عملاً اس کا مرتبہ کنیز والا تھا جسے جو دیا جاتا وہ بھیک اور عطیہ ہوتا۔ اس نے کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی جو اس جیسی حسین عورت کا حق ہوتا ہے۔ میں نے اسے برابر کا انسان سمجھتے ہوئے اس سے برتاؤ کیا۔ اس کے ناز اٹھائے اور اسے مان و مرتبہ دیا۔ یہ خوشی اس کے چہرے اور وجود سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''اتنی سردی ہے اور تم اتنی کھٹی چیزیں کھا رہی ہو بیمار مت ہو جانا۔''

''آج میں اتنی خوش ہوں کہ بیمار ہونا تو ایک طرف رہا میں اس کے لیے مرنے کو بھی تیار ہوں۔''

''ایسی باتیں مت کرو میرا دل کہتا ہے تم ابھی بہت عرصے تک زندہ رہو گی اور بہت ساری خوشیاں حاصل کرو گی۔''

اس نے چمکتی مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں کیونکہ تم ایک حوصلہ مند اور مضبوط لڑکی ہو۔''

''نہیں میں تم سے ملنے سے پہلے ایسی نہیں تھی جب تم سے ملی تو مجھے لگ رہا ہے میں بدل گئی ہوں۔''

''ایسا نہیں ہے کوئی کسی سے مل کر نہیں بدلتا ہے ہاں وہ خود کو دریافت کر لیتا ہے یہ سب تمہارے اندر پہلے سے موجود تھا بس تم نے اسے دریافت کر لیا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''شہباز ایک بات پوچھوں تم سے؟''

''ہاں پوچھو؟''

''میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟''

''تم...... تم مجھے اچھی لگتی ہو؟'' میں اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

''کتنی اچھی لگتی ہوں؟''

''اب یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ کتنی اچھی لگتی ہو۔''

میرے جواب سے وہ کچھ مایوس ہوئی تھی لیکن کچھ دیر بعد پھر چہکنے لگی۔ کھانے کے بعد اس نے آئس کریم منگوائی تھی۔ میں نے اپنے لیے کریم کافی منگوائی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم آئس کریم کیوں نہیں لے رہے؟''

''اتنی سردی میں آئس کریم...... نہیں بابا تم ہی کھاؤ۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب جلدی کرو رات خاصی ہو گئی ہے۔''

''کیوں کیا تم شادی شدہ ہو جو بیوی کا ڈر ہے؟'' وہ ہنسی۔

''یہ بات نہیں ہے میں وہ شامت کا مارا ہوں، حادثے جس کی تلاش میں رہتے ہیں ابھی تم نے دیکھا کہ کچھ دیر کے لیے باہر آئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دشمن سے سامنا ہو گیا وہ تو تمہاری حاضر دماغی کام آئی ورنہ شاید سب چھوڑ کر بھاگنا پڑتا۔''

وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''میں نے نہ جانے کیسے یہ سب کرلیا لیکن مجھے اس شخص سے بہت خوف آرہا تھا اس کی زبان ہی نہیں نظریں بھی بہت گندی تھیں۔''

''میں جانتا ہوں یہ واقعی بہت گھٹیا شخص ہے ایک بار تو میرا دل چاہا تھا کہ پلٹ کر آؤں اور اس کی گردن مروڑ دوں۔''

''تم نے اچھا کیا ورنہ میری کوشش رائیگاں جاتی اور ہم اتنا اچھا وقت نہیں گزار سکتے تھے۔'' اس نے آئس کریم ختم کرتے ہوئے کہا۔

میں نے بل کی رقم ادا کی اور ہم باہر آئے۔ میں احتیاطاً باہر آنے سے پہلے ہیلمٹ پہن لیتا تھا اور زرین نے باہر آنے کے بعد ہیلمٹ پہنا۔ بیگ کی وجہ سے آسانی ہوئی تھی ورنہ اتنا سامان بائیک پر لے جانا مسئلہ بن جاتا۔ زرین نے سویٹر پہن لیا تھا اس لیے اسے اب اتنی سردی نہیں لگنی چاہیے تھی اس کے باوجود وہ مجھ سے لگ کر بیٹھی تھی۔ میں ذرا آگے ہوا لیکن اس نے مزید سرک کر میری دور ہونے کی کوشش ناکام بنادی۔

''ذرا پیچھے ہوکر بیٹھو۔''

''پیچھے ہوکر سردی لگتی ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے بائیک آگے بڑھادی۔ اکرم چشتی سے ٹکراؤ کے بعد مجھے خطرہ تھا کہ کوئی اور مصیبت نہ نازل ہو جائے لیکن خیریت رہی اور ہم باعافیت کوٹھی پہنچ گئے۔ اندر جاتے ہوئے کوئی نہیں ملا تھا اس لیے میں نے اپنے کمرے کا رخ کرنا چاہا لیکن زرین نے روک لیا۔ ''اپنی چیزیں نہیں لوگے۔''

''وہ میں بعد میں لے لوں گا۔'' میں نے کہا میں اس وقت اس کے کمرے میں نہیں جانا چاہ رہا تھا۔

''آؤ نا۔'' اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام کر اندر کھینچ لیا۔ ''تم نے میری شاپنگ دیکھ لی اب اپنی بھی دکھاؤ۔''

''میں نے کیا شاپنگ کرنی ہے بس ضرورت کی چند چیزیں لی ہیں۔''

اس نے بیگ سے شاپرز نکال کر بیڈ پر پھیلا دیئے تھے۔ ''آؤ بیٹھو نا کھڑے کیوں ہو؟ میں چائے منگواتی ہوں۔'' اس نے کہا اور انٹرکام پر منیر کو چائے کا کہا وہ اس وقت بھی کام پر موجود تھا۔ چائے کا کہہ کر زرین نے میرے کپڑے نکال کر دیکھے۔ پھر اسے خیال آیا۔

''تم نے انعام والی بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کیسا انعام؟''

''جو میں نے تمہیں اس خبیث سے بچایا تھا۔''

''اس کا انعام تمہیں یوں مل گیا کہ تم نے باقی وقت کو انجوائے کیا۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم خود کو بچا رہے ہو؟''

میں مسکرایا۔ ''آج کے دور میں کون خود کو نہیں بچاتا ہے۔''

وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ ''مجھ سے بچ نہیں سکتے۔''

''یہ تو وقت بتائے گا۔'' میں نے کہا۔ اسی اثنا میں منیر نے دروازے پر دستک دی۔ زرین نے آنے کو کہا

اور وہ ٹرے سمیت اندر آیا۔ اس نے پوچھا۔

''آپ کھانا کب کھائیں گے؟''

''ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔'' زرین بولی۔

''میں سونے جا رہا ہوں کوئی اور چیز درکار ہے تو بتا دیں؟''

''نہیں اور کچھ نہیں چاہیے تم جا کر سو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

اندر خوشگوار گرمی تھی اس لیے زرین نے سویٹر اتار دیا۔ میں نے جلدی جلدی چائے پی اور اپنا سامان سمیت کر شاپرز میں ڈالا۔ اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے کیا کچھ دیر میرے پاس بیٹھ نہیں سکتے۔''

''بیٹھ تو سکتا ہوں لیکن زرین اس وقت رات ہو گئی ہے اور اب میرا جانا بہتر ہے۔''

''کیا تمہیں کسی کا خوف ہے؟''

''نہیں مجھے کسی کا خوف نہیں ہے لیکن کسی عورت کے کمرے میں کسی ایسے مرد کا دیر تک رہنا مناسب نہیں ہے جس سے اس کا کوئی رشتہ نہ ہو۔''

''میں تمہیں غیر نہیں سمجھتی۔'' اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا تھا۔

''تم ایسا سمجھتی ہو لیکن دوسرے تو ایسا نہیں سمجھتے ہیں اور زرین وہ میری بہت عزت کرتے ہیں۔''

وہ بجھ گئی تھی۔ ''تو تمہارے خیال میں، مَیں تمہاری عزت کے لیے خطرہ ہوں کیونکہ میں ایک بے آبرو عورت ہوں۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''نہیں میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ''تم نے مجھے ترس کھا کر پناہ دی ہے لیکن تمہارے نزدیک میں ایک بری عورت ہوں۔''

''تم اس وقت جذباتی ہو کر غلط سوچ رہی ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''کیا تم نے میرے یا کسی اور کے انداز میں اپنے لیے کوئی غلط بات محسوس کی ہے۔''

''نہیں۔'' اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

''تو اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اور سب تمہاری عزت کرتے ہیں اور جہاں تک عزت و آبرو کا تعلق ہے تو تم کسی طرح ان عورتوں سے کم نہیں ہو جو اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔''

''سچ میں تم ایسا سمجھتے ہو؟'' اس نے کسی قدر رشک سے کہا۔ ''جب کہ تم میرے بارے میں سب جانتے ہو؟''

''تمہارے بارے میں جانتا ہوں تب ہی تو تمہیں اچھا سمجھتا ہوں۔ اگر تم بری عورت ہوتیں تو مرشد کے ساتھ مزے کی زندگی چھوڑ کر نہ نکل آتیں جب کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مستقبل میں تم کس طرح زندگی گزارو گی اور تمہارا گزارا کیسے ہوگا؟''

''یہ تو مجھے اب بھی نہیں معلوم ہے۔'' وہ افسردہ ہو گئی۔ ''تم نے میرے لیے جو کیا ہے وہ تمہاری مہربانی

ہے لیکن تم ہمیشہ کے لیے میری ذمے داری تو نہیں اٹھا سکتے۔''

''اگر میرے حالات اجازت دیتے تو میں یہ کام بھی کر سکتا تھا۔'' میں کہتے ہوئے کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

''تم نے میرے لیے جتنا کیا ہے میں اس کے لیے بھی تمہاری شکر گزار ہوں۔''

''شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے جو کیا وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''شہباز ایک بات سچ سچ بتاؤ گے؟''

''میں کوشش کروں گا۔''

''کیا میرا ایک حسین عورت ہونا تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے؟''

''یہ تم نے کیسے محسوس کیا۔ تم ایک خوب صورت عورت ہو اور یہ بات کوئی مرد محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''تب تمہاری آنکھوں اور تمہارے انداز سے اس کا اظہار کیوں نہیں ہوتا؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''کیونکہ میرے نزدیک عورت کا حسن ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی کھلا ہوا پھول یا فطرت کا کوئی دل کش نظارا، اس سے ہٹ کر میں عورت کو صرف عورت سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتا ہوں جس نظر سے ایک مرد کسی عورت کو دیکھ سکتا ہے تو میں معذرت چاہوں گا میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا رخسار چھوا۔ ''شہباز تم بہت اچھے انسان ہو۔''

''شاید...... لیکن میں بننے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔''

''نہیں تم اچھے آدمی ہو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''ایک سوال اور کرنے کی اجازت ہے؟''

''پوچھو؟'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''لگتا ہے آج رات سوال جواب میں گزر جائے گی۔''

''نہیں بس یہ آخری سوال ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''شہباز کیا تم کسی کو چاہتے ہو؟''

''تمہیں یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

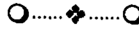
''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''پھر بتاتی ہوں۔''

''ہاں چاہتا ہوں۔'' میں نے سر ہلایا۔ ''اب تم بتاؤ کہ یہ سوال کیوں کیا؟''

''کیونکہ آج میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا۔'' اس نے رخ دوسری طرف کر لیا لیکن مجھ سے دور نہیں ہوئی تھی وہ اتنے پاس تھی اس کے بدن سے اٹھتی مسحور کن مہک محسوس کر رہا تھا۔ یہ اس کی اپنی خوشبو تھی کیونکہ اس نے کوئی پرفیوم استعمال نہیں کیا تھا۔ ''میں نے جب تمہارے پاس ہونے کی کوشش کی تمہارا ردِعمل ایسا ہو جاتا جیسے تم کوئی دیوار ہو جس سے میں سر ٹکرا سکتی ہوں لیکن اس میں کوئی راہ تلاش نہیں کر سکتی ہوں۔''

''تم نے درست اندازہ لگایا۔'' میں نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ ''تمہارے سحر میں کوئی کمی نہیں ہے۔''

میں اس کے پاس سے گزرا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر نکل کر میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا۔ ''لو میاں بنا کسی فتنے فساد کے ایک چکر سے بچ نکلے۔''



زرین کا رویہ شام سے بدلا ہوا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے وابستہ توقعات پوری نہ ہونے کے بعد ایک زبردست جذباتی بحران کا شکار ہونے والی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس بحران کا نتیجہ کیا نکلتا لیکن خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے میں نے اسے سخت رویے سے پیچھے نہیں دھکیلا بلکہ نرمی سے اپنی جگہ کھڑا رہا تھا اور بالآخر زرین خود سمجھ گئی کہ میں اس کی توقعات پوری نہیں کرسکتا ہوں۔ وہ اتنی ذہین بھی تھی کہ اس نے اس کی وجہ بھی جان لی اور میں وضاحتیں کرنے سے بچ گیا۔ میں کمرے میں آیا تو وہاں بیتو موجود تھا۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''شوبی بھائی کہاں سے آرہا ہے؟''

''مارکیٹ گیا تھا۔'' میں نے شاپرز ایک طرف رکھ دیئے۔''تم سوئے نہیں۔''

''سارا دن تو سوتا رہا تھا اب نیند اتنی جلدی کہاں آئے گا۔''

واش روم سے آکر میں نے جیکٹ اور جوتے اتارے اور بستر پر گر گیا۔''آپ نے کھانا بھی باہر کھایا ہے؟''

''ہاں برخوردار۔'' میں نے نرمی سے کہا۔''ویسے تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ میں کس کے ساتھ گیا تھا تو تمہیں معلوم ہے۔''

وہ کھسیا گیا۔''ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''اب مطلب جو بھی رہا ہو۔'' میں نے کمبل اوپر کھینچ لیا۔''تم شوق سے جاگتے رہو لیکن مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''صبح کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے تجسس سے کہا۔

''کل عتیق کو اسپتال سے یہاں لانا ہے اور کل ہی حکیم قادس آرہا ہے۔''

''ہاں ہم کو پتا ہے۔''

''یہ بات دشمن بھی جانتے ہیں اور وہ اس میں گڑبڑ کر سکتے ہیں اور اس کوٹھی کا پتا چلانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔ ان کو ان دونوں کاموں سے روکنا ہے۔''

''یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔''تب ہم کیا کرسکتا ہے؟''

''ہم یہ کرسکتا ہے کہ کل دشمن کو کوئی حرکت نہ کرنے دے۔''

''ہم اسپتال جائے گا؟''

میں سوچ چکا تھا۔''نہیں ہم اسپتال نہیں جائیں گے بلکہ دور رہ کر نگرانی کریں گے۔''

''وہ کیسے؟''

''بائیک پر۔'' میں نے کہا۔''اس لیے اب جا کر سو جاؤ تاکہ صبح تازہ دم ہو۔ پتا نہیں کس وقت میدانِ عمل میں آنا پڑے۔''

بیتو سر ہلاتا ہوا رخصت ہوگیا اور میں نے موبائل میں صبح سات بجے کا الارم لگایا کیونکہ گزشتہ کچھ عرصے

سے میری صرف سوچ کر وقت پر اٹھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی۔ حکیم قادس کی دی ہوئی دواؤں نے مجھ میں یہ صلاحیت بیدار کر دی تھی کہ میں اپنی مرضی سے سو جاتا تھا اور جو وقت سوچ کر سوتا تھا اس پر خود بہ خود میری آنکھ کھل جاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا اگر مقررہ وقت پر جاگنے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا تھا تو میں سوتا رہ جاتا تھا۔ صبح بھی الارم نے مجھے بیدار کیا تھا۔ میں نے اٹھ کر پہلے نماز پڑھی اور پھر باہر آیا۔ نشست گاہ میں عبداللہ موجود تھا۔ وہ کسی سے موبائل فون پر بات کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آٹھ بجے تک آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل رکھ دیا۔ ''صبح بخیر جناب۔''

''صبح بخیر...... کوئی تازہ احوال؟''

''ہیلی کاپٹر پائلٹ نے موسم کی رپورٹ لے لی ہے موسم کلیئر ہے ہم آٹھ بجے پرواز کر سکتے ہیں اور کوئی مسئلہ نہیں ہوا تو ساڑھے نو بجے تک واپس آ سکتے ہیں۔''

''یہاں کے انتظامات مکمل ہیں؟''

''بالکل مکمل ہیں۔ میں آتے ہی عتیق کو اسپتال سے لینے چلا جاؤں گا۔ آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں اور بیتو بائیک پر ہوں گے اور دور سے نگرانی کریں گے اگر کوئی راستے میں آیا اور اس نے روکنے یا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو ہم اسے روکیں گے۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' عبداللہ مطمئن ہو گیا۔ ''ورنہ میں اس طرف سے فکرمند تھا میرے پاس موجود آدمیوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ازخود کوئی فیصلہ کریں۔ اس کام کے لیے آپ سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہے۔''

''ہمیں اسلحہ اور مواصلاتی آلات درکار ہیں جو چھوٹے ہوں اور آپس میں سب کو منسلک رکھ سکیں۔''

''میرے پاس موجود ہیں۔ میں منیر سے کہہ دوں گا وہ آپ کو اسلحہ دکھا دے گا اور چھوٹے ہیڈ سیٹ دے گا۔ باقی آپ خود دیکھ لیجیے گا۔''

عبداللہ کو جلدی تھی کیونکہ اسے ہیلی کاپٹر کے ساتھ جانا تھا اس لیے وہ چلا گیا۔ بیتو اٹھ کر آ گیا تو ہم نے ناشتہ کیا اور ناشتے کے بعد منیر نے مجھے ایک کمرے میں موجود اسلحہ دکھایا۔ اس میں خودکار رائفلوں سمیت ہر قسم کا اسلحہ تھا لیکن میں نے پستول کے ساتھ دو عدد دھویں کے بم لے لیے تھے۔ منیر نے بتایا کہ یہ بنا کسی آواز کے پھٹتے ہیں اور چند سیکنڈ کے اندر دو سو مربع فٹ کی علاقے کو دھویں سے بھر دیتے ہیں۔ بیتو کو ان کا استعمال نہیں آتا تھا اس لیے اس کے لیے نہیں لیے۔ دو پستولوں کے دو دو اضافی میگزین بھی لیے تھے اور یہ سب ہمارے لباس میں آسانی سے آ سکتا تھا۔ فرار اور کسی کو تعاقب سے روکنے کے لیے دھویں کے بم بہترین ہتھیار تھے۔

زرین ابھی سو رہی تھی۔ میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ ''کون؟''

''شہباز۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب اٹھ جاؤ۔''

''اندر آ جاؤ۔'' وہ بولی۔

میں اندر داخل ہوا تو وہ بدستور کمبل میں روپوش تھی۔ اس کی نیند شاید پوری نہیں ہوئی تھی اس نے موندی

آنکھوں سے دیکھا۔ ''اتنی صبح کیوں اٹھ گئے؟''

''مجھے ایک کام سے جانا ہے۔''

وہ چونک گئی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''مرشد کے آدمیوں نے میرے گھر کی ایک گاڑی پر حملہ کیا تھا اس میں میرا ایک رشتے دار زخمی ہو گیا تھا۔ اسے آج اسپتال سے یہاں کوٹھی میں لانا ہے۔''

''وہ ٹھیک ہو گیا ہے؟''

''نہیں لیکن اس کا اب یہیں علاج ہوگا۔'' میں نے کہا۔

وہ اٹھ بیٹھی اور کمبل ایک طرف کر دیا۔ گزشتہ رات اس نے جو کپڑے لیے تھے ان میں ایک نائٹ سوٹ بھی تھا۔ لائنوں والا یہ سوٹ اسے اچھا لگا تھا اور اس وقت وہ یہی سوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''شہباز اگرچہ میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن مجھے اس طرح سے یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''تو تم کیا چاہتی ہو؟''

''تم نے کہا تھا مجھے جاب دلا دو گے تو یہیں جاب دلا دو میں کچھ بھی کر لوں گی۔ صفائی کا کام بھی کر لوں گی۔''

''تم اس لیے نہیں ہو کہ صفائی کے کام کرو اور یہاں تمام کام کرنے والے موجود ہیں۔''

''تب میں کیا کروں؟''

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''دیکھو شاید آج سے یہاں اچھے خاصے لوگ آ جائیں گے اور اس وقت کام کرنے والوں کی کمی ہوگی۔ تم یہاں نگرانی کر سکتی ہو۔ گھر کا نظام چلا سکتی ہو۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے تذبذب سے کہا۔

''دیکھو تمہیں ایک کوٹھی میں رہنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کا مکمل تجربہ ہے تم اس تجربے کو یہاں استعمال کر سکتی ہو۔ میں منیر سے کہتا ہوں فی الحال وہ بے چارہ اکیلا ہی سب کرتا ہے تم اس کے ساتھ شامل ہو جاؤ گی تو اس کا بوجھ بھی ہلکا ہوگا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ خوش ہو گئی۔ ''میں بھی مصروف ہو جاؤں گی۔''

''بس تو تم تیار ہو کر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ آج سے تمہاری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''وہ تو کل رات شروع ہو گیا تھا جب میں تمہارے ساتھ شاپنگ پر گئی تھی۔ اس وقت مجھے لگا جیسا میرا بھیانک ماضی صرف ایک خواب ہے۔''

''اسے خواب سمجھ کر ہی بھول جاؤ۔'' میں نے کہا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔ منیر نشست گاہ میں رات کے برتن سمیٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم یہاں سارے کام اکیلے کرتے ہو کوئی مددگار کیوں نہیں رکھ لیتے؟''

''آپ جانتے ہیں ہم کس قسم کے لوگ ہیں۔ ہم کسی کو راز دار نہیں بنا سکتے۔'' وہ بولا۔ ''کیا آپ کو میری خدمت میں کسی قسم کی کمی محسوس ہوئی ہے؟''

''نہیں یار تم تو مجھے جن لگتے ہو ہر کام کر رہے ہوتے ہو لیکن میرا خیال ہے تمہیں ایک مددگار کی ضرورت ہے۔''

''کیا آپ کسی کو رکھنا چاہتے ہیں۔''

''ان معنوں میں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ زرین ایک مظلوم عورت ہے اور وہ معمول کی زندگی کی طرف آنا چاہتی ہے اسے مصروفیت چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اس کوٹھی میں کچھ کام سنبھال لے لیکن اس کا درجہ ملازم کا نہیں ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا جناب۔'' منیر نے سر ہلایا۔ ''آپ کی ساتھی ہونے کی وجہ سے وہ قابلِ اعتماد بھی ہیں۔ میں اس معاملے کو دیکھ لوں گا۔''

''گڈ...... اب اسے دیکھنا تمہاری ذمے داری ہے۔''

کچھ دیر میں زرین بھی آ گئی۔ ناشتے کے لیے وہ براہِ راست کچن میں چلی گئی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے آ کر مجھے بتایا۔ ''میری منیر سے بات ہوگئی ہے۔ اب میں کچن کے معاملات دیکھوں گی اور گھر کا باقی کام وہ کرے گا۔''

''گڈ لیکن یاد رکھنا تم اس گھر میں ملازمہ نہیں ہو تمہارا درجہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔ شہباز مجھے حیرت ہوتی ہے یہ تمہاری کتنی عزت کرتے ہیں اور تمہارا ذکر یوں کرتے ہیں جیسے تم ان کے لیے کوئی بہت اعلیٰ وارفع ہستی ہو۔''

''بس یہ سب خدا کی مہربانی ہے۔ ورنہ بندہ کسی قابل نہیں ہے۔''

''خیر ایسا نہیں ہے تم میں کوئی بات ہے جو میں نے کسی دوسرے شخص میں محسوس نہیں کی ہے۔''

''اب تم مطمئن ہو؟''

''ہاں۔'' وہ بولی اور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد بیتو آ گیا۔

''شوبی بھائی ہم نے کب جانا ہے؟''

''جب عبداللہ حکیم قادس کو لے کر آ جائے گا۔'' میں نے گھڑی دیکھی ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ ''وہ بس آ رہا ہوگا۔''

بیتو ابھی سے تیار تھا۔ اس نے کپڑے اور جوتے بھی پہن لیے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کوئی موبائل نہیں ہے؟''

اس نے ایک موبائل دکھایا۔ ''عبداللہ بھائی نے دیا ہے۔''

''تم نے مجھے بتایا نہیں اور نہ ہی نمبر دیا۔'' میں نے اپنا موبائل نکال کر اس کا نمبر لیا۔ اسی لمحے گیٹ کی طرف سے ہارن کی آواز آئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا وین اندر آ رہی تھی اس کا مطلب تھا کہ عبداللہ آ گیا تھا۔ وہ عبداللہ ہی تھا اور اس کے ساتھ حکیم قادس اپنے مخصوص چغے میں اور اپنے دواؤں کے بکسے سمیت وین سے

اترا تھا۔ میں باہر آیا۔ حکیم قادس مجھے دیکھ کر چونکا اور اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔

''اس کا ترجمان کہاں ہے؟'' میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ''اس کی زبان کون سمجھے گا؟''

''میں راجا صاحب کی زبان جانتا ہوں۔'' عبداللہ مسکرایا۔

حکیم قادس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھا کہ وہ ہاتھ ملانے کو کہہ رہا ہے لیکن جب میں نے دایاں ہاتھ بڑھایا تو اس نے اسے نظر انداز کر کے اس نے میرا بایاں ہاتھ تھام لیا جس کا اس نے کبھی علاج کیا تھا۔ اس نے غور سے ہاتھ کا معائنہ کیا پھر اسے سونگھا اور مجھے شبہ ہوا کہ وہ ابھی اسے چکھ کر بھی دیکھے گا لیکن خیریت رہی اس نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اندر سے منیر برآمد ہوا اور اس نے حکیم قادس کا بکسا سنبھال لیا اور پھر اسے اندر لے گیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

''بس اب چلنے کی تیاری کرو۔''

عبداللہ نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔ ''کیا کر رہے ہو تیار ہو پوری طرح؟''

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ ''وہ آرہے ہیں آپ نے اپنی پسند کا اسلحہ لے لیا؟''

''ہاں میں اور بیتو پوری طرح تیار ہیں ہم بائیک پر ہوں گے اور تم لوگوں سے ذرا فاصلے پر رہیں گے لیکن ریڈیو نہیں ہیں۔''

''وہ میرے پاس ہیں۔'' اس نے وین سے ایک بیگ سے دو عدد ہیڈ سیٹ نکالے۔ یہ بہت مختصر سے ایف ایم بینڈ پر کام کرنے والے دوطرفہ ریڈیو تھے۔ ''ان کی رینج نصف کلومیٹرز ہے۔ ان کو کان پر پہن لیں اور جب بات کرنی ہو تو اس کے کان والے حصے پر ہاتھ رکھ لیجیے گا۔''

اس نے مجھے اور بیتو کو ہیڈ سیٹ دیئے اور ہم نے ان کو تجربہ کر کے بھی دیکھ لیا۔ یہ بہترین کام کر رہے تھے اور جب ہم نے اوپر ہیلمٹ پہنے تو ان کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اس دوران میں اندر سے عبداللہ کے تین افراد نکل آئے تھے ان میں سے دو تو وہی تھے جو اس کے ساتھ سرگودھا بھی آئے تھے ایک نیا تھا اور چوتھا فردایاز تھا۔ وین وہی ڈرائیو کرتا۔ ان کے آتے ہی ہم روانہ ہو گئے تھے۔ میں نے بائیک کچھ پیچھے رکھی تھی اور جب اسپتال کے پاس پہنچے تو میں جان بوجھ کر مزید پیچھے ہو گیا۔ میں نے اسپتال میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں باہر ہی رک گیا تھا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ تم مرشد کے آدمیوں کے لیے اجنبی ہو۔ تم سڑک کے دوسری طرف جاؤ اور دیکھو اگر کوئی مشکوک فرد یا گاڑی نظر آئے۔''

بیتو سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ اس نے ہیلمٹ اتار دیا تھا لیکن میں نے پہن کر رکھا کیونکہ میرے پاس بائیک تھی۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہے۔ ہیلمٹ کی وجہ سے ایک مجبوری تھی کہ میں اسے ہٹائے بغیر کسی سے کچھ نہیں سکتا تھا۔ البتہ مجھے دوسروں کی بات سنائی دیتی۔ مگر فی الحال سب خاموش تھے۔ عبداللہ وین سمیت اسپتال کی پارکنگ میں جا چکا تھا۔ مجھے رفیق بھائی کا خیال آیا لیکن میں نے رابطے سے گریز کیا اس وقت وہ عتیق کو اسپتال سے ریلیز کرا رہے ہوں گے۔

اسپتال کے باہر اس سڑک پر کئی گاڑیاں تھیں لیکن مجھے ان میں کوئی بھی گاڑی مشکوک نہیں لگی تھی۔ یہ سب

خالی تھیں اور نہ ہی آس پاس کوئی مشکوک فرد نظر آ رہا تھا۔ شاید سب سے مشکوک فرد میں خود ہی تھا جو بلا وجہ یہاں رکا ہوا تھا۔ کوئی دس منٹ بعد بیتو کی آواز آئی۔ ''شوبی بھائی اس طرف کوئی ایسا بندہ نہیں جس پر ہم شک کرے۔''

میں نے ہیلمٹ اتارا اور ہیڈ سیٹ پر ہاتھ رکھا۔ ''یہاں بھی کوئی نہیں ہے لیکن اپنا کام جاری رکھو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا۔ میں نے سوچا جب ہیلمٹ اتار ہی دیا ہے تو عبداللہ سے اندر کی سچویشن پوچھ لوں۔ ''عبداللہ اندر کیا ہو رہا ہے؟''

''عتیق کو ایمبولینس میں منتقل کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرا اندازہ ہے ہم دس منٹ میں یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ باہر کی کیا پوزیشن ہے؟''

''اگر دشمن نے یہاں گھات لگا رکھی ہے تب بھی نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سڑک کے دوسری طرف بھی کوئی نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے مطلع صاف ہے۔'' عبداللہ نے کہا اور میں نے ہیلمٹ پہن لیا۔ عبداللہ کے برعکس میری چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ مطلع اتنا صاف بھی نہیں ہے جتنا کہ نظر آ رہا ہے۔ جب عبداللہ کے بتائے ہوئے دس منٹ پورے ہونے کا وقت آیا تو میں نے ایک بار پھر ہیلمٹ اتار کر بیتو کو پکارا۔

''بیتو آ جاؤ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

فوراً ہی سڑک کے دوسری طرف سے بیتو نمودار ہوا اور وہ گرین بیلٹ عبور کرتا ہوا میری طرف آیا۔ اسی لمحے اسپتال کے گیٹ سے پہلے ایک بڑی ایمبولینس نمودار ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور بیتو اچک کر پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''عبداللہ سے پوچھو وہ کہاں ہے؟''

بیتو نے یہ سوال کیا تو اس کا جواب آیا۔ ''میں وین میں ہوں کیونکہ ایمبولینس میں ڈاکٹر ہے اور ایک نرس ہے۔ انہوں نے رفیق صاحب کے علاوہ کسی اور کو ایمبولینس میں جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

''او کے......لیکن ایمبولینس کے بالکل ساتھ رہنا۔''

''آپ بےفکر رہیں۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔''

ایمبولینس کی رفتار کچھ تیز ہوئی اور وہ ذیلی سڑکوں سے گزرتی مین روڈ پر آ گئی۔ یہ سڑک راولپنڈی کی حدود سے گھومتی ہوئی دوبارہ اسلام آباد کی حدود میں داخل ہوتی تھی۔ کچھ آگے جا کر یہ راولپنڈی کی حدود میں داخل ہو گئی۔ یہاں ایمبولینس کی رفتار مزید بڑھی تھی۔ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی وین ایمبولینس سے کوئی بیس گز پیچھے تھے۔ ایمبولینس کو اس سڑک پر سیدھے ہی جانا تھا۔ اس لیے میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آیا کہ ڈرائیور اسے کسی اور طرف موڑ سکتا ہے۔

اچانک ہی ایمبولینس ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی۔ ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بہت تیز ہو گئی تھی۔ میرے کان میں عبداللہ کی اضطراری آواز آئی۔ ''یہ کیا......ایمبولینس کو اس طرف نہیں جانا ہے۔''

خطرہ سامنے آتے ہی میں نے ہیلمٹ اتار کر پھینک دیا اور ہیڈ سیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔ ''ایمبولینس کو روکو میرا خیال ہے اسے ہائی جیک کر لیا ہے۔''

''یہی بات ہے۔'' عبداللہ نے کہا وین موڑ مڑ رہی تھی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اس کی رفتار

میں بھی تیزی آئی تھی۔ میں نے بائیک کو ایکسلریٹر دیا۔ اسی لمحے عبداللہ کے چلانے کی آواز آئی۔ ''لعنت ہو یہ کیا ہو رہا......'' اس کی آواز اچانک بند ہو گئی تھی۔

''عبداللہ کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں آیا اور اس کی وجہ بھی موڑ مڑتے ہی نظر آ گئی تھی۔ وین لڑکھڑا کر رک رہی تھی اور میری نظر سڑک پر بچھے ٹائر کلر پر گئی تھی۔ میں نے بے ساختہ بائیک کا رخ سڑک کے ساتھ کچے کی طرف کر دیا لیکن بدقسمتی سے ٹائر کلر کچے تک چلے گئے تھے اور بچاتے ہوئے بھی بائیک کا پہیہ اس پر چڑھ گیا۔ ایک دھماکے سے ٹائر پھٹا اور بائیک لڑھک گئی۔ بیتو پہلے ہی اچھل کر الگ ہو گیا تھا بائیک گری تو میں بھی الگ ہو گیا۔ چند قلابازیاں کھا کر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ وین رک گئی تھی اور ہماری نظروں کے سامنے ایمبولینس تیز رفتاری سے جا رہی تھی اور اسے روکنے کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ دشمن کامیاب رہا تھا اس نے وہاں سے وار کیا جہاں سے ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسی لمحے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔



میں نے شانے پر ہاتھ رکھنے والے کو دیکھا۔ وہ بیتو تھا اس نے تشویش سے کہا۔ ''شوبی بھائی آپ ٹھیک ہے؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے؟''

''نہیں بس کہنی چھل گیا ہے۔'' اس نے اپنی کہنی دیکھی جس سے خون جھلک آیا تھا۔ عبداللہ کے آدمی بہت تیزی سے حرکت میں آئے تھے اور وہ اس وقت وین کے ٹائر بدل رہے تھے۔ احتیاطاً انہوں نے چار اسپیئر ٹائرز رکھے تھے۔ عبداللہ ان کو کام کرتا چھوڑ کر میری طرف آیا۔ اس کے چہرے پر ندامت تھی۔ اس نے شرمندگی سے کہا۔

''شہباز صاحب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دشمن اس طرف سے وار کر جائے گا۔ میں نے ایمبولینس ڈرائیور کو چیک نہیں کیا تھا۔''

''اس طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''دشمن ہمیشہ اس جگہ سے وار کرتا ہے جہاں سے اس کی توقع نہیں ہوتی ہے۔''

''یہ مرشد علی کا کام ہے؟''

خود میرے ذہن میں بھی یہی نام تھا اور کسی حد تک اس کی وجہ بھی سمجھ آ رہی تھی۔ ورنہ مرشد نے عتیق کو مروانے کی کوشش کی تھی۔ اتنی مہارت سے یہ کام مرشد کے آدمیوں میں صرف ایک شخص کر سکتا تھا۔ یہ شخص فاضلی تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے بھی یہی شبہ ہے۔''

بیتو ٹائر کلر کا معائنہ کر رہا تھا یہ لوہے کا ایک کھل جانے والا پٹا تھا جس میں سامنے کی طرف نکلے لوہے کے نوکیلے دندانے تھے جن پر گاڑی کا ٹائر چڑھتا تو یہ اسے کاٹ کر رکھ دیتے تھے۔ اسے رول کر کے رکھا جاتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے تو اسے سڑک پر پھیلا دیتے ہیں۔ ''یہ کس نے ادھر ڈالا؟''

''یہ ایمبولینس گزرنے کے بعد کسی نے ڈالا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ ایمبولینس کے ٹائرز بھی پھٹ

جاتے۔“

”یہ ایمبولینس سے ہی پھینکا گیا ہے۔“ عبداللہ نے انکشاف کیا۔ ”یہ بنڈل کی طرح سڑک پر گرا اور خود بخود کھل کر سڑک پر پھیل گیا۔“

عبداللہ کی بات سن کر میں نے ٹائرکلر کا معائنہ کیا۔ اس میں ہر جوڑ پر ننھے اسپرنگ لگے تھے جیسے ہی اسے سڑک پر چھوڑا جاتا یہ خود بہ خود پھیل جاتا۔ اسی وجہ سے ایمبولینس والے کور کنے یا خود اسے سڑک پر بچھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے چلتی گاڑی سے اسے گرا دیا اور جب تک یہ پھیلتا وہ گزر گیا تھا۔ ایاز کو موقع ہی نہیں ملا کہ بریک لگا کر وین اس سے بچا لیتا۔ ٹائرکلر نے وین کے چاروں ٹائر تباہ کر دیئے تھے۔

”ایمبولینس میں کون کون تھا؟“

”ڈرائیور، رفیق صاحب، ایک نرس اور ایک ڈاکٹر۔“ عبداللہ نے بتایا۔ میں نے رفیق بھائی کا نمبر ملایا لیکن اس پر بیل جاتی رہی اور انہوں نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بے بس کر دیئے گئے تھے۔ ”رفیق بھائی کال ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔“ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”ہمیں ان کے پیچھے جانا ہوگا۔“

عبداللہ کے آدمیوں نے بہت تیزی سے کام کیا تھا لیکن پھر بھی انہیں دس منٹ لگ گئے تھے اور اتنی دیر میں ایمبولینس کا دور نکل جانا یقینی تھا۔ پھر بھی ہم وین ٹھیک ہوتے ہی اس طرف روانہ ہو گئے تھے۔ کچھ آگے گئے تو سڑک دو حصوں میں بٹ گئی ایک راستہ اسلام آباد کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راولپنڈی کے کسی نواحی حصے کی طرف جا رہا تھا اب سوال یہ تھا کہ ایمبولینس کس راستے پر گئی تھی۔ اس دوران میں عبداللہ نے کوٹھی پر کال کر کے منیر سے گاڑی منگوائی تھی۔ وہ اس سے رابطے میں تھا۔ مگر اسے آنے میں دیر لگتی۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”ہمیں ایک گاڑی کا بندوبست کرنا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے کہا۔

ہماری بائیک وہیں رہ گئی تھی۔ اس کا ٹائر مکمل طور پر ناکارہ ہو گیا تھا اور اسے اٹھا کر وین میں بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں نے ایاز کو گاڑی روکنے کو کہا اس نے گاڑی روکی تو میں اترتے ہوئے بولا۔ ”تم اسلام آباد کی طرف جاؤ میں اس راستے پر دیکھتا ہوں۔“

”لیکن آپ پیدل ہیں؟“ عبداللہ نے تشویش سے کہا۔

”تم فکر مت کرو میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔“

”ہم بھی آپ کے ساتھ جائے گا۔“ بیتو نیچے اتر آیا اور عبداللہ کے اشارے پر ایاز نے گاڑی چلا دی تھی۔ میں اور بیتو پیدل ہی نواحی علاقے کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔

”ہم پیدل کیسے تلاش کرے گا؟“ بیتو نے سوال کیا۔

”یہ تو میں نے سوچا نہیں۔“

”ایک بات کرے...... جو پہلا گاڑی نظر آئے اسے چھین لے، بعد میں واپس کر دے گا۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے لیکن اس سڑک پر کوئی گاڑی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔“ میں نے کہا ہی تھا کہ سامنے دور سے ایک بائیک نمودار ہوئی۔

''آ گیا گاڑی۔'' بیتو خوش ہو کر بولا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا۔
''یہ کیا کر رہے ہو وہ آدھے راستے سے بھاگ جائے گا۔'' میں نے اسے ٹوکا تو اس نے پستول والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ بائیک والا سکون سے چلا آ رہا تھا اور اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کی کیا کم بختی آنے والی ہے۔ جب وہ دس بارہ قدم دور رہ گیا تو ہم دونوں اچانک سڑک پر آ گئے اور پستول سامنے کر لیے اس نے پوری بریک لگائی اور بائیک ہم سے فٹ بھر دور رکی۔
''اندھے ہو دیکھ نہیں رہے.....'' اس نے جھنجھلا کر کہنا چاہا کہ اس کی نظر پستولوں پر پڑی اور اس کی گھگی بندھ گئی۔ ''تت.....تم ڈاکو ہو۔''
میں نے اسے کھینچ کر بائیک سے اتار لیا اور بیتو نے بائیک سنبھال لی۔ ''ہاں ہم ڈاکو ہیں اور ہمیں یہ بائیک چاہیے۔''
''لے لو بس مجھے مت مارنا۔'' اس نے التجا کی۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔''
''چلو بچوں کی وجہ سے تم کو چھوڑ دیتے ہیں بلکہ بائیک بھی مل جائے گی اگر تم کل شام کو اسی سڑک پر چکر لگاؤ تو۔'' میں نے بائیک اسٹارٹ کر کے کہا۔ میں بائیک آگے بڑھانے والا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں رک گیا اس کی طرف دیکھا تو وہ ڈر گیا کہ بائیک کے بعد اب پرس اور شاید موبائل کی بھی باری ہے۔
''تم نے آتے ہوئے کسی ایمبولینس کو جاتے ہوئے دیکھا ہے؟''
اس نے فوراً سر ہلایا۔ ''جی وہ آگے گئی تھی۔''
یہ سنتے ہی میں نے بائیک کو ایکسلریٹر دیا اس اطلاع نے مجھے پُر جوش کر دیا تھا۔ میں نے وقت پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا کیونکہ ایمبولینس کو گئے ہوئے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ہو سکتے تھے۔ میں نے بائیک کو اس کی اوقات سے زیادہ تیزی سے دوڑایا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی رفتار ستر میل سے اوپر چلی گئی تھی۔ یہ دس سال پرانی سی ڈی سیونٹی تھی مگر اس کا انجن اچھی حالت میں تھا۔ اس لیے دو افراد کو لے کر بھی وہ ستر سے اوپر کی اسپیڈ پر جا رہی تھی۔ بیتو نے مجھے کمر سے جکڑ لیا تھا۔ ابھی ہم دو کلومیٹر دور گئے ہوں گے کہ مجھے سڑک کے کنارے تین افراد دکھائی دیئے۔ دو کے سفید لباس دور سے نظر آ رہے تھے اور قریب آنے پر مجھے رفیق بھائی بھی نظر آ گئے۔ وہ اتنے بدحواس تھے کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں جب تک میں نے بائیک ان کے بالکل پاس لے جا کر نہیں روک دی۔ پھر وہ چونکے۔
''رفیق بھائی وہ کس طرف گئے ہیں۔'' میں نے ہیلمٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔
''شہباز۔'' وہ بے تابی سے بولے۔ ''وہ میرے بیٹے کو لے گئے ہیں۔''
''کون تھا؟''
''ایک لمبے بالوں والا ڈرائیور تھا اور اس نے اس جگہ ایمبولینس روک کر ایک اور آدمی کو بٹھایا اور ہمیں نیچے اتار دیا۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولے۔ ڈاکٹر اور نرس کی ابھی تک ہوائیاں اڑی ہوئی تھی۔
''اسی سڑک پر گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں اسی سڑک پر۔'' وہ بولے۔ ''دس منٹ ہوئے ہیں۔''

''بیتو تم یہیں رکو اور عبداللہ کو اطلاع کرو۔'' میں نے بیتو سے کہا اور اس کے اترتے ہی میں نے بائیک دوڑا دی تھی۔ ایمبولینس زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھی کیونکہ سڑک کی حالت اچھی نہیں تھی اور عتیق کے جسم سے مشینیں بھی منسلک تھیں لیکن وہ دشمن تھے ان کو عتیق کی جان سے زیادہ فکر اپنے بحفاظت نکل جانے کی ہوگی۔ میں سڑک کی خرابی کے باوجود بائیک کو پوری رفتار سے دوڑا رہا تھا اور میری بے قرار نگاہیں ایمبولینس کا کوئی نشان تلاش کر رہی تھیں لیکن دس منٹ اور کوئی بارہ تیرہ کلومیٹرز گزر جانے کے باوجود بھی مجھے ایمبولینس نظر نہیں آئی تھی۔ اس سڑک کے دائیں بائیں کئی سڑکیں نکلی تھیں لیکن میں اس امید پر اسی سڑک پر رہا کہ شاید ایمبولینس بھی یہیں ہو میری امید پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایمبولینس یقیناً کسی اور راستے سے نکل گئی تھی۔ رفیق بھائی نے لمبے بالوں والے کا حوالہ دے کر میرے شک کی تصدیق کر دی تھی یہ فاضلی کا کام تھا اور اس نے بہت چالاکی سے سارا منصوبہ بنایا تھا۔ اس میں فرار کے روٹ کا خاص خیال رکھا تھا۔ میں نے عبداللہ سے موبائل پر رابطہ کیا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں اسی سڑک پر آ رہا ہوں۔ منیر گاڑی لے آیا ہے۔''

''ایک بائیک میرے پاس ہے۔ کیا تمہارے آدمی اس علاقے سے واقف ہیں؟''

''کسی حد تک۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''میں اسی سڑک پر کوئی دس بارہ کلومیٹر آگے جا چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سائیں بائیں کم سے کم نصف درجن راستے نکل رہے ہیں۔''

''میں آ رہا ہوں آپ آخری ذیلی سڑک تک آ جائیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''منیر سے اس علاقے کا نقشہ بھی منگوایا ہے۔''

''رفیق بھائی واپس آ گئے؟''

''ہاں وہ مل گئے ہیں۔'' عبداللہ نے بتایا۔

میں واپس آیا اور دائیں طرف جانے والی پہلی سڑک کے ساتھ رک گیا۔ عبداللہ کوئی دس منٹ بعد نمودار ہوا۔ وہ کار میں تھا اور اس کے ساتھ منیر تھا۔ اس نے بتایا کہ دو ٹیمیں بنا دی تھیں جو اس علاقے میں ایمبولینس کو تلاش کر رہی تھی۔ ایک وہ تھا اور دوسرا میں ہمیں آگے کی سڑکوں پر تلاش کرنا تھا۔ عبداللہ کا ایک ساتھی میرے ساتھ آ گیا اور میں اسی سڑک پر آگے روانہ ہو گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد ایک چھوٹا سا اینٹیں بنانے والا بھٹا آیا اور اس کے پاس ایک ڈھابہ تھا۔ وہاں چار پانچ افراد بیٹھے تھے میں نے بائیک وہاں روکی۔

''تم لوگوں نے یہاں سے کوئی ایمبولینس گزرتے دیکھی ہے؟'' میں نے سلام کے بعد پوچھا۔

''نہیں جی یہاں سے کوئی ایمبولینس نہیں گزری ہے۔'' ڈھابے کے مالک نے بتایا۔ وہ گزشتہ ایک گھنٹے سے اسی جگہ تھا اور کوئی ایمبولینس یہاں سے گزرتی تو اسے لازمی نظر آتی۔ اس کے یقین سے بتانے پر میں لوٹ آیا اور عبداللہ کو کال کر کے اس راستے کے کلیئر ہونے کا بتایا۔ ایک گھنٹے میں ہم نے اس سڑک کے دائیں بائیں نکلنے والی تمام سڑکوں کو چھان مارا تھا لیکن ایمبولینس کا کہیں سراغ نہیں لگا تھا اور لگ بھی جاتا تو بے کار تھا کیونکہ وہ مرشد کے کسی خفیہ ٹھکانے پر پہنچ چکی ہوگی۔ ہم واپس مین روڈ کے سنگم پر پہنچے جہاں سے ایمبولینس نے غلط سمت

موڑ لیا تھا۔ رفیق بھائی نڈھال کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے آئے۔

''شہباز یہ کیا ہو رہا ہے۔''

''رفیق بھائی حوصلہ رکھیں میرے ساتھ آئیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے بیمار بیٹے کو اس طرح اغوا کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ چیخ اٹھے۔

''ان کا ایک ہی مقصد ہے مجھے اپنے سامنے مجبور کرنا اور عتیق کی بحفاظت واپسی کے لیے میں ان کا ہر مطالبہ ماننے کے لیے تیار رہوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن یہ مسئلہ یہاں سڑک پر حل نہیں ہوگا آیئے میرے ساتھ۔''

نصف گھنٹے بعد ہم کوٹھی میں تھے۔ عبداللہ اور اس کے ساتھی ابھی باہر تھے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ مرشد سے خود رابطہ نہیں کروں گا لیکن رفیق بھائی کی حالت دیکھ کر میں نے اپنا فیصلہ بدل لیا تھا۔ وہ اتنے مضطرب تھے کہ جیسے عتیق سے پہلے خود جان سے گزر جائیں گے۔ اس سے پہلے میں نے مشکل ترین مراحل میں بھی ان کو اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ میں نے مرشد کا مخصوص موبائل نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے اسی نستعلیق قسم کے ملازم نے کال ریسیو کی تھی۔

''مجھے مرشد سے بات کرنی ہے فوراً۔''

میرے لہجے میں کوئی ایسی چیز تھی کہ اس نے کچھ کہے بغیر موبائل مرشد کو دے دیا۔ ''شہباز ملک۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ''میں تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔''

''مرشد اس کا حساب بعد میں ہوگا کہ تم نے کیا کیا ہے ابھی مجھے عتیق واپس چاہیے۔''

''تمہیں معلوم ہوگا کہ عتیق کس قیمت پر مل سکتا ہے۔'' وہ بھی فضول بات کرنے کے بجائے موضوع پر آ گیا۔

''فتح خان تمہیں مل جائے گا لیکن عتیق کو تم فوراً واپس کرو اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس کی حالت بالکل ویسی ہی ہے اور وہ محفوظ ہے ہاں اگر مجھے فتح خان نہ ملا تو میں اس کی زندگی کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں۔''

''فتح خان تمہیں مل جائے گا۔''

''ملے گا نہیں اس کا ہاتھ کے ہاتھ تبادلہ ہوگا۔'' مرشد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''جلدی تمہیں ہے مجھے نہیں۔''

''مجھے منظور ہے یہ تبادلہ کہاں ہوگا؟'' میں نے بحث نہیں کی۔

''یہ میں تمہیں دس منٹ بعد اسی نمبر پر بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے رفیق بھائی کی طرف دیکھا۔

''آپ فکر نہ کریں عتیق اسی کے پاس ہے اور ٹھیک ہے۔''

''وہ دشمن ہے اور میرا بیٹا اسی کی وجہ سے اس حال کو پہنچا ہے۔''

''ہاں لیکن اس کا ایک آدمی میرے پاس ہے اور وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

دس منٹ امید و یاس کی کیفیت میں گزر گئے اور بیل بجی تو میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف مرشد ہی تھا۔ ''شہباز......تبادلہ میری بتائی جگہ پر ہوگا تمہارے ساتھ صرف فتح خان آئے گا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے انکار کیا۔ ''میرے ساتھ میرے محافظ بھی ہوں گے۔''

''او کے لیکن ایک گاڑی سے زیادہ نہ ہو۔'' خلاف توقع اس نے بحث کیے بغیر کہا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر جلد از جلد فتح خان کو اپنی تحویل میں دیکھنا چاہ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے شریف بھی چاہیے۔''

''تم انکار کر چکے ہو کہ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ ملک عارف کا بندہ ہے۔''

''میں اسی کے لیے مانگ رہا ہوں۔'' مرشد بولا۔ ''شریف کو دے کر میں اسے اپنا احسان مند بنا لوں گا۔''

''اگر میں شریف کو دینے سے انکار کروں تو؟''

''تو تبادلہ نہیں ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوچا مجھے شریف سے کچھ اگلوانے کی ضرورت نہیں تھی اور اگر میں اس سے کوئی بیان حاصل کر بھی لیتا تو اسے عدالت میں اس کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا تھا اس لیے اگر میں شریف کو اس کے حوالے کر بھی دیتا تو مجھے کوئی نقصان نہیں تھا جہاں تک شریف سے نمٹنے کا تعلق تھا تو ان سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے لیکن اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''دیر نہیں ہوگی۔ تم اسی موبائل کے ساتھ جی ٹی روڈ پر آ جاؤ اور میرے آدمی کہیں روک کر تبادلہ کر لیں گے۔''

''اگر سگنل پرابلم ہوا تو؟''

''نہیں ہوگا تب ہی تمہیں جی ٹی روڈ پر بلایا ہے۔''

''عتیق ایمبولینس میں ہے؟''

''ہاں اسے چھیڑنے سے گریز کیا ہے تمہارا ڈاکٹر اتار دیا تھا لیکن ایک ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔'' مرشد نے مجھے تسلی دی۔ ''بس اب تم نکل جاؤ جتنی جلدی کرو گے تمہارا آدمی اتنی جلدی واپس مل جائے گا۔''

میں نے کال کاٹ کر عبداللہ کو کال کی وہ واپس آ رہا تھا جب تک وہ کوٹھی میں داخل ہوتا میں نے اسے صورتِ حال بتا دی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ''شہباز صاحب آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہے؟''

''کیوں؟''

''کیونکہ آپ کو دیکھ کر وہ کوئی شرارت بھی کر سکتا ہے اور دوسرے آپ کو پولیس سے خطرہ ہے۔ آپ کی وجہ سے عتیق کی بحفاظت واپسی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''تب کون جائے گا؟''

''میں جاؤں گا۔'' عبداللہ نے نشست گاہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے کال کاٹ دی تھی۔

''میرے ساتھ تین ساتھی ہوں گے اور ہم فتح خان اور شریف کو لے جاسکتے ہیں۔ آپ نہیں ہوں گے اور اگر اس نے کوئی پلان بنایا بھی ہوگا تو وہ پھر اس پر عمل درآمد نہیں کرے گا۔''

عبداللہ کی بات درست تھی۔ ''لیکن جب تک یہ معاملہ نمٹ نہیں جائے گا میں ٹینشن میں رہوں گا۔''

''آپ بے فکر رہیں میں مستقل آپ سے رابطے میں رہوں گا۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''میں اپنے آدمیوں کو تیار کرتا ہوں اور ان دونوں کو اندر سے نکالتا ہوں۔''

''خیال رکھنا وہ اس جگہ کو دیکھنے نہ پائیں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔'' عبداللہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ رفیق بھائی کسی قدر تعجب سے دیکھ رہے تھے انہوں نے کہا۔

''شہباز تمہارے ساتھی عجیب سے ہیں میں نے کسی کو کسی کے لیے اتنا بے لوث کام کرتے نہیں دیکھا ہے۔''

''رفیق بھائی یہ سب اللہ کی مہربانی ہے ورنہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں بھی ان کے لیے اتنا ہی بے لوث ہوں۔''

''میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔'' انہوں نے سر ہلایا۔ ''پھر بھی آج کل ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں جو کسی دوسرے کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال دیں۔''

''مجھے خوش قسمتی سے ایسے لوگ ملتے رہے ہیں شاید اس لیے کہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو میری جان لینا چاہتے ہیں۔''

میں جانے سے پہلے ایک بار فتح خان سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نیچے تہہ خانے میں آیا جہاں عبداللہ کے آدمی فتح خان اور شریف کو ان کے پنجروں سے نکال کر ہتھکڑیاں پہنا چکے تھے اور ان کی آنکھوں، چہروں پر غلاف چڑھا دیے گئے تھے۔ میں نے اپنی موجودگی ظاہر کیے بغیر عبداللہ کو اشارہ کیا کہ وہ شریف کو یہاں سے لے جائے۔ عبداللہ نے سر ہلایا اور شریف کو لے کر اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے چلا گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے کہا۔ ''فتح خان تم جانتے ہو تم کو کہاں بھیجا جا رہا ہے؟''

''شہباز خانا۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''ہم کو ادھر تمہارا موجودگی محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں میرے کو لگ رہا ہے کوئی خاص بات ہے تم مجھے مرشد کے حوالے کرنے جا رہا ہے؟''

میں اس کے اندازے پر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے بالکل ٹھیک خبردار کیا تھا۔ ''ہاں میں تمہیں اس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔''

وہ چونکا۔ ''تم مجبور ہے؟''

''مرشد نے اس لڑکے کو اٹھوا لیا ہے جو اسپتال میں تھا اور اس کی حالت خراب ہے۔''

''وہ ایسا ہی آدمی ہے اس سے کچھ بھی توقع کیا جا سکتا ہے۔'' فتح خان نے کہا۔ ''کیا اس نے لڑکے کے بدلے میرا اور شریف کا مطالبہ کیا ہے؟''

''ہاں اس نے تمہیں اور شریف کو مانگا ہے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہیں اسے دینے پر مجبو

ہوں۔''

''تم مجھے اپنا قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''نہیں میں محسوس کر رہا ہوں مرشد کی نیت تمہارے بارے میں ٹھیک نہیں ہے۔''

''نہ ہو۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔ ''ہم اس سے نمٹنا جانتا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ فتح خان بہر صورت میری قید سے نکلنے پر خوش تھا اور وہ مرشد کو اپنے لیے زیادہ خطرناک تصور نہیں کر رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ بیٹا جب تم اس کے ہاتھ آؤ گے تو تمہیں پتا چلے گا۔ فتح خان بھی میرا دشمن تھا لیکن مرشد کے مقابلے میں اس کی دشمنی کی نوعیت بہت ہلکی اور مختلف تھی۔ اس لیے اسے مرشد کے حوالے کرتے ہوئے میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں اسے اوپر لایا۔ منہ پر غلاف ہونے کے سبب وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کہاں سے گزر رہا ہے۔ یہ غلاف اس کوٹھی سے باہر جانے کے بعد بھی اس کے منہ سے نہیں اتارا جاتا۔ اسے کوٹھی کے پورچ میں لا کر میں نے عبداللہ کے حوالے کیا اور بولا۔

''اس کا خاص خیال رکھنا یہ فرار ہونے کا ماہر ہے کئی بار میری قید سے پہلے بھی فرار ہو چکا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب صرف اس کی روح ہی ہماری قید سے نکل سکتی ہے۔''

''فتح خان میری خواہش ہے تم مرشد کی قید میں نہ رہو لیکن اگر ایسا ہوا اور تمہیں کوئی تکلیف برداشت کرنا پڑی تو تم مجھے دوش نہیں دے سکتے کیونکہ میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہے اور میں مجبوراً تمہیں اس کے حوالے کر رہا ہوں۔''

''تم فکر مت کرو ہم تم کو دوش نہیں دے گا۔'' فتح خان بولا۔

عبداللہ کے آدمیوں نے ان کو وین کے پچھلے حصے میں فرش پر ڈال دیا تھا۔ یہاں وہ نہ تو باہر سے نظر آتے اور نہ ہی وہ باہر دیکھ سکتے تھے اگر ان کی آنکھیں کھلی ہوتیں۔ میں نے اپنا موبائل بھی عبداللہ کے حوالے کر دیا اور اسے مرشد کا نمبر بتا دیا جس پر وہ اس سے رابطہ کر سکتا تھا۔ عبداللہ اور اس کے تین ساتھی پوری طرح مسلح تھے اور کسی قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ پانچواں شخص ایاز تھا اس کے پاس بھی ہتھیار تھے اور میں خود دیکھ چکا تھا لڑنے کے معاملے وہ کسی سے کم نہیں تھا۔ روانگی سے پہلے مجھے ایک خیال آیا اور میں عبداللہ کو ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے بولا۔

''بیتو کو ساتھ لے جاؤ اور اگر مرشد دھوکا کرے تو شریف کو زندہ مت چھوڑنا اور فتح خان کو آزاد کر دینا۔''

''میں سمجھ گیا جناب اور بیتو کی موجودگی سے ہمیں مزید طاقت ملے گی آ جاؤ یار۔'' اس نے بیتو سے کہا اور دونوں وین میں سوار ہو گئے۔ وین اسٹارٹ تھی۔ وہ کوٹھی کے گیٹ سے نکل گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ رفیق بھائی اندر نشست گاہ میں خاموش بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا اولاد کا دکھ وہی جان سکتا ہے جو خود صاحب اولاد ہو۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ''شہباز میرا بیٹا آ جائے گا؟''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''رفیق بھائی اللہ کو اس کی زندگی منظور ہے تب ہی تو اس نے اتنی خراب حالت میں بھی اسے زندہ رکھا اور آئندہ بھی وہی اسے محفوظ رکھے گا۔''

ان کے چہرے پر امید نظر آئی تھی۔ "ہاں ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہے ہیں انہوں نے اس حالت میں مریضوں کو بچتے نہیں دیکھا ہے اور وہ حیران ہیں کہ عتیق کس طرح اب تک سروائیو کر رہا ہے۔"

"یہی میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ آپ خدا سے اس کی زندگی کے لیے دعا کرتے رہیں اور باقی خدا پر چھوڑ دیں۔"

اس دوران میں منیر آ کر ہمارے لیے چائے اور کھانے پینے کے کچھ لوازمات رکھ گیا تھا دوپہر کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔ میں نے رفیق بھائی کو چائے بنا کر دی۔ انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ "شہباز اس وقت مجھ سے کچھ نہیں کھانا جائے گا۔"

میں نے اصرار نہیں کیا خود میرا ابھی یہی حال تھا۔ "وہ شخص آ گیا ہے جسے عتیق کا علاج کرنا ہے۔"

رفیق بھائی چونکے۔ "کہاں ہے؟ مجھے اس سے ملواؤ۔"

"آپ چائے پی لیں ویسے آپ اس سے بات نہیں کر سکتے کیونکہ وہ سوائے اپنی مخصوص زبان کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتا ہے۔ یہاں صرف عبداللہ اس کی زبان جانتا ہے۔"

"اور وہ عتیق کا علاج کرے گا؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔"

"اس ہاتھ کے علاج کی طرح۔" میں نے اپنا بایاں ہاتھ ان کے سامنے کیا۔ "ڈاکٹر اسے کاٹنے کی تیاری کر رہے تھے جب مجھے اسپتال سے اغوا کر کے لایا گیا اور اس حکیم نے میرے ہاتھ کا علاج کیا تھا۔ اس وقت میں خود بھی مایوس تھا لیکن میرا ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر اس نے میرے سامنے ایک آدمی کے سر میں لگنے والی چوٹ کو ٹھیک کیا اگر کچھ دیر کی دیر ہوتی تو اندرونی جریان خون سے اس کا دماغ متاثر ہوتا اور وہ مر جاتا یا ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتا۔ یہ کام اس نے بغیر کسی آپریشن کے صرف چیرے لگا کر کیا اور ڈاکٹرز اس کام کے لیے آدمی کا پورا سر کھول دیتے ہیں۔"

رفیق بھائی متعجب تھے۔ "شہباز اگر تمہارے علاوہ کسی اور نے مجھے بتایا ہوتا تو میں کبھی اس بات پر یقین نہ کرتا۔"

"خود میں نے نہ دیکھا ہوتا یا مجھ پر نہ گزری ہوتی تو میں بھی یقین نہ کرتا اور آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ میں بہت عرصے پہلے بھی اس شخص کے زیر علاج رہ چکا ہوں جب اس نے میری ادھڑی ہوئی کھال صرف چوبیس گھنٹے میں ٹھیک کر دی تھی۔"

میرا مقصد رفیق بھائی کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے ساتھ ان کا دھیان بھی بٹانا تھا۔ "لیکن عتیق کے زخم دوسری نوعیت کے ہیں۔" وہ کسی قدر مایوسی سے بولے۔ "کیا یہ حکیم ان کو ٹھیک کر سکتا ہے؟"

"دیکھیے اصل میں زندگی اور موت دینے والا اللہ ہے لیکن میں نے اس کے طریقہ علاج کو مؤثر پایا۔ چاہے زخم کی نوعیت کچھ بھی ہو۔"

عبداللہ کو نکلے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ جی ٹی روڈ تک پہنچ گیا ہو گا۔ میں نے اس کے نمبر پر گھر کے فون سے کال کی۔ "تم کہاں ہو؟"

"ہم جی ٹی روڈ پر چڑھ چکے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا مرشد کی طرف سے فون آیا؟"

"نہیں۔"

"تب تم اسے کال کر کے بتاؤ کہ تم جی ٹی روڈ پر پہنچ چکے ہو۔"

"آپ لائن پر رہیں میں اسے کال کرتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا اور میرے موبائل سے مرشد کو کال کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر اس کی آواز آئی۔ "میں شہباز صاحب کا آدمی بات کر رہا ہوں مرشد علی سے بات کراؤ۔............ ہاں میں شہباز صاحب کا آدمی بات کر رہا ہوں۔......... وہ کیوں نہیں آئے اس سے تمہیں مطلب نہیں ہونا چاہئے۔......... تمہیں اپنے آدمی چاہئیں وہ لو اور ہمارا آدمی ہمارے حوالے کرو زندہ سلامت .... اسے تم نے اغوا کیا ہے اس لئے اس کی سلامتی کی ذمے داری بھی تم پر ہے اگر اسے کچھ ہوا تو میں بھی دو لاشیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

عبداللہ اس سے بات کر کے لائن پر آیا۔ "خبیث مجھے کہہ رہا تھا کہ اگر عتیق زندہ رہا تو اسے ہمارے حوالے کر دوں گا۔"

"یہ شیطان صفت آدمی ہے تم لوگ پوری طرح محتاط رہنا اور تم نے اسے ٹھیک دھمکی دی ہے۔ اس کی کوئی بات مت ماننا۔"

"میں سمجھ گیا ہوں میں اسے ہینڈل کر لوں گا لیکن اگر اس نے دھوکا کیا تو؟"

"تو تم اس سے نبٹنے کے لئے پوری طرح آزاد ہو۔" میں نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔" مرشد نے کیا کہا ہے؟"

"اس کے آدمی ایمبولینس لے کر پہلے ہی جی ٹی روڈ پر آ گئے ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ جہاں مجھے ایمبولینس سڑک سے ذراہٹ کر نظر آئے گی میں وہیں رک کر ایمبولینس اور قیدیوں کا تبادلہ کر لوں۔"



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشف زبیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



ایک الگ انگ، ایک بہتر تک، ایک تیز آہنگ سلسلہ

- کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ، اس کے بغیر فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی ممکن نہیں۔
- اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی منتظر تھی۔
- اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا منظور تھا۔
- چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
E-mail: alimian_publications@yahoo.com